R4181-

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

سالنامہ

۶۱ ، ۶۲

جنوری، فروری ۱۹۵۷ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ قیمت
۲۰ روپے

فی پرچہ
۴½ روپے

ادارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

ترتیب

افسانے

۱ — چور (غیر مطبوعہ) سعادت حسن منٹو ، ۱۵۲
۲ — اصفہان کے نگبند امتیاز علی تاج ، ۵
۳ — جانا حاتم طائی کا — کنہیا لال کپور ، ۱۹
۴ — رات، چور اور چاند بلونت سنگھ ، ۲۴
۵ — ہاون شہر سے کا سٹیشن حجاب امتیاز علی ، ۵۶
۶ — ایک پھول، ایک کار مہندر ناتھ ، ۶۵
۷ — سات دن کی بادشاہت کشمیری لال ذاکر ، ۷۷
۸ — زینو ابو سعید قریشی ، ۸۴
۹ — ایک انسان کی موت فکر تونسوی ، ۹۳
۱۰ — پکی اینٹ غلام علی چودھری ، ۱۰۰
۱۱ — بہنا جمیل الزمان : ۱۰۳
۱۲ — مومن کی واپسی احمد سعید ، ۱۰۷
۱۳ — یورپ میں اجنبی منظور الٰہی ، ۱۱۷
۱۴ — غدر سن انیس سو ستاون احمد جمال پاشا ، ۱۲۷
۱۵ — زندہ لاش سیّدہ ثریّا سلطانہ ، ۱۳۳
۱۶ — چھبیس اور ایک انوار حسن ہاشمی ، ۱۴۱
—
—

نظمیں، غزلیں

۱ — خط جوش ملیح آبادی ، ۱۵۷
۲ — اک یہی حسن یقین تسکین جان و دل سہی جگر مرادآبادی ، ۱۵۸
۳ — جو در پردہ انھیں جلوہ نمائی کی نہ خو ہوتی سیماب اکبرآبادی ، ۱۵۹
۴ — یہی تھا وقت تری محفل طرب کے لئے عابد علی عابد ، ۱۶۰
۵ — تین نامکمل غزلیں احمد ندیم قاسمی ، ۱۶۱
۶ — فطرتِ عشق گنہگار ہوئی جاتی ہے۔ سراج لکھنوی ، ۱۶۲
۷ — کتنی کرنیں جو افق پر نور کا بنتی تھیں جال آنند نرائن ملّا ، ۱۶۳
۸ — چمن میں آؤ ذرا سیرِ نو بہار کریں معین احسن جذبی ، ۱۶۴
۹ — سہاروں کی تلاش اختر انصاری ، ۱۶۵
۱۰ — جہاں بھی اس مہ جبیں کے عہدِ شباب کی بات ہو رہی ہے عدم ، ۱۶۶
۱۱ — بڑی صدا عدم ، ۱۶۷
۱۲ — تعمیرِ نو قضا و قدر کی نظر میں ہے فضل احمد کریم فضلی ، ۱۶۸
۱۳ — ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا عرشی رامپوری ، ۱۶۹
۱۴ — ستمگر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں شاد عارفی ، ۱۷۰
۱۵ — سرد مہری سے تری دل جو تپاں رکھتے ہیں اشک رامپوری ، ۱۷۱
۱۶ — دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے شور علیگ ، ۱۷۲
۱۷ — ابر و باد شور علیگ ، ۱۷۳
۱۸ — رباعیات قتیل شفائی ، ۱۷۴
۱۹ — یاد غلام ربّانی تاباں ، ۱۷۵
۲۰ — ایک تو خود اپنی غمگینی حیرت شملوی ، ۱۷۶
۲۱ — دن ہو کہ رات کنج قفس ہو کہ صحن باغ انجم رومانی ، ۱۷۷
۲۲ — دن سے خوف آتا ہے اب رات سے بھی جی ڈرتا ہے جگن ناتھ آزاد ، ۱۷۸
۲۳ — چمن میں آتش گل بھی نہیں دھواں بھی نہیں راز مرادآبادی ، ۱۷۹

۲۴ — رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی — ناصر کاظمی، ۱۸۰
۲۵ — گھونگھٹ اوٹ — سوامی مارہروی، ۱۸۱
۲۶ — ہر گھڑی قیامت تھی، یہ نہ پوچھ کب گذری — ظہور نظر، ۱۸۲
۲۷ — غروب — ظہور نظر، ۱۸۳
۲۸ — اُن کا غم بھی نہ رہا پاس تو پھر کیا ہوگا — شاعر لکھنوی، ۱۸۴
۲۹ — پکنے لگا ہے ترا غم بہت — نور بجنوری، ۱۸۵
۳۰ — پولونیئس — مصطفےٰ زیدی، ۱۸۶
۳۱ — اشارے — منیر نیازی، ۱۸۸
۳۲ — کوئی نہ چاہنے والا تھا حسن رسوا کا — وحید قریشی، ۱۸۹
۳۳ — تعبیر — حمایت علی شاعر، ۱۹۰
۳۴ — یہ اونچے دریچے — احمد ریاض، ۱۹۱
۳۵ — تعبیر — آغا صادق، ۱۹۲
۳۶ — ہوگیا ہوں ہر طرف بدنام تیرے شہر میں — پریم وار برٹنی، ۱۹۳
۳۷ — نگارِ شہر — مظہر امام، ۱۹۴
۳۸ — کِھلا کِھلا سا ہر اک گام پر چمن دیکھا — جمیل ملک، ۱۹۶
۳۹ — ہم سے پوچھو کہ بے کراں تھے پھول — اختر ہوشیارپوری، ۱۹۷
۴۰ — زنجیر کی جھنکار کو سنگیت میں ڈھالا — شکیب جلالی، ۱۹۸
۴۱ — ہوں خندہ بلب، زورِ الم یوں تو بہت ہے — مظہر امام، ۱۹۹
۴۲ — جو تیری افشاں سنواریں زندگی اے زندگی — جلیل حشمی، ۲۰۰
۴۳ — کون بھلا یہ کہتا ہے خود آ کے ہم کو منائیں آپ — باقر مہدی، ۲۰۰

مقالات

۱ — تقریظ (غیر مطبوعہ) — مولانا محمد علی جوہر، ۲۰۱
۲ — نذیر احمد کا ایک ناول — مولانا عبد الماجد دریابادی، ۲۰۸
۳ — غالب کی مقبولیت کے اسباب — شیخ محمد اکرام، ۲۱۱
۴ — احتشام حسین کی تنقید — کلیم الدین احمد، ۲۱۵
۵ — متفرقات — قاضی عبد الودود، ۲۲۷
۶ — فقہ ہندی — اختر اورینوی، ۲۳۷
۷ — نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ — راجندر ناتھ شیدا، ۲۴۴
۸ — آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری — ڈاکٹر محمد حسن، ۲۵۲
۹ — تذکرہ شعرائے اردو — ڈاکٹر وحید قریشی، ۲۷۴
۱۰ — قدیم مشاعرے کی ادبی اہمیت — آفتاب احمد، ۲۸۲
۱۱ — حیات ڈپٹی نذیر احمد — یٰسین علی خاں، ۲۸۶

ضمیمہ شخصیات نمبر

۱ — علامہ سیّد علی حیدر نظم طباطبائیؒ — سیّد ابو الخیر مودودی، ۳۰۰
۲ — قاضی عبد الودود — ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، ۳۱۱
۳ — شفق عماد پوری — حسن وارثی، ۳۲۶
۴ — مانی جائسیؔ — سید کلب مصطفےٰ، ۳۳۲
۵ — میرزا ادیب — جمیل ملک، ۳۴۳
۶ — صالحہ عابد حسین — بیگم انیس قدوائی، ۳۴۸
۷ — قتیل شفائیؔ — ابراہیم جلیس، ۳۵۱
۸ — لاہور کی چند شخصیتیں — محمد طفیل، ۳۵۶

کھُلے خط

۱ — پہلا خط — اثر لکھنوی، ۳۷۲
۲ — دوسرا خط — عبد الحمید عدم، ۳۷۶

محمد طفیل پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے شرف پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا!

طلوع

نقوش اب کے خاصی تاخیر سے آرہا ہے۔ اس کی یوں تو کئی وجوہ ہیں۔ اُن میں سے دو ایک یہ بھی ہیں کہ میں پچھلے دنوں خاصا بیمار رہا۔ علالت بھی دل کے ڈوبنے کی۔ جس میں رات کو سوتے وقت صبح زندہ اُٹھنے کی امید کم ہوا کرتی ہے۔ خیر یہ مسئلہ سراسر ذاتی ہے۔ ممکن ہے اِس سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔

دوسری بات یہ تھی کہ شخصیات نمبر جلد دوم میں کچھ زیادہ ہی خسارہ ہوگیا۔ میں اپنی دو برس کی محنت کو جب بازار میں لایا تو ادب کے پرستاروں کو نیند آگئی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری وہ جانکاہی قارئین کے نزدیک تضیع اوقات کی حیثیت رکھتی ہو۔ میرے نزدیک تو وہ نمبر اُردو ادب کا ایک ضروری باب ہے۔

اب مکاتیب نمبر کو میری آرزوؤں کا حاصل سمجھئے۔ جتنے بھی نمبر میں نے اب تک پیش کئے ہیں۔ اُن میں افادیت کے اعتبار سے شاید اسی کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہو۔ اگر یہ نمبر میری آرزوؤں کے مطابق مرتّب ہوگیا تو میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

اس شمارہ میں جتنی تخلیقات شامل ہیں۔ وہ سب کی سب معیار پر پوری نہیں اتریں گی۔ مگر اس میں ایسی چیزیں ضرور موجود ہیں۔ جن سے استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے اور ذہن کی گرہیں بھی کھولی جاسکتی ہیں۔ ہوتے ہوتے یہ عام شمارہ بھی سالنامہ بن گیا۔ نہ جانے آپ کے نزدیک یہ بات خوشی کی ہے یا افسوس کی۔

کلیم الدین احمد، امتیاز علی تاج، شیخ محمد اکرام اور راجندر ناتھ شیدا پہلی بار بزم نقوش میں تشریف لائے ہیں۔ میں ان کے استقبال کے لئے اُٹھتا ہوں۔

اتفاق سے ہمیں منٹو مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ افسانہ مل گیا ہے۔ جسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ افسانہ اُس وقت ملا۔ جب پرچے کا بہت سا حصہ چھپ چکا تھا۔ اِس لئے ترتیب میں یہ اپنے صحیح مقام سے محروم رہا۔ یہ افسانہ کچھ مرحوم کے اپنے حالات پر بھی روشنی ڈالے گا۔ اس لئے بھی اس کی آج بڑی اہمیت ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ منٹو ہم میں موجود تھا ــــ اُسے دُور گئے ابھی دو ہی برس ہوئے ہیں۔ اور یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے سب اُسے بھول گئے ہوں۔ پچھلے برس تو اس کی برسی پر کچھ حضرات اکٹھے ہو گئے تھے۔ اب کے تو اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

مولانا ظفر علی خاں بھی چل دیئے۔ ایک اور ستون گرا۔ یہ خلا بھی پُر ہونے والا نہیں ہے۔ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ جتنے صاحب طرز اور زندہ رہنے والے ادیب تھے وہ ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں سے کچھ زیادہ شاندار روایات کی امید رکھنا، اپنے آپ کو فریب دینے کے مترادف نظر آرہا ہے۔

سوچتا ہوں کہ مکاتیب نمبر سے پہلے اسی طرح کے ایک دو اور پرچے پیش کر دوں۔ تاکہ مکاتیب نمبر میں، میرے نزدیک کوئی کسر نہ رہے۔

محمد طفیل

اصفہان کے گنبد

(ایک ریڈیائی تمثیل)

سید امتیاز علی تاج

حلاج : معزز سامعین، السلام علیکم! مزاج شریف؟ خالقِ ارض و سما نے جب سے یہ کائنات پیدا کی ہے، ابنِ آدم کو وہ مسرتیں کبھی نصیب نہیں ہوئیں جو آج اصفہان میں میسر ہیں۔ اس دیارِ حسن و عشق میں کسی شخص کا آئینۂ خاطر زنگ آلود نہیں۔ ہمیں اس قدر مسرتیں حاصل ہیں کہ اگر ہم قصداً غمگین ہونا چاہیں جب بھی نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے دیکھیے آج ایک ایسی پریشانی کا سامنا ہے کہ میرے حواس مجھ سے رخصت طلب کرنے پر مصر ہیں۔ پر کہتا ہوں، بسورنے اور ہائے وائے کرنے سے کیا حاصل؟ قصہ یہ ہے کہ میں ایک ایسی حسینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس کے دیدار سے میری آنکھیں بہرہ یاب نہیں ہوئیں۔ آپ کو شاید یہ معلوم ہو گا کہ محبت کا مقدس جذبہ محض دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا یہ آگ کبھی کبھی گفتار سے بھی بھڑک اٹھا کرتی ہے۔ چنانچہ اگر ایک شاعر اپنی محبوبہ کی صورت دیکھے بغیر محض اس کے نام پر فدا ہو جائے تو آپ اس بیچارے کو قصوروار کیونکر ٹھہرا سکتے ہیں؟ رباعی تو خیر میں نے لکھ لی لیکن سوال اب صرف یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے باپ کی دوسری شرط کیونکر پوری کی جائے؟ آخر تاجر ہے۔ ساتھ ہی یہ ترخ بھی لگا دی کہ جو شخص اس مقابلہ میں شریک ہونا چاہے رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی پیش کرے۔ یہاں لے دے کے ساری پونجی صرف یہ ایک دینار ہے۔ افسوس کہ آپ اسے دیکھنے سے معذور ہیں بہرحال اب فکر ہے تو یہ کہ کیا افسوں پڑھ کر پھونکا جائے جو اسے ایک کے دس دینار نظر آنے لگیں؟ خیر ہمیشہ سے یہی ہوتی آئی ہے، کچھ مجھ ہی پر موقوف نہیں۔ بڑے بڑے اہلِ کمال آشفتہ حال پھرے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ آج کل کاروبار مندا ہے۔ دکان پر اتنے گاہک نہیں آتے جن سے نو دینار کمانے کی امید ہو سکے۔ لیکن قسمت کا شکوہ کرنا احمقوں کا شیوہ ہے کاتبِ تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا ہے ہو کر رہے گا۔

(موسیقی کے ساتھ شاہ کمال داخل ہوتا ہے)

حلاج : اخاہ آقائے شاہ کمال، خوش آمدید! اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ غریب خانے پر آپ قدم رنجہ فرمانے والے ہیں تو میں سارے فرش پر گلاب و یاسمن بکھیر دیتا۔ لیکن آپ نے اپنی تشریف آوری کی اطلاع ہی نہ بخشی۔ کیوں خیر ہے آج؟ حضور نے اپنا تنور اس قدر جلد کیوں بند کر ڈالا؟

شہ کمال : اے کوہِ دانش! اے سلطان القلم! ابھی ابھی کلچے بیچتے ہوئے میں نے سُنا کہ اصفہان کے متمول سوداگر ابنِ حسیم نے اپنی پری جمال دختر

کی شادی کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

حلاج : ماشاء اللہ، آپ کی سماعت میں اب تک کوئی عیب پیدا نہیں ہونے پایا۔

شہ کمال : یہ بھی سُنا کہ جو شخص اس کے جمال جہاں آرا کی تعریف میں بہترین رباعی کہہ کر لائے گا وہی اس کا شوہر قرار پائے گا۔

حلاج : لیکن میرے محسن اس کے ساتھ بعض شرطیں بہت کڑی بھی ہیں۔

شہ کمال : میں بھی تو سنوں وہ کیا ہیں؟ اگر چند اشعار کے عوض جوہری کی کافر ماجرا دختر ہاتھ آئے تو اور چاہئے کیا؟

حلاج : رباعی غروبِ آفتاب سے پہلے تیار ہو جانی چاہئے۔

شہ کمال : معمولی بات ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کی فرصت ہے اتنی دیر میں چار مصرعے کہہ لینا کیا بڑی بات ہے۔ ارے برادر ایک مرتبہ شیخ کے ہاں ضیافت تھی۔ اس ناچیز نے ضیافت کا سارا کھانا گھنٹہ بھر میں تیار کر کے رکھ دیا تھا اور پھر لطف یہ کہ ہر کلیجے کی قطع اور رنگت کسی نہ کسی پھول سے مشابہ تھی۔ چنانچہ اس کارنامہ پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔ کیوں ہے نا؟ تو صرف رباعی ہی کہنی ہے؟

حلاج : ایک شرط یہ بھی ہے کہ قافیہ میں لڑکی کا نام آئے اور اس طرح لایا جائے جس طرح جوہری زرد موتی کے نگینے کے ارد گرد سونے اور چاندی کے بیل بوٹے بنا دیتا ہے۔

شہ کمال : یعنی ویسے ہی نا جیسے سانچوں میں نان پاؤ تیار کئے جاتے ہیں۔ اے لو مجھے تو شعر سوجھنے بھی لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دماغ کے تنور سے اشعار کے خستہ شیر مال نکلے آ رہے ہیں۔

حلاج : یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی نہایت پاکیزہ خطِ نستعلیق میں لکھ کر پیش کی جائے۔

شہ کمال : یہ البتہ ٹیڑھی کھیر ہے تم جانتے ہو لکھنا مجھے آتا نہیں۔

حلاج : اس خدمت کے لئے میں جو حاضر ہوں۔

شہ کمال : دام کیا لو گے؟

حلاج : آقا اس خاکسار کو چاندی کا ایک دینار دے دیجئے۔ ایسے پاکیزہ خط میں نظم لکھ کر دوں کہ لوگوں میں ایک بار تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ہاں بھئی شہ کمال کی رباعی واقعی ماہ جبیں کی نظروں سے گزرنے کے قابل ہے۔

شہ کمال : منظور۔ یہ لو دینار۔ جو کچھ کہا سچ ہے، تو یہ معاوضہ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ تو گویا اب رباعی کی طرف توجہ کی جائے اور نہایت لطیف اشعار کہے جائیں۔ ذرا مجھے فکر کرنے دو۔ ہاں تو یوں کہنا چاہئے۔ تو شمع ہے میں پروانہ بنوں۔

حلاج : مگر ایک بات اور۔

شہ کمال : یار تم تو پریشان کئے دیتے ہو بڈھا اور کیا چاہتا ہے۔ کہہ بھی چکو۔

حلاج : رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی دینے ہیں۔

شہ کمال : حریص پیر فرتوت۔ مگر پروا نہیں، دس دینار بھی ہیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ میں شمع ہوں اور پروانہ ہے تو۔ ہوں! ہوں! ہوں! لاحول ولا قوۃ۔ غارت ہو گیا سارا خیال۔ کیسے تھا؟

(گھنٹی بجتی ہے)

حلاج : کون ہے؟

آواز (باہر سے) : میں ہوں علاؤالدین عطر فروش!

حلاج : اندر تشریف لے آیئے۔

(علاؤالدین داخل ہوتا ہے)

حلاج : آج تو میری قسمت کا ستارہ زوروں پر ہے اگرچہ آپ کے عطر کے قرابوں سے گلاب کی بوئے دلآویز کے بھپکے اٹھتے ہیں لیکن مجھے اس وقت اس شخص کا خیر مقدم کرنے کی سعادت حاصل ہے جس کی باتیں عطر سے بھی زیادہ نکہت بیز ہیں۔

علاؤالدین : اگر یہ صحیح ہے تو یوں کہنا چاہیئے کہ قدرت لطیف کاموں کے لئے ان ہی لوگوں کو منتخب کرتی ہے جنہیں لطافتِ ذوق کی نعمت عطا ہوئی ہے لیکن ذرا دیکھنا یہ ان حضرت کو کیا ہو گیا؟ میرے خیال میں تو ان کی حالت اندیشہ ناک سی ہے۔

حلاج : یہ شہ کمال نانبائی ہیں۔ آپ نے یقیناً انہیں بارہا دیکھا ہوگا۔

علاؤالدین : میں نے؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میرا ان سے کیا واسطہ، لیکن یہ تو فرمایئے یہ ایسے وحشیانہ انداز میں کیوں گھوم رہے ہیں؟

حلاج : یہ اس وقت بحرِ نظم میں غرق، قافیہ کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔

علاؤالدین : کیا کہا بحرِ نظم میں غرق؟ نانبائی میں شاعر کی روح کہاں سے آئی۔ کہیں انہیں بھی تو یہ خبط نہیں ہوا کہ رباعی کہہ کر ماہِ سیمیں پری جمال دوشیزہ کو حاصل کیا جائے؟ کیا خوب چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔

شہ کمال : ارے بھئی یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے۔ اخاہ تم ہو میرے دوست علاؤالدین! وہ اس شیرمال کے دام آج تک ادا ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ یاد ہے نا؟ لاحول ولا قوۃ! مصرعہ ہی دماغ سے نکل گیا۔ کیا تھا۔ یہ گلہائے ....

علاؤالدین : کتنا فرسودہ اور پامال خیال ہے۔ جیسے اس شخص کے شیرمال پھیکے اور بے مزا ہوتے ہیں ویسے ہی اشعار بھی بے کیف ہیں لیکن حلاج پہلے میں اپنے یہاں آنے کی غرض و غایت بیان کر ڈالوں۔ معلوم ہوتا ہے بوڑھے جوہری کے خبط کا قصہ تم نے سن لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ابنِ حسیم خود تو بالکل کورا ہے۔ لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن بوڑھے کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ اس کی بیٹی ماہ سیمیں....

حلاج : میں جانتا ہوں یہ اشعار ماہ سیمیں پڑھے گی۔

علاؤالدین : بالکل ٹھیک۔ چنانچہ اگر اپنے اشعار میں تم سے لکھواؤں تو اس کا معاوضہ تم کیا لوگے؟

حلاج : دو دینار!

علاؤالدین : دو نہیں بھائی ایک۔ کامیاب ہو گیا تو سارا بٹوہ تمہارا۔

حلاج : منظور!

شہ کمال (چھاتی کوٹتے ہوئے) : میرا قافیہ تنگ ہو گیا ہے۔ شعر سوجھتا نہیں۔

علاؤالدین : تو اب سوال یہ ہے کہ اشعار لطیف ہوں یا جذبات سے لبریز ہوں یا مشکل ہوں۔

حلاج : تین دینار تو ہو گئے۔ شاید باقی سات بھی کہیں سے مل رہیں گے۔

شہ کمال : یہ گلہائے رنگارنگیں۔ یہ گلہائے رنگارنگیں۔

علاؤالدین : حلاج! یہاں میرے لئے شعر کہنا ناممکن ہے۔ جب ایک ایسا عجیب و غریب انسان اس ہیئت کذائی کے ساتھ شاعری کا خون کر رہا ہو تو بھلا کوئی شریف آدمی شعر کیونکر کہہ سکتا ہے؟

حلاج : آپ کہاں لکھنا پسند کریں گے؟

علاؤالدین : کوئی نرم اور گدگدی سی جگہ ہوتی یہاں گدیلے بھی تو نہیں ہیں۔ ارے میاں تم کیا آدمی ہو۔ درویشوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہو۔

حلاج : آپ یہاں تشریف رکھئے نا۔

علاؤالدین : ہوں۔ خیر لیکن ایک بات سُننا۔ اگر کوئی اور آئے تو اسے میرے قریب نہ پھٹکنے دینا۔ میرا دماغ بے حد حسّاس ہے اور اثر بڑی جلدی قبول کرتا ہے۔ پھر میرا ذوق بھی بے حد لطیف واقع ہوا ہے۔ کوئی غیر فصیح لفظ سُن پاؤں تو ذہنی کوفت ہوتی ہے اور اگر کسی احمق کا منحوس چہرہ نظر آجائے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر تک طبیعت مکدّر رہتی ہے۔

حلاج : الٰہی تیری پناہ!

علاؤالدین : تو اب میں شعر کہتا ہوں۔

(گھنٹی کی آواز)

حلاج : کوئی اور صاحب تشریف لائے۔ ارے یہ تو حجامت مآب جناب سلیمان حجّام ہیں۔

سلیمان (بھاگتا ہوا آیا ہے اس لئے ہانپ رہا ہے) اماں حلاج سنا تم نے بوڑھے جوہری کا قصّہ جب ڈھنڈورچی یہ خبر لے کر میرے کوچے میں پہنچا تو میں خط بناتا بناتا اٹھ کر اس طرح بھاگا جیسے شیطان جہنم سے نکل کر بھاگے۔ سارے شہر میں اس قصّے کا چرچا ہو رہا ہے اور یہ دوشیزہ ہے بھی تو حرم سرائے سلطانی کی زینت بننے کے قابل۔ ارے بھائی تمہارے وہم وگمان میں تو اس کی انگشتریوں کی صحیح قیمت بھی نہیں آسکتی۔ ان کے نگینے اتنے بڑے ہیں کہ.....

حلاج : خدا کے لئے بات کرتے وقت اپنی قینچی کو یوں نہ گھمائیے، آپ میری آنکھیں نکال ڈالیں گے۔

سلیمان : میں تو کہتا ہوں یارب یہ بیداری کا عالم ہے یا خواب وخیال کی دنیا۔ میں اس قدر مسرور ہوں کہ بچپن کے زمانے کی طرح ناچنے کو جی چاہتا ہے۔ رستو! میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں بمعاوضہ نقداً نقد، جی چاہے پیشگی لے لو اور اگر کہیں میں نے اس معرکہ میں فتح پالی اور ماہ سیمیں میرے ہاتھ آگئی تو قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے اس حجّامی کے پیشے سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ لو، اب میں شعر کہتا ہوں اور تم فوراً انہیں لکھ لینا۔

گلی میں سے آواز : ارے بدمعاش نکل باہر، کہاں آکر چھپ بیٹھا ہے۔ حلاج، سلیمان اندر ہے نا؟

سلیمان (گھبرا کر) : ہی ہی یہ کم بخت یہاں آپہنچا۔ جب ڈھنڈورچی آیا تو میں اس وقت اس کم بخت کی آدھی ڈاڑھی تراش چکا تھا۔

(گلیش داخل ہوتا ہے)

حلاج : خوش آمدید گلیش!

گلیش : لیکن تم مسکرا کیوں رہے ہو؟

حلاج : کیونکہ آج بڑی مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔

گلیش : وہ رہا کم بخت حجام۔ کیوں بے بدمعاش یہ کیا حرکت تھی۔ آدھی ڈاڑھی تراش کر اٹھ بھاگا۔ شہر کے ایک معزز آدمی کو اچھا خاصا مسخرا بنا ڈالا۔ میں اس بلا کی گرمی میں سوانگ بنا گلی کوچوں میں سے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ ادھر تو آ۔ تجھے بھاگنا سکھاؤں۔

حلاج : اجی حضرت ایسا بھی کیا غصہ، ذرا بات تو سنئے۔ سلیمان بُرا آدمی نہیں، البتہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے اور پھر اس وقت ذرا فکرِ شعر میں بھی مصروف ہے۔

گلیش : کیا کہا شعر؟ ایک بار اس کی ناک میرے ہاتھ آجائے تو اسے سکھاؤں شعر کہنا۔

علاؤالدین : ارے بھئی یہ کیا مصیبت ہے۔ دفان کرو اس جھکّی کو یہاں سے۔

شاہ کمال: اے لو۔ اتنی دیر کے بعد ایک ہی لفظ سوچا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔

سلیمان: قبلہ آپ کی باقی ڈاڑھی میں پھر کسی دن تراش دوں گا۔ اس وقت آپ کو معلوم نہیں میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ مجھے معاف فرمائیے۔

گلبیش: ہیں؟ کیا کہا؟

حلاج: میں نے کہا حضرت ذرا بات تو سنئے۔ میں نے سنا ہے آپ بڑے کاروباری شخص واقع ہوئے ہیں۔

گلبیش: تو پھر؟

حلاج: آپ بھی وہی کیجئے نا جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

گلبیش: کیا میں بھی شعر کہوں؟ میں اور شعر؟

حلاج: چار مصرعے ہی تو کہنے ہیں۔ خبر آپ نے سُن ہی لی ہوگی۔

گلبیش: وہی ابنِ حسیم کا قصّہ۔ جی ہاں! یہی نا کہ وہ اپنی لڑکی چند شعروں کے عوض بیچ ڈالنا چاہتا ہے۔ نا بھائی ان دنوں جورو پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی استطاعت کہاں۔

حلاج: غالباً آپ نے یہ نہیں سُنا کہ جہیز میں ستّر اونٹ بھی ہاتھ آئیں گے۔

گلبیش: سچ مچ! تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔ یہ بات ہے تو میں اس لڑکی کو جیت کر رہوں گا۔

حلاج: بالکل بجا۔ لیکن رباعی لکھنی بھی تو پڑے گی۔

گلبیش: لکھنے کی بات ٹیڑھی ہے۔

حلاج: ایک دینار صرف کیجئے تو یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔

گلبیش: اکٹھا ایک دینار۔ یہ تو بہت ہے، نصف دینار کہو۔ ہاں نصف دینار۔

حلاج: لیکن پاکیزہ اشعار اگر پاکیزہ خط میں نہ لکھے گئے تو حاصل کیا ہوگا۔

گلبیش: اچھا تو پھر یوں ہی سہی۔ یہ لو دینار۔

حلاج: یہ خیال بھی تو کیجئے نا کہ لڑکی کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔

علاؤالدین: شکر ہے الٰہی۔ کسی قدر سکون تو نصیب ہوا۔ تو اب سیمیں کا کوئی نیا اور شگفتہ قافیہ تلاش کریں۔ ابجد سے قافیہ کی تلاش شروع کرنی چاہئے۔ سیمیں، آئیں۔ فرسودہ اور پامال قافیہ ہے۔ پائیں۔ رنگین، سنگین، شیریں، غمگین۔ رنگین اور غمگین اچھے قافیے ہیں پہلے قافیہ مقرر کر لینا چاہئے۔ خیال خواہ پست ہو اس کی پروا نہیں۔ شاعری کی جان الفاظ کا ترنّم اور آہنگ ہے۔

گلبیش (دور سے): اماں علاؤالدین تم نے تو مغز چاٹ ڈالا۔ جہاں کوئی موزوں ترکیب سوجھتی ہے۔ تم اسے غتر بود کر دیتے ہو۔

سلیمان: کان نہ کھاؤ گلبیش میں اپنی رباعی دل میں دہرا رہا ہوں۔

شاہ کمال: اگر بکنا ہی ہے تو آپ حضرات کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈھئے۔

علاؤالدین: یہ مصرعہ کیسا رہے گا ع۔ ترانے بلبلیں گاتی ہیں تیرے روئے رنگیں کا۔

شاہ کمال: سوجھ گیا۔ بالکل سوجھ گیا ع نہیں ہے علم بلبل کو ذرا الفت کے آئیں کا

علاؤالدین (اٹھ کر): کیا کہا تم نے؟ نہیں ہے علم بلبل کو؟ یہ ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ بلبل کا خیال میرا ہے۔

گلبیش: اتنا ٹکڑا تو ہو گیا۔ کہاں بلبل کہاں نغمہ۔

علاؤالدین: تم سب کے سب چور ہو۔ یہ ساری بلبل چوروں کی ٹولی ہے۔

حلاج: ہائیں ہائیں کیا ہوا تمہیں۔ شاعر اور عاشق اور اس پہ یہ کیفیت کہ مرغوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ اس خشک اور سوختہ دنیا میں شاعر تو ابرِ رحمت کی طرح ہیں۔ جو خدا کی دنیا کو سیراب و شاداب بناتے ہیں۔ پھر شاعروں کا لڑنا جھگڑنا کیا معنی؟

سلیمان (اچانک): حلاج، گلیش، شاہ کمال، علاؤالدین! میں نے رباعی کہہ لی۔

علاؤالدین: نہیں نہیں پہلے اس قضیہ کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔

سلیمان: اماں چھوڑو اس قصے کو۔ لو حلاج تم میرے شعر قلمبند کر لو۔ دیر کی تو میں بھول جاؤں گا ؎

کہیں خوشبو ہے ریحاں کی کہیں ہے رقص نسریں کا
کہیں بلبل کے ....

علاؤالدین: کیا کہا بلبل؟ یعنی تم نے بھی میرا ہی بلبل کا خیال چرا لیا۔ چچا جان کی ریش دراز کی قسم یہ دنیا ٹھگوں سے بھری ہوئی ہے۔

سلیمان: کیوں بلبل کے ٹھیکیدار آپ کیسے بن بیٹھے؟

علاؤالدین: یہ لفظ پہلے مجھے سوجھا تھا۔

شاہ کمال: سنا آپ نے؟ حالانکہ سوجھا مجھے پہلے تھا۔

گلبش: بکتے ہو جی۔ یہ لفظ میرا ہے۔

حلاج: یہ کس نوک جھونک میں پڑ گئے آپ لوگ۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ یہ نہ بھولئے کہ آسمان کی بلندیوں پر چاند اگرچہ ایک ہی نکلتا ہے لیکن اس کا پرستار ہر باغ میں موجود ہوتا ہے جو راتوں کے سناٹے میں اس کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔

سلیمان: واللہ کیا بات کہی ہے۔ آدمی عقلمند ہے۔ مجھ سے پوچھو تو سب کے سب بڑے شوق سے اس لفظ کا استعمال کریں۔ الفاظ پر کسی کے باپ کا اجارہ ہے؟

علاؤالدین: لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ ہر ایک جانتا ہے کہ الفاظ کے دہرانے اور ان کی تکرار سے حسنِ کلام کا خون ہو جاتا ہے۔

سلیمان: حلاج! اس معاملہ سے تمہارا کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لئے تم ثالث بن کر یہ جھگڑا چکا دو۔

شاہ کمال: میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

گلیش: اور میں بھی۔

علاؤالدین: اور میں بھی۔

حلاج: یہ تو بڑی سیدھی سی بات ہے۔ آپ کے اشعار خواہ دوپہر کی طرح روشن ہوں۔ خواہ شام کی تاریکی کی مانند سبک اور لطیف، یا تاروں بھری رات کی طرح پرشکن آپ کی مرضی پہ موقوف ہے لیکن ان میں طلسم ایسے الفاظ کا باندھ دیجئے۔ جن میں سنبل و ریحاں اور مشک و عنبر کی شمیم جاں نواز کا ذکر ہو اور کائنات گلہائے رنگا رنگ سے تختۂ گلزار نظر آئے۔ نرگس کی نگاہ بازی بھی اور سوسن کی زباں درازی بھی۔ اس میں طیورِ خوش الحان کا نام بھی لیجئے قمری، فاختہ، طوطی اور طاؤس کا ذکر بھی کیجئے لیکن بلبلِ ہزار داستان کا نام بھی نہ لیجئے۔

علاؤالدین: یعنی کوئی بھی بلبل کا ذکر نہ کرے؟ اس طرح تو میں خسارہ ہی میں رہا لیکن اچھا تم کہتے ہو تو یوں ہی سہی۔

سلیمان: تو پھر فیصلہ ہو گیا نا کہ بلبل کا نام اشعار میں نہ آئے گا۔ یوں ہی سہی۔

(پھر سب بیٹھ کر شعر کہنا شروع کر دیتے ہیں)

حلاج (دینار گنتے ہوئے): ایک، دو، تین، چار، پانچ؟ —— دنیا میں مجھ سا بد قسمت بھی کوئی نہ ہوگا۔ تاجروں سے سنا ہے کہ پانچ اور پانچ دس ہوتے ہیں۔ باقی رہے پانچ دینار۔ اب وہ کیونکر حاصل کئے جائیں۔ (سامعین سے مخاطب ہو کر): اے سننے والو! معلوم نہیں میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی تعریف میں مجھ سے اچھا شعر کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن افلاس بہت بڑی لعنت ہے۔ اب اتنا وقت بھی نہیں رہا کہ روپیہ کہیں سے چرا کر ہی لے آؤں۔ اچھا اگر میں اسے اپنا نہیں بنا سکتا تو اس کی بھی کوئی پروا نہیں۔ اگر وہ میرے ہاتھ نہ آئی جب بھی یہ آفتاب کی روشنی، بادل اور یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، پھول اور شعر تو کہیں نہیں گئے۔

سلیمان (نہایت بلند آواز سے): ہو گئی ہو گئی رباعی۔ حلاج جلدی کرو۔ نکالو قلم اور کاغذ۔ اشعار سیلاب کی طرح بہے چلے آ رہے ہیں اور میری روح کے قفس کی تیلیاں توڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ جلدی کرو اور ان کے پاؤں میں حروف کی زنجیریں ڈال دو۔

حلاج: تیار ہوں، بولو!

سلیمان: ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محل پروین کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ ساماں ہے دیں کا

مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

شاہ کمال: آہا ہا ہا کیا خوب رباعی ہے۔ حلاج لکھنا میرا شعر جلدی سے۔ کیا تھا بھلا مصرع؟

سلیمان: مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

حلاج: ارے بھائی ٹھہرو، میں دونوں ہاتھوں سے نہیں لکھ سکتا۔

گلبشن: اے سبحان اللہ۔ "ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا"

علاؤالدین: اماں ہٹاؤ ان چوروں کو، ان کی نہ سنو۔ میرے شعر لکھو۔

سلیمان: میں نے کہا تھا "مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب"

علاؤالدین: ترا پیکر سہارا ہے مرے احساسِ غمگیں کا
گلبشن: ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا
شاہ کمال: جہانِ عشق و مستی میں گذر کیا ظن و تخمیں کا
سلیمان: مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج: یارو ذرا ہٹ کر کھڑے ہو۔ مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ اُفوہ کتنی گرمی ہے۔ سینوں میں شاعری کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ایک ایک کر کے کہو۔ سلیمان پہلے تم اپنی رباعی لکھواؤ۔

سلیمان: ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محل پروین کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ ساماں ہے دیں کا
مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب
مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج: واہ واہ سبحان اللہ! کیا دلکش اشعار ہیں۔ اے کاش یہ اشعار میرے ہوتے۔

علاؤالدین: اماں رہنے دو۔ تم انہیں دلکش کہتے ہو۔ خدا کی پناہ میں تو سمجھتا ہوں نہایت پھسپھسے شعر ہیں۔

سلیمان: کیوں بے پھسپھسے ہیں ہمارے اشعار؟

علاؤالدین: ارے چھوڑ میرا کان۔

حلاج: شاہ کمال اب تم اپنی شاعری کے تنور کا ڈھکنا اٹھاؤ۔ دیکھیں الفاظ کے کلچے تیار کرنے میں تمہیں کتنی مہارت ہے۔

شاہ کمال: عرض کرتا ہوں ؎

تخیل سے مرے کیا واسطہ شہباز و شاہیں کا　　جہانِ عشق و مستی میں گذر کیا ظن و تخمیں کا
اسی دن زندگی کو زندگی کہہ کر پکاروں گا　　مرے ہاتھوں میں ہوگا ہاتھ جس دن ماہِ سیمیں کا

حلاج: کیا کہنے ہیں۔ واہ، واہ، واہ!

علاؤالدین: شاہ کمال ایک بات میری سن لو۔ اگر ماہ سیمیں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو چوتھا مصرعہ بدل ڈالو۔

حلاج: گلبش! آگے آؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔

گلبش: کہتا ہوں کہ ؎

ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا　　بیاں میں کیا کروں تیرے جمالِ لذت آگیں کا
میں سچ کہتا ہوں پانی کی طرح سونا بہا دوں گا　　بس اک پل کے لئے جلوہ دکھا دو ماہِ سیمیں کا

علاؤالدین: ان اشعار میں دولت کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ ہے۔

حلاج: اماں تم تو کسی کو بھی داد نہ دو گے۔ اچھا اپنے اشعار سناؤ۔

علاؤالدین: تمہارا اصرار ہے تو انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ جو کچھ کہا ہے روا روی میں کہا ہے اور اس زمانہ کے تمام بلند پایہ شاعر ایک ایک مصرعہ پر پورا پورا ہفتہ صرف کر دیتے ہیں۔ تو عرض کیا ہے کہ ؎

ترا پیکر سہارا ہے مرے احساسِ غمگیں کا　　ترا ماتھا ستارہ ہے مری شبہائے مشکیں کا
جسے لوگوں نے کوندے کی لپک کہہ کر پکارا تھا　　ہوا میں اڑ رہا تھا بال میرے ماہِ سیمیں کا

شاہ کمال: چوہے کا سا تخیل ہے۔

سلیمان: الٹے استرے جیسا باریک خیال۔

گلبش: اماں تمہیں کیا پڑی ہے کہ نکتہ چینی کر کر کے دوسروں کے اشعار درست کر رہے ہو۔ رہنے دو یوں ہی وقت تھوڑا ہے مجھے اب دس دینار لانے کے لئے جانا چاہئے۔

سلیمان: میں بھی جاتا ہوں۔ چلو سب اپنے اپنے گھر چلیں۔

شاہ کمال: خدا حافظ حلاج۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

حلاج: اب شمعیں روشن کر دوں؟ نہیں جب دن بھر کی گرمی کے بعد رات اپنے نازک پر دنیا پر پھیلا دیتی ہے تو ارمان بھرے دل کی حرکت مدھم پڑ جاتی ہے اور غم بھی شیریں معلوم ہوتا ہے۔ شمعیں خاموش ہی رہنے دوں۔ لیکن حلاج اب ان خیالات کو چھوڑ۔ ہاتھ پاؤں ہلا اور اپنے حقیر جھونپڑے کو اپنی محبوب کی آمد کے لئے آراستہ کر۔ الٰہی فردوس اور جہنم میں کتنا کم فاصلہ ہے مٹھی بھر سونا ہے جو جنت کی رنگینیوں اور دوزخ

کی اذیتوں کو جدا کرنا ہے۔

شاہ کمال (دور سے آہستہ سے): حلاج!

حلاج: کون، آپ؟ دوسری بار کیسے تشریف لائے؟

شاہ کمال: ذرا آہستہ بولو۔ میں نے کہا کمرے میں تمہارے سوا کوئی دوسرا تو نہیں؟

حلاج: نہیں۔ یقین نہ آئے تو شمع روشن کئے دیتا ہوں۔

شاہ کمال: نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے فوراً کہے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ماہ سیمیں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے اشعار علاؤالدین کے اشعار کے سامنے تخیل کے اعتبار سے پست ہیں۔ وہ تو بڑا شاعر ٹھہرا نا، اور بھئی شعر کہنا کون سا شیرمال تیار کرنا ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو مجھے کچھ امید ہو سکتی ہے۔ تمہارے قلم کی ایک جنبش اس کے اشعار کو کچھ کا کچھ بنا سکتی ہے۔

حلاج: ذرا دیکھوں تو اس کی رباعی، یہ رہی۔ ایک دینار دو تو ہو سکتا ہے۔

شاہ کمال: بس تو میدان مار لیا میں نے، یہ لو ایک دینار، علاوہ ازیں شادی کے بعد ضیافت بھی دی جائے گی۔

(جاتا ہے)

حلاج: صرف ایک دینار..... اس سے کیا بن جائے گا؟

سلیمان (آہستہ سے): حلاج!

حلاج: کون ہے، سلیمان؟

سلیمان: ہاں میں ہوں۔ ارے بھیّا! مجھے تو اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا۔ لیکن اگر اس آڑے وقت میں تم کام آؤ تو......

حلاج: کوئی فکر نہیں۔ میں سمجھ گیا تمہارا منشا۔

سلیمان: میں تمہیں بتا دوں کہ ابن حسیم کو فنِ شعر سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ تو صرف روپے کا بھوکا ہے، چنانچہ مجھے اندیشہ ہے کہ گلبیش کے اشعار اسے بہت پسند آ جائیں گے۔ اب تم مہربانی کر کے یہ ایک دینار لو اور مجھے اس پریشانی سے نجات دو۔ میں نے جو اشعار لکھے ہیں انہیں اسی طرح رہنے دو، اور........

حلاج: میں سمجھ گیا۔

سلیمان: گلبیش کے اشعار کو مسخ کر دو۔

حلاج: ہو جائے گا بے فکر رہو۔

سلیمان: تو میں چل دیا۔ (جانے کے بعد)

حلاج: ایک دینار اور ہاتھ آیا۔ اگر اسی طرح آج.....

علاؤالدین: حلاج!

گلبیش: حلاج!

علاؤالدین: کون ہے؟

گلبیش: ارے تم کہاں سے آن ٹپکے۔ میں تو ایک نہایت ضروری کام کے لئے آیا ہوں۔

علاؤالدین: خوب! لیکن جناب نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ مجھے ضروری کام نہیں ہے۔ جناب ہی کیوں نہیں ذرا سی دیر کے لئے سرک جاتے؟

گلیش : مشکل ہے۔

علاؤالدین : تو جناب میرے لئے آسان نہیں۔

حلاج : ارے لڑتے کیوں مرتے ہو۔ ادھر آؤ اور میری ایک بات سنو۔ مجھے ایک عجیب دل لگی سوجھی ہے۔ یقیناً تم دونوں اس معرکے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو لیکن ایک آدمی تین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر تم دونوں ایک ایک دینار صرف کرو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اتنا معاوضہ لیکر میں تمہارے حریفوں کے اشعار توڑ مروڑ کر بے حد مضحکہ خیز بنا دوں گا۔ میں بآسانی یہ کر سکتا ہوں۔ ایک خط یا حرف یا لفظ سے معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔ زیادہ معاوضہ تو نہیں ایک ایک دینار میں ایسی پری جمال دوشیزہ ہاتھ آتی ہے۔

علاؤالدین : مجھے اپنے ابن عم کی ڈاڑھی کی قسم، تم میرے اندازہ سے زیادہ عقلمند ہو۔ مجھے منظور ہے، یہ لو ایک دینار۔

گلیش : نہ معلوم میرے سر پر کیا حماقت سوار ہے کہ اتنا کچھ خرچ کرنے پر تیار ہو رہا ہوں۔ بہرحال یہ رہا دینار۔

علاؤالدین : اب میں جب شہ کمال کی صورت دیکھوں گا تو مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ میں چل دیا۔ (جاتا ہے)

گلیش (جاتے ہوئے) : اب میں خواہ کامیاب ہوں یا ناکام، سلیمان کی دال تو گلنے پاتی نہیں۔

حلاج (جلد جلد) : ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔ بس ایک دینار کی کسر ہے، میری سوئی ہوئی تقدیر اس وقت آنکھیں کھول دے۔

(جلدی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

اماں گلیش پلٹ آؤ۔ بات تو سنو۔ سچ کہتا ہوں کہ تم نے آج تک اس سے زیادہ مہنگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔

گلیش : خود ہی تو میرا روپیہ ہتھیا لیا اور بدمعاش خود ہی کہتا ہے کہ میں نے اتنا مہنگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔

حلاج : میں کہتا ہوں جس شخص کو عطر سازی آتی ہے۔ وہ بہ آسانی شعر بھی تصنیف کر سکتا ہے۔ یاد رکھو علاؤالدین شاعر ہے اور تمہارے اشعار کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا۔

گلیش : تو اُگل دے میرا سارے کا سارا روپیہ۔

حلاج : تم بھی کسی قدر احمق ہو۔ ارے سُنا نہیں کہ دوڑ میں جو گھوڑا سب سے پیچھے ہو آخر میں وہی جیت جایا کرتا ہے چنانچہ اگر میدان مارنا چاہتے ہو تو ایک چہرہ شاہی اور دلواؤ۔

گلیش : قسم کھا کے کہتے ہو کہ جس طرح دوسروں کے اشعار مسخ کئے ہیں اسی طرح علاؤالدین کے اشعار بھی مسخ کر دو گے؟

حلاج : قسم ہے تمہاری ڈاڑھی کی۔ بلکہ یہ لو، میں نے اشعار میں ردوبدل کر بھی دیا۔

گلیش : بس صرف ایک لفظ کی تبدیلی؟

حلاج : صبر کرو۔ جب ماہ سیمیں تمہارے ہاتھ آ گئی اس وقت تمہیں میرے الفاظ کی صداقت معلوم ہو سکے گی۔

گلیش : مگر ایک دینار کی رقم بڑی بھاری ہے۔

حلاج : تمہاری مرضی۔ میں جانتا ہوں روپے کے معاملے میں تم بڑے سیانے ہو پر اتنا خیال نہیں کرتے کہ دلہن کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔ ارے تم تو تذبذب میں پڑ گئے۔ پھر انکار رہے کیا؟ یوں ہی سہی۔ ماہ سیمیں تمہاری قسمت ہی میں نہیں۔

گلیش (آہ بھر کر) : اچھا بھئی لے لو۔

حلاج : دس پورے ہو گئے۔ آخر دس پورے ہو گئے۔

گلیش : کیا مطلب؟

حلاج : آپ کے دستِ کرم پر دس برکتوں کا نزول ہو۔ غم کی تیرگی دور ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند نکل آیا اگر انسانوں کی دنیا درحقیقت اس سے آدھی شیریں اور دلفریب بھی ہوتی جیسی آج نظر آ رہی ہے اور شباب اور محبت کا نور ہمارے سینوں کو یونہی جگمگاتا رہتا تو زندگی ایک ایسی لطیف و پاکیزہ نظم ہوتی کہ شاعر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے۔

گلبش : تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو گویا ماہِ سیمیں کو حاصل کرنے کا خواب تم بھی دیکھ رہے ہو۔

حلاج : ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں تخیل پرست ہوں لیکن حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتے ہیں اور جب ہم شباب کو بھول جاتے ہیں تو زندگی ایک بیکار چیز رہ جاتی ہے۔ لیکن سنو آہٹ سن رہے ہو۔ اس کی پالکی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس چھوٹے سے کوچے سے گزر کر ہماری جانب آ رہے ہیں۔

(ماہ سیمیں کے عاشق داخل ہوتے ہیں)

اس کے عاشق شاعر آ رہے ہیں۔ خوش آمدید۔

شہ کمال : حلاج ہم نے اسے مسجد کے قریب گزرتے دیکھا ہے۔

سلیمان : وہ حسین ہے، بادام کے ہرے بھرے درخت سے زیادہ حسین۔

علاؤالدین : حلاج تمہارے ہاں آئینہ بھی نہیں؟

حلاج : نہیں بندہ پرور۔ اب ذرا سرک جائیے۔ اس کے لئے جگہ چھوڑ دیجئے۔ (ماہ سیمیں کی سواری آتی ہے۔ ساتھ اس کا باپ ابنِ حسیم ہے)

ابنِ حسیم : اے نیلے گنبدوں والے شہر اصفہان کے باشندو! میں تمہیں زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں تم سب نے سن لیا ہے میں اب ایک ضعیف العمر اور سفید ریش انسان ہوں مجھے لے دے کے اب یہی ایک خواہش ہے کہ میرے جیتے جی میری لڑکی کی شادی ہو جائے۔ تم پوچھو گے کہ میں اپنی لڑکی کو شعر کے عوض کیوں دے دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے امتحان کے لئے سپاہ گری کا کوئی کرتب کیوں تجویز نہیں کیا۔ میرا جواب مختصر ہے۔ جو شخص شاعری سے، جو درحقیقت زندگی کی ساری لطافت کا مجموعہ ہے محبت نہیں کرتا میں اسے فطرت کا باغی اور وحشی سمجھتا ہوں۔ وہ درحقیقت صرف نام کا انسان ہے اسی طرح جس شخص کے دل نے حسن کے آگے سر جھکا دیا ہے اس نے خواہ کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ کی ہوں وہ عام لوگوں کی نسبت بہت زیادہ شفیق ہو گا۔ اس لئے حضرات اب آپ میں سے ہر شخص باری باری آگے بڑھ کر شاعری کے جوہر دکھائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ میں سے کون شاعری کے میدان میں گوئے سبقت لے جاتا ہے اس معرکہ میں جو کامیاب ہو گا اسے حسن اور دولت کا انعام دیا جائے گا۔

حلاج : اے ماہ سیمیں! اے بہار کے چاند! اگرچہ ان اشعار کو ایک بے ہنر کے قلم نے لکھا ہے لیکن کیا آپ ان پر نظر ڈالنا گوارا فرمائیں گی؟

ماہ سیمیں : تم حلاج ہو۔ اہلِ قلم کے بادشاہ حلاج!

حلاج : بادشاہ جب، اگر میری خوش نصیبی آپ کو پسند آ جائے۔

ماہ سیمیں : اس کاغذ کے نیچے شہ کمال کا نام لکھا ہے۔

شہ کمال : میں ہوں شہ کمال۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اشعار تخیل کے اعتبار سے کسی قدر پست ہیں لیکن آپ جانتی ہیں کہ نام بلند پایہ شاعر۔۔۔۔

ابنِ حسیم : خاموش۔ ہم اشعار سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہیں۔

ماہ سیمیں : —

نہ جانے ان دنوں کیوں ولولہ اٹھتا نہیں دل کا
نہیں دیکھا ہے میں نے پیٹ اس دنیا میں مسکیں کا

چٹانوں سے بھی موٹی روٹیاں ان کو کھلاؤں گا
اگر مجھ کو میسّر ہو خزانہ ماہ سیمیں کا

ابا جان! ظاہر ہے کہ شہ کمال خواہ کیسا ہی ہنرمند نانبائی مانا جائے پر شاعری سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شہ کمال: لیکن۔ لیکن۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ان اشعار کا ایک لفظ بھی میرا نہیں ہے۔ حلاج تم بڑے بدمعاش ہو۔ خدا نہ کرے کہ میں ایسے اشعار لکھوں۔

علاؤالدین اور گلبش: مگر یہ شعر تمہی نے تو لکھے ہیں۔

شہ کمال (آتا ہے): میں کہتا ہوں۔ بس دل لگی کی حد ہو چکی۔ یہ اشعار ہرگز میرے نہیں۔

علاؤالدین: ہم کہتے ہیں یہ تمہارے ہیں تمہارے۔

شہ کمال: مجھ پر کسی نے جادو تو نہیں کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات! بخدا مجھے یقین ہے کہ یہ اشعار میں نے نہیں لکھے۔

ابنِ حسیم: اچھا اب دوسرے شاعر کی باری ہے۔

ماہ سیمیں: اس کاغذ پر سلیمان کا نام لکھا ہے۔ سلیمان کون ہیں؟

سلیمان: میں ہوں بندۂ ناچیز سلیمان۔

ماہ سیمیں: مری تخئیل نے مونڈا . . . . .

سلیمان: نہیں نہیں۔ تصوّر میں ترے دیکھا . . . . .

ابنِ حسیم: بکو مت۔ ہاں بیٹی پڑھ کیا لکھا ہے۔

ماہ سیمیں: ؎ مری تخئیل نے مونڈا ہے سر شہباز و شاہیں کا
فرشتے گیت گاتے ہیں مری مقراضِ رنگیں کا
مرے دل میں ہزاروں استرے اب تک پر افشاں ہیں
کہ دیکھا ہے تصوّر میں ہیولیٰ ماہ سیمیں کا

سلیمان: جی ایسے اشعار لکھنے کی سزا میں ہم نے حلاج کا گلا نہ کاٹ ڈالا تو دیکھنا، بیٹیا کس بھول میں ہو جو صابن کے جھاگ میں غوطہ نہ دیا تو میرا نام سلیمان نہیں۔

ابنِ حسیم: ظاہر ہے کہ ایسے بیہودہ گو شاعری کے اس معرکے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دوسرے شاعروں کا کلام پڑھو۔

ماہ سیمیں: علاؤالدین۔

علاؤالدین: میں اتنا عرض کر دوں کہ میرے ٹوٹے پھوٹے اشعار کو پورے غور سے پڑھئے گا۔

ماہ سیمیں: بسا ہے میری نس نس میں معطّر زلف مشکیں کا

علاؤالدین: نہیں نہیں یہ نہیں نہیں یہ کہاں، تیرا پیکر سہارا ہے مرے . . . . .

ابنِ حسیم: کوئی اسے چپ کرائے ہاں بیٹی پڑھو۔

ماہ سیمیں: ؎

بسا ہے میری نس نس میں معطّر زلف مشکیں کا   نہ دھوکا کھائیے غیروں کے احساساتِ رنگیں کا
میں بدصورت سہی، بھونڈا سہی، بندر سہی لوگو   مگر خوشبو سے جی بہلا ہی لوں گا ماہ سیمیں کا

علاؤالدین: ہائیں۔

ماہ سیمیں: ابا جان! کہیں اس خوشبو دار بندر سے میری شادی نہ کر دیجئے گا بس اب ایک کا عذر اور رہ گیا ہے گلبیش۔

ابنِ حسیم: گلبیش صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا انعام آپ کے حصے میں آئے گا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کے اشعار ان لوگوں سے بھی برے ہوں۔ اس لئے انہیں پڑھنے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ میں لڑکی آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔

ماہ سیمیں: لیکن ابا جان! یہ بھی دیکھئے کہ یہ شخص بھینگا ہے۔

گلبیش: میری التجا ہے کہ آپ میری گھنٹہ بھر کی محنت کو یوں ضائع نہ کر دیں۔

ماہ سیمیں: میں شعر پڑھتی ہوں ؎

زمانہ میں بس اک ریشم ہی ہے سامان تسکیں کا
نہ مجھ کو حرص خوشبو کی نہ لالچ جام شیریں کا
اگر میلے ہیں میرے ہاتھ تو کیا آپ یوں کیجے
مری ڈاڑھی سے دامن باندھ دیجے ماہ سیمیں کا

گلبیش: حلاج! رکھ دے میرے تین دینار یہاں پر اسی وقت۔

سلیمان: اماں تین دیناروں کے پیچھے مرے کیوں جاتے ہو۔ دیکھئے تو یہ شادی کا معاملہ آخر طے کیونکر ہوتا ہے۔

حلاج: آہ ماہ سیمیں کی آنکھ میں آنسو ہیں۔

ماہ سیمیں: ان سب نے میری ہنسی اڑائی ہے۔

حلاج: نہیں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں یہ سب کیا دھرا میرا ہے۔

ابنِ حسیم: تمہارا؟ صاف صاف کہو کیا بات ہے ورنہ آج خیر نہیں تمہاری۔

حلاج: لیجئے ایک اور رباعی جو ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ابنِ حسیم: یہ کس نے کہی ہے؟

حلاج: میں نے!

ابنِ حسیم: مجھے بتایا گیا ہے تم بے حد مفلس ہو۔ کیا دس دینار تمہارے پاس موجود ہیں؟

حلاج: یقیناً! یہ بھی لیجئے اور جو کچھ بھی میرے پاس ہے لے لیجئے میری طاقت، میری جوانی، میرا قہقہہ، میری طبیعت کی جودت اور حسن کی پرستش کا شاعرانہ جذبہ غرض جو کچھ آپ چاہتے ہوں میں پیش کر سکتا ہوں مجھ سے لے لیجئے۔

ابنِ حسیم: پڑھو۔

ماہ سیمیں: میں اس وقت تک اس کی نظم سنوں گی بھی نہیں جب تک کہ . . . .

سلیمان: جب تک کہ حلاج خود اسے نہ پڑھے گا۔

ماہ سیمیں: ہاں!

حلاج: کیوں صاحب! شاعر اپنا کلام خود بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔

ابنِ حسیم: تمہیں اجازت ہے۔

حلاج : ؎ رُخِ پُر نور کعبہ ہے تری چشمِ جہاں بیں کا
فلک بس ایک سایہ ہے ترے گیسوئے مشکیں کا
اسے چھُو لوں مگر ہاتھوں کو کوثر میں کھنگو لاؤں
کہ تاروں سے بھی پاکیزہ ہے دامن ماہ سیمیں کا

ماہ سیمیں : کس قدر دلکش اشعار ہیں۔

سلیمان : نہایت دلفریب، بے حد لطیف ہیں نا علاؤالدین ؟

علاؤالدین : واقعی پاکیزہ اشعار ہیں۔

ابنِ حسیم : شکر ہے الٰہی کہ میری امیدیں بر آئیں اور میں جو کچھ چاہتا تھا ویسا ہی ہوا۔ اب حلاج میرے بیٹے! یہ تحفہ جیسے تم نے اپنی دانائی اور شاعر حاصل کیا ہے تمہارے حوالے ہے۔ خدا کرے کہ تم دونوں، حلاج اور ماہ سیمیں، شاعر اور اس کی بیوی، ایسی محبت میں منسلک رہو کہ جب ہماری حیاتِ مستعار ماضی کی بھولی بسری بات بن جائے تو لوگ یاد رکھیں کہ روپیہ پیسہ بے اصل چیزیں ہیں۔ میں نے دس دینار اس لیئے طلب نہ کئے تھے کہ روپیہ انسان کی ہنرمندی اور قابلیت کا معیار ہے —— میں ان چاندی کے سکوں کو سونے کے سکوں میں تبدیل کر کے اپنے الفا کی صداقت کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ یہ لو سونے کی تھیلی۔

حلاج : ایک بات مجھے بھی کہہ لینے دیجیئے میرے دوستو مجھے معاف کر دو۔ میں نے آپ سب کو دھوکا دیا، میں ابھی اس کی تلافی کیئے دیتا ہوں گلبیش! یہ سونے سے بھری ہوئی پوری تھیلی تم لے لو، تمہیں اپنی رباعی کا معاوضہ مل گیا۔ علاؤالدین! تمہیں ساٹن کا ایک ایسا جبہ دیا دیا جائے جو اصفہان بھر میں بے نظیر ہوگا۔ شہ کمال! تمہیں شادی کے روز ضیافت دی جائے گی۔ باقی رہا سلیمان، سلیمان کے لیئے بھی کوئی اعلےٰ نف چیز ہونی چاہیئے۔

سلیمان : مجھے اپنی محبت بخشیئے۔

حلاج : بخشی۔

ماہ سیمیں : اور میں نے بھی۔

جانا حاتم طائی کا اسنومین (SNOW MAN) کی تلاش میں

کنہیّا لال کپور

حاتم طائی جب اپنے ساتویں سفر سے گھر لوٹا تو مسز حاتم طائی اسے دیکھ کر پہلے تو ہنسی اور پھر رونے لگی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاتم بہت حیران ہوا اور اپنی اہلیہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا، "اے نیک بخت! سچ سچ بتا۔ دل کی بات زبان پر لا کر تو مجھے دیکھ کر ہنسی کس لئے اور روئی کیوں؟" مسز حاتم طائی نے جواب میں کہا، "ہنسی تو اس لئے کہ اتنی مدت کے بعد تمہاری شکل دیکھنا نصیب ہوئی اور روئی اس لئے کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے تم ایک دن میرے پاس نہیں رہے۔ ہمیشہ اغیار کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے۔" حاتم نے جب بیوی کی یہ شکایت سنی تو پہلے تو خوب کھل کر ہنسا اور پھر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ "اے نیک بخت!" حاتم نے روٹھی رانی کو مناتے ہوئے کہا، "کیا تجھے معلوم نہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اس میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خاوند اور بیوی ایک دوسرے سے دور رہیں۔ نہیں تو نوبت گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے سے ہوتی ہوئی طلاق تک پہنچتی ہے۔ رہا تمہارا یہ وہم کہ میں ہمیشہ اپنوں کی بجائے دوسروں کے کام آیا ہوں، تو اس ضمن میں ایک شعر سن اور ہو سکے تو اسے سمجھنے کی کوشش کر۔ وہ شعر ہے ؎

پہلے تو فنا کا درجہ ہے اور بعد بقا بھی ملتی ہے
وہ جینے کا نام نہ لے جو مرنے کو تیار نہیں

مسز حاتم نے شعر سن کر برجستہ کہا، "سبحان اللہ! آفرین ہے تم پر اگر یہ شعر تمہارا ہے، اور اگر کسی اور کا ہے پھر بھی تم پر آفرین کہ شاعر نے ضرور تمہیں دھیان میں رکھ کر یہ شعر کہا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک دوسروں کی خاطر یونہی فنا ہوتے رہو گے؟ میرا تو خیال ہے کہ عمرِ عزیز کا کافی حصّہ برباد کر چکے ہو۔ عاقبت کا خیال چھوڑو اور دنیا کی فکر کرو۔"

حاتم طائی نے مسکرا کر کہا، "یہ ناممکن ہے۔ میرے پاؤں میں ازل سے چکّر ہے اور ابد تک رہے گا۔ میں اب اپنی زندگی کی سب سے کڑی مہم پر روانہ ہونے والا ہوں۔"

"یہ آٹھواں سفر کس سلسلے میں ہے؟"

"اسنومین کی تلاش میں!"

"اسنومین! وہ کیا بلا ہے؟"

"اے نیک بخت اسنومین بلا نہیں۔ ہماری تمہاری طرح گوشت پوست کا انسان ہے۔ فرق اس میں اور ہم سب میں صرف اتنا ہے کہ وہ اینٹ اور سیمنٹ کے مکانوں کی بجائے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر قیام کرتا ہے۔"

"تم اس کی تلاش میں کس لئے جانا چاہتے ہو؟"

"یہ ایک سب ایڈیٹر (SUB EDITOR) کی ملازمت کا سوال ہے۔ اس کے باس (BOSS) نے اسے اخبار کے سالنامے میں ایک مضمون اسنومین پر لکھنے کے لئے کہا ہے۔ اگر اس نے یہ مضمون نہ لکھا تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس بدنصیب کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں اگر اسے جواب مل گیا تو یقیناً وہ سب فاقوں سے مریں گے۔ لیکن اب خدا حافظ، کہ وقت قلیل اور راستہ طویل ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد حاتم طائی اللہ کا نام لے کر اسنومین کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ کھیتوں مرغزاروں سے گذرتا، جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا وہ ایک صحرائے لق و دق میں پہنچا جہاں اس کی ملاقات ایسے اشخاص سے ہوئی جنہوں نے اپنے چہروں پر آہنی خول چڑھا رکھے تھے اور جن کے آس پاس عجیب و غریب آلات اور مشینیں بکھری پڑی تھیں۔ حاتم طائی یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے ان کے قریب جا کر کہا "اے صاحبو! یہ کیا مذاق ہے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواب میں کہا "اے نووارد! تمہیں یقین آئے یا نہ آئے، ہم آدم زاد ہیں اور ایک نئے بم کو چلانے کا تجربہ کرنے کے لئے اس صحرا میں آئے ہیں۔" حاتم طائی نے لاحول پڑھتے ہوئے کہا "صاحبو! میری مانو تو اس حماقت سے باز آؤ اور واپس اپنے ملک چلے جاؤ۔ نئے بم بنانے اور چلانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان کسی کی بگڑی بنائے اور جہاں اچھی بات رُک گئی ہو وہاں سے اس کو آگے چلائے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ فلسفی ہو یا سر پھرے۔ ورنہ ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے۔"

"خاموش! تم شاید نہیں جانتے کہ میرا نام حاتم اور پیشہ خدمتِ خلق ہے۔"

"تو جاؤ خدمتِ خلق کرو۔ ہم سے خواہ مخواہ کیوں اُلجھ رہے ہو؟"

حاتم نے اس شخص کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا اور وہاں سے آگے چلا۔ متواتر سات دن اور سات راتیں چلنے کے بعد وہ ایک شہر میں پہنچا رات ایک ہوٹل میں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے اسے بتایا کہ رات کے وقت ایک اڑن طشتری شہر کے اوپر پرواز کرتی ہے کہ جس کی ہیبت اور رفتار دیکھ کر بچے چیخنے لگتے ہیں اور بزرگ لحافوں میں گھس جاتے ہیں۔ حاکمِ شہر نے دس ہزار روپے کا انعام اس شخص کو دینا منظور کیا ہے جو اس اڑن طشتری کا پتہ چلائے۔ حاتم نے پورے وثوق سے کہا "میں اس طشتری کا راز طشت از بام کر سکتا ہوں۔" چنانچہ اسی رات ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر حاتم اڑن طشتری کی کھوج لگانے کے لئے روانہ ہوا۔ کافی عرصہ فضا میں چکر کاٹنے کے بعد حاتم کو ایک چمکتی اور اڑتی ہوئی چیز نظر آئی۔ اس نے ہوائی جہاز کا رُخ اس کی طرف پھیر دیا۔ متواتر دو گھنٹے کے تعاقب کے بعد حاتم کو پتہ چلا کہ وہ چاند کا تعاقب کرتا رہا ہے۔ حاتم کو اپنی غلطی پر بہت افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتاً کوئی چیز اس کے جہاز میں گری۔ حاتم نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک چکور تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اڑتے اُڑتے تھک گیا ہے۔ حاتم نے چکور کو اپنے بڑے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور نیچے اُترا۔ دوسرے دن اس نے حاکمِ شہر کی خدمت میں چکور پیش کرتے ہوئے کہا "عالی جاہ! جسے آپ غلطی سے اڑن طشتری سمجھتے رہے ہیں وہ دراصل چکور ہے کہ روزِ ازل سے چاند کا عاشق ہے۔" دس ہزار روپے اور دو سنہری تمغے انعام میں پائے اور وہاں سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

چلتے چلتے حاتم کوہ ہمالیہ کی ترائی میں پہنچا۔ رات ایک درخت پر بیٹھ کر کاٹی۔ صبح اس کی ملاقات ایک شرپا سے ہوئی۔ شرپا نے حاتم طائی کو سمجھاتے ہوئے کہا "اسنومین کی تلاش بے سود ہے۔ اس کا مقام ہمالیہ کی ان چوٹیوں پر ہے جہاں انسان کی رسائی ناممکن ہے۔ تم اس جستجو سے باز آؤ اور واپس گھر چلے جاؤ۔"

”لیکن شرپا بہادر یہ ایک سب ایڈیٹر کی ملازمت کا سوال ہے۔ اگر اس نے اسنومین پر مضمون نہ لکھا تو۔ ۔ ۔ ۔“

”کچھ بھی ہو اسنومین کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔“

حاتم طائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ شرپا بہادر کو دس ہزار روپے کی تھیلی پیش کر دی۔ شرپا نے مسکرا کر کہا ”میں تمہاری مدد کرنے کیلئے تیار ہوں۔“

حاتم طائی اور شرپا نے تین کیمپ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلا دس ہزار فٹ، دوسرا بیس ہزار فٹ اور تیسرا پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر۔ انہوں نے آکسیجن سلنڈر، وائرلیس سیٹ، برف کو کاٹ کر راستہ بنانے کے کلہاڑے وغیرہ خریدے۔ دو ایک دن دوسرے کیمپ میں آرام کرنے کے بعد وہ تیسرے کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی مشکل سے ایک ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر پائے تھے کہ طوفان میں گھر گئے۔ برف پڑنے لگی، سرد ہوا کے تیز و تند جھونکوں نے اوسان خطا کر دئے۔ خون منجمد ہونے لگا۔ حاتم نے طوفان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اے قہرِ ہمالیہ! تو کیوں خواہ مخواہ ہم سے جنگ کرتا ہے اور ہمارا قافیہ تنگ کرتا ہے۔“ شرپا نے ازراہِ مذاق حاتم سے کہا ”اے حاتم! یہ طوفان تمہارا قافیہ کیا تنگ کرے گا۔ تمہارا قافیہ تو پہلے ہی تنگ ہے۔ کہ سوائے ماتم کے حاتم کا کوئی قافیہ ہی نہیں۔ تم نے غلطی یہ کی کہ موسم کی جانچ پڑتال کرنے والوں کی پیش گوئی پر یقین نہ کیا اور سوچے سمجھے بغیر دوسرے کیمپ سے چل نکلے۔“

ایک گھنٹے کے بعد طوفان تھما۔ حاتم اور شرپا تیسرے کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن حاتم نے وائرلیس پر یہ اعلان سُنا کہ تین دن کے لئے موسم خوشگوار رہے گا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور شرپا کو ساتھ لیکر اسنومین کی تلاش میں نکلا۔ چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ چرند پرند، آدم زاد، پری زاد کا کوسوں تک نشان نہ تھا۔ انہوں نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن اس بھلے مانس یا بن مانس کا کہیں پتہ نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر شرپا نے کہا ”اے حاتم! معلوم ہوتا ہے بیچارہ اسنومین اللہ کو پیارا ہو گیا۔“

”تو پھر؟“

”ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ اگر زیادہ عرصہ یہاں ٹھہرے تو ہم بھی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔“

”لیکن اس سب ایڈیٹر کا کیا ہوگا؟“

”زیادہ سے زیادہ اسے ملازمت سے جواب مل جائے گا۔“

”جواب! تم بڑے بے رحم ہو۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس کم بخت کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں۔“

”میں اپنی سات بیویوں اور ایک بچے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“

”تم بڑے خود غرض ہو۔“

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

”تلاش جاری رکھی جائے۔“

دوسرے دن حاتم اور شرپا نے برف پر کسی عجیب و غریب جانور کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔ حاتم نے خوشی سے چلّا کر کہا ”مل گیا۔ مل گیا۔“

شرپا نے پوچھا ”کیا؟“ حاتم نے جواب دیا ”اسنومین کا سُراغ۔“

دونوں ان نشانات کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک غار کے قریب پہنچے۔ حاتم نے غار کے سامنے کھڑے ہو کر کہا ”اے عجیب و غریب مخلوق اپنے مسکن سے باہر نکل کر دیکھ کہ تجھے کون ملنے آیا ہے۔ خدا کے لئے اب زیادہ انتظار مت دکھا اور جلدی سے غار سے باہر آ۔“

غار میں سے کوئی جواب نہ آیا۔ حاتم نے ایک بڑا سا پتھر لے کر غار کی طرف پھینکا۔ ایک خوفناک قسم کا جانور کہ جو ریچھ اور گینڈے کا مرکب

معلوم ہوتا تھا، غرّاتا ہوا باہر نکلا اور حاتم اور ثریا کا تعاقب کرنے لگا۔ دونوں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے اور کیمپ میں جا کر دم لیا۔

تیسرے دن ناشتہ کرنے کے بعد حاتم نے آبدیدہ ہو کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ میری پہلی شکست ہوگی۔"

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مالک کارساز ہے۔"

"کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی ہے۔"

"کہو۔"

"میری رائے میں شراب انسان کی، چاہے وہ اسنومین ہی کیوں نہ ہو پہلی اور آخری کمزوری ہے اگر ہم جگہ جگہ شراب کی بوتلیں رکھ دیں تو کام بن سکتا ہے۔"

"تجویز تو خاصی معقول ہے۔"

اس دوپہر کو حاتم اور ثریا نے جنگل میں مختلف جگہوں پر شراب کی بوتلیں رکھ دیں۔ شام کے وقت جب وہ چہل قدمی کرنے کو نکلے تو انہوں نے دور سے دیکھا کہ ایک لنگور نما انسان بوتل کو منہ سے لگا کر حلق میں شراب انڈیل رہا ہے۔ حاتم کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اور ثریا بھاگم بھاگ اس شخص کے پاس گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے مخاطب کرتے اس نے بڑے تپاک سے کہا "ہیلو حاتم طائی! تم یہاں کیسے؟"

حاتم طائی نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا "ہیلو اسنومین! تو گویا تم مجھے جانتے ہو۔"

اس شخص نے قہقہہ لگا کر کہا "نہ صرف یہ بلکہ تم بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں ایس۔ ایچ سبھرامنیم ہوں۔ اخبار "ہستارک ٹائمز" کا سب ایڈیٹر۔"

"لیکن یہ حلیہ تم نے کیا بنا رکھا ہے۔"

"تمہارا اشارہ شاید لنگور کی کھال کی طرف ہے جو میں نے پہن رکھی ہے یہ جتن تو اسنومین کو دھوکا دینے کے لئے کیا گیا ہے۔ اسنومین انسان سے بدکتا ہے اس لئے میں لنگور کی کھال پہن کر اس کی تلاش میں نکلا ہوں کہ کہتے ہیں ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"

"اچھا تو تم بھی اسنومین کی تلاش کر رہے ہو؟"

"ہاں! بات دراصل یہ ہوئی کہ جب دو مہینے انتظار کرنے کے بعد تمہاری کوئی خبر نہ ملی تو میں نے سوچا کہ خود ہی چل کر اسنومین کا سراغ لگایا جائے۔"

"تو کچھ پتہ چلا؟"

"ابھی تک تو کچھ سراغ نہیں ملا۔"

"تو پھر؟"

"ملازمت سے جواب مل جانا یقینی ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوگا۔"

"کیا کیا جائے، کوئی چارہ نہیں۔"

اس اثنا میں شرپا بالکل خاموش کھڑا رہا۔ یک لخت اس نے شری ایس۔ ایچ سبھرامنیم اور حاتم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اے صاحبو! میری مانو کام اب بھی بن سکتا ہے۔“

حاتم نے پوچھا ”کیسے؟“

شرپا بولا۔ لنگور کے بھیس میں شری۔ ایس۔ ایچ سبھرامنیم اچھے خاصے اسنومین نظر آتے ہیں۔ کیوں نہ اس لباس میں ان کی چند تصاویر لی جائیں اور نہیں اسنومین کے روپ میں پیش کیا جائے۔ باقی رہے پنجوں کے نشانات، وہ کسی بھی جنگلی جانور کے لئے جا سکتے ہیں۔“

”وہ مارا۔“ حاتم نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔

”آفریں!“ شری ایس۔ ایچ سبھرامنیم نے نعرہ لگایا۔

چنانچہ لنگور کے بھیس میں شری ایس۔ ایچ سبھرامنیم کی متعدد تصویریں کھینچی گئیں۔ ایک عجیب و غریب جنگلی جانور کے پنجوں کے نشانات کی فوٹو لی گئی اور تینوں خوشی خوشی اپنے اپنے گھر واپس آئے۔

بارِ خاطر

شوکت تھانوی کی وہ معرکۃ الآراء تصنیف، جس کا عرصے سے انتظار تھا چھپ گئی ہے۔

خطوط کا یہ مجموعہ ابوالکلام آزاد کے خطوط غبارِ خاطر کی دل نشین پیروڈی ہے۔ توقّع ہے کہ شوکت صاحب کی یہ تصنیف، اُردو ادب کی زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہو گی۔

جس میں ادبی، سیاسی، فلمی اور دیگر معروف شخصیتوں کے نام خطوط درج ہیں۔

قیمت -/-/۴

یدِ بیضا

سیّد عابد علی عابدؔ کے دل نشین ڈراموں کا مجموعہ، آغا حشرؔ فنِ ڈرامانگاری کے امام تھے۔ ان کے ڈراموں میں الفاظ کی شان و شوکت اور قافیہ پیمائی کی معجزانہ کرامات تو تھیں مگر نرم و نازک احساسات کا فقدان تھا۔ عابد صاحب نے اپنے ڈراموں میں اس خامی کو نہ صرف دور کیا ہے بلکہ اردو ڈرامے کے فن کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اگر آغا حشرؔ کے ڈرامے ماضی کی دلکش یادگار ہیں تو عابد صاحب کے ڈرامے حال اور مستقبل کا سرمایہ ہیں۔

اردو ادب میں اس سے بہتر ڈرامے آج تک پیش نہیں کئے جا سکے۔

قیمت -/-/۵

ادارۂ فروغِ اُردو۔ لاہور

رات چور اور چاند

(مسلسل)

بلونت سنگھ

(۴)

اپنے گاؤں میں واپس آجانے کے بعد چند روز تک تو پالا سنگھ کی طبیعت اکھڑی اکھڑی سی رہی ۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ اسے گاؤں کے لوگ یا یہاں کی فضا پسند نہیں ۔ بلکہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے شہر سے دفعتاً پنجاب کے ایک دورافتادہ گاؤں میں چلا آیا تھا ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ فضا کے انوکھے پن سے مانوس ہونے کے لئے کچھ مدت تو درکار تھی ۔ کلکتے میں بھی وہ ایک معمولی محلّے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا جو درحقیقت ایک ہی کمرے اور ایک چھوٹے باورچی خانے پر مشتمل تھا ۔ لیکن کم از کم دیکھنے میں تو فلک بوس عمارتیں موجود تھیں ۔ اعلیٰ ہوٹل، سیرگاہیں، سینما گھر اور دورِ نو کی رنگارنگی نظر کے سامنے رہتی تھی ۔ اس کے اپنے کمرے میں مٹی کے تیل کی لالٹین ہی روشن ہوتی تھی لیکن سڑکوں پر برقی قمقموں کی بہار رہتی تھی ۔ بھانت بھانت کے لوگ اور بھانت بھانت کی بولیاں ۔ صبح سے شام تک زندگی کی ریل پیل اور شوروغل ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔ ایسی فضا میں پیشہ کے لحاظ سے بظاہر وہ موٹر ڈرائیور تھا لیکن موٹر چلانا تو اس کا سائیڈ بزنس Side Business تھا ورنہ روپیہ کمانے کے اصل ذرائع تو قطعاً مختلف تھے ۔ وہ فطرتاً ہوشیار آدمی تھا اور پھر آغاز ہی سے اسے چند کہنہ مشق استادوں کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی ۔ انہی کا صدقہ تھا کہ اس کمسنی میں ہی اس کا ہاتھ بہت صاف ہو گیا تھا ۔

ہر بڑے شہر میں دو طرح کی زندگی ہوتی ہے ۔ ایک تو روزِ روشن کی طرح ظاہر اور دوسری پوشیدہ ۔ عوام جو معمولی طور پر روزی کماتے، بچے پیدا کرتے اور زندگی کے دیگر جھمیلوں سے نبٹتے ہوئے اپنے دن گزارے چلے جاتے ہیں ان کے لئے زندگی کا یکسر دوسرا پہلو بڑی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے وہ خود اس قسم کی زندگی پسند نہیں کر سکتے البتہ اگر وہ چاہیں تو اس سے روشناس ہو سکتے ہیں اور یہ اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر مشکل کہ عام طور پر وہ اسے سمجھتے ہیں ۔

پالا سنگھ "پوشیدہ" زندگی کا باشندہ تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ سڑک پر چلتے چلتے کن لوگوں کے ذریعہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر ایک خوبصورت عورت حاصل کر سکتا ہے ۔ اسے معلوم تھا کہ کیسے بدمعاش کہاں سے حاصل کئے جاتے ہیں ۔ بیچارے سیدھے سادے اور پڑھے لکھے شہری بھی ان آدمیوں کو جو پائجاموں کے نیفوں میں چاقو اڑسے پھرتے ہیں غنڈے اور بدمعاش سمجھ کر ان سے بری طرح خائف رہتے تھے ۔ پالا سنگھ ایسے "بدمعاشوں" کی صورتیں دیکھ کر مسکرا دیا کرتا تھا ۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اوّل تو ان لوگوں کا بدمعاشی سے کوئی تعلق ہی نہیں اگر ہو بھی تو سمجھنا چاہئے کہ ابھی وہ اس فن کی کچی پہلی جماعت میں پڑھتے ہیں وہ

ان شراب خانوں، قحبہ خانوں اور خفیہ اڈوں کو اچھی طرح جانتا تھا جو بدمعاشوں کے گڑھ تھے۔ آوارگی کے دوران میں ان لوگوں سے بھی اس کی واقفیت پیدا ہو گئی تھی۔ مبئی کے گھوڑدوڑ کے میدانوں کے باہر انعام پانے والے گھوڑوں کی پیشین گوئیاں کیا کرتے۔ اسی قسم کا ایک آدمی بیر سنگھ اس کے بہت ہی گہرے دوستوں میں سے تھا۔ وہ بلا کا چلتا پرزہ تھا۔ بیرونی فوجیوں سے راہ و رسم پیدا کر لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اسی کے ذریعہ پالا سنگھ کا بھی کئی سپاہیوں سے دوستانہ ہو گیا۔ وہ وگ اس کے ذریعے نت نئی عورتوں سے تعلقات قائم کرتے اور یہ ان سے جی بھر کر روپیہ بٹورتا۔ پالا سنگھ کا اصل منافع بخش کام تو بیرونی فوجیوں کی چھاؤنیوں سے رک چرانا تھا۔ اس میں اسے کئی مرتبہ دست بدست لڑائی بھی کرنی پڑی۔ دو مرتبہ جبکہ وہ ٹرک لے کر فرار ہوا تو فوراً پتہ لگ جانے پر اس کا بہت بری طرح تعاقب یا گیا۔ اس پر رائفلوں کے فائر بھی کئے گئے۔ ایک مرتبہ وہ ٹرک سمیت بچ کر نکل گیا لیکن دوسری مرتبہ تعاقب کرنے والوں نے گولیوں سے اس کے ٹرک کے ٹائروں ا بھبا کا اڑا دیا۔ خوش قسمتی سے رات کا وقت تھا۔ وہ ٹرک روک کر ایک دم جنگل میں گھس گیا۔ گولیاں سیٹیاں بجاتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئیں ———ن وہ بچ نکلا۔

امریکی "حبشی" دوست سے اس نے دست بدست لڑائی کے کئی نئے گر سیکھے تھے۔ اس کا ٹیڑھا میڑھا نام اس کی زبان پر نہ چڑھ سکا اس لئے وہ اسے حبشی ہی کہا کرتا تھا۔

ان آٹھ نو برسوں میں اس نے کئی دوستیاں پیدا کیں، گاؤں واپس پہنچ کر نہ صرف پرانی زندگی اور دوستوں کی یاد ہی ستاتی رہی بلکہ گاؤں کی نسبتاً خاموش فضا، مختصر دلچسپیاں، کچی اینٹوں کے بنے ہوئے سیدھے سادے مکانات، چند اینڈی بینڈی تنگ گلیاں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور انہیں کریدتے ہوئے مرغ اور چوزے، دیکھ کر وہ بعض اوقات اس جگہ سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا تھا ——— لیکن پہلے پہل صرف ایک چیز کی کشش ——— یعنی سرڈی کی موجودگی کے باعث اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ نئے حالات کے مطابق ڈھل گیا۔

گھر میں اس کی بھابی تاباں تھی۔ تاباں بڑی ہنس مکھ، خوش مزاج اور باتونی عورت تھی۔ اسے پالا سنگھ کی آمد کا بڑا چاؤ تھا۔ ابھی نوعمر تھی، دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ لیکن عمر اور صحت کے تقاضے کے سبب وہ بزرگانہ کیفیت کیونکر پیدا ہو سکتی تھی اور یہ بھی مشکل تھا کہ وہ سارا دن گاؤں کی کنواری لڑکیوں کی صحبت میں انہی کی طرح ادھر ادھر چہکتی پھلانگتی پھرے۔ حالانکہ ابھی اس کے دل میں کوئی حسرت تھی تو بس یہی۔ اس نے سوتیلی ماں کی وجہ سے بچپن بھی بڑی بے کیفی سے گزارا۔ یہ محض اس کی خوش مزاجی تھی جس نے اسے بچائے رکھا ورنہ اب تک ہلکان ہو گئی ہوتی۔ ایک دیہاتی عورت کی حیثیت سے ذہنی طور پر وہ اپنے شوہر سے زیادہ مسرتوں کی طلبگار بھی نہیں تھی۔ اور خصوصاً اس شوہر سے۔ جو عمر میں بالکل نوجوان بھی نہیں تھا اور پھر زندگی کے جھمیلوں اور تفکرات نے اسے کافی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ سنتی تھی کہ لڑکپن میں اس کا شوہر خاصہ شرارتی اور خوش مزاج تھا۔ بلکہ جب اس نے جوانی میں قدم رکھا اس وقت بھی خاصہ دبنگ تھا لیکن مخالف قوتیں اس پر غالب آئیں طبیعت ایک مرتبہ بجھی تو بس بجھ ہی گئی اور وہ خاصہ امن پسند بلکہ دبو بن کر رہ گیا۔ سنداں تو خیر اتنی حساس بھی نہیں تھی لیکن تاباں بہت حساس واقع ہوئی تھی۔ اس کی چنچل طبیعت نہ سوتیلی ماں کے جور و ستم سے بجھی اور نہ موجودہ مخالف حالات میں لیکن مالی کمزوری اور گھر میں ایک لڑاکا، مضبوط اور تندخو مرد کی کمی کی وجہ سے لوگوں سے مناسب احترام کروانا ناممکن تھا۔ اس قسم کے ہلکے پن کے احساس سے بعض اوقات تاباں کے دل کو بہت ٹھیس لگتی تھی اس لئے وہ پالا سنگھ کی واپسی کے لئے سنداں سے بھی زیادہ بے قرار تھی اور جب اس نے ایک نظر اپنے دیور کو دیکھ لیا تو بس نہال ہو گئی شکل و صورت اور قد و قامت، آواز اور تیور کے لحاظ سے بالکل اسی قسم کا ایک شخص وہ اپنے گھر میں چاہتی تھی۔ اس کا خیال درست بھی تھا کیونکہ جب سے پالا سنگھ آیا تھا، لوگوں کے دلوں میں احترام کے جذبات کو اس نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ خصوصاً پالا سنگھ کی بیلے، کشنے اور رتنے کے ساتھ پہلی جھپٹ تو گاؤں بھر میں مشہور ہو چکی تھی اور اس پر کسی قسم کا شبہ کئے گاؤں کا شاید ہی کوئی فرد بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لینے پر تیار ہوتا۔

محض یہی نہیں پالا سنگھ کا سب لوگوں سے برتاؤ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کی طبیعت میں اوچھا پن نہیں تھا۔ مصنوعی اکڑفوں اور بات بات پہ جھگڑا کھڑا کر کے دوسروں کو دھمکانے کی اسے عادت ہی نہیں تھی۔ پالا سنگھ کو اپنے بازوؤں اور اپنی عقل پر پورا اعتماد تھا۔ نیکی اور شائستگی کا خواہ اس کے اندر شائبہ تک نہ ہو،

لیکن صرف اسی اعتماد کے باعث اس کے دل میں پہنچے ہوئے رشیوں اور منیوں کا سا اطمینان پیدا ہو چکا تھا۔ گاؤں کے وہ جوان جو پہلے اس کی جسمانی طاقت تعریف میں اپنی تضحیک کا پہلو پا کر اسے دل ہی دل میں ناپسند اور شاید نفرت کرنے لگے تھے۔ اس کے برتاؤ سے خود ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ گاؤ چند جوانوں نے چاہا کہ کسی نہ کسی طرح پالا سنگھ سب سے تگڑے اور ہیکڑی باز جوانوں سے لڑ پڑے لیکن وہ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا اس نے اپنے مخ فن کارانہ صفائی کے ساتھ ان کی سب حرکتوں اور بلا واسطہ دھمکیوں کو نظر انداز کر دیا اور رفتہ رفتہ دوسروں کی لنترانیوں کے سامنے اس کی سنجیدگی اور خاموشی زیا پروقار، زیادہ پائیدار اور زیادہ طاقتور نظر آنے لگی۔ خصوصاً جب وہ جورا سنگھ کے اس پانچ من وزنی مگدر کو، جو علاقہ بھر میں دور دور تک مشہور تھا اور جسے جو جورا سنگھ بڑے اہتمام کے ساتھ بمشکل دو مرتبہ زمین سے اٹھا کر سر سے اوپر تان سکتا تھا، بڑے عاجزانہ انداز میں اور فقیرانہ بے نیازی سے زمین سے دس بلا تکان اٹھا لیتا اور پھر سر جھکا کر اس انداز سے پیچھے ہٹ جاتا جیسے وہ گاؤں کے حقیر ترین آدمیوں میں سے ہو تو لوگوں کے دلوں میں ایک نامعلوم سی دہشت چلی جاتی۔ لیکن پالا سنگھ نے کبھی کسی پر ایک انگلی تک نہیں اٹھائی۔ وہ دل میں اپنی تکنیک کو مجرب سمجھتا تھا۔ قسم قسم کے لوگوں سے نپٹ چکا تھا اس لئے وہ اپنی لا میں عملی نفسیات سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ جس سے اس کے گاؤں والے نابلد تھے۔ اسے اگر کوئی کسی حد تک سمجھ سکا تھا تو وہ جوالا سنگھ تھا ان گڑھ جوالا کر جمگھٹے میں وہی ایک پرانا پاپی تھا۔ دل میں وہ بھی پالی کو پورے طور پر سمجھ لینے کا دعویدار نہیں تھا لیکن وجدانی طور پر اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ پالی کوئی معمولی شخص اور وہ برملا کہہ دیتا تھا کہ اس گاؤں میں کیا علاقے بھر میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں جو پالا سنگھ کی عقل کو پہنچ سکے۔

تاباں کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ پالی کوئی کام بھی کرے گا یا نہیں۔ بلکہ وہ اس کے آنے سے پہلے بھی دل ہی دل میں یہی سمجھتی تھی کہ پالی کوئی کام نہیں کرے گا۔ وہ کہتی "نہ کر۔ گھر کے اخراجات تو بڑھے نہیں آخر جہاں کنبے بھر کی روٹی پکتی ہو وہاں ایک آدمی اور کھانے میں شامل ہو جائے تو اس سے کچھ فرق تو نہ پڑ جائے گا۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو ایک ایسے بیکار دیور کی آمد پر اسے خوشی چھوڑ غصہ آ جاتا۔ تاباں کا زندگی کا نظریہ ابھی تک رومنٹک تھا۔ اسے دال روٹی کے تفکرات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ا سے انہیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور پھر دنیا نے اس کے دل میں جو احساسِ کمتری پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور جو ایک حد تک اس کے دل میں پیدا ہو بھی چکا تھا کی سیری بھی پالی کی گھر میں موجودگی سے ہو جاتی تھی۔ چند روز بعد لہنا سنگھ نے پالی کی بیکاری اور لفنگ پن پر زیر لب بڑبڑانا بھی شروع کر دیا لیکن تاباں نے اس کی باتوں اہمیت دینا تو ایک طرف انہیں کان دھر کر سنا تک نہیں۔ بلکہ وہ شوہر کو غلط سمجھتی تھی یعنی اس کی یہ بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی کہ اگر کام نہ کیا جاتے تو روٹی سے آئے۔ وہ نامعلوم طور پر سمجھتی تھی کہ پالی کی موجودگی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ باقی رہی سنداں تو اسے پالی کل کا بچہ نظر آتا تھا اس کے بس میں ہو تو وہ گود میں اٹھائے اٹھائے پھرے۔ اس نے کبھی بھولے منہ سے بھی پالی کو نہ کہا کہ ہمارے حالات بہت امید افزا نہیں بس یہی ہے کہ کھائے پیئے جا رہے ہیں۔ جا کے ہاں ایک بھینس اور ایک گائے کوئی بڑی کائنات نہیں۔

بحیثیت مجموعی گھر کے حالات پالی کے موافق تھے۔ لیکن اگر نہ بھی ہوتے تو وہ ایک چڑھتے دریا کے مانند تھا۔ کوئی شے اس کے راستے میں رکاوٹ پی کر سکتی بلکہ خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلتی تھی۔ اگر کوئی کام ایسا تھا جسے پالی بلا کسی تحریک کے خود بخود کر دیتا تو وہ تھا تقریباً دونوں وقت بھینس اور گائے کے لئے سانی کر اور دودھ دوہنا۔ اس میں بھی شاید یہ لالچ شامل تھا کہ دودھ دوہنے کے بعد بھینس کا کم از کم ایک تھن دھاریں لینے کے لئے بچا لیتا تھا۔

اس کا برائے نام کام کر دینا ہی اس کی بھابی کے دل کی صد تسکین کا باعث ہوتا۔ اسے اس کی شخصیت سے محبت تھی۔ اس کی ہر حرکت بری یا اچھی سے محبت

چنانچہ ان حالات میں پالا سنگھ کی بیکاری اور آوارگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ علی الصبح حاجات ضروری سے فارغ ہونے کے لئے وہ گاؤں باہر چلا جاتا۔ ہاں منہ اندھیرے گھر میں بندھے ہوئے مویشیوں کے لئے سانی ضرور کر دیتا۔ گاؤں سے باہر داتون کرنے نہانے اور تھوڑی بہت گپ لڑانے میں خا وقت گزر جاتا۔ واپس آ کر دودھ دوہتا۔ پھر رات کی پکی ہوئی کھچڑی اور دہی یا باسی روٹی اور مکھن یا اسی قسم کی اور کسی چیز کا ناشتہ کرتا۔ پھر بڑے اہتمام سے کپڑے پہنتا پگڑی باندھتے اور اس کے شملوں کو اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ پھر انگوچھے سے مونچھیں پونچھتا ہوا بھابی کے مقابل آن کھڑا ہوتا اور بڑے مخلصانہ اور فرماں بردار انداز میں پوچھتا "

"بھابی کوئی کام وام تو نہیں گھر کا؟"

اور بھابی اسے کبھی کوئی کام نہیں بتاتی تھی بلکہ شوہر اس پر دو ایک مرتبہ خفا بھی ہوا کہ وہ اس "لٹڑرے" کو کوئی کام کیوں نہیں بتاتی . . . . .

لیکن تاباں شوہر کی سادہ لوحی پر بعض اوقات ہنس دیتی اور بعض اوقات جھگڑا بڑھ جانے کے خوف سے چپ ہو رہتی۔ لیکن دیور کے سوال کے جواب میں عموماً وہ ٹھے میں پھونکیں مارتے مارتے دفعتاً سر اوپر اٹھاتی اور سارے دھوئیں کے چھوٹی چھوٹی پر آب آنکھوں کو میلے آنچل سے پونچھتے ہوئے انہیں جھپکا جھپکا کر دیور کی طرف کھ کر مسکرانے لگتی۔

اسے چپ چاپ مسکراتے دیکھ کر وہ اپنی حرکات سے کام کرنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے پھر کہتا "نہیں بھابی! سچ سچ —— کہو تو کوئی کام وام....."

تاباں کا منہ گیندے کے پھول کی طرح کھل جاتا وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہتی "نہیں کوئی کام نہیں۔"

"واکھی (واقعی؟)"

"واکھی"

یہ سن کر پالی اطمینان کا سانس لیتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اور صحن میں ادھر ادھر نہایت "اہم" نظریں ڈالتا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے کی رف بڑھتا۔ اور کبھی خیال آ جائے تو جاتے جاتے ٹوٹی ہوئی چارپائی کی پٹیاں چرائے جانے کے خوف سے باہر والے دروازے کے قریب سے اٹھا کر صحن کے فوظ کونے میں کھڑی کر دیتا . . . . . . تاباں کن انکھیوں سے لحیم شحیم دیور کو جھک سمٹ کر ڈیوڑھی کے دروازے میں گزر کر غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہتی۔

اس کے چلے جانے کے بعد اگر اس کا شوہر گھر میں نہ ہوتا (اور عموماً اس وقت وہ کھیتوں کو چلا جاتا تھا) تو اس کی پڑوسن جو اسی کی طرح جوان اور ش مزاج تھی اور شاید پالی کو محبت کی نگاہوں سے بھی دیکھتی تھی۔ اچک کر اپنے گھر سے ان کے صحن کی طرف جھانکتی اور پھر کہنیاں درمیانی دیوار پر ٹیک پوچھتی۔ "چلے گئے "ڈھول" (محبوب) کمائی کرنے کے لئے؟"

اس پر تاباں کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

"ہاں" ڈھول ہی تو ہے"۔

شکل وصورت سے پالی کو ڈھول (محبوب) سے کوئی مشابہت نہیں تھی۔ وہ گھر سے نکل کر عام طور پر دینو لوہار کی دکان کو چلا جاتا تھا۔ گو وہاں تک راستہ ٹے کرنے کی اسے کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ راستے میں بھی گلی کی نکڑ پر کھڑے ہوتے یا دکانوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے بات چیت کرتا اور ہنستا کھیلتا تاک جھانک رتا چلا جاتا۔

گاؤں کی لڑکیوں میں سے صرف سرتوں ہی سے اسے محبت تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے دیگر لڑکیوں سے خدانخواستہ بیر تھا۔ حسن صورت نہ سہی لیکن اس کے مردانہ تیور اور وجاہت ہی اس کے حق میں بڑی بھاری سفارش کا کام دیتی تھی۔ وہ بھی میٹھی نظروں کا مسکراہٹ سے جواب دینا معیوب نہ سمجھتا تھا۔ لیکن ان کاموں میں وہ جنگلی بلے سے زیادہ ہوشیار تھا۔ کبھی کسی لڑکی سے خواہ مخواہ نظریں لڑانے کی کوشش نہ کرتا۔ گاؤں والوں میں مفت کی بدنامی اسے پسند نہیں تھی۔ اور سب سے زیادہ خوف اسے سرتوں اور اس کے گھر والوں کا تھا۔ سرتوں سے اس کی شادی کے امکانات بھی تھے۔ اس لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی اور لڑکی کے متعلق افواہ اڑے اور اس کا بنتا کام بگڑ جائے۔ دیگر لڑکیوں کے معاملے میں جس قدر محتاط تھا اسی قدر سرتوں کے معاملے میں وہ جرأت سے کام لیتا تھا۔ اس بات کا کہ دوسرے اسے سرتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں خیال رکھتے ہوئے جب کبھی وہ اکیلی وکیلی مل جاتی تو وہ اس سے چھیڑ خانی کئے بغیر کبھی نہ رہتا۔ اس نے پہلے پہل سرتوں کے ہاں بڑی پابندی سے آنا جانا شروع کر دیا تھا لیکن بہت جلد ہی اپنوں ہی کے کنایوں سے اس نے دور کی بات بخوبی سمجھ کر فوراً دوسری پالیسی اختیار کر لی۔ یعنی ان کے ہاں مناسب وقفے کے بعد جاتا۔ سرتوں کے والدین کو بھی سوائے اس کے کہ ان دونوں میں بچپن ہی سے لگاؤ ہے اور کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوا۔ سرتوں سے پرے پرے رہنا پالی کو بہت کھلتا تھا لیکن وہ اس کی کسر دوسری لڑکیوں بلکہ زیادہ تر عورتوں

سے پوری کر لیا کرتا تھا۔ شادی شدہ عورتوں میں ایسی عورتوں کی کمی نہیں تھی جو ابھی چوبیس پچیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں تھیں۔ جن میں سے بیشتر غیر شعوری ط اپنے خاوندوں سے مطمئن نہیں تھیں۔ اور پھر پالا سنگھ جیسے منتخب جوان کی چٹپٹی گفتگو سے محظوظ ہونے کو کس کا دل نہ چاہے گا۔ وہ کنواری لڑکیوں کی نسب یوں بھی بے باک ہوتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بدنامی کا ڈر نہ چھوٹی موٹی چہل سے پتی برتا دھرم کو کوئی خطرہ۔ ان سے سب باتیں اشاروں اور کنایوں یا بالواسطہ طریقوں سے ہوتی تھیں۔ کوئی مامی کوئی چاچی کوئی بھابی بنی بیٹھی ہے اس آڑ میں ذو معنی گفتگو کے دوران میں نارضامندی کے آثار نظر آئے تو راستے ہی س گئے اور اگر محض شرمیلی آنکھیں جھک کر رہ گئیں تو پھر انگلیاں گھی میں، اور سر کڑاہی میں۔

باغیچی گاؤں کے مردوں کے کلب گھر کا کام دیتی تھی تو دینو لوہار کی دکان صرف نوجوان چھوکروں کے کلب گھر کا کام دیتی تھی۔

یوں دینو مشہور تھا لوہار کے نام سے اس کے آباؤ اجداد لوہار رہے ہوں گے لیکن اب وہ خود بڑھئی کا کام کرتا تھا اور بڑھئی کا کام بھی بس برائے محض پھالوں کی ٹھکائی کے لئے ہل دو دو چار چار دن پڑے رہتے۔ دینو کی عمر ستائیس اٹھائیس برس کے قریب ہو گی لیکن اس کی صورت سے ایسی ملائمت آنکھوں سے ایسی سادگی ٹپکتی تھی کہ اس کی عمر بائیس برس سے اوپر تو کسی صورت میں بھی نہ کہی جا سکتی تھی۔ گھر میں اس کی دادی —— جو بے حد بوڑھی تھی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور اس کی ماں تھی۔ پالی کی طرح اس کا باپ بھی بچپن ہی میں مر گیا تھا۔ ایک مرتبہ شادی بھی ہوئی تھی لیکن بیوی ایک بچی چھوڑ کر چل بسی۔ بچی کی ماں پال رہی تھی لیکن وہ خود ہمیشہ کی طرح بے فکری سے دن گزار رہا تھا۔ وہ کام چور نہیں تھا لیکن کام سے زیادہ اسے تاش کھیلنے اور گپ ہانکنے کا شوق تھ کوئی نہ ہو تو چپ چاپ اپنے کام میں جٹا رہتا۔ پنجالیاں، ہل، دہی بلونے کی مدھانیاں، گھڑنجیاں غرض اس قسم کی چیزیں خاصی اچھی بنا لیتا تھا کچھ دنوں شہر کر یہ کام سیکھ چکا تھا۔ نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ قریب کے دیگر گاؤں کے لوگ بھی اسے اچھا کاریگر سمجھتے تھے۔ ایک تو اس کا سبھاؤ سیتل دوسرے اس باتیں تھیں بے حد میٹھی۔ اس لئے نہ کام کی کمی تھی نہ اجرت کی۔ لیکن اگر کسی بات کی کمی تھی تو فرصت کی۔ دو چار دوست آن بیٹھے جو عموماً آن ہی بیٹھتے تھے پھر دنوں تک اپنے کام کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ یہاں ہر نوجوان اپنی من پسند لڑکی اور اس سے تعلقات کا اظہار کرنے سے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کر ہر کسی کے دل کا راز یہاں محفوظ تھا۔ سبھی ایک دوسرے کے رازداں تھے۔ اس وجہ سے ان کے درمیان عجب یگانگی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ اگر ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ضرورت ہوتی وہ اس میں ہرگز کوتاہی سے کام نہ لیتے۔

پالا سنگھ کا دوپہر کی روٹی سے پہلے کا وقت زیادہ تر اسی دکان پر گزرتا تھا۔ دینو کو بھی اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے اس کا معمول تھا کہ دو ایک دوستوں کی موجودگی میں بھی تھوڑا بہت ضروری کام کئے جاتا لیکن جب سے پالا سنگھ نے دکان پر آنا شروع کیا تھا تو وہ اسے دیکھتے ہی سب کام چھوڑ چھاڑ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا۔

وہ پالا سنگھ کو بڑی قدر کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں اس بات کی حسرت ہی رہی کہ وہ بھی گاؤں سے نکل کر شہر شہر گھومے۔ کہیں دور دیس نکل جائے۔ خیر اب وہ خود نہیں جا سکا تھا تو کم از کم ایک دوست تو اس کا ایسا تھا ہی جو آوارگی میں کئی برس بتا چکا تھا۔ پالی باتوں کا پٹارہ تھا اور گاؤں و کا علم اس قدر محدود تھا کہ ان کے لئے نئی دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی طلسم ہوشربا کی داستان سے کم نہ تھا۔ نوجوانوں کی زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہی ہو ہے۔ اس معاملے میں پالا سنگھ کی زندگی کے واقعات نہ صرف تعداد میں بے شمار معلوم ہوتے بلکہ دینو اور دیگر نوجوانوں کے لئے بالکل انوکھے۔

دینو کی دکان پر چند اور بیکار بھی ڈیرہ جمائے رہتے تھے۔ ان میں سے سب کو کھانے کو دو وقت روٹی مل جاتی تھی۔ ماں باپ کا سایہ سر پر موجود تھا یا بھی پنجاب کے دیہات میں روزانہ ضروریات کی چیزیں تقریباً سبھی کو مل جاتی تھیں جنگ نے رنگ اور چوکھا کر دیا تھا۔ جو رنگیلے تھوڑا بہت کام کرتے تھے بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال کر ادھر کا چکر ضرور لگاتے۔ ورنہ رات کے کھانے کے بعد جو محفل جمتی تھی، اس میں شامل ہونا تو ہر ایک نے اپنے آپ پر فرض کر لیا تھا۔ چھاہ ویلے سے لے کر بھتے ویلے (یعنی لنچ ٹائم) تک پالی گپیں لڑانے میں ایسا محو ہوتا کہ اسے آگے پیچھے کا کچھ ہوش نہ رہتا۔ بچاری مسنداں پہلے تو اس کی تلاش میں سارا گاؤں چھان مارا کرتی لیکن بعد ازاں جب اسے اس کے اڈے کا پتہ چل گیا تو وہ سب سے پہلے دینو کی دکان ہی پر آتی۔ پالی کو گپیں لڑا

ھو کر ماتھے پر بہت گہرے بل پڑ جاتے لیکن منہ بہ منہ چڑتی ہوئی باچھیں دل کی مسرّت کو چھپا نہ سکتی تھیں۔ پہلے تو وہ زمین پر پاؤں جما کر ایستادہ ہو جاتی اور چپ چاپ ں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی۔

بے تحاشہ باتیں کرتے کرتے دینو کا اشارہ پا کر یا خود بخود جب پالی ماں کو قریب کھڑی پاتا تو دفعتاً وہ چپ ہو جاتا اور کچھ دیر تک تو خاموشی طاری رہتی۔ پھر اسنگھ حسبِ عادت تھوک کی پچکاری چھوڑ دیتا۔

ماں کہتی "ری میں، تجھے گاؤں بھر میں ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئی لیکن تو یہاں بیٹھا ہے......"

"ہو ہو ——— ہو" پالی ہنس پڑتا اور اس کے اگلے دو دانتوں میں جڑی ہوئی سونے کی میخیں چمکنے لگتیں۔ "ماں! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں یہیں نو کے پاس بیٹھا کرتا ہوں۔ پھر تو گاؤں بھر میں کیوں ہلکان ہوئی پھرتی ہے....."

"لو اور سنو کام کا نہ کاج کا۔ میں کیا جانوں یہاں ہر روز کیا کھچڑی پکتی ہے۔ سارا سارا دن بیکار پھرتا رہتا ہے کام چور....."

کہنے کو سنداں اس کی بیکاری پر خفا ہوتی تھی لیکن دل میں اپنے بیٹے کا یہ چلن دیکھ کر وہ پھولی نہیں سماتی تھی۔

اس پر پالی کے منہ کا یہ بڑا دہانہ پورا کھل جاتا۔

"اری ماں تو لوگوں کے بہکانے میں آجاتی ہے....."

"ہا ہائے نکھٹو نے صبح سے کون کام کئے ہیں......"

"میں نے بھابی سے پوچھا تھا کہ کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ اس نے کہا کوئی کام نہیں..... پھر میں کیا کرتا۔ مجبوراً ادھر چلا آیا۔"

یہ سن کر اسے مارنے کے انداز میں ہلکے سے ہاتھ اوپر کو اٹھاتی۔ "ہیں ہے...... اب ماں کو بھی آگے سے جواب دینے لگا ہے....."

حالانکہ سنداں کا یہ ہاتھ اٹھانا بھی محض دھمکی کے طور پر ہوتا تھا۔ لیکن پالی کہنی اٹھا کر اور سر چھپا کر اپنے آپ کو اس طرح بچانے کی کوشش کرتا یسے اس کی کمر ہی تو ٹوٹ جائے گی......

پھر سنداں ملائمت سے دونوں بازوؤں میں اس کا چہرہ سمیٹ لیتی اور اس کے گال ہلکے ہلکے تھپتھپاتے ہوئے کہتی۔

"اچھا چل روٹی کھالے...... تیری بھابی کب کی انتظار کر رہی ہے...... ہم پر اتنی مہربانی تو کر دیا کر۔"

پالا سنگھ کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ ہر ایک سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتا لیکن اپنی ماں پر تو وہ کبھی خفا ہو ہی نہیں سکتا تھا خواہ وہ کچھ کہہ دے۔

اس طرح سنداں ایک روز بڑی مشکل سے اپنے بیٹے کو کھدیڑ کر گھر تک لائی۔ اب گھر پر بھابی کے شکوے شروع ہوئے۔ وہ شکایت آمیز لہجے ں بولی۔

"نہ جانے باہر کیا رکھا ہے جو پالی ایک پل کو بھی تو گھر پر نہیں بیٹھتا....."

پالی چپ رہا ——— ماں گھر سے باہر نکل گئی تو پھر کہا۔

"نہ معلوم ہمی سے کھفا ہے۔"

"ارے نہیں بھابی...... بھلا تم سے کھفگی کیسی؟"

اس پر تاباں خوش ہوئی۔

"آخر یہ کیا چکر تیرے پاؤں میں ہے۔ ادھر دن چڑھا ادھر تو نے انگوچھا کندھے پر پھینکا اور چل دیا....."

پہلی بار پالی خلافِ معمول چپ رہا۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت بھابی کو کوئی شرارت سوجھ رہی تھی۔ اور پھر اس وقت گھر میں کوئی اور تھا بھی نہیں۔ چنانچہ پُر معنی نظروں سے دیکھ

کر بولی۔

"پہلے پہل جو تو آیا تو ہم سمجھے کوئی ہو گی ......"

پالا سنگھ کے کان کھڑے ہو گئے بظاہر انجان بن کر بولا:

"کون ہو گی؟"

بھابی نے مسکرا کر سکوت کیا۔

یہی آخر کو کوئی نہ کوئی تو ہو گی ...... جبھی تو ......"

اب پالا سنگھ کو بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

"بھابی تم تو بجھارتیں بجھا رہی ہو۔"

"اے ہے بجھارت کیا ہے اندھے کو بھی دکھ رہا ہے"

"کیا دکھ رہا ہے؟"

"یہی کہ لٹو ہو رہے ہیں کسی پر .... جبھی تو بھابی کے پاس بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی ....."

"لو بھئی خواہ نخواہ ....."

"خواہ نخواہ کیسی بر خوردار میری آنکھیں چندھی نہ سمجھو ....."

اب پالا سنگھ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اچھا بھابی تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"چل گیا۔" یہ کہہ کر تاباں نے نازک انگلی تنبیہہ کے طور پر اٹھا کر شرارت سے کہا۔ "لیکن دیکھو پالی یہ راہ بڑی کٹھن ہوتی ہے"

پالی کچھ شرما رہا تھا اور پھر بھی ہنسے جا رہا تھا۔ کٹھن وٹھن کیا۔ جب تمہاری سی بھابی کا ہاتھ ہمارے سر پر ہے تو پھر سب راہیں آسان ہو جائیں"

"ناں بابا .... ہم ایسے بکھیڑوں نہیں پڑتے۔"

پالی نے بڑھ کر خوشامدانہ انداز میں بھابی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ "نہیں بھابی تمہیں قسم ہے ہمارے ....."

"اوئی ہوئی .... کیسے کاٹھ کے سے سخت ہاتھ ہیں ...... اور بھئی یہ قسموں وسموں سے کام نہ چلے گا۔"

پالی نے مؤدبانہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جو کہو گی۔"

"منہ سے کہو نا۔"

"تمہیں اکنی کا گٹّا کھلا دوں گا۔"

اس پہ تاباں بالکل ہی تڑخ گئی۔

"یہ گٹّا وٹّا تو اسی کو کھلانا ...... ہاں نہیں تو۔"

پالی نے شرارت سے تاباں کے پھولے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"پھر بھئی تم ہی کہہ دو۔"

تاباں چپ۔

”تم بگڑ گئیں …… دیکھو ہم خوشامد کر رہے ہیں۔“

”تو پھر میری ہنسی کیوں اُڑاتے ہو۔“

”بالکو رو بالکور …… کون ہنسی اُڑا رہا ہے، ہیں؟“

”اور نہیں تو کیا۔“

”تو بھئی سچے دل سے وعدہ کرتے ہیں …… جو تم کہہ دو گی …… بس وہی منظور ہو گا ہمیں۔“

”کہو بچن دیا۔“

”بچن دیا“

”تو میں سونا لوں گی۔“

”چلو منظور ……“

”کیا چیز ہو گی بھلا“

”پہلی چیز تو ہو گی انگوٹھی منظور؟“

”منظور —— اس کا مطلب کہ دوسری چیز بھی ہو گی۔“

”ہاں ضرور ہو گی۔“

”جو تم کہو گی۔“

”منہ سے بولو“

”یہ اچھی رہی ابھی سے سب کچھ کہلوا لو —— خود بھی تو کچھ کر کے دکھاؤ۔“

”وعدہ بھولتا نہیں۔“

”واہ مجال ہے ہماری ……“

”اچھا اب کچھ باتیں بتا ڈالو۔“

”کہو“

”سرتوں ہی ہے نا؟“

”ہاں وہی“

”ابھی تک کچھ ہوا۔“

”کچھ نہیں“

”جھوٹ نہیں؟“

”بالکل سچ“

”اس کا کیا خیال ہے؟“

”خیال کیسا؟“

”یہی تمہارے بارے میں“

"بھئی کچھ معلوم نہیں۔"

"اچھی طرح بولتی ہے"

"بہت اچھی طرح۔"

"اور ——— باقی کیسا برتاؤ ہے اُس کا؟"

"بس ہنسے جاتی ہے"

"یعنی ہے اس کے دل میں بھی کچھ۔"

"کہہ نہیں سکتا ——— اس بات کا پتہ لگانا تو تمہارا کام ہے۔"

"اچھا میں پتہ لگاؤں گی۔"

"تمہارا بہناپا بھی ہے۔"

"میں نے خود ہی نہیں بڑھایا"

"تو بھابی دیکھتی کیا ہو ——— بڑھا لو نا"

"یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"

"بس تو آج ہی سے کام شروع کر دو۔ ابھی جاؤ۔"

"ابھی کیا بھاگڑ مچی ہے۔ روٹی تو کھلا لوں تمہیں۔"

اس روز کے بعد بھابی اس کی ہمراز اور ہمدم بن گئی۔ وہ اسے ہمیشہ یہی نصیحت کرتی تھی کہ صبر سے کام لو۔ سہج پکّے سو میٹھا ہوئے۔ بھابی کو ہمراز بنا لینے سے اسے بہت سی سہولتیں حاصل ہو گئیں۔ اسے سرنوں کی بابت کل خبریں ملتی رہتیں۔ آج اس نے فلاں کپڑا پہنا تھا۔ اس کا مزاج درحقیقت کیسا ہے۔ وہ کن چیزوں کو پسند کرتی ہے اور کن سے نفرت کرتی۔ وہ کس وقت کہاں جاتی۔ پالی کو جب پیشتر ہی سے معلوم ہو جاتا کہ آج سرنوں فلاں وقت کنوئیں پر جائے گی تو اسے راستے ہی میں گھیر لینے میں آسانی ہو جاتی۔ بھابی کے مشورے اور اپنی عقل سے بھی اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کے گھر بہت کم جایا کرے گا۔ اور کھیتوں میں یا تنگ گلیوں میں وہ اسے اس انداز سے ملتا جیسے ان کی یہ ملاقات بالکل اتفاقیہ ہو۔ حسبِ موقعہ وہ کوئی مناسب چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتا۔ یوں بھی اسے یقین تھا، کہ اس کی شادی سرنوں سے ہو سکے گی اس لئے وہ شریفانہ حد سے آگے قدم نہ بڑھاتا تھا۔ بعض اوقات اس کے ذہن کے گوشے میں ایک بات بہت بُری طرح کھٹکنے لگتی تھی اور وہ تھا سرنوں کا رویّہ۔

سرنوں کے اندازِ گفتگو اور حرکات سکنات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے بھی پالا سنگھ سے لگاؤ ضرور ہے۔ لیکن وجدانی طور پر پالی کبھی یوں بھی محسوس کرنے لگتا جیسے ایک روز یہ سارا بھرم کھُل جائے گا۔ جیسے سرنوں کی ہنسی کھوکھلی۔ اس کی باتیں بے معنی، اس کی خوش طبعی ظاہرداری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

پالی کو سرنوں کا ایک رنگ نہیں کئی رنگ نظر آتے تھے۔ روز بروز وہ اس کے لئے بجھارت بنتی چلی جا رہی تھی۔ جب کبھی راستے میں وہ اسے ملتی یا صحیح معنی میں یہ اس سے جا ملتا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ وہ اس کے لطیفوں اور ہنسی مذاق کی باتوں پر دل کھول کر کھلکھلاتی ہوئی ہنستی۔ اس کے ملائم رخساروں کے اُبھار اور ان کی چمک میں جوانی کا لہو لہریں لیتا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دم کو ساکن نہ ہوتے تھے۔ خواہ وہ بولے نہ بولے خون دم بدم ان ہونٹوں کی رگوں میں سمندر کی لہر کے ریلے کی طرح آتا اور گذر جاتا۔ اسی طرح اس کے ہونٹ متحرک یا لرزاں رہتے تھے۔ ہنسی تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ غالباً سرنوں کو اس بات کا احساس بھی تھا وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو سنوار سنوار کر بند کرتی لیکن آنکھ جھپکتے میں وہ پھر کھل جاتے۔ ہونٹوں کے بگڑنے اور سنورنے کا عمل جاری رہتا اور ہر صورت میں وہ حسین دکھائی دیتے تھے ان کی ہستی ہی علٰحدہ معلوم ہوتی تھی۔ پالا سنگھ سوچتا شاید کسی روز یہ متحرک ہونٹ مردانہ ہونٹوں کے لمس اور گرمی سے کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جائیں۔

جو شباب میں اس قدر بے چینی اور تلملاہٹ پیدا کئے رہتی ہے شاید اس کی تسکین ہو جائے۔

لیکن ان باتوں، اس ہنسی، اس ڈھنگ میں کوئی ایسی شے نہ تھی جو محض پالا سنگھ کے لئے مخصوص ہو۔ سرنوں کی چال یونہی اکھڑی اکھڑی سی ہوتی تھی۔ اس کی زبان میں بھی لڑکھڑاہٹ ہوتی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں کا بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ انہیں وہ کس انداز سے اٹھاتے یا بڑھائے یا ہلائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں کئی متضاد جذبات نے گھر بنا لیا تھا اور انہی کے اثرات کے تحت اس کے اعضا کی حرکات میں تغیر پیدا ہوتا رہتا تھا ——— لیکن جو بات پالی چاہتا تھا وہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس سے خاص طور پر جھینپتی نہیں۔ اس کی چھیڑ چھاڑ پر بگڑتی نہیں تھی۔ بلکہ اس کی صورت سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ان کنایوں کا مطلب بھی نہ سمجھتی ہو۔

ان باتوں سے پالی عجب ذہنی مخمصے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ مثلاً اگر وہ کہتا۔

"سرنی آج تو بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہو۔"

"جھوٹے کہیں کے۔" یہ کہہ کر وہ بجائے شرمانے کے مسکرانے لگتی۔ اگر وہ کہتا "سرنی تمہیں دو دن نہ دیکھوں تو دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگتا ہے۔"

"ہاں جی تم جھوٹ بولنے میں سب کے سردار ہو۔ گھر پہ آتے نہیں۔ بھلا کئے دن ہو گئے ہیں تمہیں . . . . ."

وہ کہتا۔

"سرنی! سچ کہو تم مجھے بھی کبھی یاد کرتی ہو۔"

"کیوں نہیں۔" وہ ہنسنے لگتی۔

نہیں . . . . نہیں . . . . . وہ ایسی بھولی نہیں تھی۔ وہ سب باتوں کو سمجھتی تھی۔ اتنا بھولپن عملی زندگی میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیا اسے اپنے حسن اور شباب کا کچھ بھی علم نہیں۔ کیا اس نے سہیلیوں کی زبانی محبت کے گیت اور قصے تک نہ سنے ہوں گے اور جب سنسان راتوں کو ہیر گانے والوں کی تانیں ساری فضا میں گونجنے لگتی ہیں، تو کیا سرنوں نے انہیں سنا تک نہ ہوگا۔ کبھی وہ سوچتا ممکن ہے اس نے مجھے عاشق کی حیثیت سے دیکھا ہی نہ ہو کبھی۔ یا شاید دل میں میری چھیڑ چھاڑ کو پسند نہ کرتی ہو۔ لیکن اخلاقاً پیشانی پر بل نہ آنے دیتی ہو۔ سمجھتی ہو کہ اتنے برس باہر رہنے کے بعد آیا ہے۔ رفتہ رفتہ خود ہی سمجھ جائے گا۔ یا مجھے جاہل مطلق سمجھ کر میری حرکات کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتی ہو۔

اس قسم کے شکوک اور تفکرات اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ابھرتے اور پھر کبھی مٹ جاتے کبھی دب جاتے۔ لیکن اس نے کسی سے بھی ان کا اظہار نہ کیا تھا۔ سرنوں کا سلوک بظاہر اس قدر اچھا تھا کہ شکایت کا کوئی موقعہ ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ اس گورکھ دھندے سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کسی روز ایسی چھیڑ خانی کرے کہ سرنوں دل کے صحیح جذبات کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مثلاً وہ کسی روز اسے گلے سے لگا سکتا تھا۔ یا اس کے ہونٹ چوم سکتا تھا۔ پھر تو سرنوں کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہے گا کہ یا تو وہ شرما جائے اور منہ چھپا کر بھاگ جائے یا اس پر برس پڑے۔ لیکن یہ راستہ خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے والدین بھی اسے اپنا داماد بنانے کی سوچ رہے تھے اس لئے اس صورت میں سارا کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ تھا وہ ان متضاد قسم کے خیالات میں گھرا ہوا تھا اور اس باب میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا۔

دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھانے کے لئے گھر آتا تو عموماً اس کی ماں لہنے کے لئے روٹی لے کر کھیتوں کو چلی جاتی۔ وہ بھابی اور بچے گھر پر رہ جاتے بھابی اور اس کی باتیں عموماً سرنوں ہی کی بابت ہوا کرتی تھیں۔ اس نے اپنے تفکرات کا ذکر تو خیر کبھی نہ کیا لیکن بھابی کی باتوں سے اصل حقیقت کی ٹوہ میں رہتا۔

کھانے کے بعد اس کا معمول یہ تھا۔ کرتا اتار کر کندھے پر ڈال لیتا اور بغل میں چارپائی دابے باغیچی کی طرف چل کھڑا ہوتا۔ وہاں سورج کی حدت کم ہونے تک مختلف مشاغل میں مصروف رہتا کبھی تاش کبھی چوسر شطرنج کی چالیں ہی اسے یاد نہ رہتی تھیں۔ اگر کوئی کھیل کھیلنے کو جی نہ چاہا تو بے سروپا باتیں شروع کر دیں۔ ورنہ سر کے نیچے بازو دبا کر خراٹے لینے لگا۔

گاؤں والوں سے اس کے تعلقات بھی گہرے ہو گئے تھے۔ اس کے ہم عمر سب کے سب اس کے دوست بن گئے تھے۔ کسی کو اس کے خلاف کوئی شکایت

نہیں تھی۔ بڑے بوڑھوں میں اسے تایا ہر پرشاد کی باتیں بہت پسند تھیں۔ اس کا سنجیدہ اور عالمانہ اندازِ گفتگو اسے پسند تھا۔ وہ اُسے بہت بڑا عالم فاضل سمجھتا تھا۔ تایا ہر پرشاد پڑھا لکھا تھا اور اس نے دوسروں کی بہ نسبت اِدھر اُدھر گھوم کر دنیا بھی دیکھی تھی۔ یوں بھی وہ ذہین تھا۔ چنانچہ جب سیدھے سادے دیہاتیوں کے دلائل کو اپنی منطق لڑا کر رد کرتا تھا تو پالا سنگھ کو وہی لطف حاصل ہوتا جو دو پہلوانوں کی کشتی میں ایک پہلوان کے چاروں شانے چت گرنے پر آتا ہے۔

کرم دین بھی خاصہ دلچسپ آدمی تھا۔ پالا سنگھ کو ان دونوں کی نوک جھونک بہت پسند تھی پہلے دن ہی اس نے ان دونوں کا تماشہ دیکھ لیا۔ اور بعد ازاں جب آپس میں ذرا بے تکلفی پیدا ہو گئی تو وہ انہیں لڑا کر بہت خوش ہوتا۔ وہ باری باری انہیں شہ دیتا اور وہ سچ مچ بحث کرنے لگتے پھر اصیل مرغوں کی طرح اپنی اپنی بات پر اڑ جاتے کیا مجال جو ان میں سے کوئی اپنی ہار مان لے۔ تایا ہر پرشاد ذہین اور پھر اسے اپنے وقار کا بھی خیال تھا بھلا وہ ہتھیار کیوں ڈالے اور ادھر کرم دین اَن گھڑ جاٹ۔ وہ بھی حقّہ تازہ کر کے ہر پرشاد کے مقابل ڈٹ جاتا۔ اس کی دلیلیں سیدھی سادی ہوتی تھیں لیکن اس کا بات کرنے کا ڈھنگ ہی ایسا تھا کہ دیکھنے سننے والے مارے ہنسی کے پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ آخر تنگ آ کر ہر پرشاد کہتا "بھئی تم ٹھہرے اُجڈ جاٹ۔ تم سے سر کون کھپائے"۔

وہ دونوں ہم عمر تھے ایک دوسرے کا لحاظ بہت کم کرتے تھے۔ ہر پرشاد کی اس بات پر کرم دین حقّے کی نے کھینچ کر مارنے کے انداز سے اُوپر اُٹھا کر کہتا۔ "کھڑا رہو اوئے باہمن دیا پُترا! بات نہیں سوجھتی تو منہ چڑانے پر اُتر آئے"۔

یہ کہہ کر کرم دین سچ مچ نے لے کر اس پر پل پڑتا۔ اور ہر پرشاد ایک ہاتھ سے عینک سنبھالتا ہوا سمٹ کر چارپائی سے چپک کر رہ جاتا اور چلّا چلّا کر کہتا۔ "اوئے نہ ماریں ...... اوئے نہ ماریں اپنے پیو نوں (اپنے باپ کو)"۔

اس پر کرم دین واقعی ہلکے ہلکے وہ ہاتھ چھوڑ دیتا۔ اسے اپنی نے کے ٹوٹ جانے کا ڈر بھی تو لگا رہتا تھا۔

پھر جب کرم دین اپنی جگہ پر جا بیٹھتا تو ہر پرشاد کہتا "یارو کرم دین پر تو وہ قصہ صادق آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں بڑا قابل پڑھا لکھا پنڈت گھومتا پھرتا آن نکلا۔

اس پر کرم دین جلدی جلدی حقے کے کش پینے لگتا۔

"اس نے لوگوں سے کہا کہ میں پنڈت ہوں اگر کوئی گیان دھیان کے مسائل پر بات چیت کرنا چاہے تو میں تیار ہوں ...... اس پر کرم دین ہی کا کوئی جاٹ بھائی کہنے لگا۔ "اوئے اس پنڈت کو میں ابھی ہرائے دیتا ہوں۔ سارا گیان دھیان دھرا رہ جائے گا، سب لوگ حیران رہ گئے......"

اس پر کرم دین گھور کر ہر پرشاد کی طرف دیکھتا۔ "بیٹا! معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اور مار کھانے کو جی چاہتا ہے تیرا"۔

ہر پرشاد مسکرا کر سلسلۂ کلام جاری رکھتا "جب وہ پنڈت جی کے سامنے آیا تو پنڈت جی نے بڑے پریم سے کہا "اُچرو" یعنی فرمائیے۔ اس پر جاٹ کہنے لگا۔ "کھچرو، پچرو، ڈھچرو"۔

حاضرین کی ایسی ہنسی چھوٹتی کہ بعض زمین پر لوٹنے لگتے۔

کرم دین قدرے کھسیا جاتا۔

ہر پرشاد کامیابی کے نشے میں مخمور ہو کر کہتا "اور بھئی پنڈت جی نے جاٹ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا "بھائی! تم جیتے اور میں ہارا۔"

پالی جوالا سنگھ کا بھی بڑا احترام کرتا تھا۔ صرف اسی لئے نہیں کہ وہ اس کے باپ کا دوست تھا اور دونوں نے بڑے بڑے معرکوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا بلکہ جوالا سنگھ کے اپنے کارنامے ایسے تھے کہ پالا سنگھ ایسے انسان کے دل میں خواہ مخواہ اس کے لئے عزّت پیدا ہو گئی۔ جوالا سنگھ کو بھی پالی سے اُنس ہو گیا تھا۔ اگر کبھی کھیت کی مینڈھ پر یا گوردوارے کو جاتے وقت ان دونوں کا میل ہو جاتا تو جوالا سنگھ گھنٹوں اسے اپنی زندگی کے واقعات سُنایا کرتا۔ اس کی زندگی بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھی۔ بڑے بڑے خطروں میں پھنس چکا تھا۔ کئی مرتبہ جیل بھگت چکا تھا پالی نے عجیب عجیب آدمیوں کی اس کے گھر میں آمد و رفت دیکھی تھی۔ دو تین مرتبہ دن کے وقت وہ اس کے گھر میں بھی جا چکا تھا۔

جوالا سنگھ کی بہن کی شخصیت پالی کے لئے اور زیادہ دلچسپ تھی۔

پالی دل میں سوچتا کہ جوالا سنگھ کی بہن کا نام جینتو کی بجائے پخنتو ہونا چاہیئے کیوں کہ اس نے آج تک اسے اداس نہ دیکھا تھا۔ وہ ہردم تیار بر تیار رہتی جیسے میدانِ جنگ کو جا رہی ہو۔ ہونٹوں پر ہنسی، آنکھوں میں چمک، حرکات و سکنات میں بلا کی پھرتی، چہرے پر جلال، چال میں وقار —— جوالا سنگھ نے دبی زبان میں دو ایک مرتبہ اپنی بہن کے خصائل بھی بیان کئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوالا سنگھ نے کسی خفیہ مقام پر ہتھیار بھی جمع کر رکھے تھے کرپانیں چھویاں، کلہاڑیاں، چاقو، چھرے اور رسّیاں اور غالباً پستول اور بندوقیں بھی۔ اس نے ان باتوں کا صاف صاف اعتراف کبھی نہ کیا تھا لیکن ایک روز اس نے پالی کو یہ حقیقت بتا دی تھی کہ جینتو کا پستول کا نشانہ بہت زبردست ہے۔ اگر دیوار پر مکھی بیٹھی ہو تو بھی اس کا نشانہ چوک نہیں سکتا۔ خود پالی نے زیادہ سوالات کرنا نامناسب سمجھا اس طرح خواہ مخواہ جوالا سنگھ کے دل میں شک پیدا ہونے لگتا۔ پالی نے اتنا سمجھ لیا تھا کہ عین ممکن ہے کسی روز ان دونوں کو ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا پڑے۔

باغیچی میں دوپہر کا وقت کاٹنے کے بعد وہ گھر جاتا۔ ادھ کھٹّی لسّی میں نمک کی ڈلی اور کالی مرچ گھول کر صبح کی پڑی ہوئی ایک آدھ روٹی کھا لیتا۔

شام کے وقت سب لوگوں کی ملی جلی محفل گاؤں سے پرے کھیتوں میں منعقد ہوتی۔ اس وقت عموماً گاؤں کے لڑکے بالے اور نوجوان علٰحدہ علٰحدہ ٹولیوں میں بٹ کر کبڈی کھیلا کرتے۔ پالا سنگھ ان کھیلوں میں حصّہ نہ لیتا لیکن تماشائیوں میں شامل ضرور ہو جاتا۔ ہاں اگر کبھی طاقت آزمائی شروع ہو جاتی اور اسے بھی اصرار کے ساتھ شامل کر لیا جاتا تو وہ انکار نہ کرتا۔

رات کے کھانے کے بعد صرف نوجوانوں کی جو خفیہ محفل جمتی اس میں پالا سنگھ پیش پیش ہوتا۔ ایک دوسرے کی معشوقاؤں کی تعریفیں اور تنقیدیں کی جاتیں۔ پالا سنگھ نے اپنے عشق کا قصّہ عام نہ ہونے دیا تھا۔ دوسرے جانتے تھے کہ پالی نووارد ہے ابھی کسی سے عشق لڑا ابھی نہیں ہوگا۔ اور سمجھتے تھے کہ محفل میں گانے والوں کے محبت بھرے عریاں گیت سن کر ہو سکتا ہے کہ ایک روز اس کے دل میں بھی عشق کی آگ بھڑک اُٹھے۔

لیکن وہاں تو آگ پہلے ہی بھڑک چکی تھی۔ ایک روز یہ راز بھی افشا ہو گیا۔

شام کا وقت تھا۔ گاؤں کو واپس آنے والے مویشیوں کی اڑائی ہوئی گرد نے بڑھتی ہوئی تاریکی میں گھل مل کر فضا میں اور زیادہ دھندلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ پالا سنگھ کبڈی کھیلنے والوں کو چھوڑ کر گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کا دل کھویا کھویا سا تھا۔ جیسا کہ کبھی کبھار ہر انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس نے نگاہ اُٹھا کر اینڈھے مینڈھے کچے مکانوں کو اور گاؤں کی تنگ گلیوں کی طرف دیکھا جہاں اس وقت نامعلوم سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خصوصاً مکانوں کے درمیان جہاں کہیں درخت اُگے ہوئے تھے وہاں تاریکی اور زیادہ بڑھ گئی تھی ان کے پھیلتے ہوئے گدلے سائے فضا کو اور اداس بنا رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ حبس اور پسینے سے دم گھٹتا اور طبیعت بے چین ہوئی جاتی تھی۔ پالا سنگھ نے بے ڈھب پگڑی میں اپنی دو لمبی انگلیاں ڈالیں پسینے سے تر بالوں میں سے ہوتی ہوئی انگلیاں آخر اس مقام تک پہنچ گئیں جہاں وہ کھجانا چاہتا تھا۔ پھر نہ معلوم فضا کی بے کیفی سے تنگ آ کر یا گرمی کی شدّت سے گھبرا کر ایک لمبی سانس چھوڑی ——

کبڈی کے میدان سے تماشائیوں کے چیخنے کی بہت ہی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پالا سنگھ کو گرمی کی وجہ سے کندھے پر پڑا ہوا انگوچھا بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بلا سوچے اسے کندھے سے اتار کر کمر کے گرد لپیٹ دیا اور کس کر گرہ لگا دی۔ اس سے اس کی کمر کا گھیرا تنگ ہو گیا اور اس کی چھاتی کا پھیلاؤ بہت زیادہ دکھائی دینے لگا۔ سامنے نواب کا طویلہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے گرداگرد چار ہاتھ اونچی دیوار بنا دی گئی تھی اس دیوار کی تعمیر میں بہت گھٹیا سرمئی رنگ کی مٹی استعمال کی گئی تھی۔ اسے کبھی پوتنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ پتلے گوبر کے چھینٹے اس پر جم کر رہ گئے تھے۔

اسے طویلے کے قریب ہی سے گزرنا تھا۔ جب وہ طویلے سے ادھر توُت کے درخت تلے سے گزر رہا تھا تو دفعتاً کھیتوں سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سرتوں ہی ہے۔ وہ ایک بیل گاڑی کے پیچھے دبک گیا۔ جب اور قریب آ گئی تو اس نے دیکھا کہ اس کا خیال درست نکلا۔ چنانچہ وہ بھاگ کر چکّر لگاتا ہوا طویلے کی دیوار کے پرلے کونے پر کھڑا ہو گیا

وہ قریب پہنچی تو وہ سہج سے دو قدم بڑھ کر اس کے قریب چلا گیا۔ سرنوں نے قدرے خوفزدہ نظروں سے اپنے شانے کے اوپر سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور وہ ہنسنے لگی۔

"اوہ میں تو ڈر ہی گئی"

یہ کہہ کر ہنستے ہنستے اس نے غالباً سنجیدہ دکھائی دینے کے لئے ہونٹ بند کر لینے کی کوشش کی لیکن حسب عادت، دانت نکلے پڑتے تھے۔ لیکن اس کی اس کوشش کے دوران میں اس کی گول ٹھڈی پر کئی ننھے ننھے نشیب و فراز پیدا ہو کر غائب ہو گئے۔

دھندلائی ہوئی روشنی میں اس کے ڈھیلے ڈھالے بالوں کی لٹیں جن پر گرد کی نہایت ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی، اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں جو بادلوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی، اس کے خوبصورت ہاتھوں کی جنبش جو شفاف پانی کی تہ میں ایک ادا سے حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے، اس کے رسیلے ہونٹوں سے نکلتے ہوئے الفاظ جو دور دیش کے کسی گوشے سے آتے ہوئے سنائی دے رہے تھے . . . . . .

سرنی نے کئی مرتبہ پالی کو اپنی طرف اس انداز سے گھورتے پایا تھا اس لئے اب اس نے اس کی اس حرکت پہ پریشان ہونا ترک کر دیا تھا . . . .

"میں نگھے (قریب کا گاؤں) تک گئی تھی" ——— اس نے کہنا شروع کیا۔ "جولاہوں کو سوت دے رکھا ہے ہم نے . . . . ."

پالا سنگھ نے ایک ہاتھ اٹھا کر سرمئی دیوار پہ رکھ دیا۔ اور قدرے آگے کو جھک کر آہستہ سے کہا "سرنوں مجھ سے کب تک ڈرتی رہوگی . . . . . ."

اور پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ملائمت سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ پہلے بھی اس کے قریب ہی کھڑی تھی لیکن اب شاید ایک طرف کو زیادہ بوجھ پڑ جانے پر وہ ایک قدم اور قریب آ چکی تھی۔ پالی نے محسوس کیا کہ وہ اس وقت اس قسم کی حرکت پر آمادہ نہیں تھی لیکن اب اسے خطرناک حد تک قریب لے آیا تھا۔ اس کی رنگین قمیص کے اوپر کے دو کھلے ہوئے بٹنوں کی وجہ سے اس کی نرم گردن کی اجلی جلد قمیص کے کپڑے کے ہلکے رنگین سائے میں گھل مل کر اور بھی زیادہ دلفریب ہو گئی تھی۔ اس کی چھاتیوں کا نچلا حصہ پسینہ کی وجہ سے قمیص سے چپک گیا تھا اور وہ متناسب گولائیاں اور بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ جذبات کے ہیجان میں سرنوں زیر لب بے ترتیب الفاظ سے احتجاج کر رہی تھی۔ پالی کی عقل کہتی تھی کہ اسے یہ حرکت نہیں کرنی چاہئے لیکن اب جبکہ وہ اپنے سینہ پر سرنوں کی سخت چھاتیوں کے لمس سے گویا مسحور ہو چکا تھا اس کے لئے پیچھے قدم ہٹانا ناممکن تھا . . . . . .

عین اس وقت نامعلوم سا کھٹکا سنائی دیا۔ اس کے بازو فوراً ڈھیلے پڑ گئے۔ اور آنکھ جھپکتے میں سرنوں اس کی گرفت سے باہر نکل گئی۔ اس نے سوچا اچھا ہی ہوا کہ میں نے سوا بغلگیر ہونے کے اور کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید وہ پھر بھی ہنس رہی تھی۔ خجالت کو مٹانے والی ہنسی . . . . . شاید اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں پر خفگی بھری بڑبڑاہٹ تھی . . . . . . اسے واضح طور پر کچھ بھی یاد نہ رہا . . . . اس نے دیکھا کہ وہ جلد جلد اپنے بے ترتیب کپڑوں کو درست کرتی ہوئی نہایت تیزی سے قدم اٹھاتی گلی کے موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

کشمکش کے دوران میں پالی کے دل اور دماغ میں جنگ جاری رہی وہ اس اندرونی انتشار کی وجہ سے کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس لئے ایک لمحہ کے لئے وہ دیوار ہی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا . . . . . . پھر نہایت مدھم سروں میں مردانہ آواز سنائی دی۔

آنی ہے کوڑے

جاہ نی جے کوڑے

بھیڑی گلی وچہ ہو وسے ٹاکرا

اوئے

بھیڑی گلی وچہ ہو وسے ٹاکرا

بھائیاں تیریاں نوں خبر جو ہو جاؤ

آجان سلنگاں پھڑکے

نی پھیر توں
پھیر توں رووین گی، لڑ ھانے دا پھڑکے

پالی نے چونک کر سر گھمایا تو دیکھا نواب طویلے کی دیوار پر دونوں کہنیاں ٹیکے شرارت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر گیت گا رہا ہے۔

نواب اس کا دوست تھا۔ جگری یوں بھی اس کے دل میں کسی کے لئے بدی نہیں تھی۔ پھر جب وہ دیوار پر سے کود کر گلی میں اترا تو اس کے سیاہ بالوں والے پٹے کانوں کے پیچھے سے نکل کر آنکھوں پر آن گرے۔ پالی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا "دیکھ یار اور کسی کو خبر نہ ہو" وہ جانتا تھا کہ دوستوں میں تو یہ قصہ مشہور ہو ہی جائے گا۔ لیکن وہ غیروں سے یہ بات چھپانا چاہتا تھا۔

پھر رات کو جب پالی کھانے کے بعد یاروں کی محفل میں پہنچا تو سب کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ پالی کو معلوم ہو گیا کہ ان سب کو اس کے عشق کا پتہ چل گیا ہے۔ اتنے میں نواب نے اپنی بے معنی بھینگی آنکھوں کو پر معنی بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا عاشک کے مجاج کیسے ہیں"

پالی تھوک کی پچکاری چھوڑ کر مسکرانے لگا۔

اس وقت وہ گاؤں سے باہر ایک بہت پرانے کنوئیں کی ٹوٹی پھوٹی منڈیر پر بیٹھا تھا اور باقی اونچی نیچی زمین پر بیٹھے تھے۔ کبھی اس کنوئیں پر لوگ پانی بھی بھرا کرتے تھے لیکن اب اسے مٹی سے بھروا دیا گیا تھا۔ یونہی چھوٹا سا گڑھا رہ گیا تھا یا دو بوسیدہ لکڑی کے ستون جن پر چرکھڑی پڑی رہتی تھی۔

سب لوگ نواب کو گانے کے لئے اکسانے لگے۔ نواب نے بڑی رسیلی آواز پائی تھی۔ اس کے مقابل خیراتی بھی خوب گاتا تھا۔ لیکن مسخرا تھا کمبخت عورتوں کی آواز اور حرکات کی بہت اچھی نقل اتارتا تھا۔ دونوں کو محفل میں پا کر سب نے شور مچایا ہاں بھئی ہو جائے۔

نواب نے دفعتاً اپنا خوبصورت مردانہ چہرہ اوپر اٹھایا اور کان پر ہاتھ رکھ کر گیت کے بول شروع کئے۔

ایس کوٹھے نی

پائیے توں کیوں چڑھی ایں

میریئے نازکے نارے

خیراتی نے میلے کرتے کو الٹا کر سر پہ اوڑھ لیا اور عورتوں کی طرح گھونگٹ سا نکال کر اپنے بھدے موٹے ہونٹوں میں سے باریک آواز نکالی۔

ایس کوٹھے وے

پائیے دی لوڑ سی

میرا دھیا ڈھولا!

حاضرین مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ بشنے نے ناک اور انگلیوں کی مدد سے گویا الغوزے بجانے شروع کر دیئے۔ اور پھوجو نے زبان اور تالو کی مدد سے چھس چھسا چھس کی آواز نکال کر گویا گھونگروؤں کی آواز بلند کی۔ نواب نے بڑھ کر پالی کی پگڑی جھپٹ کر سر پہ اوڑھنے کے لئے خیراتی کی طرف پھینک دی۔ پالی نے اس پر اسے دو تین گندی گالیاں دیں لیکن اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے رنگین پھندنوں کی لرزش کے ساتھ نواب کی مترنم آواز گونجی۔

"کیہڑی کھوہڑی نی

سانوں دس دے

میرے بیبے نازک نارے"

واہ وا . . . . . . بلہارے . . . . . "

خیراتی نے کمر بلائی

"اوہو کھوہڑی وے
سانوں بھُل گئی

میریا وہیا ڈھولا"

محفل ایک مرتبہ پھر اُچھل پڑی۔ "ہائے او ہائے . . . . اوہ کھوہڑی۔

نواب نے اپنے پٹّوں کو سنوارتے ہوئے ہنس کر سب کی طرف دیکھا۔

"کیہڑی جھجری نی
کیہڑی جھجری نی
سانوں دس دے

میرے ناچکے نارے

خیراتی نے اُٹھ کر بھونڈے طریق سے رقص کرنا بھی شروع کر دیا تھا اب اس نے بڑے زور سے کمر ہلائی۔

اوہو جھجری وے
اوہو جھجری وے
ساتھوں بھج پئی

میریا وہیا ڈھولا!

اس پر سننے والوں کی مسرّت اور وارفتگی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بعض نے ہائے وائے کے نعرے بلند کر کے تہبند اُتار پھینکے اور چاند کی چاندنی میں بلا تکلف ننگ دھڑنگ اُچھل کود کرنے لگے۔

اب کے نواب نے اپنے لمبے قد کو اور لمبا کیا اور ایک ہاتھ ہوا میں لہرا دیا۔

"اوہو ٹھیکری نی
اوہو ٹھیکری نی
سانوں دس دے

میرے بیبے ناچکے نارے"

اس پر خیراتی گھونگٹ اُلٹ کر نواب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنے بدصورت چہرے کو اور بھی بھونڈا بنا کر تان اُڑائی۔

اوہو ٹھیکری وے
اوہو ٹھیکری وے
بالک لے گئے

میریا وہیا ڈھولا

پالا سنگھ کے عشق کے اعزاز میں گایا ہوا یہ گیت ختم ہوتے ہی محفل میں گویا قیامت آگئی۔

(۵)

شام کو جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اس نے پالی کو دوستوں کی محفل میں بھی بے چین ہی رکھا۔ بظاہر وہ ان کے گانوں، باتوں اور لطیفوں سے لطف اندوز ہوتا رہا لیکن سوچ پر ایک نامعلوم سا غبار تھا۔ وہ اس رات کے بعد آنے والی صبح سے ڈرتا تھا۔

بدنامی اور لڑائی جھگڑے سے وہ خوف کھانے والا نہیں تھا۔ نیک نامی میں اس کے نزدیک کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ آخر نیک نامی حاصل کرنے کے لئے کچھ کرنا تو نہیں پڑتا۔ کسی سے کوئی بات نہ کہو، اگر کوئی زیادتی کرے تو چپ رہو، ڈاکے نہ ڈالو، پرائی استری پر بُری نگاہ نہ ڈالو۔ یعنی بزدلی اور غیر مردانہ قسم کے کام کرنے پر نیک نامی کا تمغہ مل جاتا ہے۔ باقی رہ گئے سرنوں کے بھائی۔ اگر سرنوں انہیں کہہ بھی دے اور وہ لڑنے کے لئے چڑھ دوڑیں تو بھی اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ خود ہی مار کھا کر بھاگیں گے ـــــ اسے خود سرنوں سے ڈر لگتا تھا۔ بچپن ہی سے اس کے دل میں سرنوں کی برتری کا احساس تھا وہ ستھری رہتی تھی۔ دانت صاف کرتی تھی۔ آنکھوں میں سُرمہ لگاتی تھی۔ دھوپ میں آوارہ نہیں پھرتی تھی۔ نہانے یا بال دھونے سے نہیں کتراتی تھی۔ خیر یہاں تک تو وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے سکتا تھا کہ سرنی لڑکی ہے اسے یہ کام کرنے ہی چاہئیں۔ لیکن اس کا سرنی سے جو بھی اختلاف ہو وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سرنوں سے محبت کرتا تھا اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس سے وہ اس کے خلاف ہو جائے۔

لیکن شام کو تو روکتے روکتے نوبت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ پھر اس واقعہ کی تفصیلات پر غور کرنے لگا۔ اس نے کیا حرکت کی تھی اور سرنی پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا تھا۔ لیکن اسے واضح طور پر کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ جو کچھ اس نے کیا ظاہر تھا لیکن اس کے نتائج کیا ہو سکتے تھے وہ اس کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

دوستوں کی محفل برخاست ہونے کے بعد وہ گھر کو چلا۔ اس رات پھر گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے لوگ زیادہ تر گھروں کی چھتوں پر سو رہے تھے۔ ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا جب وہ صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کی بھابی چوکے کی گوبر سے لپائی کر رہی ہے۔ اسے حیرت ہوئی تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ گھر کے باقی لوگ چھت پر جا چکے تھے۔ اس نے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدھم روشنی میں بھابی کی طرف دیکھا جو اس وقت سر دوپٹے کی بجائے یونہی ایک جھاڑن رکھے اچک اچک کر گوبر میں سنے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے کو چوکے پر پھیرے جا رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر بولا

”بھابی تم اس وقت لپائی کر رہی ہو۔ میں سمجھا سو گئی ہوگی۔ اور سب تو سو گئے ہیں نا؟“

تاباں نے حسبِ عادت ہنستے ہوئے کہا۔ ”کاکے کے ساتھ جب تک میں نہ لیٹوں وہ سوتا نہیں۔ آج نہ تو وہ خود سویا نہ مجھے اپنے قریب سے اُٹھنے دیا مشکل سے جب سو گیا تو ایک مرتبہ تو میرا دل بھی چاہا کہ سو جاؤں لیکن پھر صبح کو بھی مجھے ہی یہ سب کام کرنا پڑتا۔“

پالا سنگھ کو اس قدر طویل جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بھابی کے فقرے دھیان سے نہ سنے تھے۔ وہ بے معنی نظروں سے صحن میں پڑی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چھکڑے کا ڈھرا ٹکا ہوا تھا۔ اس کے قریب پنجابی۔ درانتی اور چھ پھل والی ترنگلی وغیرہ بے ترتیب پڑی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر ترنگلی کی کیا ضرورت۔ لہنا ہر چیز اندر سے نکال کر باہر ڈال دیتا ہے۔ پھر غُلّے پھینکنے والی کمان کو جو دروازے کے آگے گری پڑی تھی اٹھا کر اس نے صحن کی دیوار میں ٹھکے ہوئے لکڑی کے کھونٹے سے لٹکا دیا۔ پڑوس والوں کے صحن میں پیپل کا ایک بھاری درخت کھڑا تھا۔ جس کی شاخیں ان کے صحن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر بیٹھے ہوئے کوّے اور طوطے نہ صرف شور مچاتے بلکہ بیٹھوں کی بارش بھی کئے جاتے انہیں اڑانے کے لئے اس کے باپ نے وہ کمان ایجاد کی تھی۔ اس کمان کے دونوں سروں پر سُتلی کی دو رسیاں ایک دوسرے کے متوازی چلی گئی تھیں۔ بیچوں بیچ غلّے کے لئے بُنی ہوئی پوٹ تھی۔ وہ اس پوٹ کو دیکھتا رہا جس کے تاگے کمزور ہو رہے تھے۔ اس کی نگاہ صحن کے اس گوشے کی طرف چلی گئی۔ جہاں پھیکی چاندنی میں کچے فرش پر بیٹھیں چمک رہی تھیں۔ پھر وہ ٹہلتا ہوا کھرلیوں کی طرف چلا گیا اور تھوڑی دیر تک مویشیوں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

تاباں نے نگاہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے بلا مقصد کھڑا پا کر بولی۔

”تمہیں نیند نہیں آئی - جاؤ تمہارا بستر بچھا دیا ہے - میں نے کہا سو رہو - صبح اُٹھ کر تمہیں سانی بھی تو کرنی ہو گی۔“

پاآی نے بھابی کی بات سنی ان سنی کر کے یونہی بات چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”بھابی تمہیں بہت کام کرنا پڑتا ہے۔“

تاباں نے یہ بات سُنی تو مسکرا کر اس کی طرف دیکھا - اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”اب تمہاری جورو آئے گی تو میرا ہاتھ بٹا دیا کرے گی - بھلا سوچو پھر میں آدھی آدھی رات تک لپائی تپائی تھوڑے ہی کیا کروں گی۔“

یہ کہہ کر تاباں نے قدرے سکوت کیا اور پھر اپنی بات کا ردِ عمل جاننے کے لئے اس نے سر اُوپر اُٹھایا - اور پاآی کی طرف دیکھا - پاآی کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور پھر معدوم ہو گئی - تاباں کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی - اس نے ایک گول مونڈھا اس کی طرف لڑکاتے ہوئے کہا۔

”اگر نیند نہیں آئی تو بیٹھو نا! کوئی مزیدار بات یا نئی خبر ہی سُناؤ۔“

پاآی نے لڑھکتے ہوئے مونڈھے کو پاؤں سے روکا اور وہ آڑا ترچھا ہلتا ہوا بالآخر زمین پر آن رہا - پاآی بغیر کچھ کہے اس پر بیٹھ گیا اور قریب پڑی ہوئی بچوں کے کھیلنے کی چند ٹھیکریاں اُٹھا کر انہیں ہوا میں اچھالتا اور بوجتا ہوا کہنے لگا۔

”کیا کھبر سُنائیں؟“

”کیا معاملہ ہے ...... آج اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے ہو - چہرہ بھی کچھ اُداس ہے ......“

”نہیں تو۔“

تاباں نے اپنی بات کی تردید کر قبول کر لینے کے خیال سے زیادہ طول نہ دیا لیکن دل ہی دل میں کھٹک رہی تھی کہ کوئی بات ہے ضرور۔

قدرے سکوت کے بعد پاآی نے ٹھیکریاں اُچھالنے اور بوجنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

”آج تم گئی تھیں —— وہاں؟“

”وہاں —— کہاں؟“

پاآی چپ رہا - اس نے سوچا کہ بھابی خود ہی سمجھ جائے گی ...... اور دوسرے لمحہ میں وہ سمجھ بھی گئی۔

”اوہ اچھا سسرال کے بارے میں پوچھتے ہو؟ ... ہاں گئی تھی۔“

”کب“

”دوپہر ڈھلے ...... لیکن وہ نہیں تھی گھر پر ...... پھر روٹی کے بعد ڈھینگری کی کٹوری دینے ...... اس وقت وہ گھر پر ہی تھی۔“

پاآی کے ہاتھ رُک گئے۔

لیکن تاباں کی صورت سے کسی غیر معمولی بات کا اظہار نہیں تھا - پاآی اس بات کا منتظر تھا کہ وہ اور آگے کچھ کہے لیکن اس کا معمولی سکوت بھی اس کے ذہن پر بھاری ہو رہا تھا - وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا کر رہی تھی؟“

یہ کہہ کر پاآی کو احساس ہوا کہ دراصل پوچھنا وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کا رویّہ کیسا تھا - لیکن ....

تاباں کے بالوں کی ایک لٹ آنکھ پر آن گری تھی - اس نے گوبر سے سنا ہوا ہاتھ اُٹھایا اور کلائی کی اُلٹی جانب سے اسے پیچھے کی طرف ہٹا دیا - اس کی اس حرکت سے جواب دینے میں اور دیر ہو گئی - پاآی نے بے چینی سے انگلیوں میں ایک ٹھیکری کو دبا کر توڑ ڈالا - ٹھیکری توڑ ڈالنے کے بعد خیال آیا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا - بچارے بچّے بڑی مشکل سے اچھی اچھی ٹھیکریاں چنتے ہیں - پھر انہیں بڑی محنت سے اینٹوں پر گھِس گھِس کر ہموار کرتے ہیں - ....

بھابی کو بھی تو اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ اس کے جواب کا کس بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔ اور بچاری کو احساس بھی کس طرح ہوتا اسے یہ تو معلوم ہی نہیں کہ آج کس قدر اہم واقعہ پیش آچکا ہے۔

آخر تاباں بول ہی پڑی۔

"وہ دیر سے روٹی کھایا کرتے ہیں اسی لئے میں کھانا دانا کھلانے سے فارغ ہو کر ڈھینگری لے کر وہاں گئی تھی۔ سرنوں کے باپ کو ڈھینگری کا سالن بہت پسند ہے۔ اس نے پوچھا "کہو بیٹی اچھی تو ہو۔ آج تمہیں بہت دنوں کے بعد دیکھا ہے . . . . . .' میں نے جواب دیا میں تو آتی ہی رہتی ہوں آپ ہی نہیں کبھی دکھائی دیئے اور نہ کبھی ہمارے گھر آتے ہیں، پھر اسے جب معلوم ہوا کہ میں ڈھینگری کا سالن لائی ہوں تو کہنے لگا۔ لو بھئی ہم تو کھانا کھا چکے . . . . نصیب کی بات ہے نا' یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ تو کھانا دانا بہت دیر سے کھاتے ہیں اسی لئے تو میں بے فکری سے اس بکت چلی آئی، اس پر ماں بول اٹھی۔ گرمی ہے نا آج اور پھر سبھی گھر پر موجود تھے سو چا ساری الا بلا چھت پر سے جانی ہوگی کیوں نہ کھا ہی لیں . . . . اور ہاں لاؤ کٹوری پانی میں رکھ دیتی ہوں چھت پر پڑی رہے گی تو خراب نہ ہوگی ڈھینگری . . . . . ."

پالی کو بھابی کی یہ گفتگو سن کر از حد کوفت ہوئی اور بار بار ڈھینگری کا لفظ سن کر تو اس کے کان پک گئے۔ اس قدر طویل گفتگو میں کام کی بات ایک بھی نہ کہی۔ اس نے سر سے پگڑی اتار اپنے گھٹنے پر دھر دی۔ ڈاڑھی کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"تو تم وہاں بیٹھی رہیں یا بھگ آئیں"۔

"ارے بیٹھی کیوں نہیں۔ بیٹھنے کے لئے تو گئی تھی۔ ہاں اب سارا کام نشٹم پشٹم . . . . . ."

پالی کا دل کچھ بھر آیا۔ ہاں بہت کام کرتی تھی بھابی۔ اور پھر اسے اپنا لفنگ پن یاد آیا۔

"بھابی تم بہت ہی کام کرتی ہو۔ ایک ہم ہیں۔ فالتو، بے کار، نکھٹو . . . . . ."

اپنی تعریف سن کر تاباں خوش ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی بزرگانہ شفقت بھی جاگ اٹھی:۔

"ارے کون کہتا ہے کہ تو نکھٹو ہے"۔

"سبھی کہتے ہیں"۔

"زبان کھینچ لوں کہنے والے کی"

پالی خوش ہوا۔

"منہ سے نہ کہیں دل میں تو کہتے ہیں"۔

"کسی کی مجال بھی ہے۔ آخر تجھے یہ وہم کیسے ہو گیا"۔

"نہیں بھابی! میں کبھی کبھار سوچنے لگتا ہوں . . . . تم اتنا کام کرتی ہو اور میں ہر روز، تم سے پوچھ کر گھر سے باہر نکلتا ہوں"۔

بھابی کو دیور کے "پوچھ کر گھر سے نکلنے" کی حقیقت معلوم تھی۔ تاہم اسے دیور کی یہ ادا پسند تھی۔

"ہاں ہاں پوچھ کے تو جاتے ہی ہو مجھ سے" یہ کہہ کر اس نے کن انکھیوں سے پالی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ایک ہی خیال کے تحت دونوں کے منہ سے بے اختیار ہنسی نکل گئی ——— جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

تاباں لوگوں کے سامنے دب کر رہنے والی نہیں تھی۔ فطرتاً وہ لڑاکا عورت تھی۔ اسے صرف سہارے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب سے پالی گاؤں میں آیا تھا وہ دو تین نہایت معرکے کی لڑائیاں لڑ چکی تھی۔ کام کرنے میں وہ تیز مزدور تھی۔ لیکن گھومنے پھرنے کا شوق شروع ہی سے اس کے دماغ میں سما گیا تھا۔ کام دام بھگتا کر وہ سارے گاؤں میں پھرکی کی طرح گھوم جاتی۔ اسے سب عورتوں کے بھید اور ہر گھر کی ڈھکی چھپی برائیوں کا علم تھا۔ اس لئے ذرا کسی سے لڑائی ہو جائے تو وہ اس کے

آبا و اجداد تک کی تو ایسی برائیاں گِنا دیتی تھی۔ پالا سنگھ کو عورتوں کی ان لڑائیوں کی خبر تک نہ ہوتی تھی لیکن اس کے نام کا دبدبہ تو تھا۔ اور تاباں نے اس کا جائز یا ناجائز فائدہ اُٹھانے سے کبھی گریز نہ کیا۔

تھوڑی دیر تک ہنستے رہنے کے بعد پالی نے ناک کے نتھنے میں اُنگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھابی تو پھر تم وہاں بیٹھی رہیں"۔

"ہاں"۔

"چھت پر یا صحن میں؟"

"پہلے صحن میں پھر چھت پر"۔

تاباں کو معلوم تھا کہ پالی جرح کیوں کر رہا ہے۔ وہ اُلٹ پھیر کر باتیں پوچھتا رہا۔ اور وہ رُک رُک کر چندھی آنکھوں سے پُرمعنی انداز میں ہاتھ روک دیوار کی طرف دیکھنے لگی . . . . پالی اس کی ہونٹوں کی مسکراہٹ سے سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔

"بھابی تم جان بوجھ کر مجھے دِق کر رہی ہو!"

"ہے ہے یونہی بیٹھے بٹھائے ——— ؟"

"دیکھو تو جان بوجھ کر ادھر ادھر کی ہانکے جا رہی ہو"۔

"تم بھی تو اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہو۔ تمہیں جو بات پوچھنی ہو صاف صاف پوچھو"۔

اس کے دل میں شک گزرا کہ ضرور بھابی کو آج کی بات کا علم ہو گیا ہے۔

بھابی نے پھر کہا۔

"اب تم ہی سے کوئی پوچھے کہ روز تو باتیں ہوتی ہیں پھر آج یہ گول گول باتیں کیوں؟"

بھابی کی یہ بات بھی درست ہی تو تھی۔ جب اس نے خود شرما کر اصل بات پوچھنے سے کترانا شروع کیا تو بھلا بھابی اس کی جھینپ کا تھوڑا بہت لطف کیوں نہ اُٹھائے . . . . لیکن وہ خود بھی تو لاچار تھا۔ اس کے دل میں بھی چور تھا۔ تاہم اس نے راز افشا کرنے سے پہلے بھابی کے دل کی ٹوہ لگانے میں چنداں حرج نہ سمجھا۔

اس دوران میں اس نے اپنے جُوڑے پر سے جالی اُتار لی اور اسے ایک پھندنے سے پکڑ کر گھماتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو بتاؤ"

"پوچھو"

"وہ کہاں تھی؟"

"وہ کون"

"بھئی وہی . . . . . . یہ کیا مجاک ہے؟"

"وہی کون؟"

"سرنوں، سرنوں، سرنوں"

پالی نے چڑ کر یہ الفاظ اتنی زور زور سے کہے کہ تاباں نے زمین پر پھرتا ہُوا ہاتھ روک لیا۔ اسے ڈر لگا کہ ضرور گھر کا کوئی فرد اُس کو چھت پر سے جھانک کر پوچھے گا کہ آخر یہ سرنوں سرنوں کی رٹ کیا لگا رکھی ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ کان دھر کر سنتی رہی کوئی آہٹ نہ پا کر اس نے قدرے ملامت آمیز نظروں سے پالی کی طرف دیکھا۔

پالی نے بچوں کی سی خفگی کے ساتھ دبی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"بھابی تمہارا ہی تو قصور ہے۔ مفت میں بات کا بتنگڑ بناتی ہو ...... پریشان کر دیا مجھے۔"

اس پر تاباں چپ ہو گئی اور منہ پھیر کر جلدی جلدی لپائی کرنے لگی۔

کچھ دیر تک تو پالی اس کی بات کا منتظر رہا۔ پھر اسے شک گزرا کہ مزید خفا ہو گئی ہے بھابی۔ چنانچہ وہ بیل کی طرح دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ دیکھا تو واقعی منہ پھولا ہوا تھا۔

تاباں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ بھی اچک کر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالمقابل لے گیا۔ تاباں اپنے پھولے ہوئے منہ کو ادھر ادھر حرکت دیتی رہی۔ لیکن پالی کا چہرہ بھی ادھر ادھر پہنچ جاتا .... آخر کار تاباں کے منہ سے ہلکی سی ہنسی نکل گئی۔ یوں بڑے بھائی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ بزرگ بن بیٹھتی تھی ورنہ مزاج میں تو بچپن ہی تھا۔ "ہٹ باگھڑ بلا۔"

پالی نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ بڑھا کر انگلیاں اس کی چکنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دیں۔

"اچھا بھابی غصہ تھوک دو۔"

"پیچھے تو ہٹ .... آدھی رات کو کوئی ہمیں اس طرح دیکھ لے تو نہ معلوم کیا سمجھے ......"

یہ کہہ کر دفعتاً اس نے اپنا منہ بند کر لیا۔ اور پالی شریفانہ انداز سے پیچھے ہٹ کر چوکے کی بالشت بھر اونچی دیوار پر بیٹھ گیا۔

"تم ہی تو بات بے بات پر روٹھ جاتی ہو۔"

"تم چلائے جو ہو اتنی زور سے۔"

پالی نے انگلی سے ابروؤں کا پسینہ جھٹک کر کہا۔

"تم ہی تو ......"

"تو کیا اب ہنسی مجاک بھی نہ کریں۔"

"تو بھابی میں نے کون سے لٹھ برسا دیئے۔"

"گلا پھاڑ کر جو چلائے تم ......"

"اچھا بھابی دیکھو ادھر ......"

تاباں نے دیکھا کہ وہ پگڑی گلے میں ڈالے دونوں ہاتھ باندھے بڑی مسکین صورت بنائے بیٹھا ہے۔

بھابی نے دیور کی یہ صورت دیکھی تو مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

صلح ہو گئی تھی لیکن بات از سر نو شروع کرنے کے لئے خوشگوار تمہید کی ضرورت تھی۔

تاباں نے لپائی والے گوبر کی ہنڈیا کو اس کے گلے سے بندھی ہوئی رسی سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ غالباً وہ بیٹوں سے اٹے ہوئے حصے پر لپائی کرنے کے خیال سے اٹھی تھی۔ پالی موقع تاڑ کر لپکا اور بڑھ کر ہانڈی کی رسی پکڑ لی۔

"لائیے بھابی ہم لے چلتے ہیں"

تاباں نے چپ چاپ ہانڈی اس کے حوالے کر دی۔

پالی نے اجڈپن سے پہاڑی کوے کی طرح چونچ آڑی کر کے بھابی کی طرف دیکھا اور مصنوعی تفاخر سے بولا۔

"بھلا بھابی ہمارے ہوتے ہوئے تم گوبر کی ہانڈی اُٹھاؤ گی . . . . اگر اُٹھاؤ گی بھی تو کیا ہم اُٹھانے دیں گے؟"

اب وہ کوٹھے کے سائے سے چاندنی میں آ گئے تھے۔ تاباں بڑی حسّاس عورت تھی بچپن ہی سے وہ محبت کی بھوکی رہی تھی۔ اس لئے پیار اور اخلاص کی بات پر وہ موم کی طرح پگھل جاتی۔

چنانچہ پالی کی حرکتوں اور باتوں کا اس کے دل پر بہت ہی خوشگوار اثر ہؤا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خفا ہی کب ہوئی تھی۔ وہ تو محبت کا روٹھنا تھا۔ اسے کی چہل ہی تو کہیں گے اور اگر پالی اسے منانے کی کوشش نہ کرتا تو تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی اسے منا لیتی۔

وہ بیٹیوں سے اَٹے ہوئے حصّے پر پتائی کرنے لگی لیکن ایک دو ہاتھ مارنے کے بعد دیکھا کہ بیٹیں ایسی جمی ہوئی ہیں کہ گوبر کی تپلی تہ میں تو یہ چھپیں گی او کی رطوبت ہی گھل ہی سکیں گی۔

پالی نے دیکھا تو بول اُٹھا۔

"بھابی بیٹوں کو کھرچنا پڑے گا"

"یہ تو مصیبت ہے کیا کروں۔ سوچا تھا جلدی سے اس پر بھی پتائی کر دوں گی۔ . . . . . ."

وہ بات ختم بھی نہ کر پائی تھی کہ پالی دوڑ کر صحن کے تاریک کونے سے کھرپا اٹھا لایا اور بیٹیں کھرچنے لگا۔

"لو میں بیٹیں کھرچے دیتا ہوں اور تم پتائی کرتی چلی آؤ۔ . . . . . . دیکھو ابھی دم کے دم میں سب کام ہو جائے گا . . . . . ."

آوارہ مزاج پالی کا اس قدر انکسار سے کام کرنا تاباں کو بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ پتائی کرتے کرتے سوچ رہی تھی کہ اب پھر کسی نہ کسی طرح ر کے گھر کی بات چیت شروع کر دینی چاہئے۔ محض کچھ کہنے کی خاطر بولی۔

"اب تو سرنوں بھی بہت کام کرنے لگی ہے۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ آج دوسرے گاؤں میں گئی ہوئی تھی۔ پہلے تو بڑی مشکل سے اسے بھیجنا پڑتا تھا۔ اب خود بخود ہی چلی جاتی ہے۔ . . . . . . جب تم دونوں کی شادی ہو جائے گی تو پھر تم اِدھر اُدھر گھومنا پھرنا بھول جاؤ گے۔ بس جو بی بی رانی کہے گی وہی کرو گے بھاگ کر . . . . ."

اب گویا تاباں نے بھی مزے دار باتیں کہہ کر دیور کا دل خوش کر دیا تھا۔

پالی کے چوڑے منہ پر ہنسی پھوٹ پڑی۔ لیکن پھر اسے شام کی کرتوت یاد آئی۔

"اچھا تو پھر باتیں واتیں ہوتی رہیں خوب"

"ہاں گھر کے سب لوگ تھے نا"

"اور سرنوں؟"

"وہ بھی بیچ ہی میں تھی . . . . لیکن ہم دونوں کو اکیلے میں بیٹھنے کا موقعہ نہیں ملا نا"

"پھر بھی —— وہ باتیں تو کرتی ہو گی"

"ہاں ہاں . . . . تو کیا بات بھی نہ کرتی"

"میرا مطلب ہے تم سے بھی باتیں کرتی رہی تھی"

"ہاں کیوں نہیں بھئی"

پالی ابھی تک ذہنی تذبذب میں تھا۔ نہ معلوم بھابی کو شام کے قصّے کا علم تھا یا نہیں۔

"کیا بات کہی تھی اُس نے"

"لو اور سنو ...... " یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ " تو کیا اب مجھے اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات یاد ہے .... گھر کے سبھی لوگ بیٹھے تھے۔ عورتیں بھی بھی بچے بھی۔ سبھی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اب میں کیا جانوں کس نے کیا کہا۔ ارے کوئی ہے بھی ایسا جو سب باتیں یاد رکھ سکے۔"

"بھابی سب کی تو نہیں .... سرنوں کی باتیں پوچھ رہا ہوں ......"

"ہائے ہائے ...... پگلا ہے پگلا"

پالی کھسیا کر ہنسنے لگا۔

"بس سمجھ لو خوب مزے دار باتیں ہوتی رہیں اور سرنوں بھی بولتی رہی ..... اور کیا کہوں"

"کیا باتیں ...... یونہی بس گپ شپ"

"سرنوں کی ماں کہنے لگی اب کے چلیں گے امرت سر صاحب دیوالی دیکھنے کے لئے"

"کب"

"اب کے ...... جب دیوالی آئے گی"

"کب ہو گی دیوالی"

"ابھی تو ڈھائی تین مہینے پڑے ہیں ...."

"تو تم بھی جاؤ گی"

"میں کیا ...... تم بھی چلو گے ماں کا کے دا باپو سبھی ....."

"اچھا تو ......"

"ہم سب مل کر چلیں گے نا! ہر سال تو ہم جاتے ہیں۔ وہ کہتی تھی اب کے تو پالی بھی آگیا ہے اور رونق رہے گی اس کے ساتھ ......"

"تو کیا اُس نے یہ بات بھی کہی تھی"

"ہاں"

"نہیں ..... مجھے خوش کرنے کو کہتی ہو"

"دُر"

پالی خوش ہوا۔

"اور وہ یہ بھی کہتی تھی .... ہاں بھئی وہ تو گلہ کرتی تھی کہ پالی ہمارے ہاں آتا نہیں .... کھچا کھچا رہتا ہے۔ ہم تو اسے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن نہ علوم اس کے دل میں کیا بات بیٹھ گئی ہے ......"

پالی نے خوش ہو کر بٹیں کھرچنی بند کر دیں اور حیرت سے بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔

"سچ بھابی .... نہیں!"

"ہاں ہاں ہاں ...... اسے تو تیرا بہت ہی چاؤ ہے۔ مجھ سے کہنے لگی کہ اسے ہمارے گھر بھیجا کر .... میں نے جواب دیا .... پر ماں لی کو بھی آپ لوگوں سے بڑی محبت ہے نہ۔ شرماتا ہے جو آتا نہیں ...... گھر میں بیٹھ کر تم لوگوں کی بہت ہی تاریپ کرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے سرنوں کی ماں بہت چھی لگتی ہے ......"

سرنوں کی ماں اچھی لگنے کی غپ سن کر پالی دل ہی دل میں بڑا محظوظ ہوا اور اس نے جب سر اُٹھا کر بھابی کو دیکھا تو وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"دیکھ لو ...... میں نے اسے یہ نہیں کہا کہ اسے سرنوں اچھی لگتی ہے بلکہ سرنوں کی ماں اچھی لگتی ہے ....."

پالی بھابی کی سیاستدانی کا قائل ہو گیا۔

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا تھا۔ جلدی جلدی پنکھا جھلتے ہوئے کہنے لگی" واری جاؤں میرا بیٹا جو ٹھہرا — تجھے کیا بتاؤں تاباں — ننھا سا تھا ..... ہے ب سا ..... ہم نے اسے کھلایا گود میں ...... اسے یاد نہ ہو۔ دل سے ماسوس کرتا ہے نا! میں بھی تو اس کی ماں ہی ہوں۔ سنداں ٹھہری میری دھرم بہ اور تاباں تو کیا جانے جب وہ کالکتے بھاگ گیا تو بچاری سنداں ایسی روئی ایسی روئی کہ بس ...... یہ کہہ کر وہ آنچل سے ناک پونچھنے لگی ......"

پالی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اچھا! بھابی سچ کہو ......"

"اب میں تجھے کیسے اکین دلاؤں؟"

"تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں میرا بہت کھیال ہے ...... کیوں بھابی!"

"واکہی انہیں تیرا کھیال ہے؟"

"اچھا تو دیوالی پر مجھے بھی ساتھ لے جاویں گے"

"ہم ہر سال جاتے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے ان کے ساتھ!"

"ہاں ...... مجا رہے گا ساتھ ساتھ!"

وہ دل میں سوچنے لگا معلوم ہوتا ہے ابھی سرنوں نے اس کی شرارت کا ذکر ماں سے نہیں کیا۔ نہیں تو وہ ایسی پریم بھری باتیں نہ کرتی۔ شاید سیدھے منہ بو نہ ...... یا اور غصہ چڑھا ہوتا تو لڑنے پر طیار ہو جاتی۔ لیکن اگر اب بھی سرنوں نے بتا دیا تو پھر بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ میں چھیڑ دیا اس نے۔ آخر اتنی بے صبری کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس نے کئی مرتبہ تہیہ کیا تھا کہ وہ سرنوں کے ساتھ بات چیت کرتے وقت زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گ جو بات نصیب میں لکھی ہو اسے کون روک سکتا ہے۔ نہ معلوم اس کے سر پر کیا بھتنا سوار ہو گیا تھا۔ کاش آج کی شام وہ رک جاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کا ک رفتہ بن رہا ہے۔ لیکن واہگوردا اکال پرکھ نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیئے تھے۔ وہ دونوں اتفاق سے مل گئے۔ گاؤں کا گوشہ سنسان۔ اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ نہ کرتی رہی دل قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اور پھر آنکھ جھپکتے ہی اس نے اسے پکڑ لیا۔ اسے کوئی سدھ بدھ نہ رہی۔ واقعی اس کے ہوش ٹھکانے نہ رہے تھے۔ ات سے وہ صبر کر رہا تھا تو اب کیا مشکل تھی۔ کاش وہ گلی میں نہ ملتے یا نزدیک کوئی آدمی شروع ہی میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا۔ تو بھی وہ ایسی جرأت نہ کرتا۔

پالا سنگھ کا چہرہ بھی اس ذہنی کشمکش کی وجہ سے اتر گیا۔ آنکھوں میں کھوئی کھوئی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ تاباں کو کچھ شبہ ہوا۔ پالی نے یہ دیکھتے ہی بات کے لئے کہا۔

"اچھا تو سرنوں بھی باتیں کرتی رہی؟"

"ہاں وہ بھی تھی؟"

"تو وہ بھی خوش ہوئی ہوگی؟"

"ہاں خوش تو تھی"

تاباں کی حیرت کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ پالی نے محسوس کیا کہ وہ دلی کیفیت کو زیادہ عرصے تک نہیں چھپا سکے گا۔ اس نے نظریں ملانے سے

ہوئے پوچھا۔

"میرا اتبل ہے۔ اس نے . . . . . اس کا مجاج کچھ بگڑا ہوا تو نہیں . . . . . . تجھے کچھ بھرک دکھائی دیا یا نہیں ؟"

بھابی کو اپنی جانب مشکوک نظروں سے تاکتے دیکھ کر پالا سنگھ نے پھر کھرپا سنبھالا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ تاباں بھانپ گئی کہ وہ جان بوجھ کر اُس سے آنکھ ملانے سے کترا رہا ہے۔ ادھر پالی کا ہاتھ چل رہا تھا ادھر تاباں کا ہاتھ چلتے چلتے رُک گیا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔

"کیوں پالی! کیا بات ہے ؟"

پالی نے سر اُوپر اُٹھایا۔

"بات ؟" اس نے دلی جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری آنکھوں میں دھول مت ڈالو۔"

"اوہ کیا کہتی ہو۔"

"دال میں کچھ کالا جرور ہے۔"

پالی چپ رہا۔

"مجھ سے چھپانے سے تمہیں کیا مل جائے گا۔"

پالی نے کھرپا ہاتھ سے رکھ دیا۔

"اوہ تم تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔"

جواب میں تاباں کے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

اب پالی نے ہار مان لی۔

"اچھا اب بتا دے پالی! کیا بھید ہے ؟"

"سچ کہو بھابی تمہیں کچھ خبر نہیں ؟"

"نہیں"

"دھرم سے کہتی ہو"

"ہاں بھئی دھرم سے کہتی ہوں۔"

پالی نے چندے بے یقینی سے بھابی کی طرف دیکھا۔

"میرا کھیال تھا تمہیں پتہ چل گیا ہوگا۔"

"بھلا وہ کیسے ؟"

"سرنوں کی جبانی"

"نہیں مجھے کچھ نہیں بتایا اس نے۔"

پالی نے اچٹتی ہوئی ایک نظر بھابی پر ڈالی۔

"آج شام میں نے اُسے چھیڑ دیا تھا جرا۔"

کچھ دیر کے لئے سکوت طاری رہا۔ تاباں شاید اس بات کی منتظر تھی کہ وہ خود ہی سارا واقعہ کہہ سُنائے گا۔

بالی مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔

"تو کیا کہہ دیا تو نے اُسے"

"میں نے نباب کے طویلے کے نجدیک اسے روک لیا تھا۔"

"کچھ اور"

"اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔"

"بس ؟"

"اسے اپنی طرف کھینچا"

"بس ؟"

"میرا کھیال ہے میں نے جرا!!!

"کہو"

"جرا کی جرا چھاتی سے لگالیا تھا۔"

بالی زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ معلوم کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی کہ اس کی بھابی کے چہرے پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا ہے۔ لیکن اُس نے سوچا کہ اب چھپانے کی بات تو کوئی رہی نہیں کیوں نہ اس اہم واقعہ پر تبادلۂ خیال کر لیا جائے۔

"میں ڈر رہا تھا کہ کہیں سرنوں نے اپنی ماں کو نہ بتادیا ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ نہیں تو کیا اسکی ماں تم سے ایسی پریم بھری باتیں کرتی بھلا" قدرے سکوت کے بعد بولا۔

"نہ جانے ابھی کہنے کو بکھت ہی نہ ملا ہو۔ ...... شیَت رات کو کہہ دے گی۔"

معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بھابی اس بات پر زیادہ فکر مند نہیں تھی۔

"کسی اور نے تو نہیں دیکھا ؟"

"نہیں"

"تمہیں اچھی طرح اکین ہے نا"

"ہاں ...... لیکن وہ اپنا نباب ہے نا اسے پتہ چل گیا تھا۔"

"کیا سرنوں کو بھی مالوم ہے کہ نباب نے تم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ لیا ہے۔"

"نہیں اسے کچھ مالوم نہیں .... وہ تو یونہی کھشکاسن کر بھاگ آئی تھی"

"ہوں"

"اور پھر جب وہ چلی آئی تو نباب نے دیوار پر سے سر نکال کر میری طرپھ دیکھا۔"

"نباب کی پھکر نہیں وہ بڑا سریپ ہے کسی سے نہیں کہے گا۔"

"میرے دوستوں کو اس نے اِتنا بتادیا ہے کہ ہم دونوں کا پریم ہے لیکن اصل بات نہیں بتائی۔"

"ہاں تو فکر کاہے کو کرتا ہے۔ یہ پریم وریم کا کسہ تو سبھی کا چلتا ہے۔ اصل بات معلوم نہیں ہونی چاہیئے۔ نباب بہت سریپ آدمی ہے ...... بچارا کسی کی برائی نہیں کرتا اور پھر تیرا تو دوستانہ ہے اس سے ......"

بات بنتی دیکھ کر پالی کا حوصلہ استوار ہونے لگا۔

"لیکن بھابی پھکر نباب کا نہیں .... سرنوں کا ہے وہ کھُد ہی بتا دے جو اپنی ماں کو......"

"دُر" تاباں نے ہاتھ کو جھٹکا جو دیا تو گوبر کے چند چھینٹے پالی کے چہرے پر بھی آن گرے" بھلا مٹیار لڑکیاں بھی ایسی باتیں ماں باپ کو کہتی ہیں۔ بھولے بھیا لڑکیاں اپنے ڈھکے چھپے بھیدوں کا بھانڈا خود ہی نہیں پھوڑ دیا کرتیں۔"

"سچ بھابی؟"

پالی کی باچھیں مارے خوشی کے چرنے لگیں۔

"اور نہیں تو کیا!"

پالی کے سینہ پر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔

"اچھا تو اس کی بات چیت کرنے کا ڈھنگ کیسا تھا!"

"روز کی طرح"

"کوئی پھرک نہیں تھا؟"

"نہیں تو!"

"بھابی کیا بتاؤں میں تو بہت ڈر گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے کھُد ہی اپنا بنا بنایا کام بگاڑ ڈالا ہے"۔

"پگلا جو ٹھہرا......... ارے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اتنی اکل بھی نہ آئی۔ ہائے بچارے کو جندگی میں عورت کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا بھلا ایسی باتیں کیسے سمجھے گا۔"

بھابی کی اس غلط فہمی پر پالی نے دل ہی دل میں خوب بغلیں بجائیں وہ بدمعاش عورت کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔ لیکن شریف لڑکی سے پالا نہیں پڑا تھا۔ اسے پہلے کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو کام چلاؤ محبت کرتا رہا تھا لیکن سرنوں کا معاملہ ٹیڑھا تھا اور پھر وہ اسے اپنی ادھرنگی (جنم ساتھی) بھی بنانا چاہتا تھا بس کچھ ایسی ہی پیچ در پیچ باتیں تھیں جو ذرا اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ ورنہ وہ کبھی کا اس جھنجھٹ سے چھوٹ گیا ہوتا۔

تاباں نے سمجھا کہ دیور پھر تفکّرات میں ڈوب گیا ہے۔ چناں چہ اس نے بڑے عالمانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سرنوں تو سمجھتی ہے کہ اس بھید کو دنیا میں کوئی نہیں جانتا بس ایک تم جانو یا وہ جانے۔ اب جرا اکّل سے سوچو کہ وہ خواہ مخواہ اپنی بدنامی کیوں کرے۔ آئی میری بات سمجھ میں؟"

اس پر پالی چہک کر بولا۔

"سچ پوچھو بھابی! تو میں نے اس سے کہا ہی کیا۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے قریب کھسک آیا۔ اور اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دئے۔" تو بس ایسے میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ دھرے اور پھر جرا سا کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔"

"ہٹ رے" بھابی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا پھر مسکرانے لگی" دیکھو تو منہ پر داڑھی اُگ آئی ہے اور....... اور یہ آدھی رات کے بکھت جو کوئی اس طرح ہم دونوں کو دیکھ لیتا تو پھر......؟"

پالی پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھا تھا دھکّا کھا کر لڑھک گیا اور بھابی کو یقین دلانے کے انداز میں بولا۔

"سچ بھابی! بس اِتی سی بات تھی........ اب تم ہی کہو میں نے کون سا لٹھ کھینچ مارا اسے......"

“بیاکوفی تو ہے تیری۔”

“بیاکوفی کیسی”

“اور جو کوئی دیکھ ہی لیتا”

“کون دیکھ لیتا”

“کوئی بھی دیکھ لیتا”

“تو پھر کیا”

“سارے گاؤں میں مساہور ہو جاتی یہ بات”

“ہوں مساہور کیسے ہو جاتی میں بھان چھو کا وہیں دم نکال دیتا گلا گھونٹ کر ....”

تاباں آنچل میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔

“نرا مورکھ ہے مورکھ”

“اچھا بھابی تم ہمیں ہمیش مورکھ کہتی ہو ــــــ کیا میرے ڈھاگ میں بالکل ہی بھس بھری ہے۔”

“بھئی اب تم سے بحث کون کرے اب جاؤ سو جاؤ۔ دیکھو یونہی بات کا بتنگڑ بنایا۔ باتوں باتوں میں مجھے کام بھی کھتم نہیں کرنے دیا .....”

“واہ جی وا ...... ہم نے اتنا کام کر دیا۔ ایک تو ہات بٹائیں دوسرے گالیاں بھی کھائیں ......”

“اچھا بھئی اچھا .... جا تیرا بھلا ہو .... تیری کھاٹ بچھا دی ہے میں نے جا کر سو رہو۔ صبح اُٹھ کر سانی وانی کرنی ہو گی پڑا خراٹے لیتا رہے گا دن چڑھے تک۔”

“نہیں بھابی جی چاہتا ہے آج تو رات بھر باتیں ہی کرتے چلے جائیں۔”

پالا سنگھ وہیں پھیل پڑا۔

“اب چلا بھی جا جو ماں کی آنکھ کھل گئی تو چلّانے لگے گی گاؤں بھر کو کھبر ہو جائے گی۔ ....”

اتنے میں چوکیدار نے ہانک لگائی “جاگتے رہو ہو ہو۔”

“نہیں بھابی ساتھ ساتھ چلیں گے اوپر .... اب کام ہی کیا ہے کھتم تو ہو گیا۔”

تاباں نے چپ رہنے ہی میں اپنی خیر سمجھی۔

پالی نے سارس کی سی ٹانگیں سمیٹیں اور بھابی کے قریب سٹکتے ہوئے بولا۔

“ہاں بھابی! کچھ اور بات سُناؤ۔”

“کیا بات ...... سُنا تو دیں سب”

“اچھا تو اب کے امبرسر کی دیوالی دیکھنے کا ارادہ ہے۔”

“لو اب پھر سے رامائن چھیڑ بیٹھے۔”

“نہیں بھابی جرا گَور تو کرو میں نے امبرسر کی دیوالی دیکھی ہی نہیں۔”

“ارے ہاں میں تو بھول ہی گئی۔ ہاں پالی تُو تو چھوٹا سا ہو گا تجھے امبرسر کی دیوالی یاد ہی کیا ہو گی۔”

“ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں۔”

"تو نے امبر سر تو دیکھا ہی ہو گا۔"

"اب کے آیا تو دیکھا، پہلے کا مجھے بہت اچھی طرح یاد نہیں تھا نا میں بہت چھوٹا تھا جب ماں مجھے دیبالی پر لے گئی تھی۔ پھر جب بڑا ہوا تو امبر سر دیکھا۔ امبر سر مجھے تھوڑا تھوڑا جاد تھا لیکن دیبالی بلکل نہیں جاد۔۔۔۔۔۔"

"ارے ہائے پھر تو نے کیا دیکھا۔ کیا باتیں بناتا ہے۔ دیبالی دیکھے گا تو پھر کہے گا۔ ایسی رونک ہوتی ہے ایسی رونک ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں۔"

"ہو ہو"

"بس رونک تو بیساکھی کی یا دیبالی کی دیکھے آدمی"

"اچھا۔۔۔۔۔ بھابی میلوں کی باتیں تو یاد ہیں مجھے۔۔۔۔۔ جب ہماری نہر کے پل سے سنگ گزرا کرتا تھا۔ ہائے میرے پاس گھوڑا ہوتا تو میں بھی اسے کوداتا ہوا جاتا سنگ پر۔۔۔۔۔۔۔"

"تو نے کالکتے میں رہ کر روپیہ بھی نہ کمایا۔۔۔۔۔۔"

"کمایا تو بھابی!۔۔۔۔۔"

"پھر؟"

"سب چٹ"

"تو گھوڑا کہاں سے آئے پھر" یہ کہہ کر تاباں ہنسنے لگی۔ "ہاں رے کیا تو نے سرنوں کی ماں سے کہا تھا کہ اب میں جین کھریدوں گا؟"

پالا سنگھ نے ذہن پر زور ڈالا۔

"او ہاں کہا تو تھا پہلے دن جب گیا نا تو۔۔۔۔۔۔ اچھا کیا کچھ کہتی تھی؟"

"پوچھتی تھی کہ پالی نے جین کھریدی کہ نہیں۔"

"پھر تو نے کیا کہا"

"میں نے کہا کھریدے گا۔۔۔۔۔"

پالی چپ سا ہو گیا۔

"کہنے لگی پاس والے گاؤں کے نمبردار کا لڑکا کپٹین ہو گیا ہے۔ چھوٹا سا تھا یونہی گھوما کرتا تھا۔ پھر سہر میں پڑھنے لگا پھر کپٹین ہو گیا اب سرکاری بردی پہنتا ہے اور سرکار کا تکمہ (تمغہ) لگاتا ہے۔"

"پر اس بات کا متبل کیا۔۔۔۔۔۔" پالی نے ماتھے پر بل ڈالے۔

"کیا جانیے کیا متبل تھا۔۔۔۔۔"

"اور یہ سور نمبردار کا لڑکا کون ہے"

"وہ وہ کیا بھلا سا نام ہے۔۔۔۔۔۔ پہ۔۔۔۔۔۔ پرتھی پال سنگھ"

"تو نے دیکھا ہے اسے"

"ہاں دو ایک بار دیکھا ہے۔۔۔۔۔۔ بڑا ہی کھب سورت ہے۔ کیا پیارا ناک نکشا ہے جیسے عورت۔۔۔۔۔۔"

پالی کو پرتھی پال سنگھ کی یہ تعریف پسند نہ آئی۔

"پر بھابی میں نے تو سنا ہے پرتھی پال سنگھ بڑا بدمعاش ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ عورتوں کو کھراب کرتا ہے۔"

”بانگو رو ہی جانے ...... شکل سے بڑا بھولا دکھائی دیتا ہے اور جب بردی پہنتا ہے تو کیسی سج دھج ہوتی ہے اس کی۔ ارے ہاں اسے کون پوچھے تھا یونہی بیکار ھرے تھا ...... اب جو آیا تو لوگ آگے پیچھے گھومتے تھے ......“

”چھوڑو بھابی اس منحوس کی باتیں ......“

”ارے تیرا اس سے کیا بیر ہے“

”بھابی تم ان پڑھے لکھوں کی باتیں نہیں جانتی۔ بڑے بدماش ہوتے ہیں یہ لوگ —— بس اُوپر کی ٹیپ ہی ہوتی ہے۔“

”جو ہو سو ہو ...... بچارے نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا۔ ہر کسی سے ہنس کر بولے۔ ایک بار میں ان کے گاؤں میں گئی تو وہ چھٹی گجار کر بھوج کو جا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو رک گیا۔ تم ہی سوچو کہاں اتنا بڑا آدمی اور کہاں میں ...... دونوں ہاتھ جوڑ کر پہلے اسی نے ست سری اکال کہی اور پھر ہنس کر بولا ’آپ کو جاد نہیں ...... ہم پہلے بھی ملے تھے کہیں‘ ہاں مجھے جاد تو تھا ...... پر پالی میں تو گھبرا گئی نا۔ میں چپ رہی۔ ’آپ سردار نرنجن سنگھ کے ہاں بیٹھی تھیں‘ —— ہاں ہاں مجھے اچھی طرح یاد تھا ...... بچارا مجھے آپ کہہ کر بلاتا تھا۔“

”تو کیا وہ نرنجن سنگھ کے ہاں بھی جاتا رہتا تھا۔“

”ہم نے تو ایک ہی بار دیکھا ہے یونہی کبھی کبھار آتا ہوگا۔ گاؤں میں جو کوئی نیا آدمی آئے تو پتہ چل ہی جاتا ہے نا“

”کیا اس نے بہت روپیہ کمایا ہے۔“

”ہاں سنتے ہیں ڈیڑھ ہجار تنکھا پاتا ہے“

”اجی ہاں اتنی تنخا تو لاٹ صاحب کی بھی نہیں ہوتی۔“

”اب بتاؤ میں کیا جانوں ان باتوں کو“

پرتھی پال سنگھ کا ذکر چھڑنے پر پالی ذرا کچھ سوچ میں ڈوب گیا۔ مبہم سائے اس کے ذہن میں گھومنے لگے۔ اسے اس بات کا تو علم بھی نہیں تھا، کہ وہ سرنوں کے ہاں بھی جاتا رہتا تھا اور نہ معلوم وہ بھی سرنوں سے شادی کرنا چاہتا ہو لیکن وہ شادی کیا کرے گا۔ پڑھا لکھا لپھٹین تو کسی میم کو پھانس لے گا یا کسی پڑھی لکھی لڑکی سے بیاہ رچائے گا جو گٹ مٹ گٹ مٹ کر سکے۔ بھلا سرنوں میں کیا دھرا ہے۔ صورت اچھی سہی لیکن ہے تو آخر دیہاتن کی دیہاتن۔

”کیا سوچ میں ڈوبے ہو“ بھابی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“

”نہیں کچھ تو ہوگا“

پالی کھرپے سے ساری بٹیں کر چکا تھا۔ اب وہ چوکے کی ننھی سی دیوار پر بڑے آرام سے چڑھ بیٹھا۔ پھر اس کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”اچھا تو تمہیں لپھٹین پسند آگیا ہے۔“

تاباں نے ماتھے پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا اور شرارت بھانپ کر تاؤ میں آگئی۔

”مجھے کیوں پسند ہوتا۔“

”خود کہہ رہی تھی نا“

”کہہ کیا رہی تھی ......“

پالی نے بات ٹوک دی

”یہی کہ بڑا کھب صورت ہے۔ ہنستا رہتا ہے تمہیں ’آپ‘ کہتا ہے اور راستے میں کھڑا ہو کر تم سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔“

"اور مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کیوں کرنے لگا"

"بھئی دل ہی تو ہے"

"دل کی کیا بات"

"اس نے دیکھا ہوگا کیسی پیاری لڑکی ہے ......"

"دُر"

"یہ ننھی ننھی پیاری پیاری چندھی آنکھیں ...."

"ہائے ......"

"ہائے کیا"

"تو اپنی صورت تو دیکھ"

"میری صورت کو کیا ہے"

وہ دونوں کبھی بالکل جاہل بچوں کی طرح لڑنے لگتے تھے۔ بھابی نے منہ چڑا کر کہا۔

"یہ لمبا بانس"

"برائی کیا ہے"

"بڑے بڑے کان ہاتھی کے سے"

"تجھ سے بھی بڑے؟"

"یہ بڑا منہ بیل کی طرح سر"

"اچھا جی؟"

"اور چلے محبت لڑانے"

"ہوں؟"

"کہاں سرنوں اور کہاں تم جُٹھّو وٹّے"

"بڑی سرنوں کی طرفدار آئی ہیں وہاں سے"

"ہاں نہیں تو میری سہیلی جو ہے"

"ہاں جی جیسا منہ ویسی چپت"

"منہ سنبھال کر بولو نا"

"کیوں سہیلی کی بے اجتی ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں"

"بڑی سہیلی تو دیکھو"

"کیسی پیاری ہے سرنوں جیسے ریشم کی لچھّی ...."

پالی نے منہ چڑا دیا۔

"ارے شرم کرو نامنہ چڑاتے جواب"

"ارے میں پروا نہیں کرتا کسی کی"

"اچھا جی!"

"ہاں جی؟"

"اور جو میری خوشامدیں کرتے رہتے ہو"

"کیا خوشامد کی میں نے"

"یہی کہ طادوں سرفوں سے ۔ اس کا دل تو ٹٹولو۔ ہائے میری شادی ہو جائے اس سے"

"میرے جوتے سے"

"اچھا پھر یاد رکھنا"

"یاد رکھیں گے"

"پھر نہ کہنا"

"نہیں کہیں گے"

"تم تو ناک رگڑو گے ناک"

"میں کسی سالے کے آگے ناک نہیں رگڑتا"

"اچھا یہ اکڑ ہے تو پھر دیکھ لینا"

"کیا"

"میری بھی بلا سے"

"منظور"

"اب تمہارے لئے کوئی کوشش نہیں کروں گی"

"نہ کرو لیکن ہم تو تمہارے لئے کریں گے"

"کیا متبل"

"یہی سفارش کریں گے"

"ڈیم"

"آنے دو لفٹین کو"

تاباں روہنگی ہوگئی۔

"کہوں گا ——— ہجور لفٹین صاحب، آپ ہی اس عورت کے مائی باپ ہیں اس کی چندھی آنکھوں کا دھیان نہ کیجئے۔ چھاتی چیر کر دل دیکھئے آپ کے پریم میں..."

"ہٹ کُتے بے شرم"

تاباں کی آواز بھرا گئی۔

"وہ کہے گا ——— مت رو مانو۔ مت رو میری کوتو ——— میں میم کے بدلے تجھے اپنے گھر لے جاؤں"

تاباں نے اسے مارنے کے انداز میں کھرپا اوپر اُٹھایا۔ پالی شکاری کتے کی طرح اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "نا میری لپھٹانی . . . . . پچ پچ . . . . . ."

تاباں آگے بڑھی وہ پیچھے ہٹا۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ پالی ایک دروازے سے ڈیوڑھی میں گھستا اور دوسرے میں سے نکل آتا۔ اس طرح آگے پیچھے اُنہوں نے تین چار چکر لگائے۔ پالی گھوڑے کی طرح ہنہنا کر ہنس رہا تھا اور تاباں کے رندھے ہوئے گلے سے گالیاں نکل رہی تھیں آخر تھک کر وہ چوکے کی دیوار پر بیٹھ کر خوب زور زور سے رونے لگی۔

سنداں جاگ اُٹھی۔ اُس نے کوٹھے پر سے جھانک کر دیکھا۔ "ارے کیا ہے"

پالی نے منہ اوپر اُٹھا کر دیکھا" ماں بھابی کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے"

سنداں نے نہ معلوم لینے کو بتانے کے لئے یا کیوں بڑے زور سے "باہگورو باہگورو" کا وِرد کیا اور پھر سیڑھیاں اُترنے لگی۔

ماں کے آنے سے پہلے پہلے پالی نے جھک کر بھابی کے پاؤں کے قریب ناک سے زمین پر تین چار لکیریں نکال دیں۔

چنانچہ تاباں نے ماں سے کچھ نہیں بتایا اور پھر ماں کی دی ہوئی اجوائن چپکے سے پھانک کر اُوپر سے دو گھونٹ پانی پی لیا۔

سیاستِ الٰہیہ

امام ابنِ تیمیہ کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف اس سے پہلے بھی ایک بار اس ادارہ نے ہی پیش کی تھی اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی تھی کہ صرف دو مہینے کے اندر اندر پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔

اس کتاب میں قرآن اور احادیث کی روشنی میں زندگی کے ہر شعبہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حاکمانِ وقت کے فرائض رعایا پر اور رعایا کے فرائض حاکمانِ وقت پر، پوری تفصیل سے درج ہیں۔

قیمت ۲/۸/-

ہماری داستانیں

اردو ادب کی سب سے دلچسپ صنف ہماری قدیم داستانیں ہی ہیں جو ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان داستانوں سے ہر شخص لطف اندوز ہوا ہے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک نے اگر کوئی داستان شروع کر لی ہے تو دن رات لگا کر اسے ختم ہی کیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نے اسے بیچ میں چھوڑ دیا ہو۔ اتنی دلچسپ صنفِ ادب کے بارے میں اب تک کوئی کام کی تنقیدی کتاب نہ تھی۔ اس تصنیف سے نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں داستان کا خلاصہ کیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کا ادب میں کیا مقام ہے اور کیوں؟

قیمت ۵/-/-

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

ہاون شرے کا سٹیشن

حجاب امتیاز علی

میں ناگپوری سے کیباس جا رہی تھی کہ رستے میں ہاون شرے کے ویران سے سٹیشن پر گاڑی یکایک رُک گئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جس پل پر سے اُسے گزرنا تھا وہ بارشوں کی وجہ سے مخدوش حالت میں ہے چنانچہ ٹرین یہاں تین چار گھنٹے ٹھہری رہے گی۔

وہ برسات کی ایک رات تھی۔ اُس وقت بھی دھواں دھار بارش ہوئے جا رہی تھی۔ بجلیاں فلک شگاف انداز سے کڑک رہی تھیں۔ بادل د درندوں کی طرح گرج رہے تھے اور طوفانی ہوائیں کسی ناکام تمنا کی طرح سسکیاں بھر رہی تھیں۔ رات کے دو بجے تھے۔ اور ابھی کئی گھنٹے گاڑی کے چلنے کی نہ تھی۔ مسافر پریشانی کے عالم میں اپنی اپنی کھڑکیوں میں سے سر نکالے باہر کی شرابور تاریکی کو جھانک رہے تھے۔ پانی اکتا دینے والے تسلسل سے برسے جا رہا اور رات کے سناٹے میں ہاون شرے کے چھوٹے سے ویران سٹیشن کی دقیانوسی لالٹین تاریکی پر گیلی روشنیوں کے پھیلے ہوئے دھبے ڈال رہی تھی۔ اس ق کے حالات اور ماحول سے میرے اعصاب سخت متاثر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دستی بٹوہ کھول کر سکونِ اعصاب کے لئے پہلے تو میں نے ایک اعصابی گولی کھا پھر یوڈی کولون سونگھا۔ اور سوچنے لگی کہ کیا کروں! زلفی کے ہاں جانے کا خیال دو ایک دفعہ ضرور آیا مگر طوفانِ باد و باراں ہمت پست کر دیتا تھا۔

جب بارش کی ٹپ ٹپ کچھ کم ہوئی تو مجھے پھر زلفی کا خیال آنے لگا اور سوچنے لگی کہ گاڑی تین چار گھنٹوں کے لئے ٹھہری ہے تو زلفی سے ضرور مل لینا چاہئے اس کا گھر سٹیشن کے قریب ہی ہوگا کیونکہ اس کا شوہر ہاون شرے کے سٹیشن پر انجن ڈرائیور تھا۔ جی ہاں انجن ڈرائیور ——— ! شاید آپ چونک پڑیں مگر یہ واقعہ ہے میری سہیلی کا میاں انجن ڈرائیور ہی تھا۔ یہ سب کچھ اس کے دلِ دیوانہ کی کرتوت تھی۔ ہوا یوں ——— کہ میری سہیلی زلفی ایک مشہور اور کامیاب مصوّرہ تھی۔ ا کے تصویر خانے میں اس کے کئی "ماڈل" آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ زلفی ایک نامعلوم شخص کو اچانک اپنا دل دے بیٹھی جو گزشتہ چند ہفتوں سے ا کا ماڈل بنا ہوا تھا۔ بعد میں تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ انجن ڈرائیور ہے۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مرض لاعلاج ہو گیا تھا۔ اس زلفی کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ صبر کی سِل سینے پر دھر لیں۔ تاہم اس عظیم طبقاتی امتیاز نے دوستوں اور زلفی میں بتدریج نامعلوم خلیج حائل کر دی۔ میں بہ حیثیت ایک افسانہ نگار عورت ہونے کے اس سانحے کو ذاتی طور پر رومانوی نقطۂ نظر سے ضرور دیکھتی اور قابلِ معاف بھی سمجھتی

تاہم زلفی جیسی اعلیٰ درجے کی مصوّر خاتون کو ایک غیر شاعرانہ پیشے کے آدمی کے ساتھ وابستہ دیکھ کر مجھے سخت روحانی اذیت ہوتی تھی۔

اس واقعہ کو چھ سال گزر چکے تھے۔ پانچ سال تو ان محب و محبوب نے مل کر خدائے محبت کے آگے مسلسل سجدے کئے مگر تقریباً ایک سال پیشتر مجھے زلفی کا ایک خط ملا تھا جسے پڑھ کر میں انگشت بہ دنداں رہ گئی تھی۔

"روحی پیاری

بہاریں گزر چکیں۔ یہ خزاں کا دور ہے۔ پانچ سال مسلسل دمکنے کے بعد اب ہمارے ارمانوں کا چاند ہمیشہ کے لئے ڈوبنے کو ہے۔ دو مہینوں کے غور و فکر کے بعد میں نے اور راہی نے مل کر فیصلہ کر لیا ہے کہ اب ہمیں طلاق لے لینی چاہئے کیونکہ اب یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ یہ بات افسوسناک ضرور ہے مگر چونکہ حقیقت یہی ہے اس لئے اس پر زیادہ ماتم کرنا فضول ہے۔ راہی سے جدا ہونے کے بعد کیا اس میں میں اپنا نگار خانہ قائم کروں گی اور زندگی فنکاری کے جنون میں گزار دوں گی تم سمجھ سکتی ہو کہ پانچ سال کی کامیاب عشقیہ ازدواجی زندگی کے بعد یوں دفعتاً ہمارا ایک دوسرے سے جدا ہونا کس قدر المناک ہے جبکہ ہمارے دو بچے بھی ہیں۔ مگر موجودہ حالات نے ہمیں جدا ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

محرومِ محبت زلفی۔

مزید:۔ ہماری طلاق کی کوئی معیوب وجہ نہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ بلا وجہ ہی ہم اس پر مجبور ہیں۔ ملاقات ہوئی تو تفصیل سناؤں گی۔

ز"

مجھے خط کا آخری حصہ بے حد پُراسرار اور پیچیدہ سا معلوم ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں انجن ڈرائیوری کے پیشے کو بددعائیں دینے لگی۔ کہاں محبت جیسی رنگیلی چمکیلی چیز۔ اور کہاں انجن کا کالا دھواں ——!

چھ سال پہلے ہم سب نے ملکر زلفی کو کتنا سمجھایا تھا کہ دیوانی! باز رہ ——! اب اپنے کئے کی سزا بھگت رہی ہے۔ کہاں وہ اعلیٰ محفلوں کی باذاق لڑکی۔ اور کہاں ——" میں نے دانت پیستے ہوئے بڑبڑا کر اپنے آپ سے کہا۔

برسات کی اس ہولناک کالی رات میں جب میں اپنے رفیقِ سفر ایک سیاہ رو سیامی بلّے کو اونی شال میں لپیٹے ہوئے گاڑی سے ہاون شرے کے ویران سٹیشن پر اتری تو آسمان پر ساون کے موٹے موٹے بادلوں کے درمیان لمحہ بھر کو ایک بہت بڑا سا تارا جھلمل کرنے لگا جسے دیکھ کر میں مسکرا پڑی کیونکہ اب بارش کا زور ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اور سمندری حواصلیوں کی قیں قیں بھی کم ہو گئی تھی۔

تھوڑی سی کد و کاوش کے بعد جب میں زلفی کے دروازے پر پہنچی تو سوچنے لگی وہ یہاں ہوگی بھی!! اگر ہوئی تو اتنی طویل مدت بعد —— میں اس سے کیونکر آنکھیں چار کر سکوں گی؟ میں نے اس کے خط کا جواب تک نہ دیا تھا اور وہ شادی کے بعد میرے کنارہ کش ہونے کو محسوس بھی کرتی رہی ہے!

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ بند دروازوں کے اندر سے نہایت سریلی آواز میں لوری کی لے مجھ تک پہنچی۔ آن واحد میں میں زلفی کی گوش آشنا قدیم آواز کو پہچان گئی۔ میں نے سوچا غالباً انجن ڈرائیور سے قانونی جدائی ہونے کے بعد تنہائی میں وہ یوں اپنی شبِ غم گزارتی ہوگی۔ آہ بے وقوف لڑکی ..... جس نے گہر عشق کی خواہش کے دھوکے میں اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے اپنی دو انگلیاں بجائیں۔

لوری کی لے ختم ہو گئی۔ اور اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

میں نے ہمت کر کے کہا: "میں ہوں زلفی۔ میں —— روحی"

دروازہ کھل گیا۔ اور میں اندر داخل ہوئی، سب سے پہلے میری نظر ایک پالنے پر پڑی جس میں ایک شیر خوار پڑا عالم خواب میں مسکرا رہا تھا۔ بچّے کی مسکراہٹ نے اندھیرے در و دیوار پر ایک نور سا پھیلا دیا تھا۔

زلفی مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئی دُور پر کسی مہجور حواصیل نے زور کی چیخ ماری۔ دو لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو بُت بنی تکتی رہیں نجانے ماضی کی کتنی عجیب

داستانیں نامعلوم طور پر حافظے میں بے چین ہو گئی تھیں۔ وہ ہم مکتبی کے سنہرے دن ——— وہ کیباس کے چمکیلے ساحل ——— وہ دن وہ راتیں!

پھر جب وہ بولی تو اس کی آواز میں ایک درد انگیز طنز تھا۔ "اس کال کوٹھڑی میں تم کیسے آگئیں روحی؟"

گویا وہ ابھی بھولی نہ تھی کہ اس کی شادی کے موقع پر میں نے جل کر اس سے کہا تھا:۔ اس شخص سے محبت کر کے تمام عمر تم انجن کے دھوئیں میں دم بخت ہوتی رہو گی گویا کال کوٹھڑی میں ———!"

ابھی میں نے زبان بھی نہ کھولی تھی کہ اس نے دوسرا وار کیا:۔ "میرے پاس تو تمہارے قابل کوئی نشست بھی نہ ہو گی میری پیاری۔"

"کیا بکتی ہو ———" میں نے شرمندگی کے لہجے میں کہا۔ پھر اپنے سیامی بلّے کو آگ کے پاس چوکی پر دھر دیا اور بولی: "کوئی بچھڑے ہوئے دوست سے یوں سوکھے منہ ملتا ہے زلفی؟ تم نے رسمِ اُلفت ہی بھلا دی۔" زلفی نے ایک آہ سرد بھری اور بولی:ـ

سب نے چھوڑا مجھے مگر حسرتؔ!
درد کی غمگساریاں نہ گئیں

جو جگہ بھی تم مناسب سمجھو بیٹھ جاؤ روحی۔ نیز روشنی لے آؤں طوفان کی وجہ سے بجلی خراب ہو گئی ہے۔"

اور جب زلفی موم بتی لینے اندر گئی تو میں خاموشی سے بیٹھے بیٹھے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

مختصر سا کمرہ۔ سامان آسائش کا فقدان۔ اس کے باوجود مصوّرانہ سلیقہ ہر طرف سایہ فگن۔ مثلاً خوبصورتی کی اور کوئی چیز نہ تھی تو کیا ہوا ——— دریچے میں جو گل دان رکھا تھا اس میں ایک بیل نما ٹہنی اس انداز سے دیوار کی طرف لٹک رہی تھی جیسے رخسار پر لمبے لمبے آنسو بہ رہے ہوں۔ یہ طرزِ فکر ایک فنکار ہی کا ہو سکتا تھا۔ اور میرے سوا اسے دیکھ کر یوں شاید کوئی اور محسوس بھی نہ کرتا۔ مگر میں زلفی کے انقلابِ زندگی سے کما حقہٗ واقف تھی۔ کمرے میں آگ جل رہی تھی آتش دان کے اوپر عین درمیان میں ایک بڑی روغنی تصویر رکھی تھی جس میں ایک بے حد طرحدار سجیلا اور شکیل آدمی شکاری لباس میں کھڑا ایک ادا کے ساتھ پائپ پی رہا تھا۔ آپ کو علم ہے۔ میری تمام عمر کہانیاں سوچنے اور لکھنے میں گزر گئی۔ بندوق اور شکار جیسے مشاغل سے میرا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ شکاری لباس مجھے ہمیشہ غیر شاعرانہ ہونے کی وجہ سے ناپسند رہا۔ مگر یہ تصویر اعلیٰ مصوّری کا نمونہ تھی اور اس حسین مرد پر یہ لباس ایسے سجتا تھا جیسے چہرۂ گل پر قطراتِ شبنم۔ لہٰذا میں بے حد متاثر ہو گئی اور بے اختیار اس حسن کی پرستش میں محو ہو گئی۔

زلفی کے واپس آتے ہی میں نے پوچھا:۔ "یہ تصویرِ حُسن کس کی ہے؟ اس کی قاتلانہ مسکراہٹ تو دیکھو! کمبخت نے اس اندھیری رات کو روشن کر رکھا ہے۔"

زلفی نے نجانے کیوں مڑ کر مجھے دیکھا۔ پھر بولی "تمہیں پسند آئی روحی؟"

"کس باذوق کو پسند نہ آئے گا ایسا حسن! اگر تم دوزخ کے ڈرائینگ روم میں اس تصویر کو لگا دو تو وہ جگہ خلدِ بریں کہلائے گی۔" میں نے تصویر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

زلفی بے حد متاثر نظر آنے لگی پھر بولی:۔ "یہ میرا تصوّری آدمی ہے روحی، خواب کے جزیروں کی کامنی کہانیوں میں ——— اور شام کے رنگین شفق زاروں میں ہم ایک دوسرے سے ملتے اور محبت کرتے ہیں۔ یہ تصویر میں نے کھینچی تھی ——— تاریخ تو یاد نہیں مگر اسے کئی سال ہو گئے ہیں۔"

میں مخمور سی ہو رہی تھی بولی:۔ "نجانے بعض کوڑھ مغز یہ کیوں کہتے ہیں کہ "فن برائے فن" نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ فن کا کوئی افادی مقصد ہونا چاہئیے۔ فن کا سب سے بڑا اور پہلا مقصد یہی ہونا چاہئیے۔ کہ آدمی اسے دیکھ کر ایک سکون محسوس کرے۔ یہی فن برائے فن ہے' کہ فن کے ذریعہ بنی نوع انسان میں سکون اور اطمینان روح کا احساس پیدا ہو۔ تم اب تک تصویریں اتارتی ہو زلفی! ہائے۔ کہاں وہ تمہاری فنکارانہ زندگی۔ وہ مصوری کا عروج۔ وہ تمہارے نگار خانے کی شہرت۔ اور کہاں یہ یہ ——— یعنی یعنی۔" میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

زلفی مسکرائی: "یعنی یعنی سے تمہارا مطلب ہے کہاں وہ شہرت و دولت اور کہاں یہ مختصر سا غریبانہ وضع کا کمرہ؟ یہ پالنے میں پڑا؟ انجن ڈرائیور

بچہ ——— اور ———"

میں اس موضوع سے بے چین ہو گئی اور قطع کلام کر کے بولی ۔ "تمہارا خط مجھے مل گیا تھا زلف ......"

مگر وہ بات کاٹ کر بولی : " مگر تم اونچے طبقے کی خاتون تھیں ——— ہزاروں مصروفیتیں ——— اور پھر خط گیا بھی ہاون شرے سٹیشن جیسی گمنام جگہ سے تھا ——— جہاں کوئی اعلیٰ محفلوں کی خاتون رہنا کبھی پسند نہ کرے ۔ ان صورت حالات میں بھلا تم کیونکر جواب دے سکتی تھیں روح ؟"

میں شرمندہ سی ہو کر جھجکتی ہوئی بولی :۔ " مگر میں جواب بھی کیا دے سکتی تھی زلفی ؟ تمہارا خط اتنا دردناک اور مایوسانہ لہجے کا تھا کہ ہم سب کو ——— یعنی ہماری م سہیلیوں کو بے حد صدمہ ہوا تھا ۔ پھر ان حالات میں کوئی تمہاری مدد بھی بھلا کیا کر سکتا تھا ؟ زبانی جمع خرچ کا فائدہ ؟ مگر زلف پیاری ، مجھے علم تھا کہ ایک دن تم پر کوہ الم ٹوٹ پڑے گا ۔ کیونکہ طبقاتی امتیاز بہت بڑی چیز ہوتا ہے میری پیاری ۔ تم جیسی اعلیٰ پیمانے کی مصوّر کو کسی مشہور شاعر ۔ کسی نقاش ۔ کسی مصنّف کسی انٹلکچوئل عاشق ہونا چاہئیے تھا نہ کہ ——— .."

" ایک مفلس آدمی پر ——— جس پر عاشق ہونا تمہاری اونچی سوسائٹی میں ناقابل معافی گناہ سمجھا جاتا ہے ۔" یہ کہہ کر زلفی عجیب تلخی سے ہنس پڑی ۔ پھر لی : " اگر میں چاہتی تو اب بھی کیباس میں اپنے نگار خانے کے مقابل اسی قدیم عالیشان کوٹھی میں رہ سکتی تھی روحی ۔ مگر میں نے ہاون شرے کے ویران یشن ہی کو اپنی سکونت گاہ بنایا اس لئے کہ پھر راہی تنہا رہ جائے ۔ محبت ہمارے لئے ویرانے میں بھی محفلیں منعقد کرتی ہے روحی !"

میں مچل کر بولی : " تمہارا خیال اور ہمارا یہ فقرہ قابل داد ہے زلفا ۔ تم نے بالکل سچ کہا ۔" یہ کہتے کہتے میری نظریں بے اختیار اسی تصویر حُسن پر جم گئیں ۔ اس طوفانی رات کو بھی شام بہار بنا رہی تھی ۔ میں دل ہی دل میں زلفی کی مصوّرانہ تخیل پرستی اور جمیل خیالی کا لوہا مان گئی ۔ مگر ماتم اس بات کا تھا کہ واقعیت اسی نے ایک غیر شاعرانہ آدمی سے محبت کر کے اپنی بدذوقی کا ثبوت مہیا کیا تھا ۔

" خیالی حُسن کو رنگ اور برش سے مزین کرنا آسان کام نہ تھا زلف ——— !" میں پھر اس تصویر کی بیساختہ تعریف کرنے لگی : " واقعی تم ایک عظیم فنکار ہو ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم خود آزاری پر آخر کیوں تل گئیں ! ہم سب نے کتنا تمہیں سمجھایا تھا ۔" (میرا غصہ بڑھنے لگا) :۔ " مگر تم ——— نجانے تمہاری عقل گھاس نے گئی تھی یا تم پر کیا افتاد پڑ گئی تھی ——— اب بتاؤ حالات کس منزل پر ہیں ؟ آخر کیباس واپس آ کر نگار خانہ کیوں نہیں دوبارہ کھول دیتیں ؟ طلاق کے بعد سی گزر رہی ہے ؟"

اسی وقت پردے کے پیچھے سے ایک اور بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ اُدھر بھاگی ۔

میں چونک پڑی :" ارے یہ تم نے کہاں کہاں چھپا رکھے ہیں ؟ تمہاری تصویر کشی کی مصروفیت میں یہ چیخ و پکار حارج نہیں ہوتی ؟" ——— مگر میں نے کر دیکھا تو پالنے میں پڑا ہوا شیر خوار مجھے اپنے چہیتے سیامی سیاہ رو بلّے سے بھی زیادہ پیارا معلوم ہونے لگا ۔ اس وقت مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا کہ انسانی چہ مادر فطرت کی تصویر کشی کا بہترین شہ پارہ ہے ۔

اتنے میں زلفی قہوے کی پیالی لے آئی اور کہنے لگی : " میرا جی تو چاہتا تھا روحی کہ تمہیں مائیکل انجیلوں کی تصویروں میں قہوہ پلاؤں مگر کیا کروں اس سیدھی سادی پیالی ی کو لے آنا پڑا ۔"

میں نے پیالی فوراً لے لی اور اسے بغور دیکھ کر کہا :۔ " یہ بھی تمہاری مصوّری کا ایک کمال ہے یہ پیالی ۔ ہائے زلفی ۔ تمہاری یہ صلاحیتیں دیکھ کر مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے ۔ اس کا اندازہ تم نہیں لگا سکتیں ۔ اچھا بتاؤ طلاق کے بعد تم پر کیا گزری ؟"

وہ میرے قریب بیٹھ گئی ہنس کر بولی :۔ " بڑے مزے سے گزر رہی ہے روح ۔"

میں جھنجلا گئی :۔ " سنجیدگی سے اپنے مصائب بیان کرو ۔ قہقہہ لگا کر اپنی مصیبتوں کا ذکر کرنا دماغی توازن کے خلل کی دلیل ہے ۔ جو واقعہ بھی بیان کرو اس سے تعلق صحیح جذبے کے ساتھ کرو ۔ اگر میں کوئی [illegible] بیان کر رہی ہوں ؟"

دراصل میں اس وقت دل ہی دل میں زلفی کی ایک، دُود آلود انجن ڈرائیور سے شادی کر لینے کی حرکت پر مشتعل ہو رہی تھی۔ میرے پاس اس کی یہ حرکت قابلِ معافی نہ تھی۔ مجھے اپنی محبوب سہیلی کی اس اچانک بے وقوفی سے کس قدر ذہنی دھچکا پہنچا تھا یہ میں ہی جانتی تھی۔ میں نے یہ خبر سُن کر ہیبتوں برومائڈ کی گولیوں پر گولیاں کھائی تھیں اور نجانے یوڈی کولون کی کتنی شیشیاں سکونِ اعصاب کے لئے سونگھ سونگھ کر ختم کر ڈالی تھیں۔

وہ پھر ہنس پڑی: ”میں خوب جانتی ہوں روحی۔ تم مجھ سے سالہا سال سے متنفر ہو۔“

میں بولی: ”تم سے نہیں۔ تمہاری بدذوقی اور غیر شاعرانہ حرکت سے! نجانے تمہاری جمالیاتی حِس کو کیا ہو گیا تھا دیمک چاٹ گئی تھی یا کیڑا لگ گیا تھا؟“

زلفی مسکرا کر بولی: ”جراثیمِ عشق نے محبت کی دِق میں ———“

مجھے بہت ہی ناگوار معلوم ہوا بولی: ”بے موقع مذاق جنون ہے۔ عقل و ہوش کے ناخن لو۔ تمہیں شادی یا محبت کرنا ہی تھی تو بیسیوں آدمی موجود تھے۔ مثلاً وہ خوبصورت فوجی۔ کیا نام تھا اس کا؟ ——— شہباز یا منیر؟“

”منیر“ اُس نے یاد دلایا۔

”ہاں منیر۔ وہ محض فوجی نہ تھا۔ وہ انٹلکچیول تھا ———“

وہ ہنس پڑی: ”بے شک۔ یہ بات اس کی نکٹائیوں اور اس کے جام پینے کے انداز سے ظاہر ہوتی تھی کہ وہ انٹلکچیول ———“

میں جھنجلا کر بولی: ”اور ہنسی میں ٹالو۔ میں کہتی ہوں منیر تمہارا ہم مرتبہ آدمی تھا۔ آج تم کس ٹھاٹھ کی زندگی کیباس میں بسر کر رہی ہوتیں! یہ ہادن شرے کے سٹیشن پر تو نہ پڑی ہوتیں اس طرح۔“

وہ سنجیدگی سے بولی: ”لیکن روحی۔ اگر جنت جہنم میں بھی ہو تو وہ جنت ہی ہوتی ہے۔ ہادن شرے کا سٹیشن ———“

مجھے غصہ آگیا: ”تمہاری الٹی منطق نہ میری سمجھ میں آئی ہے نہ آئے گی۔ اب اپنے کئے کا نتیجہ دیکھ لیا یا نہیں؟“

”دیکھ لیا روحی“ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی مجھے آگ لگ گئی: ”یہ بے وقت کا مسکرانا بند کرو زلفی۔ یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ جلد جلد اپنے حالات سناؤ۔ تمہاری بے موقع ہنسی اور شگفتگی سے مجھے تمہارے خللِ دماغ کا شبہ ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے سکونِ اعصاب کے لئے یوڈی کولون سونگھنا شروع کر دیا۔

وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی: ”تم نے اخباروں میں دریائے شون پر سے گزرنے والی ایکسپریس کا حادثہ پڑھا تھا روحی؟“

”کیا بے تعلق باتیں کرتی ہو۔ ہاں پڑھا تھا۔ چھ مہینے کی پرانی بات ہے۔ ٹرین کا خوفناک حادثہ تھا۔ پر اس سے تمہارا کیا تعلق؟“

”یہ حادثے عجیب ہوتے ہیں روحی ———“ وہ مسکرا کر بولی۔

”افسوس! تمہارے دماغ میں فتور واقع ہو چکا ہے ——— ورنہ یہ وقت حادثات کی نفسیاتی وجہ بیان کرنے کا نہ تھا ——— دو گھنٹوں میں صبح ہو جائے گی اور میری گاڑی کا وقت ہو جائے گا۔“ یہ کہتے کہتے میں مارے خوف و دہشت کے اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

زلفی بولی: ”میں تمہیں اپنے حالات سنا رہی ہوں اور تم مجھے مجنون سمجھتی ہو۔ بیٹھو تو ———“

”مگر اس حادثے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ میں نے اکتا کر کہا۔ پھر سکونِ اعصاب کے لئے تصویرِ حسن کو دیکھنے لگی۔ زلفی کی مصورانہ ذہنیت کا یہ حسین خدوخال کا آدمی برسات کی اس اندھیری رات کو کس قدر رومان انگیز بنا رہا تھا!

زلفی سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی: ”میں نے اپنے خط میں طلاق کا ذکر کیا تھا۔ اس خط میں میں نے مختصراً سب کچھ لکھ دیا تھا کہ پانچ سال ہم نے سرزمینِ عشق پر کس والہانہ طریق پر عشرت کی زندگی بسر کی تھی۔ بہاروں میں میں کیباس چلی جاتی اور تصویر کشی میں مصروف رہتی، ابتدائی خزاؤں میں راہی کے پاس ہادن شرے چلی آتی۔ زندگی کے دن عید اور راتیں شبرات تھیں مگر ایک سال کا عرصہ ہوا کہ کتابِ زندگی کا المیہ باب دفعتاً شروع ہو گیا۔“

میں انتہائی دلچسپی سے پوچھنے لگی: ”کیسے اور کیونکر؟“

"اس کا مجھے خود علم نہیں رہی۔ ایک دن راہی پانی میں شرابور گھر پہنچا۔ اسے انفلوئنزا ہو گیا شدید قسم کا۔ اور جب وہ تندرست ہوا تو وہ بالکل ایک نیا آدمی تھا۔ پھر وہ بتدریج بدلتا گیا۔ اپنی عادات اپنے خیالات میں بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مجھے ایک بالکل مختلف آدمی معلوم ہونے لگا۔ آخر وہ اس حد تک بدلا، اس حد تک بدلا کہ اس کے ساتھ رہنا ناممکن نظر آنے لگا۔"

"وجہ کیا تھی ——؟ کوئی دوسری عورت؟" میں بے چین ہو کر بولی۔

"نہیں۔ کام کی شدّت۔"

میں بولی: "یہ تمہاری تشخیص غلط ہے۔ یہ بتاؤ اس کے بدلنے کی نوعیت کیا تھی؟"

"وہ چڑچڑا اور مایوس سا رہنے لگا۔ دن رات کی شدید محنت کی وجہ سے اس پر افسردگی و اضمحلال کے دورے پڑنے لگے اور وہ مجھ سے کھنچتا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ شب و روز کی محنت نے اسے بوکھلا دیا تھا۔"

میں نے حقارت سے شانے سکوڑے: "محبت آدمی میں کام کرنے کی بے انتہا توانائی اور صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ اکتاہٹ یا افسردگی پیدا نہیں کرتی۔ یہ تمہارا خیال غیر علمی ہے۔ راہی کی کشیدگی کی کوئی اور وجہ ڈھونڈو۔" میں سوالیہ انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولی: "جو کچھ بھی تھا۔ بظاہر تو اس کی کشیدگی اور افسردگی کی یہی وجہ نظر آتی تھی۔ ورنہ ہم میں کوئی نیا اختلاف نہ پیدا ہوا تھا۔ دن بدن اس کی طبیعت کا انتشار بڑھتا گیا۔ جھنجلاہٹ اور لڑائی جھگڑے کا رجحان ——"

"جس قسم کے ماحول میں وہ پلا اور بڑھا ہو گا ——" میں فکرمندی کے ساتھ کچھ کہنے کو تھی۔

زلفی نے قطع کلام کیا: "نہیں نہیں —— اتنی دور جانے کی تکلیف نہ کرو۔ وہ بیچارہ ——"

میں بولی: "میں اس پر کوئی اندازہ تو نہیں کس رہی تھی۔ میں اپنی عادت کے مطابق اس کے بچپن میں جا کر موجودہ حالات کی بے عنوانیوں کی وجہ دریافت کرنا چاہتی تھی کہ شاید کوئی ذہنی کشمکش نکل آئے۔ ...... خیر تم سناؤ۔" یہ کہہ کر میں نے جھک کر اپنے سیامی بلّے کے اونی کنٹوپ کے بند کھول دیے۔ کیونکہ آگ کی تمازت زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ بلّے نے ایک جمائی لی۔ ہم دونوں کو غور سے دیکھا پھر ایک دائرے کی شکل میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

زلفی نے اپنی داستان جاری رکھی: "اسے نہ بچوں سے پیار باقی رہا نہ مجھ سے دلچسپی۔ جنون تھا تو صرف انجن کھول کر پرزے دیکھنے کا تھا تمام وقت اس میں لگا رہتا ——"

میں بولی: "اس قسم کا جنون بعض ڈاکٹروں کو بھی ہو جاتا ہے —— وہ اچھے بھلے انسانوں کا پیٹ چیر کر اندر دیکھتے رہتے ہیں ——" ان کے لئے انجن اور شکمِ انسان ایک ہی چیز ہے۔"

وہ بولی: "آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم نے علٰحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا رو جی۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تمہیں دراصل اپنے خوابوں کا ہیرو چاہئے تھا۔ اس قسم کا! نہ کہ —— انجن۔"

زلفی نے نظر اٹھا کر تصویر کو دیکھا پھر ذرا مسکرا کر بولی: "اس قسم کا؟"

میں چونکی: "خیر۔ اتنا حسین اور ایسا بانکا نہ سہی۔ اس سے کچھ کم تو ضرور مل جاتا۔"

زلفی کہنے لگی: "علٰحدگی کے تصفیہ کے بعد بھی تعلقات میں کوئی خوشگواری پیدا نہیں ہوئی۔ زندگی کی وہ تاریخی رات میں کبھی نہ بھول سکوں گی روجی۔ اس یادگار رات کو میں اپنے سفرِ حیات کا انقلابی موڑ کہتی ہوں۔ وہ وہ رات تھی جس کی صبح ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا تھا اس رات راہی کو ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اور مجھے اپنا سامان سفر تیار کرنا تھا اور زندگی کی ایک بالکل اجنبی منزل پہ گامزن ہونا تھا۔ کیونکہ میرا ارادہ طلاق کے

بعد کیباس جاکر نگار خانے میں قیدیوں کی سی زندگی گذارنے کا تھا خیر - راہی اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا - وہ مطلقاً متاثر نہ تھا - جانتا تھا کہ آنے والی صبح ہمیں ہمیشہ لئے ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنا دے گی - مگر وہ حسب معمول چڑچڑا اور متنفر ہی رہا - اُس وقت میں قائل ہوگئی کہ ہمارا فیصلہ درست تھا - ہمیں ایک دو سے فوراً جدا ہونا اور طلاق لے لینی چاہیئے ۔"

وہ اچانک چپ ہوگئی - شدت احساس نے شاید اس کا گلا گھونٹ دیا تھا - وفور جذبات نے شاید اسے مفلوج سا کر دیا تھا - میں خود متاثر اور یوڈی کولون سونگھنے اور اپنے اعصاب کو سکون دینے لگی ۔

باہر طوفان باد و باراں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا —— اور اندر کمرے میں جذبات و احساسات کی تند آندھیوں نے ہمیں کسی برق زدہ کی طرح ویران اور مغموم بنا رکھا تھا - بارش پھر سے شروع ہوگئی تھی - بادل گرج رہے تھے اور سمندری پرندے آہ و بکا میں مصروف تھے ۔

"پھر —— ؟" میں نے دوبارہ یوڈی کلون سونگھتے ہوئے کہا ۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "نجانے میں اتنی متاثر کیوں ہوگئی - حالانکہ وہ وقت اب گزر چکا ہے - روحی تم زندگی کی سچی کہانیاں لکھنے کی شوقین ہو - اگر اس آخری رات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکو تو میں تمہاری سحر نگاری کا لوہا مان لوں ——"

"کوشش کروں گی - اچھا پھر؟"

"مختصر یہ کہ اس نے سوکھے منہ سے مجھے خدا حافظ کہا اور دروازہ کھول کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا - گویا میری زندگی سے باہر نکل گیا —— شاید تم اسے میری دیوانگی کہو - مگر روحی - سچی بات یہ ہے کہ باوجود اس طرز عمل کے مجھے اس سے محبت تھی اس کی جدائی کا صدمہ تھا - اس کے جانے کے بعد میں اکیلے گھر میں سے لپٹ کر رونے لگی - کیا کرتی روحی؟ مجھے راہی سے محبت جو تھی ——"

میں بڑی جذباتی سی عورت ان برسات کی اس پُر شور خوفناک رات میں متاثر ہوگئی اور لرزاں لہجے میں بولی: "آہ محبت - یہ ظالم محبت! میں اس پہ ایک اور بسیط مضمون لکھنے ہی والی ہوں زلفی - اچھا پھر؟"

زلفی بولی: "وہ شعر سنا ہے؟ ؎

شبِ ہجراں کے جاگنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی!

مگر میں چاہتی تھی کہ سحر نہ ہو - کیونکہ یہ سحر میرے لئے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی طویل شب غم ثابت ہوتی - داستان کا دوسرا باب اہم اور دلچسپ ہے کہانی کی معراج یہی ہے - غور سے سنو روحی - دوسرے دن راہی کو صبح چھ بجے کی ٹرین سے واپس آنا تھا - مگر وہ دس بجے تک نہ آیا - میں وفور مسرت سے بے خودی ہو رہی تھی - مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ راہی محض اس لئے واپس نہیں آنا چاہتا کہ اسے میری علحدگی منظور نہیں - میں سوچنے لگی کیا معلوم —— وہ شام کو آئے اور تجدید محبت کرے - اپنی خطاؤں کی معافی مانگے - صبح کا گیا شام کو واپس آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے - میں ان ہی خوشگوار حالات میں مدہوش تھی کہ دروازے پر کسی نے آواز دی - میں وفور شوق سے اُدھر بھاگی - وہاں راہی کی بجائے ایک ریلوے کا چپراسی کھڑا تھا - اس نے مجھے دریائے شون کے پُل کے حادثے کی ہولناک خبر سنائی - میرے خرمن آرزو پر بجلی گر پڑی - اخبار اُٹھا کر دیکھا تو اس میں بہت بڑی سرخی کے نیچے لکھا تھا کہ رات کے ڈیڑھ بجے شون ایکسپریس دریائے شون کے پل پر سے گزر رہی تھی کہ پل ٹوٹ گیا اور گاڑی دریا میں گر پڑی - بہت سے مسافر اور ریلوے ملازم اور ڈرائیور موت کے گھاٹ اُتر گئے ۔"

میں متاسف لہجے میں اچانک بولی: "آہ تو کیا راہی کا انتقال ہوگیا؟"

وہ بولی: "دوسرے دن دوپہر کے وقت راہی کی لاش گھر لائی گئی - تھوڑی دیر بعد میرا گھر لوگوں سے بھر گیا - حالانکہ میں ان چھوٹے درجے کے لوگوں سے کبھی نہیں ملتی تھی کیونکہ ہم میں کسی قسم کی ہم مذاقی نہ تھی مگر اس وقت ان لوگوں کے اخلاق و ہمدردی نے مجھے متاثر کیا - میں نے راہی کی لاش ان لوگوں کے درمیان

چھوڑ دی اور خود احتیاطاً معالجوں کو بلانے کی فکر میں لگ گئی۔ روحی، میری کوششیں رائگاں نہ گئیں۔ ایک معالج نے مجھے بتایا کہ راہی زندہ ہے۔ اس کا دماغ ہل گیا ہے اور اس پر قوما کی کیفیت طاری ہے۔ میری خوشی کا اندازہ بھلا تم لگا سکتی ہو روحی؟ سوکھے دھانوں پانی پڑا تھا اور گویا میں خود جی اٹھی تھی ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ راہی شام تک ختم نہ ہو جائے چنانچہ اسے ہسپتال میں فوری علاج کے لئے داخل کر دیا گیا۔ حالات درست ہوتے تو اصولاً آج شام کی ٹرین سے مجھے ماون ٹرے کو چھوڑ کر کیباس روانہ ہو جانا تھا۔ مگر صورت حال بالکل مختلف تھی۔ لہٰذا میں نے چند دنوں کے لئے سامان سفر کھول دیا اس طرح ہماری طلاق خود بخود چند دنوں کے لئے ملتوی ہو گئی۔"

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر چپ رہی۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر اشتیاق سے داستانِ حیات سن رہی تھی۔ اس کہانی کا انجام میری سمجھ سے بالا تر تھا۔ المیہ ہے کہ مزاحیہ؟

——— ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ زلفی نے دوبارہ آغاز کیا: "دن پر دن گزرنے لگے۔ اضطراب و انتشار نے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان جھولا جھولا جا رہا تھا۔ مگر یہ کھیل کب تک جاری رہتا؟ ——— آخر ایک شام ہسپتال سے اطلاع آ گئی کہ فوراً پہنچو۔ میں سمجھ گئی کہ آخری وقت آن پہنچا۔ احساس کی شدّت اور واقعات کی بے ترتیبی نے ذہنی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ اُس زمانے میں میں سوچتی کم اور کرتی زیادہ تھی۔ بالکل ایک دیوانے کی طرح ——— جب میں ہسپتال پہنچی تو کمرے کے باہر ایک نرس اپنے کفن کے سے سفید براق کپڑوں میں ساکت کھڑی تھی مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی: "بیگم صاحبہ جلد اندر جائیے۔"

یہ سن کر میں ٹھٹک گئی: "کیا حال ہے مریض کا؟" لرزاں لہجے میں میں نے پوچھا۔

"وہ بار بار آپ کا نام لے رہے ہیں۔ بار بار ———"

"میرا نام؟؟ ———" متحیّر ہو کر میں اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔

"جی ہاں ——— آپ کا نام بیگم صاحبہ۔ زلفی زلفی پکار رہے ہیں۔"

میں حیران ہو کر نرس کو دیکھنے لگی۔ کیا وہ مجھے مذاق کر رہی تھی؟ یہ سوچتے ہوئے میں مریض کے کمرے میں داخل ہوئی۔

میں نے دیکھا راہی چپ چاپ لیٹا ہوا چھت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے ایک عرصے بعد آنکھیں کھولی تھیں اور ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ اسے اتنے دنوں بعد تندرست دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی تھی اس کا اظہار میں نہیں کر سکتی۔ مگر ساتھ ہی قانونی جدائی کا خیال مجھے مغموم بنا رہا تھا۔ وفورِ جذبات سے میں بے تاب ہو گئی اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا "راہی"۔

یہ سنتے ہی اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا پھر عجیب بے ساختگی کے لہجے میں بولا: "زلفی؟ تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

میں نے ضبط کر کے کہا: "تمہاری علالت کی وجہ سے میں رک گئی تھی۔ مگر ——— مگر آج چلی جاؤں گی۔"

"کہاں؟"

"جہاں میرا جانا طے ہوا تھا"

"اکیلی؟"

میں حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگی پھر بولی: "تم میرے ساتھ چلو گے تو سفر کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا زلفی ———" یہ کہہ کر وہ معصومانہ حیرانی کے ساتھ مجھے یوں تکنے لگا جیسے کوئی ننھا بچّہ اپنی ماں سے گفتگو کر رہا ہو ———

پھر میں نے دیکھا کہ راہی کی آنکھوں میں جذبات کا وہی عمق، آواز میں آرزومندی کی وہی لے اور حرکات میں نیازمندی کی وہی ادائیں جھلک رہی تھیں جو آج سے ایک سال پہلے اسے قابلِ پرستش بنائے رکھتی تھیں۔

پھر اس نے التجا کے پیرائے میں کہا: "کیا تمہیں بہت ضروری کام سے کہیں جانا ہے زلفی؟ چند دنوں انتظار کر لو تو میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

مجھے بتدریج معلوم ہوتا گیا کہ بعض موقعوں پر دماغ کا ہل جانا کس قدر مفید ہوتا ہے جب وہ ہسپتال سے واپس آگیا تو وہ وہی راہی تھا وہی محبت شعار راہی جس کے لئے میں نے سب سے کنارہ کشی حاصل کرلی تھی۔ دماغی چوٹ نے محبت کی پرانی چوٹ کو تازہ کر دیا تھا۔ اس کی پیشانی پر زخم کا ایک نشان، اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔

داستان کے ساتھ رات بھی ختم ہو رہی تھی۔ اور پو پھٹ رہی تھی۔ دُور ساحل پر ایک سمندری چڑیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دروازہ کھلا۔ آفتاب کی ایک دمکتی کرن کے ساتھ ہی ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے آتش دان پر رکھی ہوئی تصویرِ حسن زندہ ہو کر کمرے میں اتر آئی ہے میں حیران ہو کر آنے والے کو دیکھنے لگی اُس وقت میری آنکھیں کھلیں اور مجھے معلوم ہوا کہ زلفی اگر مجبور ہو گئی تھی تو خطاوار نہیں ٹھہر سکتی راہی اپنی رات کی ڈیوٹی سے واپس آیا تھا اور مجھے ایسی حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اسے دیکھ رہی تھی۔

جی تو نہیں چاہتا تھا مگر میری گاڑی کا وقت ہو گیا چنانچہ میں اپنے سیاہ رو سیامی بلے کو گود میں لئے ہوئے ہادن شرے کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

بے قاعدہ

شوکت تھانوی کی یہ نئے انداز کی تصنیف، اُردو ادب میں بالکل انوکھی چیز ہوگی۔ اس قاعدے سے بچے بھی لطف اندوز ہوں گے اور بڑے بھی۔ بچے اسے دلچسپ تصنیف سمجھ کر پڑھیں گے اور بڑے اس سے زندگی کا شعور حاصل کریں گے۔ اس قاعدے کے حرف، آپ کے تمام پسندیدہ ادیب ہیں۔ مثلاً اس قاعدہ میں آپ کو الف سے آلو نہیں پڑھایا گیا بلکہ الف سے امتیاز علی تاج پڑھایا گیا ہے۔

مصوّر — قیمت -/۲

نقوشِ لطیف

مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔ یہ کتاب زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں اُردو کی تمام نمائندہ افسانہ نگار خواتین کے منتخب افسانے ہیں۔ ہر خاتون افسانہ نگار نے اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھے ہیں اور ادب کے بارے میں اپنے نظریات کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہ مجموعہ اتنا دلچسپ اور اتنے کام کا ہے کہ کبھی بھلایا ہی نہیں جا سکتا۔

قریباً تمام افسانہ نگار خواتین کے فوٹو بھی شامل ہیں جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

قیمت -/۶

ادارۂ فروغِ اُردو۔ لاہور

ایک پھول، ایک کالے

مہندر ناتھ

سورج مغرب میں غروب ہوگیا تھا۔ بدلے ہوئے رات کی تاریک قبا زمین و آسمان کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھی۔ بوڑھا فنکار اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا ماضی کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ اُس کے سامنے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور باغ کا ایک حصّہ، اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ رات اپنے سیاہ بال کھولے ہوئے پھولوں اور کلیوں سے ہمکنار ہو رہی تھی، گزرے ہوئے واقعات اُس کی نگاہوں کے سامنے رقصاں تھے۔ اُس کی نگاہیں ایک خائف شدہ قیدی کی طرح ڈرائینگ روم کو دیکھ رہی تھیں، ہاں اُسے یاد ہے، اور اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا ماضی تکلیفوں اور مشکلات کی ایک دردناک چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ روشنی کی کرن دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ ایک ہی کمرے میں گزارا تھا اور جب شباب کا رنگین دور ختم ہوگیا تو اُسے یہ حسین بنگلہ رہنے کے لئے ملا۔ بھلا اب اس کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اس عالی شان بنگلے میں اکیلا رہتا تھا۔ یہ بڑے بڑے کمرے، یہ پھیلا ہوا برآمدہ یہ روشندان۔ یہ ریشمی پردے، دیواروں پر لٹکتی ہوئی تصویریں۔ یہ رنگ و روغن، اب کس کام کا تھا، اب ماضی کی ہولناک تصویریں ڈراؤنے پیرہن پہنے ہوئے اُسے ستاتی تھیں، اُس کی روح کو کچوکے لگاتی تھیں۔ کبھی کبھی بہار آتی ہے۔ تو نہایت ہی بے موقعہ۔ —— ایسی بہار سے تو خزاں ہی اچھی۔ کیونکہ خزاں کے رنگ و روپ کو جانتا تھا۔ وہ پت جھڑ سے آشنا تھا۔ وہ المناک سسکیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس کی زندگی چیخوں اور کراہٹوں کے درمیان پروان چڑھی تھی۔ یہ تو اس کی جانی پہچانی صورتیں تھیں۔ بہار اس کے لئے ایک اجنبی چیز تھی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ باہر اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اور اندر اس کی روح پر ایک نیم غنودگی کا عالم طاری تھا۔ ایک دردناک سناٹا اُس کی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھا۔ اور چپکے سے دیوار کی طرف گیا اور بجلی کے بٹن کو دبایا، کمرہ روشنی سے منور ہوگیا۔ لیکن دل کے اندھیرے کو کون دور کریگا.

—— اُس کی بے قرار روح اتنی روشنی کے باوجود تڑپ رہی تھی۔ نہ جانے اُس نے ساری زندگی کس چیز کی تلاش میں گزاری تھی۔ ایک عجیب قسم کی یاسیت، ایک عجیب قسم کی ٹھنڈک۔ ایک عجیب قسم کی بے حسی، اُس کی رگوں میں سمائی ہوئی تھی۔ اُسے زندگی سے اتنی نفرت کیوں ہوگئی تھی۔ کاش وہ بوڑھا نہ ہوتا۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ اُس نے اپنے ڈرائینگ روم کو بغور دیکھا۔ وہ اکیلا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائینگ روم روشنی سے جاگ اُٹھا تھا۔ اور کمرے کی ہر چیز میں یکایک زندگی عود کر آئی تھی۔ لیکن باہر اندھیرا تھا۔ باغ میں گیندے کے پھول ہنس رہے تھے، ہوا میں ایک میٹھی میٹھی سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی ہوئی

تھیں۔ اور پکے ہوئے آموں کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی، ـــــ اُس کے برآمدے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ والا کمرہ خالی تھا۔ صرف باد خانے سے کسی کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید اُس کا نوکر کھانا پکا رہا تھا۔

نہ جانے یہ کیسی زندگی تھی، جو اُس کی روح میں ویرانگی اور افسردگی کا سمندر لے آئی تھی۔ وہ اس سے پہلے اتنا کبھی اداس نہ ہوا تھا۔ زندگی سے بیزار احساس یوں شعلہ بن کر کبھی نہ ابھرا تھا۔ زندگی سے نفرت، بے انتہا نفرت، لامحدود نفرت۔ جیسے نفرت کا لاوا چاروں طرف سے بھڑکتا ہوا آ رہا ہو، یہ واقعی ب زندگی تھی۔ دو وقت کا کھانا۔ کپڑے پہننے۔ سونا۔ پھر کھانا، پھر سونا اور زندگی گزار دینا۔ یہ بھی کیا زندگی تھی۔ اُس کی زندگی میں کبھی طوفان نہ آئے۔ اگر کوئی طوفان آیا بھی کنارے سے لوٹ گیا۔ نہایت سنجیدہ، پروقار۔ شام کی طرح ٹھیری ہوئی زندگی تھی اُس کی۔ اُداس اور غم سے لبریز۔ اُس نے اس غم کے سمندر میں جھانک کر دیکھا۔ یہا ہی ڈراؤنے جانور مختلف ڈراؤنی صورتیں بناتے ہوئے اُسے گھور رہے تھے۔ بھوک۔ بیکاری۔ بیماری۔ غم۔ دھوکے۔ فریب۔ بے غیرتی۔ لامحدود اُداسی۔ یہ کیسی کریہہ المنظر صورتیں تھیں، جن کو دیکھ کر روح کانپ جاتی تھی۔ ان شکلوں کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ یہ جانی پہچانی ہوئی شکلیں تھیں۔ اور اُس کی کشتی انہی مسخ شدہ سے ٹکرا رہی تھی۔ ہاں وہ دن دور نہیں، جب اُس کی زندگی کی کشتی انہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی اور وہ موت سے ہمیشہ کے لئے ہمکنار ہو جائے گا۔ اور پھر اُس زندگی میں کوئی طوفان نہ آئے گا۔

وہ اس کربناک احساس سے جاگ اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبھی اس کونے میں جاتا اور کبھی دوسرے کونے کی طرف۔ اُسے باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ جیسے چاروں طرف سے اندھیرے نے یلغار کر دی ہو، اور وہ ایک شکست خوردہ جرنیل کی طرح اپنی شکست پر نغمہ زن ہوا۔

اتنے میں کسی کے قدموں کی آہٹ آئی۔ اور وہ چونک پڑا۔ اُس نے دروازے کی طرف نگاہ ڈالی، دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا، دوسرا بند تھا۔ کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اونکار نے پوری قوت سے کہا، "اندر آؤ۔"

نووارد نے کہا۔ "نمستے۔"

ارے یہ تو اندر تھا۔ اُس کے دوست کا بیٹا۔ ـــــ "آؤ بیٹا۔ بیٹھو" اُس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اندر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیسے آنا ہوا" ـــــ

اندر نے اپنی نکٹائی ڈھیلی کی، جیب سے سگرٹ کیس نکالا۔ پہلے اونکار کو پیش کیا۔ اونکار نے سگرٹ لے لیا۔ اندر نے ماچس جلائی اور اونکار نے ماچس سے اپنے سگرٹ کو جلایا، اور بوڑھے اونکار نے کش لگاتے ہوئے کہا۔ "کیسے آنا ہوا اندر"

"بس یونہی چلا آیا تھا"۔ اور اندر پھر خاموش ہو گیا۔

اُس نے اندر کی طرف دیکھا، ایک ہٹا کٹا نوجوان۔ عمر بیس سے اوپر۔ چوڑا چکلا سینہ۔ فراخ ماتھا، پیشانی پر بال لہرا رہے تھے۔ آنکھوں سے ذہانت اور ذکاوت ٹپکتی تھی۔ لیکن اندر عالم اضطراب میں تھا، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو، اور کہہ نہ سکے۔ اُس کے ہاتھوں میں سگرٹ کا ٹکڑا کانپ رہا تھا۔ اور جب کبھی اندر سگرٹ کا کش لگاتا تو اس کے موٹے موٹے ہونٹ، کانپ کانپ سے جاتے۔ بوڑھے اونکار کو اپنے نوجوانی کے دن یاد آ گئے۔ ہائے وہ کیسے دن تھے۔ روح میں کتنی شادابی تھی۔ جسم میں سے آگ کے شعلے نکلتے تھے۔ دُنیا کو دیکھنے کی کتنی تمنا تھی۔ خوبصورتی سے کتنا پیار تھا۔ شفق کی سُرخی۔ عورت کی مسکراہٹ۔ نگاہوں کی نرمی، سینے کا اُبھار۔ چاند کی سیمیں کرنیں، یہ موسمِ بہار۔ پت جھڑ۔ سمندر کا پھیلا ہوا سینہ۔ یہ ناریل کے درخت ـــــ یہ گھاس۔ یہ سبزہ۔ یہ پہاڑ۔ آسمان۔ چاند تارے، آبشار۔ یہ ماتھے پر جھکی ہوئی زلف۔ جیسے بادلوں میں بجلی لہرا جائے۔ اُن دنوں یہ سب چیزیں کیوں اچھی لگتی تھیں۔ اب کیا ہو گیا تھا۔ کیا زندگی کی شام قریب آ رہی تھی۔ موت اپنے بادباں پھیلائے ہوئے۔ زندگی کو آغوش میں لے رہی تھی۔ بوڑھے اونکار نے پھر اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ اور ماضی کی کربناک دیوار کو توڑتے ہوئے وہ بڑھاپے کی دہلیز پر آ گیا۔ اور اُس کی نگاہیں اندر پر جم گئیں۔

ہاں دیئے سے دیا جلتا ہے، ایک نگاہ بجھتی ہے، دوسری نگاہ روشن ہوتی ہے

"چاچا جی، ...... میں۔ میں ...... " اندر کہہ کر رُک گیا۔

"بیٹا۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو، بے دھڑک کہو۔ شرماؤ نہیں،"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا۔ کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے" —— وہ ایک ہی سانس میں سارا فقرہ کہہ گیا۔ اور کہہ کر وہ کچھ شرما سا گیا اور پھر خاموش ہو گیا۔

بوڑھے اونکار نے کچھ جواب نہ دیا۔

"میں یہ پوچھنے آیا تھا۔ کہ کیا کروں۔ لڑکی سے شادی کروں یا نہ کروں،۔ پتا جی تو اس لڑکی سے شادی نہیں کرنے دیں گے۔ کیونکہ وہ لڑکی ایک ایکٹرس ہے"

"ایکٹرس"۔ بوڑھے اونکار کے لب پھڑپھڑائے۔ جیسے وہ کسی خواب سے جاگا ہو۔ ایکٹرس اور محبت۔

"محبت"۔ وہ بڑبڑایا۔ نگاہوں کے سامنے رنگین پردے سرسرانے لگے۔ دور بلبل نے اپنا نغمہ چھیڑا۔ سمندر کے شفاف سینے پر لہریں مچلنے لگیں۔ نگاہیں شرابی ہو گئیں۔ بال ہوا میں لہرانے لگے۔ اور بوڑھے اونکار نے کھانستے ہوئے کہا "بیٹا اندر۔ محبت بڑی قیمتی چیز ہے۔ یہ انسان کو زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے اس سے پہلے کہ میں تمہیں کوئی نصیحت کروں۔ تم میری محبت کی داستان سن لو۔ نہایت ٹوٹی پھوٹی داستان ہے شاید یہ داستان سن کر تمہاری سمجھ بوجھ میں کچھ اضافہ ہو۔"

یہ اُن دنوں کی داستان ہے جب میری عمر ستائیس برس کی تھی۔ یہ عمر بلا کی ہنگامہ خیز ہوتی ہے۔ اندر! میں نے زندگی میں خاموشی سے محبت کی ہے۔ بچپن میں پتھروں سے باتیں کیا کرتا تھا، اور جب جوان ہوا۔ تو انسان بھی پتھروں کی مانند دکھائی دینے لگے۔ باتونی آدمیوں کی صحبت سے اُکتا جاتا ہوں۔ خاموشی سے دوسرے کی طرف دیکھنا، خاموشی سے دُکھ سہنا،۔ حرف شکایت لبوں پہ نہ لاتا، یہ میری عادت سی بن گئی ہے، لیکن دل کی یہ کیفیت نہ تھی۔ دل تو طوفانوں کا دلدادہ تھا۔ ہر لہر ایک نیا پیغام لاتی۔ اور میرے دل میں ایک طوفان برپا کر دیتی۔ میں چھوٹے چھوٹے واقعہ سے متاثر ہو جاتا ہوں (جیسے اور کوئی نہیں ہوتا)۔ کوئی جھڑک دیتا تو رات بھر نیند نہ آتی۔ کوئی بے عزتی کرے، تو آنکھوں میں خون اُتر آتا۔ کسی کو غمزدہ دیکھتا۔ تو خود کچھ مایوس سا ہو جاتا، کسی قلاش آدمی کو دیکھتا، تو اس کا دبلا پتلا چہرہ، اُس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، اُس کی چہرے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، نگاہوں کے سامنے گھومتی رہتیں اگر زندگی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تو صرف اپنے آپ کو کوسا، کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو منہ سے مانگنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگر دوسرے کو اس بات کا علم ہو گیا، تو شاید میری تکلیفوں میں کوئی کمی ہو جاتی۔ نہیں تو —— ذہن بھٹی کی طرح سلگتا رہتا۔ کسی کو ستانے یا جلانے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ زہر جو چاروں طرف بکھرا ہوا تھا وہ خود پینے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ زندگی کتنی پیاری تھی، وہ دن کتنے دلکش تھے وہ زندگی کتنی رنگین تھی۔ ظاہری طور پر خاموش رہتا۔ لیکن ذہن میں آگ کے شعلے برپا تھے۔ میں اُس انگارے کی طرح تھا، جس پر راکھ کی ایک تہہ سی جم گئی ہو، جو اندر اندر سلگتا رہے۔ تم نے ایکٹرس کی محبت کا ذکر کیا۔ میں بھی ایک بار ایک ایکٹرس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ قصّہ کافی دلچسپ ہے۔ تم ذرا ٹانگیں پھیلا کر بیٹھو۔ یوں اکڑوں بیٹھو گے تو تھک جاؤ گے اور میری داستان سے حظ حاصل نہ کر سکو گے۔ بوڑھے اونکار نے اندر کی طرف دیکھا۔ اندر خاموش، چپ چاپ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بلا کی ذہین تھیں، اُس کے ہونٹ جذبات کی فراوانی سے کانپ رہے تھے۔ "ہاں بالکل اسی طرح ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اسی طرح ہوا تھا۔ ہر شخص کے ساتھ اسی طرح ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے کہا۔" میں ایک فلم کمپنی میں نوکر تھا، اور میری تنخواہ دو سو روپے ماہوار تھی۔ یوں کھانے پینے کے لئے روپے کافی تھے لیکن زندگی میں آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ اُن دنوں میں نے ایک کہانی فلمانے کے لئے بیچ دی، اور ڈائریکٹر نے مجھ سے یہ وعدہ لیا، کہ شوٹنگ کے دوران میں مجھے سٹ پر رہنا پڑے گا، —— یہیں میری ملاقات پرمیلا سے ہوئی۔ کیا زمانہ تھا پرمیلا کا۔ جدھر نکل جاتی، نگاہوں کی مخملیں چادر بچھ جاتی اور وہ گلِ رعنا ایک غاصب کی طرح ان آنکھوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ ایسی

جوانی کسی عورت پر نہ آئے۔ ایسا حسن خدا کسی کو نہ دے۔ ایسی شفاف بلّوریں رنگت، کہ دیکھتے ہی دل ہزار کروٹیں لینے لگے۔ ایسی کٹار کی طرح تیز آنکھیں، کہ جسم میں سے شعلے نکلنے لگیں۔ جب مسکرائے۔ تو بجلی لہرائے۔ ہائے۔ کس آفت، کس بلا سے میرا سامنا ہوا تھا۔ اس دن ملاقات بڑی فروعی سی تھی۔ میری بغل میں فائیل تھی۔ اور شام کا وقت تھا اور شوٹنگ ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ میں باہر کھڑا تھا۔ جب ایک کار میرے قریب آ کر رکی۔ یہ پرمیلا کی کار تھی۔ پرمیلا اپنی کار سے اتری اور سیدھی میک روم میں چلی گئی، ان دنوں پرمیلا کی شہرت بام عروج پر تھی۔ ڈائرکٹر اس کے آگے پیچھے بھاگتے۔ اور پرمیلا کو منہ مانگے دام ملتے۔ میں نے پرمیلا کا نام سنا تھا۔ لیکن اسے قریب سے نہ دیکھا تھا۔ اس کی تعریف میں کئی جملے سنے تھے۔ لیکن خود نگاہوں نے ان تعریفی جملوں کی اصلی حقیقت کو محسوس نہ کیا تھا۔ دیکھ کر کیا کرتا۔ وہ تو آسمان کا چاند تھی اور میں محض ایک تماشائی۔ میں نے اسے میک روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور پھر باغ کی طرف چلا گیا۔ میں نے دل میں سوچا۔ کہ اس خطرناک دائرے کے اندر داخل ہونا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے۔ میں باغ میں یونہی گھومتا رہا۔ پھولوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی پھولوں کو ہاتھ لگاتا۔ کبھی صرف سونگھتا۔ کبھی توڑ لیتا۔ آفتاب مغرب میں غروب ہو چکا تھا اور سورج کی آخری بوند اندھیرے نے چوس لی تھی اور ہلکا ہلکا سا اندھیرا پھولوں سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں دل میں ایک خوشی کا احساس جاگ رہا تھا۔ جوانی کے دن بھی خوب ہوتے ہیں اندر۔ دل ایک نامعلوم مسرت سے دھڑکتا رہتا ہے۔ موت کا کبھی خیال نہیں آتا۔ اس وقت کتنی تکلیفیں سامنے آجائیں انسان برداشت کرلیتا ہے۔ میں گہری سوچ میں مستغرق تھا کہ کسی نے پیچھے سے پکارا "مس پرمیلا آپ کو بلا رہی ہیں" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا بدری کھڑا تھا۔ میں چپکے سے اس کے ساتھ ہو لیا، کچھ قدم چل کر میں ایک کار کے قریب رک گیا۔ پرمیلا کار کے انجن پر تشریف فرما تھیں ایک اور دوشیزہ فٹ بورڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

پرمیلا نے میری طرف دیکھا، بے دھڑک۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک نگاہ نے تولنے کی کوشش کی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار پرمیلا کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ کیا یہ وہی پرمیلا تھی، وہی قتالہ، وہی ناگن، جس کے چرچے ہر میک روم اور ہر سٹوڈیو میں ہوتے ہیں۔ ہاں، یہ وہی گول مٹول چہرہ، ماتھے پر ایک زلف لہراتی ہوئی۔ گورا گورا سا رنگ، آنکھیں بڑی بڑی، لیکن نہایت ہی ذہین۔ سینہ تنا ہوا، ـــــ سب سے زیادہ مجھے پرمیلا کی جلد کی رنگت پسند آئی۔ نہایت ہی گوری گوری۔ نہ زیادہ سفید نہ زیادہ گندمی۔ ایک عجیب قسم کا نشہ تھا اس کی رنگت میں۔ باتوں ہی باتوں میں وہ آنکھیں مٹکاتی۔ مخروطی انگلیوں کو گھما پھرا کر بات کرتی۔ اس نے جلدی سے اپنے سر پر پلو اوڑھ لیا۔ اس کے بال اوڑھنی کے نیچے چھپ گئے اور چہرے کے باقی نقش اور ابھر گئے آنکھیں اور حسین نشیلی ہوگئیں، ہونٹ اور سرخ ہوگئے، ناک ستواں ہوگئی اور چہرے کی ہر لرزش زیادہ واضح ہوگئی۔ ہائے وہ سنگِ مرمر کی طرح بے داغ چہرہ، پتلے پتلے سرخ ہونٹ ـــــ پرمیلا نے مجھے ایک جوہری کی طرح پرکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس فلم کی کہانی کے متعلق کچھ علم نہیں، میرا رول کیا ہے۔ کہانی میں میرا کردار کیا ہے۔ اور خاص کر مجھے کون سے مکالمے بولنے ہیں۔ سنا ہے، آپ نے کہانی لکھی ہے اور مکالمے بھی آپ کے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کہانی کا کیا پلاٹ ہے؟"

میں نے ادھر ادھر دیکھا، کار کے اردگرد کچھ اور لوگ جمع تھے۔ پرمیلا کو دیکھنے کے لئے۔ لڑکی اسی طرح، فٹ بورڈ پر بیٹھی تھی۔ اس نے شلوار کے پائنچہ کو اونچا کیا اور اپنی پنڈلی کو کھجلانے لگی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ میں کہانی تو سنا دیتا۔ لیکن یہ جگہ کہانی سنانے کی نہ تھی۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "کہانی کا پلاٹ پھر سناؤں گا اور جہاں تک آپ کے رول کا تعلق ہے اس کے متعلق کیا عرض کروں وہ بڑا ڈہانس ہے؟"

"آپ کو فلم لائن میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟" پرمیلا نے عمل جراحی کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میں کچھ شرما سا گیا۔ یہ عمل جراحی مجھے پسند نہ آیا۔ میں اس قسم کی باتوں کا عادی نہیں ہوں کہ سرِ بازار مجھے کوئی پرکھنا شروع کردے۔ دراصل کسی کو حق حاصل نہیں، کہ وہ یوں سرِ عام مجھ سے پوچھتا پھرے کہ آپ کون ہیں، اور کیا ہیں اور آپ یہ کام کب سے کر رہے ہیں یعنی اتنے عرصہ سے کیوں جھک مار رہے ہیں۔

"کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا" میں نے فائل کو بغل میں دباتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے پاس کار ہے،" پرمیلا نے وار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس سوال کی تہہ میں کیا تھا، میری شخصیت کی کار سے کیا نسبت تھی۔

”اُسی کی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔“ میں نے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

اور وہ ہنس پڑی اور موتیوں کی لڑی ایک لمحہ کے لئے تاریکی میں چمکی۔ پرمیلا کی ہنسی مجھے پسند نہ آئی۔ اس ہنسی میں استہزا کا پہلو تھا۔ اُس کی ہنسی اُس مالدار سیٹھ کی طرح تھی جو ایک غریب کی جھونپڑی دیکھ کر قہقہہ مار دے۔

پرمیلا نے شلوار کے پائنچے کو اونچا کیا۔ اندھیرا اور بڑھ گیا۔ ہوا میں گندھے اور چمبیلی کے پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی، اور اوپر آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ کار کے اردگرد لوگ جمع تھے اور وہ لڑکی اُسی طرح فٹ بورڈ پر بیٹھی تھی۔ کہ بدری نے آکر کہا۔ ”پرمیلا جی میک اپ کر لیجئے گا۔“ پرمیلا نے فوراً انجن سے چھلانگ لگائی۔ بالکل ایک مرد کی طرح۔ شلوار کے دونوں پائنچوں کو اُونچا کرتی ہوئی میک روم کی طرف بھاگ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی دو بلوریں ایڑیاں اندھیرے اور اُجالے کے سنگھم پر ملیں، اور پھر آنِ واحد میں پرمیلا اُن ایڑیوں سمیت غائب ہو گئیں۔

یہ میری اور پرمیلا کی پہلی ملاقات تھی۔ نہ جانے مجھے پرمیلا کیوں اچھی لگی۔ لیکن ایک بات میرے ذہن میں صاف اور واضح تھی کہ پرمیلا کو پانا آسان نہیں۔ ایک فقرے میں پرمیلا نے اپنے کردار کو مجھ پر عیاں کر دیا تھا۔ وہ فقرہ کتنا پُرمعنی تھا۔ کیا تمہارے پاس کار ہے، یعنی اگر کار ہوتی تو کیا بات تھی۔ یعنی میرے پاس کار ہے اور تمہارے پاس نہیں، یعنی میں جو ہوں وہ ہوں۔ تم بھی قبول صورت تو ہو، تم بھی ایک نئی زندگی پانے کیلئے اس میدان میں آئے ہو، اور میں بھی۔ میں نے کار حاصل کر لی ہے۔ تمہیں حاصل کرنا ہے۔ فرق زیادہ نہیں، لیکن بہت بڑا فرق ہے۔ یہ تو سمجھنے کی بات ہے۔ لیکن میں بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ بات سمجھنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ دل کے اندر کی کشمکش کو کیسے سکون حاصل ہو۔ پرمیلا نے یہ بات پوچھ کر اپنا راستہ صاف کر لیا۔ میں نے جواب دیکر اپنا جی ہلکا کر لیا۔ لیکن بات وہیں کی وہیں تھی۔ پرمیلا میرے ذہن کے دروازے پر اُسی طرح کھڑی تھی۔ وہ تو بھاگ کر نہیں گئی، وہ گورا گورا رنگ، وہ ذہین آنکھیں، وہ جادو بھری مسکراہٹ، وہ سلوار کے پائنچے کو اونچا کرنا اور انجن سے مردوں کی طرح چھلانگ لگا کر بھاگ جانا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر قائم تھیں، ان کی اپنی ہستی تھی، ان کو کوئی انسان اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی —— بھلا اس عورت کو ذہن میں رکھ کر تمہیں کیا ملے گا۔ وہ تو اکیلی نہیں، اُس کے ساتھ ایک کار ہے، ایک کوٹھی ہے، بنک بیلنس ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ یہ نہیں، کہ میں بے لگام گھوڑے کی طرح محبت کے میدان میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ محبت کے میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں۔ بے عزتی کا سہارا لے کر آگے نہیں بڑھتا۔ چاہے، میری محبت کا جنازہ نکل جائے۔ چاہے دم گھٹ کر رہ جائے۔ رات کو نیند نہ آئے۔ دل کو چین نصیب نہ ہو —— کوئی بات نہیں، کسی دوسرے کے آگے اپنے آپ کو گرانا پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے تو خاموش رہا۔ اور میری خاموش محبت اندر ہی اندر سلگتی رہی، تڑپتی رہی اور میں پرمیلا کو ایک اجنبی عورت کی طرح تکتا رہا۔

پرمیلا اُن عورتوں میں سے تھی، جو محبت کی شمع کو دل میں روشن کرتی ہیں، اور پھر پروانے کو جلتا ہوا دیکھ کر محظوظ ہوتی ہیں، اور زیرِ لب کہتی ہیں ”ہائے۔ یہ تو مجھ پر یونہی عاشق ہو گیا۔ میں نے تو ایسا نہیں چاہا تھا۔ میں تو یونہی مسکرائی تھی۔ بس یونہی، اپنی تو عادت ہے نا۔ بھلا اوڑھنی کو سر پہ رکھ کر، اپنی انگلیوں کو گھما پھرا کر بات کرنے میں کیا ہرج ہے۔ کسی کو میری ادا پسند آجائے تو میں کیا کروں۔ میں کھلکھلا کر ہنس دوں۔ اور کوئی راہگیر محبت کی خنجر کو اپنے سینے میں بھونک لے، تو اس میں میرا کیا دوش۔ یہ مرد بچارے۔ ہتھیلی پر دل لئے گھوما کرتے ہیں۔ اپنی زندگی میں ایک پروانہ نہیں کئی آتے ہیں اور آہیں بھرتے ہوئے راہی ملکِ عدم ہو جاتے ہیں۔“ شاید۔ پرمیلا کے دل میں یہی خیال آیا ہو، لیکن میں بذاتِ خود۔ طوفانوں سے بہت گھبراتا ہوں۔ اپنی کشتی کو صحیح و سلامت کنارے پر لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن کنارا ہے کدھر۔ وہ کشتی ہی کیا جو طوفانوں سے نہ ٹکرائے۔ وہ کشتی ہی کیا، جس کے بادبان تیز و تند جھونکوں سے تار تار نہ ہو جائیں۔

کچھ ایسے ہی تھا میرے ساتھ۔ شوٹنگ کے دوران میں میری اور پرمیلا کی ملاقات ہو جاتی۔ میں اکثر اُس کے میک اپ روم میں چلا جاتا۔ لیکن میک اپ روم میں جانے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا۔ دروازہ کھُلتا۔ تو پرمیلا قد آدم آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی میک اپ کرتی ہوئی نظر آتی۔ وہ پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھتی

"تو ہاں ڈائیلاگ پڑھ کر سنایئے۔" وہ لپ اسٹک لبوں پر لگاتے ہوئے کہتی۔

میں فائیل کھولتا اور سین پڑھ کر سُناتا۔ وہ میک اپ کرتی رہتی۔ کبھی لبوں پر لپ اسٹک لگاتی۔ کبھی چھوٹے سے برش سے بھویں ٹھیک کرتی اور کبھی بالوں کو پیشانی پر بٹھانے لگتی اور ساتھ ہی وہ مکالمے سنتی رہتی۔

جب سین ختم ہو جاتا، تو وہ چائے کا آرڈر دیتی۔ میک اپ مین جو اکثر کمرے میں ہوتا چائے کا آرڈر دینے کے لئے باہر چلا جاتا۔ اور میک اپ روم میں پرمیلا اور میں ہوتے۔ دوسرا کوئی نہ ہوتا۔ اُس وقت دل میں کتنی بار خیال آیا کہ پرمیلا سے اظہار عشق کر دوں اپنے دل کا مدعا بیان کر دوں اُس سے ایک بار جتا دوں کہ میرے دل میں تمہارے لئے کتنی محبت ہے۔ لیکن یہ الفاظ ہمیشہ میرے لبوں پر آ کر رُک جاتے۔ صرف ایک خیال رہ رہ کر باقی تمام خیالوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا۔ اگر تمہاری محبت کا مذاق اُڑا دیا گیا۔ تو۔ اس خیال کے آتے ہی، میرے چہرے کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ حلق میں آواز اٹک جاتی، اور میں دروازے کی طرف دیکھنے لگتا۔ کمبخت چائے والا ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

اتنے میں چائے آجاتی اور میں اور پرمیلا چائے پینے لگتے۔ پرمیلا نمکین چیزیں کھانے کی بہت شوقین تھی۔ نمکین چیز کو اس چٹخارے سے کھاتی کہ اُسے کھاتے دیکھ کر لطف آجاتا۔ بھلا گانٹھیا۔ اور سیو کوئی کھانے کی چیزیں تھیں۔ لیکن کس مزے سے وہ کھاتی کہ دیکھ کر لطف آجاتا اور انسان کا بے اختیار ان چیزوں کو کھانے کے لئے جی چاہتا۔ جب حلق سے آواز نہ نکل سکے۔ جب آنکھیں بے اختیار ایک ہی چیز کو دیکھنے پر مجبور ہو جائیں تو انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ میں بھی گانٹھیا اور سیو کھانے لگتا اور پرمیلا کے چہرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا۔ یوں بار بار دیکھنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ نہ جانے پرمیلا کو یہ بات اچھی نہ لگے۔ اور وہ کہہ دے، آپ ذرا باہر تشریف لے جایئے۔ یہ نمائش گاہ نہیں کہ آپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھتے رہیں میری نگاہیں فرش کی طرف جھک جاتیں۔ اور دل بیقرار ہو جاتا۔ نہ جانے اُسے کیسے پتہ چل گیا کہ میں اُسے چاہتا ہوں۔ کیا میری حرکتوں نے اُس پر واضح کر دیا تھا۔ کیا میری آنکھوں کی تاک جھانک نے یہ راز اُس پر افشا کر دیا تھا۔ کیا میری خاموشی نے میری محبت کے راگ گائے تھے۔ کیا میرے لرزتے ہوئے ہونٹوں نے میری کہانی سُنائی تھی۔ کیا میری آواز جو نہایت سہمی سہمی اور دبی دبی سی تھی، اُسے یہ انمول نغمہ عطا کیا تھا کہ وہ پرمیلا کے کانوں میں جا کر کہہ دے کہ یہ نوجوان تم سے محبت کرتا ہے۔ یا پرمیلا کے دل میں خود بخود اس حسین نغمے نے جنم لیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کیا بات تھی۔ لیکن چند دنوں کے بعد مجھ پر یہ بات آشکارا ہوئی کہ پرمیلا مجھ پر مہربان ہے۔ کیونکہ اس مہربانی کا اندازہ صرف میں ہی نہ کر سکا۔ بلکہ میرے ساتھیوں نے مجھے چھیڑنا شروع کیا۔ "میاں خوب ہاتھ مارا ہے۔ قسمت کے دھنی ہو، خدا جب دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔" اس قسم کے فقرے اکثر میرے ساتھیوں کے لبوں سے نکلتے۔ اب سٹ۔ پر جب کبھی پرمیلا سے ملاقات ہوتی۔ وہ ہمیشہ ایک دلنواز مسکراہٹ سے میرا سواگت کرتی۔ بات بات پر مسکراتی۔ اُس کا گول مٹول چہرہ، ایک نئی روشنی سے منور ہو جاتا۔ اور آنکھوں کی پلکیں رخساروں پہ بوجھل ہو جاتیں اور مجھے سین کے مکالمے بار بار پڑھنے کے لئے کہتی۔

"دیکھو جی اب میں ٹھیک بولتی ہوں۔ یا نہیں۔ جہاں غلطی کروں۔ فوراً ٹوک دینا۔" اور وہ مکالمے زبانی سُناتی۔ پرمیلا کا حافظہ بہت تیز تھا۔ ایک بار ڈائیلاگ سن لے تو دوسری بار اُسے سُنانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

"پرمیلا جی آپ مجھ سے بہتر بولتی ہیں۔"

ہائے جی۔ تم کتنا اچھا پڑھتے ہو جی۔ تو ہاں ٹھیک طرح پڑھو، شرماؤ نہیں، جی۔ وہ جی کا لفظ بار بار دہراتی۔

میں پھر مکالمے پڑھتا۔ اور وہ غور سے سُنتی۔ تلفظ کی طرف خاص طور پر دھیان دیتی۔ اور ہر لفظ جو اچھی طرح ادا نہ کر سکتی۔ مجھ سے بار بار کہلواتی اب بتاؤ، ماسٹر جی یہ لفظ یوں نہیں، یوں ہوگا نا جی، —— تم بڑے اچھے ماسٹر ہو جی۔" اتنے میں ڈائرکٹر آواز دیتا اور پرمیلا ناک کے نتھنوں کو پھُلاتے ہوئے۔ زبان کو دانتوں سے باہر نکال کر مجھے چڑاتی ہوئی اور جی کہتی ہوئی کیمرے کی طرف بھاگ جاتی۔ میں تو نہیں کہتا۔ اور نہ ہی آپ کہیں گے کہ اگر تمام حرکتوں کا جائزہ لیا جائے۔ تو بے اختیار یہ کہنا پڑے گا کہ ہم دونوں محبت کی آگ میں جل رہے تھے۔ گو ہماری ان چھوٹی موٹی حرکتوں۔ ان مسکراہٹوں، اور

ہلکی پھلکی نوک جھونک نے سٹ پر ایک عجیب سا ماحول پیدا کر دیا تھا کچھ لوگ خوش تھے۔ کچھ حسد کی آگ میں جل رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔ اس میں جلنے کی کیا بات ہے۔ کوئی بات ہو تو انسان جلے۔ یوں جلنا ہے تو ضرور جلو۔ اور جلو۔ نہ رات کو مجھے نیند آتی ہے، اور اگر آپ کو بھی نہیں آتی۔ تو میرا کیا قصور ——

اگر کسی دن سٹ پر شوٹنگ کے لئے پرمیلا نہ آتی۔ تو مجھے اُسے بلانے کے لئے کہا جاتا۔ ہاں ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ پرمیلا کی ہمارے سٹ پر شوٹنگ تھی!۔ اور اُسے آنا چاہئے تھا۔ لیکن ہمیں موقعہ پر معلوم ہوا۔ کہ پرمیلا کسی اور سٹوڈیو میں شوٹنگ کر رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب گرم ہو گئے۔ لگے اِدھر اُدھر کی ہانکنے "اگر پرمیلا آج نہ آئی تو میرا دیوالہ نکل جائے گا۔ ہزاروں روپوں کا نقصان ہو جائے گا"۔ کانفرنس ہوئی، اور یہ طے پایا۔ کہ میں پرمیلا کو بلانے کے لئے جاؤں۔" ڈائرکٹر نے صاف کہہ دیا۔ کہ آج قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے"۔

میں خود حیران تھا۔ کہ اب کیا کروں۔ عجیب جھنجھٹ میں پھنسا دیا ان لوگوں نے۔ اس سے بہتر تو یہ تھا۔ کہ میں محبت نہ کرتا۔ بھلا ان مسکراہٹوں سے کیا فائدہ۔ یعنی محبت ہم کریں۔ رات کو ہمیں نیند نہ آئے۔ دن کو چین ہمیں نصیب نہ ہو۔ لیکن فائدہ دوسرے اٹھائیں۔ پرمیلا میری بات کیسے مانے گی۔ وہ میرے کہنے پر کیسے چلی آئے گی۔ عجیب چغد ہوں میں۔ بھئی میں اس محبت سے باز آیا۔ اگر وہ نہ آتی۔ تو میری کتنی بے عزتی ہو گی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اگر آ گئی۔ تو۔ میں نے سوچا۔ ہاں آج شاید میری محبت کا امتحان تھا۔ بہر حال مجھے ہر حالت میں جانا پڑیگا۔ اور میں ڈائریکٹر کے کہنے کے مطابق چلا گیا۔ سٹوڈیو پہنچا۔ تو پرمیلا واقعی میک اَپ کر کے کیمرہ کے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ نشاط ختم ہو گیا۔ اور کیمرہ سے ہٹ کر میرے پاس آ کر بولی" ارشاد۔"

"میں آپ کو لینے آیا ہوں"۔

"آپ کے ڈائریکٹر صاحب کہاں ہیں، وہ یہاں کیوں نہیں آئے"۔

"اُنہوں نے مجھے بھیج دیا"۔

"آپ کے آنے کی کیا ضرورت تھی جی، آپ کے ڈائرکٹر صاحب کیوں نہیں آئے جی"۔

میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ پرمیلا اس وقت جوگن کے لباس میں تھی۔ لبوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں شرم و حیا کے ڈورے تھے۔ پرمیلا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نہ آتے جی۔ تو اچھی بات تھی۔ اب آئے ہو۔ تو —— جی"۔

اتنے میں ڈائریکٹر نے آواز دی۔ "مس پرمیلا۔ آپ کا شاٹ تیار ہے"۔ وہ کچھ بغیر کہے کیمرے کی جانب چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ ٹانگوں میں سکت نہ رہی۔ جاتا۔ تو کہاں جاتا۔ میں پرمیلا کے اُس فقرے کو دوہراتا رہا۔ اگر تم نہ آتے۔ تو اچھی بات تھی"۔ اب کیا کروں۔ واپس سٹوڈیو میں کونسا مُنہ لے کر جاؤں۔ ڈائریکٹر سے کیا کہوں گا۔ میرے یار دوست کیا کہیں گے۔ وہ خوش ہوں گے کہ میں شکست فاش کھا کر لوٹا ہوں۔ تم لوگوں نے میرے متعلق نہ جانے کیا سوچا تھا۔ ہاں پرمیلا اور میرے متعلق۔ اب معلوم ہو گیا نا۔ اب تو دل خوش ہوا۔ میرے اور پرمیلا کے درمیان کچھ نہ تھا۔ وہ ہنسی، وہ مسکراہٹ بے معنی تھی۔ وہ چھیڑ چھاڑ۔ وہ نگاہوں کا یکبارگی مل جانا اور شرما کے جھک جانا۔ محض زندگی کے دن بتانے کا ایک بہانہ تھا۔ پرمیلا کی مسکراہٹ ایک حسین فریب تھا۔ وہ اپنے اردگرد پروانوں کی ایک لمبی قطار لگانے کی شیدائی ہے۔ اور میں اُس کیو میں آخری نمبر پر ہوں۔ اس بے عزتی سے کیا فائدہ۔ کیوں میری خاموشی، پرخلوص محبت کا مذاق اُڑاتے ہو۔ کیوں مجھے آگ کے دریا میں چھلانگ لگانے کے لئے اکساتے ہو، میں نے آج تک اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ مجھے اپنی جگہ پر رہنے دو۔ مجھے نہ ستاؤ۔ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔ لیکن پرمیلا سے یہ نہ کہوں گا۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، یہ سُن کر وہ قہقہہ لگائے گی۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جائے گی۔ ہائے اُس کی ہنسی، وہ فتح اور کامرانی کی ہنسی، کون دیکھ سکے گا۔ جب وہ میری شکست پر کھلکھلا کر ہنسے گی تو اُسے کون برداشت کر سکے گا۔ یہ چھ فٹ کا قد، یہ بھرا ہوا کسرتی جسم —— یہ سنجیدہ چہرہ، یہ ذہین آنکھیں۔ یہ گھمبیر آواز۔ یہ عزت یہ وقار۔ یہ رعب داب سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ اور پرمیلا اپنی سہیلیوں سے ہنس ہنس کر کہے گی۔ کمبخت وہ بھی مجھ پر مرتا ہے۔ اُس دن سٹ پر آیا۔ اور اپنی محبت کا جنازہ نکال کر چلا گیا۔ یہ مرد۔ بچارے مرد —— عورت کی مسکراہٹ کی تاب نہیں لا سکتے۔ بڑے بنے پھرتے ہیں نا۔ یہ بیوقوف مرد، جاہل، نامعقول مرد۔ بالکل بچے ہوتے ہیں۔ بس

محض مسکرا دو۔ تو پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہنس دو۔ لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ آنکھیں مٹکا کر ایک دو باتیں کر لو۔ بس آہیں بھریں گے۔ روئیں گے۔ تیشہ لے کر پہاڑ کھود دیں گ تخت و تاج چھوڑ دیں گے۔ جنگ کرائیں گے۔ لاکھوں انسانوں کا خون کرائیں گے۔ بس ایک مسکراہٹ کی خاطر۔ ارے سیزر بن گئے۔ انطونی بن گئے ——

نہیں۔ نہیں۔ میں نے سوچا آج میں نے یہاں آکر اپنی خاموش محبت کی توہین کی ہے۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کیا کوئی میری ہنسی تو نہیں اڑا رہا تھا۔

شاٹ ختم ہو گیا۔ پرمیلا پھر میرے قریب آئی۔ ”آخری بار مسکرا کر میری محبت کو ہمیشہ کے لئے دفنا دو پرمیلا“ میں نے یہ فقرہ پرمیلا کو کہنے کے ل دل ہی دل میں سوچا، اور پھر خاموش لبوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ لوگوں نے فیصلہ کر دیا ہے۔ اب تم اپنا فیصلہ سنا دو۔ میرے لب خاموش تھے لیکن لرزتے ہوئے ہونٹوں نے یہ فریاد اس تک پہنچا دی۔

”لنچ کے بعد، تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ سیدھی سٹ پر چلی گئی۔

ہاں آج میں رسوائی سے بچ گیا۔ محبت کی کشتی چٹانوں سے ٹکرانے لگی تھی۔ کہ پرمیلا نے کشتی کا راستہ بدل دیا۔ اب کشتی گہرے پانیوں میں تھی۔ اسے ان گہرے پانیوں سے کون نکال کر ساحل تک لے جائے گا۔ یہ کسی نے نہیں سوچا۔ میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور لنچ کا انتظار کرنے لگا۔

لنچ ہوا۔ پرمیلا کار میں بیٹھ کر ہمارے سٹ پر آئی۔ جب لوگوں نے پرمیلا کو میرے ساتھ سٹ پر آتے ہوئے دیکھا تو ایک عجیب مسکراہٹ سب کے چہروں پر پھیل گئی۔ جیسے سب لوگ کہہ رہے تھے۔ ”ہاں آج تمہاری فتح کا دن ہے آج تم دولہن بیاہ کر لاتے ہو۔ تم نے فتح اور کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ تم محبت کی آزمائش میں کامیاب ثابت ہوئے ہو۔“ میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ اور زیر لب کہا ”ہاں جلو —— اور جلو —— خوب جلو ——“

لیکن اپنی جگہ پر کتنا نادم تھا۔ کتنا پریشان تھا۔ کتنا مضمحل اور افسردہ تھا۔ اس بات کا کسی کو علم نہ تھا۔ شاید پرمیلا بھی میری پریشانی سے آگاہ نہ تھی۔ اس کا ی احسان مجھ پر ایک آہنی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ مجھ پر احسان کرنے سے کیا فائدہ۔ تمہارے لئے کار کہاں سے لاؤں۔ اور ان دوسروں سے چھٹکارا کیسے حاصل کروں —— تم سے اظہار محبت کر کے اپنی بے عزتی کیسے کرا لوں۔ اپنی انا کو کیسے پاش پاش کر دوں۔ بے حیائی کا لبادہ کیسے اوڑھ لوں۔ میں اپنی جگہ خاموش رہا۔ چپ رہا۔ اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ سڑتا رہا۔ گلتا رہا۔ —— لیکن دوسروں پر یہ حقیقت کبھی آشکارا نہ ہونے دی۔

پھر وہ دن آ ہی گیا۔ آج فلم کی آخری شوٹنگ تھی۔ وہ صبح مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ بڑی پیاری صبح تھی۔ ہوا اپنے نازک ہاتھوں سے پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ اور دھوپ چمکیلی اور نشیلی —— میں اسی طرح فائل بغل میں دبائے ہوئے پرمیلا کے میک اپ روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔ اور میں اندر داخل ہوا۔ پرمیلا نے میک اپ کر لیا تھا۔ اور وہ خوبصورت کپڑوں سے آراستہ ہو کر کرسی پر بیٹھی تھی، ہوا میں عطر کی خوشبو تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میک اپ مین باہر چلا گیا۔

میں نے پہلے فائل کی طرف دیکھا۔

آج سین سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت کچھ سن چکی ہوں جی۔“ پرمیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ بالکل ایک دوست کی طرح، میں اسے اپنے اتنا قریب دیکھ کر ذرا جھجک سا گیا۔ سامنے کی ڈریسنگ ٹیبل پر سبز رنگ کا گلدان رکھا ہوا تھا۔ گل دان میں گلاب کے تازہ پھول آویزاں تھے۔ وہ آتشیں نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں بالکل خاموش ہو گیا۔ وہ گل دان کی طرف جھکی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے ایک پھول توڑا میں بے اختیار اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں بہت کچھ دیکھتا رہا۔ میں بہت کچھ سونگھتا رہا۔ کن انکھیوں سے اس کی مرمریں جلد کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی طرف۔ اس کی ریشمی گردن کی طرف۔ اس کا بلاوز آج زیادہ کھلا ہوا تھا۔ گردن کے پیچھے کا حصہ نظر کے سامنے تھا اور ہلکا زردی رنگ کا بلاوز اسے چوم رہا تھا۔ پرمیلا نے جھک کر گل دان سے ایک پھول توڑ لیا۔ وہ پھول توڑتے وقت ضرورت سے زیادہ جھکی۔ میری نگاہیں بھی زیادہ جھکیں۔ نہ اسے اتنا

زیادہ جھکنا چاہئے تھا۔ نہ میری آنکھوں کو۔ میری نگاہیں، اُس کے سینے کی طرف پھسل سی گئیں۔ آنکھوں میں ایک نشہ سا آگیا۔ ہائے وہ سپید سپید سا سینہ۔ اتنا خوبصورت سینہ کسی کا نہ ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا۔ اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کہیں اُس کا جسم میرے ساتھ ٹکرا نہ جاتے۔ میں ذرا اور کھسک گیا۔ اُس نے گلاب کے پھول کو ایک بار سونگھا اور پھر مجھے دیا۔ میں نے خاموشی سے کانپتے ہوئے لبوں سے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس پھول کو پکڑ لیا۔ پھول کو ایک بار دیکھا، اور پھر پرمیلا کو۔ کہیں کانٹا نہ تھا۔ سب کانٹے صاف تھے۔ وہ آتشیں پھول، اور اُس کی سُرخ سُرخ پتیاں میری طرف جھانک رہی تھیں۔ فضا میں ایک غنودگی سی طاری تھی۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ تھی۔ کانچ کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ تھی۔ کسی کے بال کندھوں پہ پریشان تھے۔ لب لرزاں تھے۔ گورا۔ گورا رنگ ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ ہر ذرّہ آتشیں ہوگیا تھا۔ لیکن میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس حسن سے مسحور ہوکر۔ ایک قیدی کی طرح، اُس پھول کو پکڑے ہوئے صوفے پر الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ اور کسی کی آنکھیں، میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں میک اپ مین داخل ہوا اور پرمیلا صوفے سے اُٹھ کر کرسی پر جا بیٹھی اور میں پھول پکڑے، باہر نکل آیا۔

جی میں آیا، کہ سٹ پر جا کر سب کو یہ سُرخ پھول دکھا دوں اور کہوں، جلو —— اور جلو —— دیکھو، یہ میرے ضبط اور خلوص کا صلہ ہے۔ دیکھو۔ یہ میری محبت کی یادگار ہے، دیکھو۔ اس پھول کی شہ رگ میں میرے دل کا خون ہے۔ دیکھو۔ اس پھول کی خوشبو میں میرے حسین خوابوں کی رنگت ہے۔ دیکھو۔ میں پرمیلا کو چاہتا ہوں۔ میں اُسے پیار کرتا ہوں۔ میں اُس کے لئے مارا مارا پھرتا ہوں مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ دن کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ پھول میرے پاس ہے۔ یہ میری جوانی کا شاہکار ہے۔ میری محبت کا تاج محل ہے۔ یہ میرا ایلورا ہے، اجنتا ہے لیکن میں نے پھول جیب میں ڈال لیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ نہیں کہا۔ کسی کو پھول نہیں دکھایا۔ اپنی محبت کی منزل کا حال کسی سے نہ کہہ سکا۔ کسی کے آگے چرچا نہ کیا۔ فتح اور کامرانی کے گیت نہ گائے۔ کہیں بینڈ نہ بجا۔ دور دور تک شہنائی کی آواز نہ آئی۔

فلم بن گئی۔

پانچ سال گزر گئے۔

میں پرمیلا سے نہ مل سکا۔ کئی بار سوچا، کہ پرمیلا سے ملنے کے لئے اُس کے گھر جاؤں گا اور اپنے دل کا حال کہوں گا۔ لیکن دل کا حال نہ کہہ سکا۔ دل میں کہتا پہلے ایک کار لے لو۔ میں نے پانچ سال کار خریدنے کی جدوجہد میں گزار دیئے۔ میں نے دن رات کام کیا۔ محنت اور خلوص کا پرچم بلند کیا۔ لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جس شخص سے ملنے کے لئے جی نہ چاہتا تھا اُس سے ملا۔ جس کام سے نفرت تھی، اُس کام کو کیا۔ لوگوں کو دھوکا دیا، فریب دیا۔ اکثر جھوٹ بولا۔ لوگوں کی گالیاں سُنیں۔ چاپلوسی کی، گڑگڑایا۔ جس بات کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اُس کو برداشت کیا۔ لیکن کار نہ ملی۔ اگر اتنی محنت پرمیلا کے لئے کی ہوتی تو شاید میری محبت پر ایمان لے آتی۔ لیکن کار تو لوہے کی بنتی ہے، نا۔ اُس کی آنکھیں ہوتی ہیں، وہ چلتی ہے، پھرتی ہے، رکتی ہے، دوڑتی ہے، اُس کا دل ہے، رگیں ہیں۔ لیکن خون کی جگہ پیٹرول ہوتا ہے۔ اُسے میری حالت پہ ترس نہ آیا۔ وقت کے کوڑوں نے میری پیٹھ کو زخمی کر دیا۔ اب مجھ میں وہ دم خم نہ تھا۔ پانچ سال گزر چکے تھے۔ اب پرمیلا مجھے بھول چکی ہوگی۔ کوئی اور کار والا آگیا ہوگا آہستہ آہستہ میرے دل و دماغ میں ایک سکون سا آگیا۔ میں نے اپنے آپ کو وقت کے مطابق ڈھال لیا۔ ہاں اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہاں اب پرمیلا کو بھول جاؤ۔ کافی عرصہ کسی کی یاد میں گزار دیا۔ لیکن پرمیلا کی یاد دل سے نہ گئی۔ دل ویران ہوگیا۔ لیکن کھنڈر بدستور رہے، کوئی ایسی آندھی نہ آئی۔ کوئی ایسا طوفان نہ آیا، کوئی ایسا زلزلہ نہ آیا۔ جو ان کھنڈروں کو صاف کر دیتا، اور یہ زخم ہمیشہ کے لئے مندمل ہو جاتے۔

پانچ سال بعد کا واقعہ ہے مجھے ایک کہانی سُنانے کے لئے پرمیلا کے پاس پھر جانا پڑا۔ پانچ سال بعد بھی پرمیلا کا ستارہ عروج پر تھا۔ پروڈیوسر پرمیلا سے ملا تھا اور پرمیلا نے اس شرط پہ کام کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی تھی۔ اگر کہانی اُسے پسند آ جائے۔ تو وہ فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہوگی۔ پروڈیوسر نے یہ خیال مجھ پہ ظاہر کیا۔ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ پرمیلا کی ہاں پر اس فلم کے بننے کا دارومدار ہے۔

میں پرمیلا سے ملنے کے لئے گریز کرتا رہا۔ اگر اُس نے میری کہانی ناپسند کر دی، تو۔ نہ جانے پرمیلا کیوں زندگی کے ساتھ چپکی ہوئی ہے، زندگی کے ہر موڑ

محض مسکرا دو۔ تو پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہنس دو۔ لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ آنکھیں مٹکا کر ایک دو باتیں کر لو۔ بس آہیں بھریں گے۔ روئیں گے۔ تیشہ لے کر پہاڑ کھود دیں گے۔ تخت و تاج چھوڑ دیں گے۔ جنگ کرائیں گے۔ لاکھوں انسانوں کا خون کرائیں گے۔ بس ایک مسکراہٹ کی خاطر۔ ارے سیزر بن گئے۔ انطونی بن گئے ——

نہیں۔ نہیں۔ میں نے سوچا آج میں نے یہاں آکر اپنی خاموش محبت کی توہین کی ہے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کیا کوئی میری ہنسی تو نہیں اڑا رہا تھا۔

شاٹ ختم ہو گیا۔ پرمیلا پھر میرے قریب آئی۔ ”آخری بار مسکرا کر میری محبت کو ہمیشہ کے لئے دفنا دو پرمیلا“ میں نے یہ فقرہ پرمیلا کو کہنے کے لئے دل ہی دل میں سوچا، اور پھر خاموش لبوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ لوگوں نے فیصلہ کر دیا ہے۔ اب تم اپنا فیصلہ سنا دو۔ میرے لب خاموش تھے۔ لیکن لرزتے ہوئے ہونٹوں نے یہ فریاد اُس تک پہنچا دی۔

”لنچ کے بعد، تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ سیدھی سٹ پر چلی گئی۔

ہاں آج میں رسوائی سے بچ گیا۔ محبت کی کشتی چٹانوں سے ٹکرانے لگی تھی۔ کہ پرمیلا نے کشتی کا راستہ بدل دیا۔ اب کشتی گہرے پانیوں میں تھی۔ اسے ان گہرے پانیوں سے کون نکال کر ساحل تک لے جائے گا۔ یہ کسی نے نہیں سوچا۔ میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور لنچ کا انتظار کرنے لگا۔

لنچ ہوا۔ پرمیلا کار میں بیٹھ کر ہمارے سٹ پر آئی۔ جب لوگوں نے پرمیلا کو میرے ساتھ سٹ پر آتے ہوئے دیکھا تو ایک عجیب مسکراہٹ سب کے چہروں پر پھیل گئی۔ جیسے سب لوگ کہہ رہے تھے۔ ”ہاں آج تمہاری فتح کا دن ہے آج تم دولہن بیاہ کر لاتے ہو۔ تم نے فتح اور کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ تم محبت کی آزمائش میں کامیاب ثابت ہوئے ہو۔“ میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ اور زیر لب کہا ”ہاں جلو —— اور جلو —— خوب جلو ——“

لیکن اپنی جگہ پر کتنا نادم تھا۔ کتنا پریشان تھا۔ کتنا مضمحل اور افسردہ تھا۔ اس بات کا کسی کو علم نہ تھا۔ شاید پرمیلا بھی میری پریشانی سے آگاہ نہ تھی۔ اُس کا یہ احسان مجھ پر ایک آہنی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ مجھ پر احسان کرنے سے کیا فائدہ۔ تمہارے لئے کار کہاں سے لاؤں۔ اور ان دو سو روپوں سے چھٹکارا کیسے حاصل کروں —— تم سے اظہار محبت کر کے اپنی بے عزتی کیسے کرا لوں۔ اپنی انا کو کیسے پاش پاش کر دوں۔ بے حیائی کا لبادہ کیسے اوڑھ لوں۔ میں اپنی جگہ خاموش رہا۔ چپ رہا۔ اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ سڑتا رہا۔ گلتا رہا۔ —— لیکن دوسروں پہ یہ حقیقت کبھی آشکارا نہ ہونے دی۔

پھر وہ دن آ ہی گیا۔ آج فلم کی آخری شوٹنگ تھی۔ وہ صبح مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ بڑی پیاری صبح تھی۔ ہوا اپنے نازک ہاتھوں سے پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ آسمان نیلا اور شفّاف تھا۔ اور دھوپ چمکیلی اور نشیلی —— میں اُسی طرح فائل بغل میں دبائے ہوئے پرمیلا کے میک اپ روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا کہ دروازہ کھُلا۔ اور میں اندر داخل ہوا۔ پرمیلا نے میک اپ کر لیا تھا۔ اور وہ خوبصورت کپڑوں سے آراستہ ہو کر کرسی پر بیٹھی تھی، ہوا میں عطر کی خوشبو تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میک اپ مین باہر چلا گیا۔

میں نے پہلے فائل کی طرف دیکھا۔

”آج سین سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت کچھ سُن چکی ہوں جی۔“ پرمیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ بالکل ایک دوست کی طرح، میں اُسے اپنے اتنا قریب دیکھ کر ذرا جھجک سا گیا۔ سامنے کی ڈریسنگ ٹیبل پر سبز رنگ کا گلدان رکھا ہوا تھا۔ گل دان میں گلاب کے تازہ پھول آویزاں تھے۔ وہ آتشیں نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں بالکل خاموش ہو گیا۔ وہ گل دان کی طرف جھکی۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک پھول توڑا میں بے اختیار اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں بہت کچھ دیکھتا رہا۔ میں بہت کچھ سونگھتا رہا۔ کن انکھیوں سے اُس کی مرمریں جلد کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے بالوں کی طرف۔ اُس کی ریشمی گردن کی طرف۔ اُس کا بلاوز آج زیادہ کھُلا ہوا تھا۔ گردن کے پیچھے کا حصہ نظر کے سامنے تھا اور ہلکا زردی رنگ کا بلاوز اُسے چوم رہا تھا۔ پرمیلا نے جھک کر گل دان سے ایک پھول توڑ لیا۔ وہ پھول توڑتے وقت ضرورت سے زیادہ جھُکی۔ میری نگاہیں بھی زیادہ جھکیں۔ نہ اُسے اتنا

زیادہ جھکنا چاہئے تھا۔ نہ میری آنکھوں کو۔ میری نگاہیں، اُس کے سینے کی طرف پھسل سی گئیں۔ آنکھوں میں ایک نشہ سا آگیا۔ ہائے وہ سپید سپید سا سینہ۔ اتنا خوبصورت سینہ کسی کا نہ ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا۔ اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کہیں اُس کا جسم میرے ساتھ ٹکرا نہ جاتے۔ میں ذرا اور کھسک گیا۔ اُس نے گلاب کے پھول کو ایک بار سونگھا اور پھر مجھے دیا۔ میں نے خاموشی سے کانپتے ہوئے لبوں سے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس پھول کو پکڑ لیا۔ پھول کو ایک بار دیکھا، اور پھر پرمیلا کو۔ کہیں کانٹا نہ تھا۔ سب کانٹے صاف تھے۔ وہ آتشیں پھول، اور اُس کی سُرخ سُرخ پتیاں میری طرف جھانک رہی تھیں۔ فضا میں ایک غنودگی سی طاری تھی۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ تھی۔ کانچ کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ تھی۔ کسی کے بال کندھوں پہ پریشان تھے۔ لب لرزاں تھے۔ گورا۔ گورا رنگ ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ ہر ذرہ آتشیں ہو گیا تھا۔ لیکن میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس حسن سے محصور ہو کر۔ ایک قیدی کی طرح، اُس پھول کو پکڑے ہوئے صوفے پر الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ اور کسی کی آنکھیں، میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں میک اپ مین داخل ہوا اور پرمیلا صوفے سے اُٹھ کر کرسی پہ جا بیٹھی اور میں پھول پکڑے، باہر نکل آیا۔

جی میں آیا، کہ سٹ پہ جا کر سب کو یہ سُرخ پھول دکھا دوں اور کہوں، چلو ـــــ اور چلو ـــــ دیکھو، یہ میرے ضبط اور خلوص کا صلہ ہے۔ دیکھو۔ یہ میری محبت کی یادگار ہے، دیکھو۔ اس پھول کی شہ رگ میں میرے دل کا خون ہے۔ دیکھو۔ اس پھول کی خوشبو میں میرے حسین خوابوں کی رنگت ہے۔ دیکھو۔ میں پرمیلا کو چاہتا ہوں۔ میں اُسے پیار کرتا ہوں۔ میں اُس کے لئے مارا مارا پھرتا ہوں مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ دن کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ پھول میرے پاس ہے۔ یہ میری جوانی کا شاہکار ہے۔ میری محبت کا تاج محل ہے۔ یہ میرا ایلورا ہے، اجنتا ہے لیکن میں نے پھول جیب میں ڈال لیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ نہیں کہا۔ کسی کو پھول نہیں دکھایا۔ اپنی محبت کی منزل کا حال کسی سے نہ کہہ سکا۔ کسی کے آگے چرچا نہ کیا۔ فتح اور کامرانی کے گیت نہ گائے۔ کہیں بینڈ نہ بجا۔ دور دور تک شہنائی کی آواز نہ آئی۔

فلم بن گئی۔

پانچ سال گزر گئے۔

میں پرمیلا سے نہ مل سکا۔ کئی بار سوچا، کہ پرمیلا سے ملنے کے لئے اُس کے گھر جاؤں گا اور اپنے دل کا حال کہوں گا۔ لیکن دل کا حال نہ کہہ سکا۔ دل میں کہتا پہلے ایک کار لے لو۔ میں نے پانچ سال کار خریدنے کی جدوجہد میں گزار دیئے۔ میں نے دن رات کام کیا۔ محنت اور خلوص کا پرچم بلند کیا۔ لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جس شخص سے ملنے کے لئے جی نہ چاہتا تھا اُس سے ملا۔ جس کام سے نفرت تھی، اُس کام کو کیا۔ لوگوں کو دھوکا دیا، فریب دیا۔ اکثر جھوٹ بولا۔ لوگوں کی گالیاں سُنیں۔ چاپلوسی کی، گڑگڑایا۔ جس بات کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اُس کو برداشت کیا۔ لیکن کار نہ ملی۔ اگر اتنی محنت پرمیلا کے لئے کی ہوتی تو شاید میری محبت پر ایمان لے آتی۔ لیکن کار تو لوہے کی بنی ہے، نا۔ اُس کی آنکھیں ہوتی ہیں، وہ چلتی ہے، بھرتی ہے، رکتی ہے، دوڑتی ہے، اُس کا دل ہے، رگیں ہیں۔ لیکن خون کی جگہ پیٹرول ہوتا ہے۔ اُسے میری حالت پر ترس نہ آیا۔ وقت کے کوڑوں نے میری پیٹھ کو زخمی کر دیا۔ اب مجھ میں وہ دم خم نہ تھا۔ پانچ سال گزر چکے تھے۔ اب پرمیلا مجھے بھول چکی ہوگی۔ کوئی اور کار والا آگیا ہوگا آہستہ آہستہ میرے دل و دماغ میں ایک سکون سا آگیا۔ میں نے اپنے آپ کو وقت کے مطابق ڈھال لیا۔ ہاں اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہاں اب پرمیلا کو بھول جاؤ۔ کافی عرصہ کسی کی یاد میں گزار دیا۔ لیکن پرمیلا کی یاد دل سے نہ گئی۔ دل ویران ہو گیا۔ لیکن کھنڈر بدستور رہے، کوئی ایسی آندھی نہ آئی۔ کوئی ایسا طوفان نہ آیا، کوئی ایسا زلزلہ نہ آیا۔ جو ان کھنڈروں کو صاف کر دیتا، اور یہ زخم ہمیشہ کے لئے مندمل ہو جاتے۔

پانچ سال بعد کا واقعہ ہے۔ مجھے ایک کہانی سُنانے کے لئے پرمیلا کے پاس پھر جانا پڑا۔ پانچ سال بعد بھی پرمیلا کا ستارہ عروج پہ تھا۔ پروڈیوسر پرمیلا سے ملا تھا اور پرمیلا نے اس شرط پہ کام کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی تھی۔ اگر کہانی اُسے پسند آ جائے۔ تو وہ فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہو گی۔ پروڈیوسر نے یہ خیال مجھ پہ ظاہر کیا۔ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ پرمیلا کی ہاں پہ اس فلم کے بننے کا دارومدار ہے۔

میں پرمیلا سے ملنے کے لئے گریز کر رہا تھا۔ اگر اُس نے میری کہانی ناپسند کر دی، تو۔ نہ جانے پرمیلا کیوں زندگی کے ساتھ چپکی ہوئی ہے، زندگی کے ہر موڑ

میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کروں گا۔ صرف جانے سے پہلے ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں، کہ مسرت ایک لمحے کی ہوتی ہے اندر—
ہاں ایک لمحہ کی۔ اور یہ لمحہ تمہارا ہے اور تمہاری محبوبہ کا۔

یہ کہہ کر بوڑھا اونکار خاموش ہو گیا۔ بوڑھے اونکار نے اپنی آنکھیں میچ لیں، اور ایک ہولناک سنّاٹا کمرے میں چھا گیا۔ نوجوان چپکے سے اُٹھا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

مضامینِ جمال الدّین افغانی

جمال الدین افغانی ایسا نڈر اور بے باک رہنما تھا جس سے انگریزوں کی سلطنت کانپ اٹھی تھی۔ ان جیسا انگریزوں کا دشمن اور مسلمانوں کا خیر خواہ ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔

مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کیلئے انہوں نے عربی میں ایک اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس میں جتنے آتشیں مضامین نکلے تھے وہ سب اس کتاب کی زینت ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر لا کر تمام دنیا کی سرداری کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ آج بھی پورا ہو سکتا ہے۔

قیمت -/۵

اِنتقاد

سیّد عابد علی عابدؔ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ، عابد صاحب نامور شاعر، بہترین انشاپرداز اور بے مثل نقّاد ہیں۔ ان کی تنقید میں روایتی نقّادوں کی طرح ثقالت اور یاوہ گوئی نہیں ہوتی۔

یہ جو بات بھی کہنا چاہتے ہیں اس کیلئے مناسب الفاظ ڈھونڈتے ہیں اور رچی تلی بات کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں شعروں کی سی مٹھاس اور فیصلوں میں تلوار کی سی کاٹ موجود ہے۔ ان کے نزدیک کسی لفظ کا غلط استعمال گناہ ہے اور یہ بھی گناہ ہے کہ نقّاد اپنے ساتھ قاری کو بھی اُلجھا دے۔

قیمت -/۳

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

سات دن کی بادشاہت

کشمیری لال ذاکر

ہیرا صبح سویرے ہی اپنے گاؤں سے شہر چلا آیا۔

اس کا گاؤں شہر سے چھ میل دور تھا اور وہ پچھلے تین برسوں سے ہر روز دن چڑھتے ہی شہر چلا آتا تھا جہاں وہ گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ گورنمنٹ سکول میں داخلہ اس نے آٹھویں جماعت میں لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے گاؤں کے ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول میں پڑھتا تھا جس کا ہیڈ ماسٹر اسے رتی بھر نہ بھاتا تھا۔ اس کی آواز بے حد کرخت اور اس کی آنکھیں بڑی دہشت ناک تھیں۔ اسے دیکھ کر اس کے ذہن میں جو تصویر ابھرتی تھی وہ اور بھی زیادہ ڈراؤنی تھی۔ آٹھ سال تک ہیرا نے اس کرخت گونجتی ہوئی آواز کو سنا تھا اور ان خوفناک آنکھوں میں سمائی ہوئی دہشت کا مقابلہ کیا تھا اور جب وہ آٹھویں جماعت پاس کر کے سکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ لے کر سکول کی چار دیواری سے باہر نکلا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اب تک وہ پھانسی کے تختے پر کھڑا تھا اور بالوں بھرے سیاہ جسم کا ایک بے ہنگم انسان ہاتھ میں پھانسی کی ڈوری لئے اپنی آنکھوں کی ساری آگ اس پر برساتا رہا تھا اور اب ایکدم سب کچھ بدل گیا تھا اور اس کی پھانسی کی سزا منسوخ ہو گئی تھی۔

ہیرا فطرتاً بڑا نازک مزاج تھا۔ اسے خوبصورت، رنگین اور متناسب چیزیں ہی پسند تھیں۔ اسی لئے اسے گندم کی بالیاں اور عورتوں کے لہنگے اچھے لگتے تھے اور کھیتوں میں ہل کی متوازی لکیریں بھی اچھی لگتی تھیں اور جب اس کا باپ اسے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے ساتھ لے جاتا تو وہ کام کم کرتا اور سوچتا زیادہ تھا اور جب سکول میں اس کی پٹائی ہوتی تو اس کے ہاتھوں کی سرخ سرخ ہتھیلیاں تو کم دکھتیں لیکن اس کے دماغ کی نسیں درد سے پھٹنے لگتیں۔

اور جب وہ اپنے گاؤں کے مڈل سکول سے نکل کر شہر کے گورنمنٹ سکول میں داخل ہوا تو اس کی نازک طبع کو بے حد سکون ملا۔ خوبصورت عمارت، کھلا میدان، پھولوں سے بھری کیاریاں، صاف کمرے، چمکتے ہوئے برآمدے، نیا فرنیچر، اجلی دیواریں، خوب بڑے بڑے بلیک بورڈ۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس طرح کھویا ہوا سا رہا جیسے بھرے میلے میں اپنے باپ سے بچھڑ گیا ہو حالانکہ اس کا باپ اس کے ساتھ تھا اور اسے بار بار کوس رہا تھا۔ اس کا باپ جب اسے بھاری بھر کم گالیاں دیتا تو اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کے بوجھ کے نیچے دب کر مر جائے گا۔ دراصل اسے کوئی بھی وزنی اور بھاری اور بوجھل چیز پسند نہ تھی۔ اسی لئے کبھی کبھی اسے اپنے باپ سے بھی نفرت ہونے لگتی اور اب ماں سے بھی ہونے لگی تھی جس نے جانے کیسے اپنا پیٹ مشک

کی طرح چھلا لیا تھا اور اسے چھپانے کے لئے ہر وقت اپنی اوڑھنی کی اوٹ کئے رکھنی تھی۔

لیکن اس وقت وہ خوش تھا کیونکہ اس کے ذہن کے آنگن میں اب بالوں بھرا جسم، دہشت ناک آنکھیں، سیلن بھرے کمروں کی بُو اور گھٹن نہ رہی تھی۔ ان کی جگہ آم کے گھنے درختوں کی چھاؤں، پھولوں کے رنگ اور ان سب سے زیادہ نئے ہیڈ ماسٹر کی پیاری سی شخصیت تھی جو ہیڈ ماسٹر کم اور انسان زیادہ دکھائی دیتا تھا اور وہ بھول گیا تھا کہ اس کے ساتھ اس کا باپ تھا جس نے گھٹنوں تک اونچی دھوتی باندھ رکھی تھی، جس کی قمیص میلی تھی اور جس کی داڑھی کے سیاہ اور سفید بال خوب بڑھے ہوئے تھے اور جو اسے بات بات پر پیٹ دیتا اور ناقابلِ برداشت گالیاں دیتا تھا۔

پہلے ہی روز جب کلاس لگی تو ہیرا سب سے اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے اپنے کپڑے خوب دھوئے تھے، بالوں میں تیل لگایا تھا اور ان میں کنگھی کی تھی۔ کنگھی چونکہ اس نے پہلی بار کی تھی اس لئے بال اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک سے نہ بیٹھے تھے اور کہیں کہیں عجیب اوٹ پٹانگ انداز سے کھڑے تھے لیکن وہ خود اپنے آپ میں بڑا مطمئن تھا۔ اسے اس کی پروا نہ تھی کہ دوسرے اس کے متعلق کیا سوچتے تھے۔ اس کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھا شہری چھوکرا بار بار اس کی طرف دیکھتا تھا لیکن ہیرا اپنے آپ میں ہی مست تھا۔ کلاس ٹیچر نے حاضری لیتے ہوئے جب اس کا نام پکارا تو اسے جیسے پہلی بار اپنی اہمیّت کا احساس ہوا۔ وہاں گاؤں کے سکول میں تو ہیڈ ماسٹر نے اسے کبھی ہیرے سے زیادہ کچھ نہ کہا تھا اور یہاں اسے ہیرا سنگھ کہہ کر پکارا گیا تھا۔ کتنا بڑا فرق تھا، اور نازک مزاج ہیرا اسی بات پر مرمٹا۔

یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اس کے گاؤں کا کوئی اور لڑکا گورنمنٹ سکول میں نہ پڑھتا تھا۔ وہ قومی سکولوں میں داخل ہوتے تھے۔ ہیرا کو فیس کی رعایت مل گئی تھی چونکہ اس کے باپ نے پہلی عالمگیر جنگ میں حصّہ لیا تھا اور اس کی فوجی خدمات کی وجہ سے اسے سات روپے آٹھ آنے پنشن بھی مل رہی تھی۔ دوسرے لڑکوں کو گورنمنٹ سکول میں وہ رعایت نہیں ملی تھی اس لئے وہ تھوڑی رعایت لے کر قومی سکولوں میں داخل ہو گئے تھے۔ ہیرا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گاؤں کا کوئی بھی اور لڑکا اس کے سکول میں پڑھے اور تمام دن سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہے۔ اس سے بھی اس کے احساس کو چوٹ لگتی تھی۔

بہر حال اس نئے ماحول سے ہیرا مطمئن تھا۔ ہر صبح وہ گھر سے پیدل نکل پڑتا اور ٹھیک وقت پر سکول پہنچ جاتا۔ گاؤں کے دو لڑکے جو دوسرے سکول میں پڑھتے تھے سائیکلوں پر جاتے تھے اور کبھی کبھی ان کے اصرار پر وہ سائیکل کے کیریر پر بیٹھ جاتا ورنہ عام طور سے وہ پیدل ہی جاتا تھا۔ دوسروں کا احسان اسے پسند نہ تھا اور جب کبھی وہ وقت سے پہلے سکول پہنچتا تو بازار کا ایک چکّر ضرور لگاتا۔ اس سے اسے ایک آسودگی سی ملتی۔

سکول میں داخل ہوتے ہی اس نے جی لگا کر پڑھائی شروع کر دی۔ ایک بات اسے بے حد پریشان کرتی تھی۔ گاؤں کے سکول میں جتنی انگریزی اس نے پڑھ رکھی تھی وہ یہاں جماعت کے ساتھ چلنے کے لئے کافی نہ تھی۔ استاد زیادہ تر انگریزی ہی میں بولتے تھے اور اس لئے بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ریاضی میں تو اسے اور بھی دقّت پیش آتی تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور محنت کر کے جماعت کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ کمزور تو وہ رہا لیکن نالائق نہیں۔ اگلی سیٹ بھی اس نے نہ چھوڑی۔ اس کے ساتھ کے شہری لڑکے نے ایک آدھ بار اس سے چھیڑ خانی کرنی چاہی تو اس نے اسے بیچ میدان میں اچھی خاصی پٹخنی دی اور اس کے بعد جماعت کے کسی دوسرے لڑکے نے اس کے ساتھ بھڑنے کی کوشش نہ کی۔ وہ دوہرے جسم اور تگڑی جان کا لڑکا تھا اور سب نے اس کی یہ برتری تسلیم کر لی تھی۔

لیکن گھر میں اس کے باپ کی گالیاں ویسی ہی وزنی تھیں جن کے خلاف بغاوت کرنے کو اس کا بار بار جی چاہتا تھا اور اس کی ماں کا پیٹ پھولتا جا رہا تھا اور اب تو وہ آسانی سے اٹھ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ ہیرا اندر ہی اندر غصہ سے پھنک رہا تھا۔

جس روز ہیرا کی ماں نے ہیرا کی ایک اور بہن کو جنم دیا اس روز ہیرا نے گلزاری کو سڑک کے بیچ جی بھر کر پیٹا کیونکہ اس نے اسے سائیکل کے کیریر پر سے گرا دیا تھا۔ حالانکہ اس میں گلزاری کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس بے چارے کو تو خود بھی چوٹ آئی تھی اور اس رات ہیرا کے باپ نے اس کی ماں کو

لڑکی جننے پر بہت ہی گندی گندی گالیاں دی تھیں جن کی سڑاند سے ہیرا کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

سالانہ امتحان میں ہیرا پاس ہو گیا۔ ریاضی میں تو جیومیٹری کی مدد سے اس نے پاس ہونے کے نمبر حاصل کر لئے اور انگریزی کے دونوں پرچوں میں پاجامے کے نیفے میں اڑسے ہوئے کاغذ اس کے کام آ گئے۔

ہیرا دسویں جماعت میں چڑھا تو وہ بہت خوش تھا۔ اب وہ ہفتے میں دو بار خود اپنے کپڑے دھوتا تھا اور اب مسلسل کنگھی کرتے رہنے سے اس کے بال بھی اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک سے جم جاتے تھے۔ اب اس نے گاؤں کے چمار کے ہاتھ کی بنی ہوئی دیسی جوتی پہننا چھوڑ دی تھی اور باٹا کے کالے بوٹ لے لئے تھے۔ گلزاری فیل ہو گیا تھا اور اب ہیرا نندو کے کیریر پر بیٹھ کر سکول جاتا تھا اور کبھی کبھی خود بھی سائیکل چلاتا تھا کیونکہ نندو نے اسے سائیکل چلانا سکھا دیا تھا۔ نندو نے بھی گورنمنٹ سکول میں داخلہ لینا چاہا پر اسے داخلہ نہ ملا اور ہیرا اس پر خوش تھا۔ نندو آ جاتا تو کبڈی کی ٹیم کا کپتان وہی بنتا۔ نندو اگرچہ جسمانی لحاظ سے ہیرا سے ہلکا تھا لیکن کبڈی اس سے کہیں اچھی کھیلتا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے ہوٹ ویدر ٹورنامنٹ ہوئے تو ہیرا کی ٹیم ضلع بھر میں اوّل رہی اور ہیرا کو سب سے اچھا کپتان ہونے کی وجہ سے چاندی کا بڑا سا کپ ملا۔ سکول میں اس کی تصویر اتری اور ڈپٹی کمشنر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہیں بھیڑ میں کھڑے کسی تماشائی نے اسے اپنی لڑکی کے لئے پسند کر لیا۔ دوسرے روز جب وہ سکول آیا تو ہیڈ ماسٹر نے اسے اپنے دفتر میں بلایا جہاں اس نے دو دیہاتی زمیندار بیٹھے ہوئے دیکھے جن میں سے ایک لڑکی کا باپ تھا اور ہیرا کو دیکھنے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے اس سے کھیل کی باتیں کیں اور مسکراتا رہا اور لڑکی کے باپ کا ارادہ مضبوط ہوتا رہا اور جب وہ دفتر سے باہر جانے لگا تو لڑکی کے باپ نے پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دیا۔ ہیرا نے ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کس لئے؟

"چودھری صاحب تمہیں انعام دے رہے ہیں، لے لو۔" ہیڈ ماسٹر کے کہنے پر اس نے نوٹ لے لیا اور پرنام کر کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

اس نے سنا کوئی کہہ رہا تھا:

"بڑا اچھا لڑکا ہے۔" آواز لڑکی کے باپ کی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد جب سکول کھلا تو ہیرا کا بیاہ ہو چکا تھا اور جب وہ سکول آیا تو اس کے پاس نئی سائیکل تھی جس کی گھنٹی وہ بلا ضرورت ہی بجاتا تھا کہ دوسروں کو احساس ہو کہ اس کے پاس نئی سائیکل ہے، نئی ریشمی قمیص ہے اور نئی بیوی ہے —— اور نئی بیوی صرف ایک رات کے لئے اس کے گھر میں آئی تھی اور پھر واپس میکے چلی گئی تھی اور اس ایک رات میں بھی گاؤں کی عورتیں ہی اس کے پاس رہی تھیں۔ ہیرا بے چارہ تو چھت پر چارپائی ڈالے تاروں کو ہی دیکھتا رہا تھا۔ جنسی ضرورت سے زیادہ اسے اپنی بیوی کو دیکھنے کا اشتیاق تھا جو ہر نئے خاوند کو ہوتا ہے، اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پر جب وہ اسے نہیں دیکھ سکا تو پھر وہ معمولی بات غیر معمولی بات بن گئی تھی اور اب تو یہ بات اس کی شخصیت سے یوں چمٹ گئی تھی کہ ہزار بار جھٹکنے پر بھی الگ نہ ہوتی تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ہریانہ کے رواج کے مطابق اس کی بیوی سہاگ سے پہلے میکے سے واپس نہیں آ سکتی۔

اب ہیرا جماعت میں اگلی سیٹ پر بیٹھتا تو جیومیٹری کی مختلف شکلوں میں جانے کیسے اسے عورت کے جسم کی قوسیں، زاویے اور گولائیاں نظر آنے لگتیں۔ جیومیٹری کی ہر شکل اسے گھونگھٹ میں لپٹی ہوئی ایک دوشیزہ جان پڑتی اور جب ریاضی کا استاد اس شکل کو ٹرے سے بلیک بورڈ پر منتقل کر دیتا تو وہ سمجھتا جیسے اس کی نئی نویلی بیوی جھٹپٹے میں اپنے گھر کی دہلیز سے باہر پنگھٹ کے پاس کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ گھبرا جاتا اور ایک دم دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملنے لگتا اور اس کا وہ تصور آنکھوں پر جمی دھول کی طرح چھٹ جاتا۔

اس کے ذہن کی یہ کیفیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جیومیٹری کے پیریڈ میں اس کے لئے کلاس میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔

اور پھر امتحان کے ایڈمشن فارم بھرے گئے۔ فارم میں اس نے اپنا نام ہیرا سنگھ کی جگہ ہیرا سنگھ یادو لکھا۔

اور اس سے اگلے روز ہیرا سنگھ باڈھو نے اپنی جیومیٹری کی کتاب بیچ ڈالی تاکہ اسے قوسوں اور گولائیوں سے چھٹکارا مل جائے اور ان پیسوں سے اس نے سنیما دیکھا اور سنیما دیکھ کر جب وہ سائیکل پر گاؤں گیا تو وہ اتنا تیز جا رہا تھا کہ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور اس کے ذہن میں جیومیٹری کی بے شمار شکلیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔

اور پھر اس نے جیومیٹری کے پیریڈ مس کرنے شروع کر دئے اور امتحان تک جیومیٹری کو ہاتھ نہ لگایا اور وہ بغیر کسی تیاری کے امتحان میں بیٹھ گیا اور جیومیٹری کے پرچے میں سارا وقت قوسیں اور زاویے اور گولائیاں ہی بناتا رہا۔

اور آج ہیرا صبح سویرے ہی شہر چلا آیا تھا کہ یہیں اخبار میں اپنا رزلٹ دیکھے گا اور جب اس نے اخبار میں اپنا رول نمبر ڈھونڈا تو اسے مایوسی ہوئی۔ وہ شہر کی باہر والی سڑکوں پر سائیکل چلاتا رہا اور ڈاک کے وقت کا انتظار کرتا رہا کیونکہ رزلٹ کی بلیک لسٹ ڈاک سے آنی تھی جسے لینے کے لئے سکول کا چپراسی صبح سے وہاں بیٹھا تھا۔ جب وہ اس طرح سائیکل چلا چلا کر تھک گیا تو سکول میں چلا آیا جہاں اس نے بلیک لسٹ دیکھی اور جانا کہ وہ پانچوں مضمونوں میں فیل تھا۔

پانچوں مضمونوں میں فیل ہونے کی خبر وہ تحمل سے نہ سُن سکا۔ اسے بڑا صدمہ ہوا یہ خبر اس کے لئے بڑی وزنی تھی اور اس نے اس کے نازک احساس کو کچل کر رکھ دیا۔ ایک آدھ مضمون میں فیل ہونے کی اور بات تھی پر پانچوں مضمونوں میں صفر ہونا تو وہ برداشت نہ کر سکا اور سیدھا کمپنی باغ میں جا کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس بُری طرح تو وہ جب بھی نہ رویا تھا جب کبڈی کے میچ میں اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن آج تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ ننھو اور گاؤں کے دوسرے لڑکے سبھی پاس ہو گئے تھے۔ ایک وہی فیل ہوا تھا۔ اب وہ کیسے منہ دکھائے گا گاؤں والوں کو۔ اس کا باپ تو اسے دیکھتے ہی گالیاں دینے لگے گا اور اس کی ماں جو پھر اپنا پیٹ پھلانے لگی تھی اپنی کراہت آمیز ہمدردی اس کے حلق میں ٹھونسے گی اور اسے اُبکائی آنے لگے گی۔

پھر ہیرا کو اپنی بیوی کا خیال آیا۔ اسی کم بخت نے تو ڈبویا تھا اسے۔ ایک رات کے لئے سالی آ نہ سکتی تھی میکے سے،' اب بیٹھی رہے باپ کے گھر، عمر بھر منہ نہ لگاؤں گا سالی کو۔' پر اب بیوی کا خیال آیا تو اس کے ساتھ وہ سب لطافتیں اور گُھماؤ نہیں تھے جو اس سے پہلے اس کے تصوّر کو جھنجھوڑا کرتے تھے۔ ایک ہی بھرپور شکست نے اس کا ذہن سپاٹ کر ڈالا تھا جیسے کھیت میں ہل چلانے کے بعد اس پر وزنی سہاگا پھیر دیا گیا ہو اور ہر لکیر نیچے دب کر رہ گئی ہو۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ گاؤں واپس نہیں جائے گا، شہر ہی میں رہے گا اور مزدوری کرے گا۔

شام تک وہ باغ میں لیٹا رہا اور طرح طرح کے ارادے باندھتا رہا۔ پھر اس نے سائیکل پکڑی اور بازار میں آ گیا۔ کچھ آنے اس کی جیب میں تھے، ان کی اس نے لسّی پی لی۔ جب وہ بنچ پر بیٹھا لسّی پی رہا تھا تو اس کی نگاہ سامنے کی دکان پر پڑی۔ بورڈ پر لکھا تھا:

"یہاں رکشا کرائے پر ملتی ہیں"

اور ہیرا نے لسّی پیتے پیتے ہی اپنے لئے آخری فیصلہ کر لیا۔ لسّی پی چکنے کے بعد وہ سیدھا رکشا والے کی دکان پر گیا۔

"مجھے ایک رکشا چاہئے۔"

"کرائے پر؟"

"ہاں!"

"چوبیس گھنٹوں کا اڑھائی روپے کرایہ ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" ہیرا نے بغیر کچھ سوچے سمجھے جواب دے دیا۔

"لیکن ضمانت؟" رکشا والے نے کہا۔

"یہ میری نئی سائیکل ہے، تم اپنے پاس رکھ لو۔" ہیرا نے جواب دیا۔

دکاندار نے ہیرا کی دلہن کی طرح سجی ریلے کی نئی سائیکل جس کی وہ بلا ضرورت گھنٹی بجایا کرتا تھا، اٹھا کر دکان کے اندر رکھ لی اور اسے ایک پرانی سی رکشا دے دی۔

"کبھی پہلے بھی چلائی ہے رکشا؟" دکاندار نے ہمدردی سے پوچھا۔

"نہیں!"

"تو اسے کچھ دیر خالی ہی باہر کی سڑکوں پر چلاؤ تاکہ تمہارا ہاتھ جم جائے۔"

ہیرا اس پرانی ڈھچر رکشا پر بیٹھ گیا جو پہلے کرائے دار نے تنگ آ کر کل ہی دکاندار کو واپس کی تھی۔ اس نے کچھ ہی روز میں کرائے دار کی کمر توڑ ڈالی تھی۔

ہیرا رکشا کو لئے باہر کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس کے جذبات اتنے مشتعل تھے کہ اسے رکشا کے پرانے اور بھاری پن کا احساس ہی نہ ہوا۔

جب وہ واپس دکان پر آیا تو رکشا کے مالک نے پوچھا:

"ہاتھ جم گیا رکشا پر؟" اس بیچ میں اس نے ہیرا کی نئی ریلے کی سائیکل کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا۔

"ہاں جم گیا!"

"رکشا کا دھندا کرنا چاہتے ہو تو ایک وقت مالش ضرور کروایا کرو نہیں تو نسیں پھول جائیں گی۔"

ہیرا کو اس کی ہمدردی اچھی لگی۔ اس نے ہیرا کو مالش والے کی دکان بھی بتا دی۔

"لیکن کرایہ ہر روز رات کے دس بجے سے پہلے مل جانا چاہئے۔"

"مل جائے گا۔" ہیرا نے جواب دیا اور بالکل رکشا والوں کے سے انداز میں رکشا کو گھما کر ہوا ہو گیا۔ وہ سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف گیا، کیونکہ گاڑی کا وقت ہو رہا تھا۔

چار گاڑیاں یہاں سے گذرتی تھیں۔ اس نے سوچا بس وہ یہی چار گاڑیاں دیکھا کرے گا، شہر میں نہیں گھومے گا۔ شہر میں گھومنے سے کسی نہ کسی کی نظر اس پر پڑ جائے گی اور وہ پکڑا جائے گا۔ کچھ دن اس طرح گذر جائیں اور وہ کچھ روپے کما لے تو کسی دوسرے شہر میں جا کر کوئی دھندا شروع کرے گا۔

دوسری صبح اٹھ کر اس نے سب سے پہلے مالش کرائی۔ مالش کرانے کا اسے خوب مزا آیا۔ مالش کے اس نے آٹھ آنے دئے۔ چھ آنے کی اس نے لسی پی اور دو آنے میں بیڑی کا ایک بنڈل اور ماچس لی اور پھر دن میں اس نے چاروں گاڑیاں دیکھیں اور رات کو بھی مالش کرائی اور رکشا کے مالک کو دس بجے سے پہلے پہلے اس کا کرایہ ادا کر دیا۔

یہ نیا رکشا والا اڈے پر پہنچا تو سب نے اس کا سواگت کیا۔ اتنا نخرے والا اور جسم کا تگڑا کوئی دوسرا رکشا والا نہ تھا۔ سب بے چارے مریل اور بے جان تھے۔ اڈے کے رکشا والوں نے آپ سے آپ تسلیم کر لیا کہ وہ ان سب سے برتر تھا۔

"یہ رکشا والا تھوڑی ہے، شہزادہ ہے۔" کستوری نے کہا۔

اور پھر سب نے اسے شہزادہ بنا دیا۔ کسی نے اس کا نام نہیں پوچھا، وطن نہیں پوچھا، ذات نہیں پوچھی۔ شہزادوں کا بھی بھلا کوئی نام اور وطن ہوتا ہے، وہ تو بس شہزادے ہوتے ہیں اور ہیرا ایک ہی دن میں ہیرے سے شہزادہ بن گیا۔

دو تین روز رکشا چلانے سے اسے معلوم ہوا کہ وہ رکشا کتنی ردی تھی۔ اسے خالی کھینچنے میں بھی اتنا ہی زور لگتا تھا جتنا کہ دو آدمی بٹھا کر۔ اس کے پہیے جھول کھاتے تھے اور سیٹوں کا چمڑا اکھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کے بغیر اب چارہ بھی کیا تھا۔ مہینہ بھر تو اب اسی کو کھینچنا پڑے گا، اس کے بعد کوئی دوسری صورت نکل سکے گی۔

سر پر سرخ رومال باندھے فلمی گانے گاتے ہوئے وہ سب سے پہلے ریلوے اسٹیشن سے چلتا تھا اور اپنی سواریوں کو اڈے سے کچھ فاصلے پر ہی اتار دیتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ اڈے پر اس کا کوئی جاننے والا نہ مل جائے۔ دوپہر کو جب دوسرے رکشا والے دھوپ میں محنت کرتے وہ کمپنی باغ میں آم کے درختوں کے نیچے سویا رہتا۔ رات کو مالش کرانے کے بعد اسے اتنے زور کی نیند آتی کہ پھر وہ اگلی صبح ہی اٹھتا۔ وہ جو ایک چیز اس کی شخصیت کے ساتھ اتنے دنوں چمٹی رہی تھی خود بخود ہی کہیں گر گئی تھی۔ وہ قوسیں اور گولائیاں جو اسے رُلا دینے کی حد تک پریشان کیا کرتی تھیں اب جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ جیسے ان کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔

رات کو جب وہ رکشا کے مالک کو کرایہ دینے جاتا تو ایک بار اپنی نئی سائیکل کو ضرور دیکھتا جو دکان کے اندر کھڑی ہوتی اور جسے دکاندار کا لڑکا دن بھر اِدھر اُدھر گھماتے پھرتا۔ ہیرے کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ علم ہوتا تو وہ اسے کبھی برداشت نہ کرتا اور پرانی رکشا کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دکان کے سامنے ڈھیر کر دیتا۔

ہیرا کو نمی بڑی پسند تھی۔ آج اس کا نمی کی پکچر دیکھنے کا پروگرام تھا۔ گاڑی نو بجے پہنچتی تھی، پکچر ساڑھے نو بجے شروع ہوتی تھی۔ وہ سواریوں کو اڈے سے اِدھر ہی اتار کر سیدھا سینما چلا جائے گا اور وہیں کچھ کھا پی بھی لے گا۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والی پہلی دو سواریوں کو اس نے اپنی رکشا میں بٹھایا اور چل پڑا۔ ریلوے اسٹیشن شہر سے کوئی اڑھائی میل دور تھا اور چونکہ وہ میونسپل کمیٹی کی حدود سے باہر تھا وہاں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ دونوں طرف سے نیم کے بڑے بڑے درختوں سے گھری ہوئی اندھیری سڑک تھی جس پر رکشا اور تانگے والے بھی عموماً بغیر روشنی کے ہی چلتے تھے۔

ہیرا خوب تیز رکشا چلا رہا تھا اور ایک ٹپہ گا رہا تھا جو اس نے آج ہی کستوری سے سیکھا تھا۔ ہیرا اور کستوری دونوں گہرے دوست بن گئے تھے۔

جدوں ہان دے منڈے نے اکھ ماری
تے ٹُلاں نے جان پھیری

اس کا لہجہ تو ہریانہ ہی کا تھا لیکن طرز ٹھیک تھی۔ وہ مست تھا، اس کا سرخ رومال ہوا میں اڑ رہا تھا اور اس کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ اس آواز کو سب رکشا والے پہچانتے تھے۔ وہ ہیرے کی آواز تھی جو رکشا والوں کا شہزادہ تھا۔ رکشا میں بیٹھی سواریاں بھی اس کی داد دے رہی تھیں۔

اندھیرے میں ایک اور رکشا اس کے بالکل نزدیک سے ہو کر گذری۔ وہ اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔

”پی رکھی ہے سالے دیکھتا نہیں؟“ ہیرا نے اونچی آواز میں کہا۔

”ہاں پی رکھی ہے حرامی!“ دوسری رکشا والے نے جواب دیا۔ وہ کستوری تھا۔ دونوں دوست تھے۔ کسی نے دوسرے کی بات کا بُرا نہ مانا تھا۔

”او ہیرے روکیو ذرا۔“ لمحہ بھر کے بعد کستوری کی آواز پیچھے سے گونجی۔ ہیرا رک گیا۔ شاید اس کے دوست کو کوئی ضروری کام ہو۔

”سالا میرا سینما کا پروگرام خراب کرے گا؟“ اس نے رکشا میں بیٹھی سواریوں کو سناتے ہوئے کہا۔

کستوری کی رکشا ہیرے کی رکشا کے بالکل برابر کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہے سالے؟“ ہیرے نے کستوری کو مخاطب کیا۔

”تو اپنی سواریاں مجھے دے دے اور میری سواریاں تو بٹھا لے۔“

"کیوں؟"

"ایسے ہی۔"

"نہیں۔" ہیرے نے جواب دیا اور اپنی رکشا کا پیڈل گھمانے لگا۔

کستوری کی رکشا کی سواریاں فوراً ہی نیچے اُتر آئیں۔ ایک دیہاتی مرد تھا اور ایک عورت۔ مرد کے ہاتھ میں بڑا سا لٹھ تھا۔ اس نے لٹھ زمین پہ پٹکا۔

"بھاگ رہا ہے ماں کے یار؟" ہیرا نے آواز سُنی تو ایکدم گھبرا گیا۔ اس کا باپ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ میری رکشا میں آجائیں۔" کستوری نے ہیرا کی سواریوں سے کہا۔

"کیا معاملہ ہے؟" سواریوں نے پوچھا۔

"راستے میں بتاؤں گا، آپ بیٹھیے۔" ہیرے کی سواریاں کستوری کی رکشا میں بیٹھ گئیں اور کستوری نے اپنی رکشا شہر کی طرف گھما دی۔

"شہزادہ بنا پھرتا ہے سالا۔" کستوری نے جاتے جاتے طعنہ کسا اور ہیرا تڑپ کر رہ گیا۔ جیسے واقعی وہ شہزادہ تھا اور اب اس کی بادشاہت چھن گئی تھی۔ کسی چالاک رزیڈنٹ نے اس سے تخت لے کر دوبارہ اس کے باپ کو دے دیا تھا۔

ہیرے کا باپ اور اس کی ماں دونوں اطمینان سے رکشا میں بیٹھ گئے جیسے تخت کے اصلی حقدار وہی ہوں۔

"حرامی نے سات روز سے پریشان کر رکھا ہے، لے بھاگ اب کدھر بھاگتا ہے؟" ہیرے کے باپ نے لٹھ کو ایک بار زور سے رکشا کے پائدان پہ مارا اور ہیرا کا جی دہل گیا۔

اس نے پیڈل پر پاؤں جمایا اور بوجھل رکشا کے جھومتے ہوئے پہیے اندھیری سڑک پر گھومنے لگے۔

زینو

ابوسعید قریشی

اس کا جھونپڑا وادی کے دہانے پر واقع تھا، جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں تھا، صرف اس کی باتیں سُنی تھیں۔ رات کو جب وادی دودھیا دھندلکوں میں چھپ جاتی تو اس کا باپ حقّہ سلگا کر بیٹھ جاتا اور چراغ کی لو پر نظریں گاڑے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ اس کی دھوئیں میں لپٹی باتیں سُن کر احساس ہوتا کہ شاید اس کا حقّہ باتیں کر رہا ہے۔

”تیری ماں وادی کی سب سے حسین دوشیزہ تھی۔ بالکل تجھ جیسی۔ میں اسے یہیں بیاہ کر لایا تھا، اسی جھونپڑے میں۔ شہد کی مکھیاں اسے کبھی ڈنک نہیں مارتی تھیں۔ بالکل تیری طرح۔ اور اس کے ہاتھوں میں بھی ایسی ہی برکت تھی۔ تیری اس گوری گائے کی ماں جو گوالوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیا کرتی تھی، بکری ہی تو بن جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیا گنگناتی تھی اس کے کان میں۔ جب چاہو دودھ لو —— مرغیاں تھیں تو وہ جیسے کڑک بیٹھنا ہی نہیں آتا۔ ٹوکری بھری رہتی تھی انڈوں سے، اور جتنے انڈے بٹھاؤ اتنے ہی چوزے نکلتے تھے —— تیری چینیاں بھی تو ویسی ہی ہیں —— اور انگور، سیب، اخروٹ، خوبانی کا تو یہ حال تھا کہ منڈی میں بیچ کر بھی بانٹنے کو بچ رہتا تھا...... وہ جب کشیدہ لے کر بیٹھتی تھی تو تتلیاں بھول پڑتی تھیں کہ سچ مچ کے پھول ہیں —— تیرے ہاتھوں میں بھی وہی بات ہے —— مگر سوچتا ہوں کہ جب ان ہاتھوں میں مہندی لگے گی، بیاہ ہو گا تیرا اور تو چلی جائے گی کسی اور کے گھر، جس طرح تیری ماں اس گھر میں آئی تھی، تو تیرے باپ کا کیا بنے گا؟“

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی ابّا!“

”تو یہ نہیں جانتی پگلی کہ ایک کا گھر سُونا ہو کر ہی دوسرے کا گھر آباد ہوتا ہے، اور تیرے بیاہ کی تیاریاں تو تیری ماں نے تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہی شروع کر دی تھیں —— ”مجھے تو لڑکی چاہیئے۔ سات لڑکیاں چاہئیں۔ تین سسرال میں ہوں تو چار میکے میں۔ وہ اِدھر آئیں تو یہ اُدھر چلی جائیں اور ان کے بچے دن بھر گھر میں کھیلتے شور مچاتے پھریں۔“

”مجھ کو بھی ایک مُنّا لا دو گے ابّا؟“ زینو اپنے باپ کی بات کاٹتی۔ ”بڈھے چناروں کے جھنڈ تلے جہانیاں کے مُنّے جیسا! رونا تو آتا ہی نہیں اس کو۔ اتنا پیارا ہے کہ بس۔“ اور وہ اپنے باپ کی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی۔ ”لا دو گے نا ابّا؟“

"منالاؤں تجھے؟ —— جبھی تو کہتا ہوں کہ کاش تیری چھ بہنیں اور ہوتیں، یا پھر بھائی ہوتے —— تو تو بس پگلی ہوگئی ہے لڑکی۔ اتنی بڑی ہوگئی پر عقل نہ آئی۔ اب میں کیسے سمجھاؤں تجھے۔ کاش تیری ماں . . . ."

ایسے میں کہیں دور سے چنگ کی آواز آتی یا چکور کا نغمہ گونجتا۔ شاہ بلوط کی شاخوں میں ٹڈا اپنی سارنگی بجانے لگتا اور زینو بھول جاتی کہ ابھی ابھی اس نے اپنے باپ سے کیا فرمائش کی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھتی اور دروازہ کھول کر رات کے منظر کا جزو بن جاتی۔ دودھیا چاندنی میں چکوروں کے پیادھورے خوابوں کا پیرہن پہن لیتے۔ اُدھر کہیں دیودار کے پیڑوں کے نیچے سے چنگ کی چھن چھن اَن دیکھے ناچوں کی گت بن جاتی —— پن چکی کی گھمر گھمر، آبشار کا شور، زعفران کے کھیتوں کی مہک اور سبزے کے پُراسرار اندھیرے میں جگنوؤں کی جگمگاہٹ جیسے جہانیاں کا مُنّا آنکھیں جھپکتا تھا —— زینو اس تصویر کو بُت بنے دیکھتی۔ یہاں تک کہ چیڑوں کے پتوں میں ہوا گنگنانے لگتی اور زینو کے بالوں کی لٹیں اس کے گالوں پر لہرانے لگتیں۔

"پگلی ہوگئی ہے یہ لڑکی!" اس کا باپ حقے کا لمبا کش لگاتے ہوئے اسے آواز دیتا۔ "بند کردے اب دروازہ، ورنہ ہوا لگ جائے گی، اور تو تو اب اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ میں تیری تیمارداری بھی نہیں کرسکتا۔"

زینو اپنی کالی کالی التجا بھری آنکھوں سے جو نیند کے باعث اور بھی کالی نظر آتی تھیں، اپنے باپ کی طرف دیکھتی، جیسے کہہ رہی ہے کہ مجھے یہاں سے نہ ہٹاؤ۔

"بالکل اپنی ماں پر ——" بڈھے کا سر اپنے بارہا دوہرائے ہوئے جملے کی پھر تائید کرتا۔ "رات بہت بیت گئی زینو —— اب سو جا بیٹی!"

زینو کے ہونٹوں پر وہی پُراسرار مسکراہٹ ظاہر ہوتی جو اس کی ماں کے ہونٹوں پر نظر آیا کرتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ چاند یہ چکورہ، یہ چنگ اور چیڑوں کا نغمہ نیند میں مجھے کہاں ملے گا؟ —— مگر اس کا باپ چپکے سے اٹھتا اور اسے شاخوں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیتا۔ اس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے چھوتا اور اسے لحاف اوڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہتا۔ کاش آج اس کی ماں زندہ ہوتی۔

وہ جانتا تھا کہ زینو حسین ہے۔ وہ ابھی انگوٹھا ہی چوستی تھی جب اس کے لئے پیغام آنے شروع ہوگئے تھے لیکن اس نے ہر سوالی کو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا . . . . کتنے ہی آئے اور کتنے ہی یہ جواب لے کر چلے گئے۔ چنانچہ زینو چیڑ کے جنگلوں میں ہوا کی طرح آزاد کوہِ سیمیں کی کنواری چوٹی کی طرح ناقابلِ رسا تھی، جس تک پہنچنے کی آرزو میں کتنے جوگی کتنے گڈریے آہیں بھر کر رہ گئے تھے۔ سفیدے کے ستونوں، چناروں کے چھاتوں، قوسِ قزح کی قناتوں، جھیلوں، آبشاروں، چشموں اور ندی نالوں کی طرح وہ بھی وادی کی تصویر کا ایک ضروری جزو تھی ——

مگر ایک روز کلیوں، پھولوں، بھونروں اور تتلیوں کے موسم میں جب وادی سرکٹے ہوئے ساز کی طرح اپنا ازلی نغمہ الاپ رہی تھی یکایک یوں محسوس ہوا جیسے تار کھینچ گئے ہوں اور ان پر کسی نے الٹا سیدھا گز پھیرنا شروع کر دیا ہو۔ زینو اس روز پہاڑ کے دامن میں خودرو گلاب کے گہنے گوندھ رہی تھی اس آواز سے وہ چونک پڑی۔ کوئی ٹڈنگا تو نہیں گھس گیا تھا؟ —— نہیں، یہ پن چکی نہیں تھی! پتھروں پر پریوں کے آبشار کا شور بھی نہیں تھا! دہی کے مٹکوں میں بلونی کی آواز بھی نہیں تھی! چرخے کی گھوکر بھی نہیں تھی . . . . . .

اس نے افق پر نگاہ دوڑائی اور دور آسمان پر سیاہی کا دھبہ نظر آیا۔ سیاہی کا یہ دھبہ برابر نشان قریب آتا اور پھیلتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خوفناک آواز بڑھتی گئی۔ پہاڑوں کے پتھر لرزنے لگے۔ زینو خوف سے بُت بنی دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا بلا ہے؟ ایک مرتبہ اسے ٹڈی دل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اتنی بڑی بڑی ٹڈیاں جن کے پر اس کے جھونپڑے کی چھت سے بھی بڑے تھے، وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ نہیں یہ ٹڈیاں نہیں ہوسکتی تھیں! ایک بڈھے سیاح نے جو وادی سے گذرتے وقت ان کے یہاں ٹھہرا تھا، حبشیوں کے وطن کا حال سناتے وقت بتایا تھا کہ وہاں اتنے بڑے بڑے گدھ ہوتے ہیں کہ غزالوں کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر لے جاتے ہیں —— اس تصور سے وہ سہم گئی اور سورج مکھی کے پودوں میں ایک پتھر سے چمٹ گئی — اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بچپن میں جب وہ کوئی خوفناک کہانی سنتی تھی تو لحاف سے منہ ڈھانپ کر اپنے باپ سے لپٹ جایا کرتی تھی اور

اس کا خوف دور ہو جاتا تھا۔

"زینو!" گِدوں کے شور کو چیرتی ہوئی اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔ "تم کہاں ہو زینو؟"

لیکن زینو کی آواز حلق میں سوکھ گئی۔ اس نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا مگر سورج مکھی کی کیاریوں میں جہاں وہ چھپی ہوئی تھی گِدوں کے پروں کے سائے تیر رہے تھے —— پتھر کے گرد اس کی باہوں کا حلقہ اور تنگ ہو گیا۔

اپنی آواز کا جواب نہ پا کر زینو کے باپ نے اپنی بیٹی کی ہرنی کے بچے کو جسے پھولوں کی کیاریوں کو بچانے کے لئے کبھی کبھی باندھ دیا جاتا تھا کھول دیا۔ آہو بھاگا اور اس کے گھنگھروؤں کی آواز پر زینو کا باپ سورج مکھی کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔

"زینو! —— زینو بیٹی! یہ تیری باہوں کو کیا ہو گیا ہے؟ —— ڈر گئی پگلی —— اُٹھ، وہ چلے گئے۔"

گِد اب وادی کی دوسری جانب پرواز کر رہے تھے۔ سیٹیاں بجاتے، غوطے لگاتے، جیسے شکار کا جائزہ لے رہے ہوں۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ابا کہ یہ گِد مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔" زینو کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"ڈر مت میری بیٹی۔ کوئی ہوا نہیں ادھر لے آئی ہے۔ اس سے پہلے بھی ہوا ٹڈی دل کو لائی تھی اور ہم نے ٹڈیوں کو مار بھگایا تھا۔ ٹڈیاں تیرے دادا کے کھیت میں اتری تھیں مگر اس نے اپنے کھیتوں میں آگ لگا کر دوسرے کھیتوں کو بچا لیا تھا۔"

اس نے اپنا قصہ ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ کھڈوں، غاروں، وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے ایک اور قسم کا شور ہوا۔ چاروں طرف سے کسا اور گڈریے ڈھول پیٹتے، شور مچاتے اس جانب بڑھے جہاں گِد منڈلا رہے تھے۔

"دیکھا تو نے؟" زینو کے باپ نے کہا۔ "اس وادی کے لوگ تیرے دادا کا احسان نہیں بھول سکتے۔ تیرے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، کبھی تالا نہیں ڈالا تو نے۔ لیکن ہمارا کبھی ایک تنکا بھی گم ہوا؟"

زینو نے سر ہلایا کہ نہیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ وہ اب تک سہمی ہوئی تھی۔

"تیرے باغ سے سیب کا ایک دانہ یا انگور کا ایک خوشہ بھی کسی نے توڑا؟"

"نہیں!" زینو کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔

"تیری غزالہ، تیری مرغیاں اور بطخیں...... دن بھر ادھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں، کبھی کسی کا کتا بھی ان پر بھونکا؟"

"کبھی نہیں!" زینو نے جواب دیا۔

"یا پھر تو جو اندھیرے سویرے جنگلوں میں یا چشموں کے کنارے گھومتی رہتی ہے، کبھی کسی نے تجھے اکیلا پا کر جھوٹ موٹ ہی سے ڈرایا ہو؟؟؟"

"قطعاً نہیں۔" زینو نے کہا۔

"یہ سب تیرے دادا کی بدولت ہے۔ یہاں کے لوگوں پر اس کے ان گنت احسان ہیں، اور تو دیکھے گی کہ یہ ان گِدوں کو اسی طرح اڑا دیں گے جس طرح تیرے دادا کے وقت میں ٹڈی دل کی سرخ آندھی یہاں سے اٹھ گئی تھی ——"

"اور میرے بچپن کی بات ہے جب برف کا طوفان آیا تھا اور ہماری جھیل تک جم گئی تھی۔ ہم برف پگھلا کر پانی پیتے تھے۔ طوفان تھما تو پہاڑوں سے ریچھوں کی یلغار ہوئی۔ سفید بھوکے برفانی ریچھوں کو جب پہاڑوں پر کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا تو وادی پر ٹوٹ پڑے تھے اور پھر وہ جنگ شروع ہوئی تھی جس کی یاد سے میرا جسم آج بھی کانپ جاتا ہے۔ آدمیوں اور درندوں کی چیخوں سے پرندے اپنے آشیانوں کو چھوڑ کر دیوانہ وار اڑ رہے تھے اور چٹانوں سے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔ تیرے دادا نے ریچھوں کے راستے میں جگہ جگہ الاؤ روشن کروا دیے تھے اور ہاتھوں میں مشعلیں، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لئے لوگ دست بدست ریچھوں سے لڑ رہے تھے —— اتنے میں ایک عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ ایک ریچھ کہیں پیچھے سے ہوتا ہوا ایک جھونپڑ

گھس آیا تھا جو اس درخت سے صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع تھا جس کی شاخوں میں چھپا ہوا میں یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا جیسا اگلے وقتوں کے بادشاہ جھروکوں میں بیٹھے آدمیوں اور درندوں کو آپس میں لڑا دیا کرتے تھے ——"

"مگر اس ریچھ کا کیا ہوا ابا؟" زینو نے اپنے باپ کی بات کاٹی۔ اسے معلوم تھا اگر بادشاہوں کا قصہ چھڑ گیا تو ریچھ کی کہانی ادھوری رہ جائے گی۔

"ہاں تو وہ ریچھ جھونپڑے میں گھس گیا اور ایک عورت کو لے بھاگا —— بڑا موذی جانور ہے یہ ریچھ۔"

"موذی کیا ہوتا ہے ابا؟" زینو نے پوچھا۔

"تلوے چاٹ لیتا ہے عورتوں کے —— یہ مطلب ہے۔ اب میں تجھے کیسے بتاؤں بیٹی۔ بہت بے شرم ہوتا ہے یوں سمجھ لو۔ آدمی کی طرح۔ پر میں کیسے بتاؤں تجھے! کاش تیری ماں زندہ ہوتی اس وقت۔" اس نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ زینو جانتی تھی کہ جب وہ اس طرح سانس لیتا ہے تو بعض اوقات ایسی چپ سادھتا ہے کہ پہروں بیت جاتے ہیں۔ مگر یہاں ریچھ کی کہانی ادھوری رہی جا رہی تھی۔

"تو ریچھ اس عورت کو اٹھا کر لے گیا، اور اس کے بعد کیا ہوا ابا؟"

"ہاں —— مرجینا نام تھا اس کا۔ اس کی چیخ مجھے اپنے گرد کمند کی طرح لپٹتی ہوئی محسوس ہوئی، اور اگر میں نے درخت کی شاخوں کو نہ تھام لیا ہوتا تو زمین پر آ رہتا۔ خیر، مرجینا کی چیخ سن کر ایک آدمی، جس کے ایک ہاتھ میں مشعل تھی اور دوسرے میں درانتی، اڑتے ہوئے انگارے کی طرح لپکا اور اپنی درانتی ریچھ کے پیٹ میں گھونپ دی —— یہ شخص تیرا دادا تھا بیٹی —— زخمی ریچھ مرجینا کو چھوڑ کر تیرے دادا پر جھپٹا —— تیرے دادا کو ورزش کا بہت شوق تھا اور یہ اس کی جوانی کا زمانہ تھا۔ بڑے بڑے تیراکوں کا ہماری جھیل کے آدھے ہی میں سانس ٹوٹ جاتا تھا لیکن تیرے دادا نے اسے کئی بار پار کیا ہوگا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس پر ضرور خواجہ خضر کا سایہ ہے ورنہ یہ جھیل تو ایک سانس میں نہنگ سے بھی پار نہیں ہو سکتی ——"

"تو ریچھ نے مرجینا کو چھوڑ دیا اور دادا ابا پر جھپٹا۔" زینو نے کہا۔

"ہاں تو تیرا دادا جانتا تھا کہ زخمی ریچھ سے بچنا محال ہوتا ہے اور جب آدمی زندگی اور موت کا فرق مٹا دے تو بعض اوقات موت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ اس نے ریچھ کو باہوں میں لپیٹ کر بھینچنا جو شروع کیا تو درندے کی آنکھیں ابل پڑیں، منہ کھل گیا، بازو ڈھیلے پڑ گئے، حتیٰ کہ وہ بے جان ہو کر گر پڑا۔ بعد میں وہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ جنگ میں پہلا وار ہی آخری وار ہوتا ہے۔ اگر میں اس وقت سوچتا رہ جاتا تو میرا وہی حشر ہوتا جو ریچھ کا ہوا تھا۔"

دفعتاً گِدھوں کا ایک اور غول سیٹیاں بجاتا ہوا گذرا۔

"اوہ یہ نحس پرندے!" زینو کے باپ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "میرا گوپیا زینو...... میرا گوپیا!"

لیکن زینو جس کا خوف پھر عود کر آیا تھا، اپنے باپ کے گرد عشق پیچاں کی بیل کی طرح لپٹ گئی —— اس کا دل اس کبوتری کی طرح دھک دھک کر رہا تھا جس کے سر پر باز منڈلا رہا ہو۔

"اِدھر ہٹ کر کھڑی ہو جا بیٹی! یہ غلیظ پرندے شاید یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی جوانی میں جنگلی سوروں کے سر کچل چکا ہوں۔"

اور وہ پتھر اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار ہوا میں پھینکنے لگا لیکن گدھ بدستور سیٹیاں بجاتے گذرتے چلے گئے اور بوڑھے کے پتھر اس کے گرد یوں گرتے رہے جیسے سردیوں میں اولے۔

"جانے دو ابا! تم تھک جاؤ گے! یہ موذی بہت اونچے اڑ رہے ہیں۔" زینو نے اپنے باپ کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹیا!" بڈھے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ —— ورنہ —— لیکن میں اِن اِن اِن ٹڈیوں سے ہار نہیں مان سکتا۔

آدمی تو جنّات سے لڑ جاتا ہے۔"

اس کے منہ سے جنّات کا لفظ نکلا ہی تھا کہ ایک بگولا بلند ہوا اور سارے علاقہ میں پھیل گیا۔ غبار کم ہوا تو زینو اور اس کا باپ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک دیو کھڑا ہے۔ دیو نے زینو کے باپ کو جھک کر سلام کیا اور اس کی جانب گیندے کا ہار پھینکتے ہوئے بولا:

"تمہیں مبارک ہو بڑے میاں! تمہاری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا۔"

زینو کے باپ نے گیندے کے ہار کو، جو کمند کی طرح سیدھا اس کی گردن میں آ کے گرا تھا، توڑ کر جن کے منہ پر دے مارا۔

"لے جاؤ اپنے یہ مرگی[1] کے پھول، اور میری زعفران کی کیاریوں سے اس طرف ہو کر بات کرو۔ تمہارے سانس کے تعفن سے ان کی خوشبو جاتی رہے گی۔"

دیو کی اکیلی آنکھ جو اس کے ماتھے کے درمیان تھی، سلگنے لگی۔ اس کے بال ساہی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور دانت غرّا کے انداز میں نمودار ہوئے۔ لیکن وہ اپنا غصّہ پی گیا اور اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا:

"تیری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا ہے بڑے میاں۔ ہمارے بادشاہ نے اسے اپنے حرم کے لئے منتخب فرمایا ہے۔"

"میں نہ کہتا تھا بیٹی کہ تو جو ہر وقت پھولوں کے گہنے گجرے پہنے پھرتی ہے اور اندھیرے سویرے چشموں کے کنارے گھومتی ہے اچھ نہیں۔ یہ تیری ماں ہوتی تو سمجھاتی نا تجھے اس کا مطلب کہ کنواری بچیوں کو خوشبو سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔" زینو کے باپ نے اپنی بیٹی کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا۔ "اور سب سے بڑا ظلم تو نے یہ کیا کہ وہ تعویذ اتار دیا جو تیری ماں نے تیرے بازو سے باندھا تھا لیکن رو نہیں بیٹی — میرے جینے جی......"

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ آسمان سے نوبت و ناقوس کی آواز آئی —— شہ جنّات کا پیامی منہ کے بل گر پڑا اور ایک تخت زمین پر اترا۔

"ہم میں اتنی تاب نہیں تھی بڑے میاں کہ ہم تمہارے جواب کا انتظار کرتے اس لئے ہم خود چلے آئے۔"

"تم!" زینو کے باپ نے کہا۔

"ہاں! تمہاری بیٹی کے حسن کا شہرہ ہم نے اپنے دربار میں سنا تھا اور ایک روز جب تم لوگ اپنا غلّہ تقسیم کر رہے تھے ہمارا بھی ادھر سے گذر ہوا اور ہم نے دیکھا کہ نیلم ندی کے پانیوں میں ایک سفید شعلہ تیر رہا ہے — تیری بیٹی کا جسم کچی چاندی ——"

"چپ ہو جا بے غیرت عفریت!" زینو کا باپ غصے سے کانپ اٹھا۔

"اپنی بیٹی کی تعریف بھی نہیں سن سکتے بڑے میاں۔ بہت پیار ہے تمہیں اس سے! تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ وہ شہ جنّات کے پہلو میں بیٹھے گی اور دنیا کی کوئی نعمت اس کے لئے ناقابلِ رسا نہیں ہو گی۔"

"لیکن وہ تمہارے لئے ضرور ناقابلِ رسا ہے۔" زینو کے باپ نے کہا۔ "تم ناری ہو۔"

"تم نے اپنے اطبّاء سے نہیں سنا کہ تم میں بھی آگ موجود ہے —— تم اگر ٹھنڈے ہو جاؤ تو مر جاؤ۔"

"کل تو تم یہ کہو گے کہ نور اور نار دونوں میں روشنی ہے اس لئے ہم نوری ہیں۔"

"تمہیں منطق میں ضرور ید طولیٰ حاصل ہے بڑے میاں لیکن شاید تم طاقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے —— سو دلائل

---

[1] بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ گیندے کے پھولوں سے مرگی ہو جاتی ہے۔ (مصنف)

کی ایک دلیل۔"

"مگر طاقت سے تم روح کو زیر نہیں کر سکتے، اور جسم بغیر روح کے بالکل ویسا ہی ہے جیسے — جیسے —" اس نے رکتے ہوئے مناسب تشبیہہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے یہ وادی بغیر بہارے —— سو تیری طاقت کی مجھے اتنی بھی پروا نہیں جتنی اس پتھر کی —— لیکن تیری بدتمیزی، جسارت اور دھمکی کے باوجود میں تیری درخواست پر غور کرنے کو تیار ہوں، مگر ایک شرط ہے۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" جن نے جواب دیا۔

"لوحِ سلیمانی کی قسم کھا!"

"کھائی —— مگر اب مزید انتظار نہ کرا۔ آتشِ شوق نے مجھے پہلے ہی دیوانہ کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں بھسم کر دوں۔"

"تو سن —— میرے خاندان کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی بغیر اپنی رضامندی کے شادی نہیں کرتی۔"

"خوب! تو کیا میں تیری بیٹی سے پوچھ سکتا ہوں کہ کیا وہ ملکۂ جنات بننا منظور کرے گی؟ —— اے حسینہ! تیری ایک ہاں پر دنیا کی نعمتیں تیرے قدموں میں ہوں گی۔" اور اس نے موتیوں کی ست لڑی مالا اتار کر زینو کے قدموں میں پھینک دی۔ "کوہ قاف کی جھیلوں کا یہ تحفہ تیرے پاؤں کی دھول پر نثار ہے۔"

"کیا تیرے موتی میری جھیل میں کنول کے پتّوں پر اوس کے قطروں سے زیادہ حسین ہیں؟" زینو نے موتیوں کی مالا کی طرف بے التفاتی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"او جاہل لڑکی یہ ان سیپیوں کی سوغات ہے جنہیں قاف کی کنواری پریاں، مینہ کی پہلی بوندوں کی تلاش میں صدیوں اپنی جھولیوں میں لئے پھری ہیں۔"

"مجھے تیرا ہار نہیں چاہئے۔" زینو نے کہا۔ "کیا تو نے اپنے تاج کے پیچھے اپنا سینگ نہیں دیکھا؟"

عفریت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سر کی طرف گیا۔ وادی کے لوگوں نے جو گیدڑوں کو مارنے کے لئے اپنے گھروں سے آئے تھے اور زینو کے جھونپڑے کے گرد جمع ہو گئے تھے، ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ شہِ جنات نے چیخ ماری اور اس کے خدّام "پناہ! پناہ!" پکارتے ہوئے اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔

"کیا تجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟" زینو کے باپ نے دریافت کیا۔ "میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا تیرا ہم سے ملاپ نہیں ہو سکتا۔"

"چپ ہو جا بڈھے!" عفریت گرجا۔ "تجھے اور تیری گستاخ بیٹی، دونوں کو اس بدتمیزی اور ناشکری کی سزا دی جائے گی۔"

"تو قسم کھا چکا ہے —— سلیمان کے عذاب سے ڈر!"

"اسے شطرنج ہی سے فرصت نہیں کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے سکے۔ اس کا مجھے کوئی کھٹکا نہیں۔"

"تو اپنے ضمیر سے بھی نہیں ڈرتا؟"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اس قدر توہّم پرست واقع ہوا ہے۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو اس قدر مکّار اور وعدہ شکن ہے تو میں ان فضول باتوں میں کبھی اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔"

"تمہاری زبان گُدّی سے کھینچ لی جائے گی۔"

"تجھ پہ انگشتِ سلیمانی کا قہر ٹوٹے گا۔"

"اس کا طلسم اپنی طاقت کھو چکا ہے۔"

"تو پھر میں تیرا مقابلہ کروں گا۔" زینو کے باپ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

"مگر ان جنّات کو نہیں دیکھا تو نے ——— یہ دیو، یہ گِد، یہ بھُتنے ...... یہ سب میرے غلام ہیں۔" عفریت نے کہا۔

"اور ان کو بھی دیکھ لو۔" زینو کے باپ نے وادی کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرے بھائی ہیں، اور ان پہاڑوں کے اُدھر میرے اور بھی بھائی ہیں ——— تیرا مقابلہ کیا جائے گا۔"

عفریت چنگھاڑا اور زینو کی طرف بڑھا۔

اور پھر آدمیوں اور عفریتوں کے درمیان وہ جنگ شروع ہوئی جس کا شور سُن کر اڑوس پڑوس کی وادیوں سے زینو کے باپ کے دوسرے بھائی بھی اپنی آبائی تلواریں لے کر آ پہنچے جو ایک مدت سے ان کے صندوقوں میں بند تھیں۔

لوگ لاٹھیاں، کلہاڑے، درانتیاں، چپو اور پھاوڑے لے کر عفریتوں کے لشکر پر پل پڑے اور یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ شہ جنات گھبرا گیا۔ گلّہ بانوں، کسانوں اور ملاحوں نے اس کا تخت توڑ ڈالا۔ اس کے ساتھی دم دبا کر بھاگ گئے اور وہ خود ایک گِد کی دُم سے لٹک کر بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

لیکن عفریت کے فرار ہونے کے کچھ ہی دیر بعد، وادی کے دہانے کی طرف ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور پہاڑ پھٹ گیا اور آسمان کا ایک ایسا ٹکڑا آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا جسے وادی کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زمین لرزنے لگی اور جیسے اس کے پیٹ میں بادل لڑھک رہے تھے، بجلیاں کروٹیں لے رہی تھیں وادی کے نشیب و فراز سے گرج کی گونج اٹھی۔ پیڑوں کی چڑیاں، جھونپڑوں کے کبوتر، چٹانوں کی ابابیلیں بے تابانہ ہواؤں میں اڑنے لگیں۔ فضا میں شہد کی مکھیوں کے پر پھڑپھڑائے، جیسے ان کے چھتّے پر کسی نے پتھر پھینک دیا تھا۔ بھیڑ بکریاں ممیائیں، زینو کی گائے بلبلا اٹھی، اس کی مرغیوں نے گویا بِلّا دیکھ لیا، جھیل کی جانب سے ڈری ہوئی مرغابیاں بغیر قطار کے اڑتی نظر آئیں۔ خرگوش اپنے بھٹ چھوڑ کر نکل آئے اور دیکھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، درختوں کی شاخوں میں گلہریاں چک چک پوچھنے لگیں کہ یہ کیسی گڑگڑاہٹ ہے جس نے ہمیں درختوں کے تنوں میں بھی آرام نہیں لینے دیا۔ تتلیوں کے پر ذرّے بن کر پھولوں کے کٹوروں میں گر پڑے اور پھولوں کی پتیاں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ سیب، ناشپاتی اور شفتالو کی شاخوں سے کچے پھل آنسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے اور جھیل کے شفّاف پانیوں کی سنہری مچھلیاں کناروں پر تڑپتی دکھائی دیں۔

"بھونچال!" زینو کے باپ نے کہا۔ لیکن پہاڑ کا وہ شگاف بند کیوں ہوا جا رہا تھا۔

"اژدہے!" کسی نے کہا۔

"چیتے!" کوئی پکارا۔

"چیتوں کی آنکھوں والے اژدہے!"

"اژدہوں کے جسم والے چیتے!"

"گینڈے!"

"گینڈے اور ہاتھی!"

"چار چار سونڈوں والے ہاتھی!"

"آگ نکلتی ہے سونڈوں سے!"

"سؤر!"

"لمبے لمبے دانتوں والے جنگلی سؤر!"

"طلسمات!

"طلسمات!!"

"طلسمات!!!"

"ٹوٹ جائے گا یہ طلسم!" زینو کا باپ پکارا۔ "اپنی زمین کی مٹی اپنے ہاتھوں سے مل لو، مامون ہو جاؤ گے تم اس سحر سے ——— یہ فسوں تمہاری حمیّت کا امتحان ہے۔"

زینو کا باپ اور اس کے ساتھی نعرے لگاتے ایک بار پھر عساکر عدو پر ٹوٹ پڑے۔ اژدہے آگ اگلنے لگے، ان کے نتھنوں سے دھوئیں کے بادل اُمڈ رہے تھے۔ سؤروں کے دانتوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں اور ان کے ہونٹوں سے لاوا بہہ نکلا۔ زینو کے باپ کے ساتھی کٹ رہے تھے، گر رہے تھے، مر رہے تھے لیکن ان کا ہر قدم آگے ہی کو بڑھتا تھا۔ ان کی دیوانگی نے دیوؤں کی کمر دوہری کر دی اور جنّات کی فوج پھر اسی شگاف کی طرف پسپا ہوتی نظر آئی جدھر سے وہ داخل ہوئی تھی۔ مگر عین ایسے میں جب کہ ان کی شکست یقینی ہو چکی تھی آسمان یکایک تاریک ہو گیا۔ سورج گِدوں کے پروں کے پیچھے چھپ گیا۔

"ابّا!" زینو پکار اٹھی۔ "یہ گِدھ نہیں رُخ ہیں جنہوں نے سندباد کے جہاز کو پتھراؤ سے غرق کر دیا تھا۔"

رُخوں کے پرے وادی کے مختلف علاقوں پر پھیل گئے۔ وہ جہاں جہاں سے گذرتے زمین سے شعلے بھڑک اٹھتے اور لوگ "آگ کے بیچ! آگ کے بیچ!" پکارتے ہوئے اپنے گھروں کی آگ بجھانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن زینو کے باپ کے ساتھیوں میں پھر بھی ایسے لوگ موجود رہے جن کے سینوں میں زینو کے دادا کے احسانات سلگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے جلتے ہوئے جھونپڑوں سے منہ موڑ لیا اور ناموس کے نعرے لگاتے ہوئے پھر عساکر ابلیسی کی طرف بڑھے۔

مگر اتنے میں رُخوں کے پرے یکایک کہیں غائب ہو گئے اور اس جانب سے جہاں پہاڑ پھٹا تھا، ساون کے بادلوں کی طرح کالی کوئلوں کا جھنڈ اُمڈ آتا دکھائی دیا۔ ان کی چونچوں میں کچھ چمک رہا تھا۔ جب وہ زینو کے باپ کے لشکر کے اوپر پہنچیں تو انہوں نے اپنی چونچیں کھول دیں اور لشکر پر اشرفیوں کی بارش ہونے لگی ——— لوگ اشرفیاں لوٹنے کے لئے لپکے اور آپس میں اُلجھ گئے۔

زینو اور اس کا باپ اکیلے رہ گئے اور جنّات نے انہیں اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔

فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"اب بتاؤ!" آسمان سے شہِ جنّات کی آواز سنائی دی۔ "لیکن ہماری پیشکش بدستور موجود ہے۔ یہ لڑکی اگر اب بھی ہماری ہو جائے تو ہفت اقلیم کی ملکہ کہلائے گی۔"

"چپ ہو جا مردود!" زینو کے باپ کے منہ سے کف جاری ہو گیا لیکن اس کے بازو جکڑے ہوئے تھے۔ اس کا بدن اپنی جھیل کے کنارے بید مجنوں کی شاخوں کی طرح کانپنے لگا۔

"لیکن تو بڈھا ہو گیا ہے شاید، اور اپنی بُرائی بھلائی کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تیری بیٹی سے بات کریں گے ——— کوئی ہے؟" شہِ جنّات نے تالی بجائی۔ "وہ تاج کہاں ہے؟ ہماری ملکہ کا تاج، جسے ہمارے دربار کی کنواری پریوں نے ہماری دلہن کے لئے تیار کیا ہے ——— دیکھ لڑکی! اِدھر دیکھ! اس ہیرے کو دیکھ، ملکۂ سبا کے تاج میں بھی ایسا نگینہ نہیں ملے گا تجھے ——— اور یہ نیلم دیکھ رہی ہے تو! ساتویں آسمان کی نیلاہٹ اس کے آگے ماند ہے اور یہ زمرد! روئے ارض کا سبزہ اس سے اپنا رنگ ادھار مانگتا ہے [illegible] اور تونے کہانیوں میں

لعلِ بدخشاں کا نام سُنا ہوگا! ان لعلوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بدخشاں کے سوداگر اپنا ایمان نیلام کرتے ہیں۔ اس میں اس آگ کی سرخی جنہیں ہماری پجارنیں کبھی بجھنے نہیں دیتیں۔ خواجہ سنگ پرست کو اگر ان لعلوں کی آب کا حال معلوم ہو جائے تو اپنے کنٹھے کا پٹّہ اتار کر اسے اپنے گلے میں ڈ لے ---- لیکن تیری ایک ہاں پر یہ تاج تیرا ہے۔"

"تیرا تاج میری وادی کے خود رو گلاب کے تاج سے بہتر ہے؟ اور تیرے زیورات جن کا تو مجھے لالچ دے رہا ہے ان گجروں سے اچھے ہیں جو کی شاخیں میرے لئے ہر روز گوندھتی ہیں؟" زینو نے پوچھا۔

"سُن لیا تو نے؟" زینو کے باپ نے کہا، "اور اب کہ وہ آخری بار نہ کہہ چکی ہے، اگر تیری آگ میں غیرت کی کوئی بجھی ہوئی چنگاری بھی موجود ہے تیرا راستہ وہ ہے جدھر سے تو آیا ہے ---- رہے ہم اور ہمارے جلے ہوئے جھونپڑے، کھیتوں، کھلیانوں میں ہمارے مُردے، اور ہمارے باغوں میں ہوئے پھول اور کلیاں ---- سو ہم سمجھیں گے کہ یہ ہماری شامتِ اعمال تھی ---- جا ---- اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔"

"جذباتی بڈھا!" عفریت نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ملعون ناری!" زینو کا باپ بھڑک اٹھا۔ "تو ہمارے جذبات کو کیا سمجھ سکتا ہے ---- ہماری بیوائیں، ہمارے یتیم، ہماری لٹی آبرو ...... اور سب سے بڑھ کر ہماری عزت جو تیری شیطانی فوج کے ہاتھوں برباد ہوئی ---- تجھے ان جذبات کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ ہوس ک عفریت! جا دور ہو یہاں سے، ورنہ ایک ایک لاش بھڑک اٹھے گی اور پھر تجھے ---- تجھ ناری کو بھی اس حدّت سے پناہ نہ ملے گی۔ سمندروں کی ساون کی گھٹائیں، پہاڑوں کی برف اور کرّۂ زمہریر کی ہوائیں بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکیں گی ---- جا ---- جہنّم کی مخلوق دور ہو جا یہاں سے

"کپڑا ٹھونس دو اس بدلگام بڈھے کے منہ میں اور اس کی مغرور بیٹی کو اندھے غار میں ڈال دو! لیکن ٹھہرو۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کے رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم رحم و کرم کے جذبات سے عاری تھے۔"

اور بھولے بھٹکے سیّاحوں کا بیان ہے کہ زینو کی وادی میں اب زعفران کے کھیتوں سے لاشوں کا تعفن پھوٹتا ہے، تاکستانوں کی رگیں سوکھ گ ہیں، عشقِ پیچاں کو امربیل کھا گئی ہے، تھوہر کے کانٹوں نے نرگس کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں، چشموں کا پانی پہاڑوں کے سینے میں جذب ہو گیا ہے میں سنہری مچھلیوں کے بجائے جونکیں رینگتی ہیں، کنول کے پھول بجھے دلوں کی طرح سیاہ پوش ہیں، سیب کی شاخوں سے پتھر لٹکتے ہیں، جگنو اپنی بھول چکے ہیں، کوہِ سیماب کے مرغِ زریں پر کوّے کا گمان گزرتا ہے اور کوہِ گراں خواب کی برفوں کے نیچے نیلم کی رگیں کوئلہ بن گئی ہیں، شہد کی زنبوروں کی طرح ڈستی ہیں اور ان کے چھتوں میں تتلیوں کا بسیرا ہے، گایوں کے تھنوں سے کیچڑ چھٹتے ہیں..... اور ان فضاؤں میں جہاں کبھی تتلیو پر جگمگاتے تھے اب چمگادڑ مردہ چوہوں کی بو پھیلاتے ہیں...... گڈریوں کے چنگ گنگ ہیں اور پن چکی سے مکّی کے سنہرے آٹے کی بجائے شعلے

اور

اندھے غار کی گہرائیوں سے کبھی کبھی 'مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!' کی آواز آتی ہے اور غار کے باہر، ایک بڈھا جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے، پاؤں ہیں اور ہاتھ سلوں کے نیچے دبے ہیں، اپنا سر پتھروں سے پٹختا ہے، لیکن اس سے لہو کا ایک قطرہ نہیں نکلتا۔ خیال ہے کہ بے بسی کے احساس اس کا سارا خون خشک کر دیا ہے۔

ایک انسان کی موت

فکر تونسوی

شہر کے سب سے بڑے اور بارونق پُل پر ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ ابھی ابھی دس منٹ پہلے مرا ہے۔ اُس نے دانائی یہ برتی کہ پُل کے فٹ پاتھ پر مرا۔ اگر وہ پل کے عین درمیان مرتا تو ٹریفک رُک جاتا اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی۔ —— مرنے والے زندہ رہنے والوں سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتے ہیں۔

"ارے! —— یہ تو شمبھو فقیر ہے!" —— شمبھو فقیر کے ایک کامریڈ نندو فقیر نے آکر اعلان کیا۔ —— نندو فقیر شمبھو فقیر سے تین گز کے فاصلے پر بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا ہے، اس لئے پڑوسی ہونے کے ناطے سے اُس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اُٹھ کر آئے اور لوگوں کو بتائے کہ میرے مرحوم پڑوسی کا نام کیا ہے —— چنانچہ وہ لنگڑاتا ہوا آیا۔ لاش پر جُھکا اور چور سی فاتحانہ نگاہ شمبھو پر ڈالی، جیسے وہ نگاہ کہہ رہی ہو —— "میں نہ کہتا تھا شمبھو! آخر تم مر جاؤ گے اور تمہاری اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کر بھیک مانگنا پڑے گی؟"

شمبھو —— قسمت کا دھنی تھا۔ کیونکہ وہ عین اُس نادر موقع پر بیٹھا کرتا تھا۔ جہاں سے پُل کے پہلو سے اُترنے چڑھنے والی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کے کامریڈ نندو فقیر نے اس نادر جگہ کو حاصل کرنے کے لئے نجانے لاکھوں بار دُعا کی تھی، جب جا کر شمبھو مرا ہے ——

نندو نے اپنے کان پر سے ادھ جلی بیڑی اُتاری ہے اور شمبھو کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی ہے اور بیڑی سُلگا کر، ماچس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ہے —— "میرا اور شمبھو کا دس سال کا ساتھ تھا۔ ہم بالکل جگری دوستوں کی طرح بھیگ مانگا کرتے تھے۔ آہ! بھگوان نے اُسے مجھ سے پہلے بُلا لیا ——"

ایک ٹھنڈا سانس بھر کر بڑی حد تک وہ رونے لگا ہے۔ اور رونے رونے قریب سے گزرتی ہوئی ایک اپ ٹو ڈیٹ اور خوشحال حسینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا ہے۔ —— "بی بی بھگوان کے نام پر ایک پیسہ۔ بھگوان تجھے امیر بنائے رکھے۔"

شمبھو کا مُنہ کُھلا ہوا ہے۔ کُھلے ہوئے مُنہ میں بھیک مانگنے کا انداز نہیں ہے۔ کیونکہ موت کے اس کے لئے بھیک مانگنا غیر ضروری ہے۔ اُس کے دانت

سختی سے بھینچے ہوئے ہیں اُس کا چہرہ خشک، زرد اور پھیکا پھیکا سا ہو گیا ہے، کلائی کی ہڈیاں اور نیلی نیلی رگیں پوری آب و تاب سے اُبھر آئی ہیں —— کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر لاش کو خوبصورت کہا جا سکے۔ لباس: دریدہ اور میلا پرانا ہے۔ دو تین جگہوں پر جو پیوند لگے ہوئے ہیں وہ اصلی لبا
زیادہ صاف اور چمکیلے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر یہ مسرت ہوتی ہے۔ کہ شمبھو کا پیوند لگانے کا ٹیسٹ کافی جدید اور ترقی یافتہ تھا۔

شمبھو کی لاش سے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر پُرانے بوٹوں کا سوداگر لُوٹا رام بیٹھا ہے۔ وہ پالش سے چمکائے ہوئے پرانے بوٹوں کو فٹ پاتھ پر نہایت نفاست اور تنظیم کے ساتھ سجائے
اپنے ایک گاہک کے ساتھ سودا پٹانے میں مصروف ہے۔ وہ شمبھو فقیر کی گداگری سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے کیونکہ شمبھو نے کبھی اس سے پرانا بوٹ نہیں خریدا تھا، اسی
اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا، کہ شمبھو فقیر مر گیا ہے وہ اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے —" جناب! میں نے یہ بوٹ امریکہ کے ایک خاص فوجی آفیسر سے حا
ہے۔ آپ بھی اسے پہن کر فوجی آفیسر معلوم ہوں گے۔"

شمبھو مرا پڑا ہے۔ اور ڈیڑھ گز کے فاصلہ پر جو شخص ابھی مرا نہیں ہے، فوجی آفیسر بننے میں مصروف ہے —— اس سے پرے ایک جوتشی پا
پھینک رہا ہے۔ اور غیب کے خزانے ڈھونڈنے میں جٹا ہوا ہے۔ ایک بھدّی سی بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کی عورت اپنے میلے دانت کھول کر ہنس رہی ہے
مردوں کے ہاتھ سانڈے کا تیل بیچ رہی ہے۔ اٹھارہ سال کی ایک شوخ و شنگ کنواری لڑکی اپنے ایک کنوارے عاشق کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہے اور
عاشق کہہ رہا ہے کہ یہ آئس کریم تمہارے ہونٹوں کی طرح شیریں اور لذیذ ہے۔ ایک ریفیوجی چھوکرا اپنے کیلوں کی گلی سڑی ٹوکری اُٹھائے اُس حسین کنواری کی منّ
خوشامد کر رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلے آئس کریم سے زیادہ میٹھے اور لذیذ ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ساری ٹوکری صرف دو آنے میں دینے کو تیا
—— سارا فٹ پاتھ زندہ رہنے میں مصروف ہے —— شمبھو کے بارے میں ہر ایک کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مر گیا ہے، یہی اطلاع کافی ہے
سے زیادہ اطلاع کے لئے اُن کے ذہن میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کے ذہن کی بیشتر جگہ پُرانے بوٹوں، آئس کریموں، غیب کے خزانوں، سانڈے کے تیل
گلے سڑے کیلوں سے گھری ہوئی ہے۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟" لاش کے قریب گزرتے ہوئے ایک معزز سے آدمی نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے یہ مر گیا ہے۔" دوسرے معزز آدمی نے نہایت ایمانداری سے جواب دیا ہے۔

"مر کیوں گیا ہے؟"

"سالا گھٹیا اور زیادہ بیڑیاں پیتا ہوگا۔ اس لئے اُسے دمہ ہو گیا ہوگا۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں، مجھے بھی دمہ کا ہی کیس دکھائی دیتا ہے۔" پہلے معزز آدمی نے نہایت مہذّبانہ لہجہ میں تائید کی ہے، اور پھر یوں ہلکا پھلکا ہو
گیا ہے۔ جیسے اُس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔ اگر اُسے یہ نہ بتایا جاتا۔ کہ شمبھو دمہ سے مرا ہے تو اُسے سخت جسمانی کرب رہتا۔ چنانچ
جسمانی کرب کا علاج کر کے وہ مطمئن ہو کر چلا گیا ہے۔

"میرے خیال میں کسی سپاہی کو بلانا چاہئے۔" ایک اور آدمی نے رائے دی ہے —— ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینا پڑتی ہے۔

"میرا خیال ہے، سپاہی کو نہیں بُلانا چاہئے۔" دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔

پہلا آدمی ناراض ہو گیا ہے اور غصہ میں آکر جیب سے چلغوزے نکال کر چبانے لگا ہے۔ اُس کی رائے کی رتّی بھر قدر نہیں کی گئی ہے، لہٰذا وہ شمبھو کی
سے سخت ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو بُلا کر لاش اُس کے حوالے کر دی جاتی تو آخر کسی کا کیا بگڑ جاتا۔ لوگ نجانے پولیس سے اتنا کیوں بدکے
اپنے مُردے بھی اُس کے حوالے کرنے سے گھبراتے ہیں۔

سڑک کا ٹریفک نہایت زور شور سے جاری ہے، بسیں، لاریاں، کاریں، موٹر سائیکلیں، ٹرک، سائیکلیں —— سبھی مشینیں نہایت تیزی
بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہر مشین کی رفتار کی سوئی اپنے توازن میں ہے۔ اور اپنے مقررہ نشان پر ٹکی ہوئی ہے۔ کسی کا پٹرول ختم نہیں ہو رہا، کسی کے ٹائر میں نقص

ہو رہا - کوئی بہانہ ایسا پیدا نہیں ہو رہا جس کی وجہ سے کہ پل بھر کو رُک جائیں اور شمبھو کی لاش پر ایک نظر ڈال لیں - شاید شمبھو کی موت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے - کیونکہ شمبھو انسان تھا اور انسان اور مشین میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا - انسان جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے، مگر مشین پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے -

ایک کُتّا مٹرگشت کرتا ہُوا شمبھو کی لاش کے قریب سے گزرا ہے - ایک دو سیکنڈ کے لئے شمبھو کی لاش کے پاس ٹھٹکا ہے - وہ لاش کو پہچاننے لگا ہے، وہ لاش کو پہچان گیا ہے کیونکہ شمبھو اور وہ دونوں کئی بار اکٹھے سوتے رہے ہیں - کُتّے نے لاش کو پہچان کر پیار سے دم ہلائی ہے - مگر شمبھو کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے - اس نے مزید توجہ دلانے کے لئے اور شمبھو کو چھیڑنے کے لئے اُس کے ساتھ رکھی ہوئی گٹھڑی کو سُونگھا ہے - مگر شمبھو کی لاش بدستور بے حس پڑی ہوئی ہے - کتا مایوس ہو گیا ہے - اُس نے ایک آخری کوشش کی ہے اور ساتھ کھڑے ہوئے آدمیوں پر بھونکا ہے - شاید اُس کا خیال ہے - کہ یہ لوگ شمبھو کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں - یہ لوگ شمبھو کے دشمن ہیں - شک کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ شمبھو کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا ہے - اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شمبھو کی موجودہ پوزیشن کیا ہے -

لاش کے قریب آدمی آتے ہیں، ایک دو منٹ ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں - ہر آدمی یہ تصدیق کر کے آگے بڑھتا ہے کہ واقعی ایک انسان ہی مرا ہے - یہ لاش ایک ایسے چوراہے کی طرح دکھائی دے رہی ہے جہاں سے لوگ ایک دو منٹ میں کراس کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں - شمبھو کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے اُسے کراس کیا ہے - ورنہ زندگی بھر وہ بھیک کے لئے لوگوں کو بُلاتا رہتا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر پکارتا رہتا، مگر کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا - ——— موت نے اُسے زندہ لوگوں کے بہت قریب کر دیا ہے -

"اس کے اُوپر کوئی کپڑا ڈال دینا چاہئے، لاش کا کھلا رہنا دھرم نہیں ہے -" ——— ایک کھدّر پوش نے انسانیت کی بلندیوں سے پُکارا ہے -

"ہاں، ضرور ڈال دینا چاہئے - آخر انسان کی لاش ہے، لوگ تو جانوروں کی لاش پر بھی بوری ڈال دیتے ہیں" ——— دوسرے نے انسان کو جانور سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے -

معاملہ دھرم کا ہے - اس لئے کوئی آدمی بھی سچی بات مُنہ سے کہنے کی ہمت نہیں کر رہا - بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کر ایک میلا کچیلا کھیس شمبھو پر ڈال بھی دیا ہے ——— یہ کھیس خود شمبھو کا ہے، اور اس کی گٹھڑی کے اُوپر پڑا ہُوا تھا - اس کھیس نے زندگی بھر اُس کا ساتھ دیا ہے اور اب موت کے وقت بھی دے رہا ہے ——— میلے کچیلے کھیس سے میلی کچیلی لاش ڈھانپ دی گئی ہے - رنگ سے رنگ میچ کر گیا ہے -

"اس کے مُنہ پر کھیس مت ڈالو!" کسی نے سختی سے پروٹسٹ کیا ہے -

"نہیں نہیں، ڈال دو!" کسی نے ناک پر رُومال رکھتے ہوئے کہا ہے -

"نہیں نہیں، مت ڈالو! پتہ کیسے چلے گا کہ کھیس کے نیچے مُردہ پڑا ہے" - اُس آدمی نے خطرہ کی گھنٹی بجائی ہے -

"یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت ہے"

"نہیں ہے -"

"ہے!"

"نہیں ہے!"

اُس آدمی نے ہینکڑی میں آ کر لاش کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا ہے - دوسرے نے غصّہ میں آ کر دوبارہ کھیس مُنہ پر ڈال دیا ہے، پہلے نے پھر ہٹا دیا ہے، دوسرے نے پھر ڈال دیا ہے، اور پھر دونوں نے کھیس کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے مُنہ پر گھونسہ مارا ہے، اور حق اور صداقت کی لڑائی ہونے لگی ہے اور پھر اس لڑائی کو دو چار آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر ختم کرا دیا ہے اور دونوں صداقت کی تلاش میں دو مختلف سمتوں کو چلے گئے ہیں ——— ایک گھٹیا موضوع پر لڑنا بیکار

ہے۔ جب زندہ شمبھو پر کوئی آپس میں نہیں لڑا تھا تو اب مُردہ شمبھو پر لڑنے کا کیا فائدہ ہے —— اور پھر دھرم اور دیار کا زمانہ تو ویسے بھی ختم ہو گیا ہے۔ اب لاش اپنا منہ چھپائے ہوئے پڑی ہے، اُس کے قریب کوئی آدمی نہیں ہے، جتنے آدمی آئے تھے، وہ اپنا اپنا فرض ادا کر کے جا چکے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو یہ پتہ نہیں چل رہا کہ کھیس کے نیچے شمبھو سو رہا ہے یا مر گیا ہے۔ یُوں لگتا ہے، جیسے چند منٹ پہلے شمبھو کو جو موت آئی تھی۔ وُہ کھیس ڈالتے ہی بھاگ گئی ہے۔ یعنی زندگی اور موت کے درمیان کھیس آ گیا ہے۔ جس نے زندگی اور موت کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

تین چار منٹ سے لاش کھیس کی اوٹ میں ہے۔ اور پھر بارہ تیرہ سال کا ایک غلیظ سا بھک منگا لونڈا، گنگناتا ہُوا آیا ہے، اس نے پہلے شمبھو کا کندھا جھنجھوڑا ہے اور پھر منہ سے کپڑا ہٹا دیا ہے۔ موت ایک بار پھر سُورج کی روشنی میں چمک اُٹھی ہے۔ روشنی کی اس حرکت سے لونڈا ڈر گیا ہے۔ اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجہ میں کہا ہے:۔

"بابا! —— بابا، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"ابے سالے! مر گیا ہے تیرا بابا!!" قریب کھڑے ہوئے ایک گنڈیری فروش نے جیسے اُسے شرم دلاتے ہوئے کہا ہے۔

"کیسے مرا؟"

"موت سے۔"

"ابھی ابھی تو میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔"

"ابے، تمہارا نوکر تو نہیں تھا کہ تم سے پوچھ کر مرتا۔ اُس کا جی چاہا اور مر گیا۔ ہاہاہا —— !! —— گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ۔ رے بھائیو! ایک آنے کی پاؤ"۔

لونڈے کی خوف زدہ آنکھیں یکدم سنجیدہ ہو گئی ہیں۔ اُس نے کھیس کے اندر اپنا ہاتھ لے جا کر شمبھو کی ڈبیک کھولی ہے۔ اُس میں سے کچھ ریزگاری نکلی ہے۔ جسے اُس نے احتیاط سے جیب میں ڈال لیا ہے۔ اُسے شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے پھٹے پُرانے کوٹ کی جیب میں سے دو روٹیاں نکالی ہیں۔ گٹھڑی کھول کر اُس میں سے سبزی کا سالن نکالا ہے اور لاش کے قریب بیٹھ کر کھانے لگا ہے . . . روٹی کے دو چار لقموں نے ہی اُس کے رخساروں پر لہو دوڑا دیا ہے۔ اس لہو میں ایک طمانیت ہے۔ جو بھیک میں مانگی ہوئی روٹیوں میں سے نچوڑی گئی ہے، اور شمبھو کا لونڈا چونکہ شمبھو کی طرح ابھی مرا نہیں ہے اس لئے وہ طمانیت نچوڑ سکتا ہے۔

لونڈے نے کھانا ختم کیا ہے، بیڑی سُلگائی ہے، شمبھو کی گٹھڑی میں سے اپنے کپڑے نکالے ہیں۔ ایک کٹورا، ایک گلاس اور ایک پُرانی چپل نکالی ہے اور باقی گٹھڑی وہیں باندھ کر رکھ دی ہے۔ اور اپنی اشیاء کی ایک نئی گٹھڑی بنا کر گنگناتا ہُوا چلا گیا ہے ؎

جیون کے دن چار —— اے گوری
جیون کے دن چار
لوٹ لے موج بہار —— اے گوری
جیون کے دن چار ——

اب لاش پھر ایک بار ننگے منہ پڑی ہے۔ نئے نئے راہگیر آ جا رہے ہیں مگر وہ دُہرائی ہوئی باتیں دُہرا رہے ہیں۔ یُوں لگتا ہے، جیسے شمبھو کی لاش پر کوئی اچھوتی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور اب لاش ایک ایسے ریگستان کی طرح پڑی ہوئی ہے۔ جہاں سال میں ایک انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

"یہ لاش آخر کب تک یہاں پڑی رہے گی؟" قریب کھڑے ہوئے گنڈیری فروش نے ایک جمائی لے کر کہا۔

"میں کیا جانوں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"میرے خیال میں لاش کو یہاں سے اُٹھوا دینا چاہئیے بُری لگ رہی ہے۔" گنڈیری والے نے ایک تجویز اُٹھائی۔

"ہاں بُری تو لگ رہی ہے۔ زندہ انسانوں کے درمیان ایک مُردے کا پڑا رہنا ؟؟؟ ...... چھی چھی چھی!" بوٹا رام نے ایک مَیلے سے بُوٹ کو میلے سے کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"مگر اُٹھوایا کیسے جائے۔ اس سالے کا کوئی ساکھ سمبندھی تھوڑا ہو گا۔"

"تو پھر؟ ...... میرا خیال ہے، پٹڑی والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے۔ کہ سب مِل کر اس کے کفن دفن کے لئے چندہ اکٹھا کریں۔"

"تجویز بُری نہیں۔ مگر پٹڑی والے مانیں گے نہیں۔ سب حرامی ہیں۔ یہ انسان کی قدر کرنا کیا جانیں —— اچھا ذرا خیال رکھو بھیا! میرے بُوٹوں کا۔ میں ذرا سامنے دُکان سے چائے پی آؤں۔"

بوٹا رام چائے پینے چلا گیا ہے —— سارے پٹڑی والے حرامی ہیں۔ چائے کے بہت پیاسے ہیں۔ گنڈیری فروش شاید سوچ رہا ہے کہ بوٹا رام سچ کہتا ہے۔ پٹڑی والے انسان کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ابھی تو آدھی گنڈیریاں بیچنا باقی ہیں۔ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں بیچنا بہت بُرا لگتا ہے۔ گاہک لوگ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں خریدنے سے ہچکچاتے ہیں۔ گزشتہ آدھے گھنٹہ سے ایک بھی گاہک قریب نہیں پھٹکا ہے۔

وہ اپنا خوانچہ اُٹھا کر چل دیا ہے۔ اور سامنے والے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے —— پٹڑی والے سب حرامی ہیں۔ انسان کی قدر نہیں کرتے گنڈیریوں کی زیادہ کرتے ہیں۔

لاش پر جو مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ وُہ گنڈیریوں کی وجہ سے تھیں۔ اب وہ مکھیاں بھی شمبھو کو چھوڑ کر گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے دوسرے فٹ پاتھ پر جا رہی ہیں —— ہر چیز شمبھو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ اور گزر گئے ہیں۔

نندو فقیر پھر لنگڑاتا ہُوا آیا ہے، وہ لاش کے گرد گدھ کی طرح منڈلانے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہے۔ جس کا چہرہ نیک نیت قسم کا ہے۔ اُس نے بازو پر ایک بِلّا لگا رکھا ہے۔ جس پر "جماعت خادمانِ قوم" کے لفظ لکھے ہوئے ہیں۔ اُس نے جیسے لاش کو سونگھ کر پُوچھا ہے،

"اچھا تو یہ لاش ہے۔"

"جی ہاں"، نندو فقیر نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا ہے۔ "بھیک مانگا کرتا تھا، کئی دنوں سے بیمار تھا، آج مر گیا ہے بچارا۔"

"کوئی ہرج نہیں، ہماری جماعت اس کے کریا کرم کا بندوبست کر دے گی۔ آہ! ملک میں بھکاریوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

نندو فقیر کو بھکاریوں کے فلسفہ پر بحث میں حصہ لینے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ اس لئے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے۔ "اسے آپ کیسے اُٹھوا کر لے جائیں گے؟"

"مزدوروں کے ذریعے رسّے سے باندھ کر۔"

وہ شخص مُردے اُٹھوانے کا شاید تجربہ رکھتا ہے۔ اُس نے دو مزدوروں کو اشارہ سے بُلا لیا ہے اور انہیں حکم دیا ہے کہ لاش کو رسّے سے باندھ کندھے پہ اُٹھا کر ہمارے دفتر تک لے چلو۔"

نندو فقیر نے رسّہ بندھوانے میں نہایت پھُرتی سے امداد دینا شروع کر دی ہے۔ راہگیر ایک لاش کو رسّہ بندھتے دیکھ کر پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ رسّہ باندھنا ایک تماشہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر تماشہ ہر راہگیر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ کشش ثقل کا اُصول ہے۔

"یہ بہت بے رحمی ہے۔ انسانی لاش کو رسّہ نہیں باندھنا چاہئیے۔" ایک راہگیر نے حقارت سے کہا ہے۔

"تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چارپائی لا کر دے دیجئے۔"

"میں ہوٹل میں رہتا ہوں، میری اپنی چارپائی کوئی نہیں ہے۔"

ہوٹل والا لطیفہ خوبصورت ہے، سب کو مزا دے گیا ہے۔ اور سبھی بے ساختہ ہنس پڑے ہیں۔

مجمع دیکھ کر ایک کانسٹیبل فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اُس نے ڈنڈا لہرا کر دُور سے ہی للکارا ہے۔ "ایک طرف ہٹ جاؤ، کیوں اکٹھے ہو رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"یہ شمبھو فقیر ہے جو مر گیا ہے۔" خادمِ قوم نے جیسے کو تیسا جواب دیا ہے۔

"کیوں مر گیا ہے، کیسے مر گیا ہے؟ کس نے مارا ہے؟" کانسٹیبل نے آئینی سوالات کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ اور لاش کے سرہانے اٹین شن ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے رسہ باندھنا بند کر دیا ہے۔ اُنہیں قانونی آرڈر کا انتظار ہے۔

"یہ لاوارث لاش ہے، اور ہماری جماعت اسے شمشان لے جا رہی ہے۔" خادمِ قوم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

"کون ہے ہماری جماعت؟ ہُوں! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی بدمعاشیاں۔ تم اسے مار کر اب لاش چھپانا چاہتے ہو؟"

ڈنڈے کی آواز پھر اُبھری ہے۔ جس سے سبھی لوگ سہم گئے ہیں، کئی کنّی کترا کر نکل گئے ہیں۔ خادمِ قوم جوش و خروش سے اُبل رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"اس فقیر کے قاتل تم ہو، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے، ہماری سرکار ہے۔ انسان، سڑکوں پر یوں بھوکے پیاسے مر رہے ہیں۔ اور تم ہتھکڑی ہاتھ میں لئے مُردوں کو گرفتار کرنے کے لئے پھر رہے ہو۔ شیم، شیم!"

سبھی لوگ اس تقریر سے متاثر ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ "شیم، شیم!"

"اپنا لیکچر جیب میں رکھ" کانسٹیبل اپنے وقار کو مٹی میں ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ "میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں، کیونکہ تم قانونی کاروائی میں رکاوٹ ڈال رہے ہو۔"

سبھی لوگ کانسٹیبل کی مدلّل بات سے متاثر ہوئے ہیں ——— "شیم، شیم!"

زندہ فقیر کی حالت دگرگوں ہے ——— اُسے قانون کے باریک نکتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اس لئے وہ گرفتاری کے ڈر سے کھسک کر اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں خادمِ قوم ہوں۔" خادمِ قوم کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہے۔

"چلو چلو، بکواس بند کرو اور تھانے چلو۔"

"یہ لاوارث لاش ہے اس لئے قوم کی امانت ہے، اسے میں لے جاؤں گا۔"

"تم اس لاش کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔"

"میں اسے لے جائے بغیر ٹلوں گا نہیں۔"

کانسٹیبل نے اُس کی کلائی میں ہتھکڑی ڈال دی ہے۔ لوگ تذبذب میں ہیں کہ لاش کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ رہے گی۔ پولیس کے یا خادمِ قوم کے۔

"مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔" کانسٹیبل نے خادمِ قوم پر آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ "اس لئے اب تمہارے خلاف مقدمہ چلے گا۔"

شمبھو کو کس نے مارا ہے؟ ـ اس سلسلہ میں شمبھو خاموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق اُس کی کیا رائے ہے، اپنے دفنانے کے بارے میں اُس کا اپنا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کیونکہ شمبھو اپنی لاش کے مستقبل سے بے نیاز ہو کر مرا پڑا ہے۔ خادمِ قوم ہتھکڑی پہن کر سپاہی کے ساتھ تھانے جا رہا ہے اور نہایت جوشیلے انداز میں کہتا جا رہا ہے ——— "میں عدالت میں بات کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ . . . . . . میں حق اور صداقت . . . . . ."

وہ چلے گئے ہیں، لوگ بھی چلے گئے ہیں۔ شمبھو کی لاش پر سے اب مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب شمبھو کی لاش پھر لوگوں سے کٹ گئی ہے۔

تین چار منٹ اور گزر گئے ہیں۔

تین چار منٹ اور

—— دس پندرہ اور

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوئی ہے اس کے منہ سے ایک خفیف سی کراہ لرزتی ہے جیسے کوئی رُک رُک کر سانس لے رہا ہو۔ اس نے نہایت کرب اور اذیّت کے ساتھ ہولے ہولے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ اور پھر بند کر لی ہیں، پھر کھولی ہیں اور پھر بند کر لی ہیں۔ اور پھر جیسے ہڑبڑا کر اُٹھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر نقاہت کے باعث اُس سے اُٹھا نہیں جا سکا۔ اُس نے چند بے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ اُس نے چلتی ہوئی سڑک کی طرف اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔

نندو فقیر بھاگ کر لنگڑاتا ہوا اُس کے پاس آگیا ہے۔

"شمبھو! —— تم ...... تمہیں ...... اچھا! تم تو اُٹھ بیٹھے ہو۔" شمبھو نے اُٹھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اُس کا سر اُٹھ نہیں رہا ہے نندو چونکہ اُس کا کامریڈ ہے اس لئے وہ شمبھو کے سر کو سہارا دے کر اُسے اُٹھا رہا ہے۔ "تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کہیں سے پانی لاؤ"

نندو فقیر پانی لینے چلا گیا ہے۔ اُس کے قدم من من کے بھاری ہو رہے ہیں۔

"گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ" سامنے کے فٹ پاتھ سے آواز اُبھری ہے۔

"سانڈے کا تیل! سانڈے کا تیل!" ایک اور آواز جاگی ہے۔

"صاحب! بالکل امریکن بوٹ ہیں، خالص فوجی ......" ایک اور مانوس آواز شمبھو کے کان میں پڑی ہے۔

شمبھو نے ایک ہاتھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے۔ اور دوسرا ہاتھ ایک حسین راہگیر جوڑے کی طرف پھیلا دیا ہے۔

"جوڑی بنی رہے بابو جی! بھگوان کے نام پر ایک پیسہ!"

پکّی اینٹ

غلام علی چودھری

آدمی مرغ کی اذان کے ساتھ کندھے پر بندوق رکھ کر گھر سے نکلا ہوں، پانچ سات کوس ٹیلوں ڈھلانوں پر بھی دوڑتا پھرا ہوں اور ہوں شہر کا رہنے والا تو معاملہ کچھ زیادہ ہی دگرگوں ہو جاتا ہے۔ میں کنوئیں پر پہنچا تو بے طرح ہانپ رہا تھا اور سر سے پاؤں تک پسینے پر شرابور تھا۔ بندوق میں نے شیشم کے تنے کے ساتھ کھڑی کر دی اور تھیلا نزدیک ہی زمین پر رکھ دیا۔ بوٹ اتار کر گیلی جگہ پر پاؤں رکھے تو آنکھوں تک ٹھنڈک پہنچ گئی۔ پہلے میں نے اوک سے پانی پیا پھر پتلون گھٹنوں تک چڑھا کر پنڈلیوں تک ٹانگیں چاہ بچے میں ڈبو دیں۔

بوڑھا گادھی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا چلتی چلتی جوڑی رک گئی تو وہ دھچکا کھا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ایک ڈنڈا اس نے بیلوں کی ٹانگوں پہ مار کر انہیں یوں ہانکا کہ کنوئیں کی شامت آ گئی۔ گہرا سانولا رنگ، سر پہ چڑی سی پگڑی، بڑا سا کھلا تہبند باندھے، گلے سے ننگا، سفید داڑھی ناف سے کچھ ہی اوپر تھی۔ میرے سامنے چاہ بچے کی دوسری طرف بیٹھ گیا اور ڈنڈے سے پانی میں پڑی ٹھیکریوں کو چھیڑنے لگا۔ پہلے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا "بابو شاید ابھی آیا ہے۔"

میں نے کہا "جی ہاں بابا! بس آ کے پانی پیا ہے۔"

بولا "اتنی کڑاکے کی دھوپ میں سے آتے ہی پانی بھی پی لیا اور ٹانگیں بھی چاہ بچے میں ڈبو دیں ایسے تو تاؤ لگ جاتا ہے بیٹا۔"

میں نے جھٹ ٹانگیں پانی سے باہر نکال لیں تو مسکراتے ہوئے بولا "اپنی طرف سے احتیاط چاہیئے ورنہ جو دکھ بھاگوں میں ہوتا ہے وہ تو ہو کے ہی رہتا ہے۔ اسی نامراد تاؤ کا مارا ہوا میں چھ مہینے چارپائی پر پڑا رہا، وہ تو خدا بخشے میاں غوث کا ہاتھ برکت والا تھا نہیں تو میرے بچنے کی تو امید ہی نہ تھی۔"

میں نے پوچھا "تمہیں تاؤ کس طرح لگ گیا تھا بابو جی!"

بولا "لڑکپن کی بات ہے بیٹا کیا یاد رہتا ہے، ایسے ہی گرم سرد کا خیال نہیں کیا ہوگا۔"

کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا "میاں غوث بڑا اچھا آدمی تھا، مسجد میں اذان دیتا تھا، نماز بھی پڑھاتا تھا، دوا دارو بھی کرتا تھا اور جنم مرگ بھی بھگتا دیتا تھا اور کچھ لوگ تو کہتے تھے اسے کالا علم بھی آتا تھا۔ میرے چچا کا بیٹا خدائیا تو قسمیں کھا کھا کر کہا کرتا تھا کہ میاں کا چیلا گلدو اصل میں جن ہے۔

ایک رات خدائیا میاں کو نیا گڑ دینے گیا تو رلدو میاں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ خدائیا دو گھڑی بیٹھا رہا۔ میاں کو یاد نہ رہا، اس نے ویسے ہی لیٹے لیٹے آنکھیں بند کئے کہہ دیا "دیا بجھا کے لیٹ جا بچو!" رلدو وہیں بیٹھے بیٹھے بانہہ لمبی کر کے دس ہاتھ پرے سے دیا اٹھانے لگا تو خدائیے کی چیخ نکل گئی۔ میاں بہت دیر تک پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارتا رہا جب کہیں جا کر اسے ہوش آیا، پھر بھی اسے دو دن تک بڑے زور کا تپ رہا۔"

بابا جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈنڈا گادی پر پھینک کر بولا "پانی اگلی کیاری کی طرف موڑ آؤں۔"

وہ آہستہ آہستہ کھیت کی طرف چلا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رلدو شیشم کے درخت پر بیٹھا اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال کر مجھے اوپر کو اٹھائے لئے جا رہا ہو اور روں روں کرتا ہوا رہٹ کا لاعلم پڑھ رہا ہو۔

بابا واپس آگیا، بیلوں کو ہانک کے وہ پھر وہیں آبیٹھا اور ہنس کے بولا "میاں غوث بڑا اچھا آدمی تھا بیٹا۔ آج کل اس جیسے لوگ کہاں ملتے ہیں، جمعے کے دن وعظ میں بڑے بڑے اچھے مسئلے سنایا کرتا تھا۔ ایک بار کی بات مجھے نہیں بھولتی، بوڑھا نمبردار مر گیا تو اس کا بیٹا نمبردار بنا۔ جوانی کا وقت، ہر چیز کی بہتات اور پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ کئی نئے نئے منصوبے اس نے باندھے اور کئی نئے نئے سلسلے اس نے چلائے۔ ایک بہت کھلی حویلی کے اندر اس نے ایک بڑی شان کا پکا مکان بنایا تو میاں غوث نے مسجد میں کہہ دیا "گاؤں میں پکی اینٹ لگ گئی یہ قیامت کی نشانی ہے۔" اس وقت میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی پر جلد ہی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ گاؤں نیچی جگہ تھا، دوسرے تیسرے برس سیلاب کا پانی آجاتا تھا، مرنے والا نمبردار لاٹھی کے ساتھ لالٹین لٹکا کر ساری ساری رات بھوکا پیاسا جگہ جگہ کھڑے ہو کے بند لگواتا پھرا کرتا تھا —— اگلے ہی سال سیلاب آیا اور سارے گاؤں کی دیواریں بیٹھ گئیں نئے نمبردار نے اپنے پکے چوبارے سے جھانک کے تو ضرور دیکھا پر نیچے نہ اترا۔ میاں غوث اس عرصے میں مر چکا تھا۔ اللہ کی قسم میں نے اونچی خانقاہ میں اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہا "میاں تو نے سچ کہا تھا، پانی میں کیا قیامت ہوتی تھی وہ تو آتا جاتا ہی رہتا ہے، پکی اینٹ ٹھیک قیامت ہے جس نے نمبردار کو سارے گاؤں سے الگ کر دیا اور اس کے من سے مہر محبت اڑا دی...... میاں غوث بڑا ہی اچھا آدمی تھا بابو!"

بابا آہ بھر کر اٹھ کھڑا ہوا اور گاؤں کی طرف دیکھ کے بولا "بڑھیا نہیں آئی ابھی۔" پھر آگے بڑھ کے اس نے جوڑی کو ٹھہرایا، اوپر والے بیل کے ڈھاٹے ٹھیک کئے اور انہیں ہانک کر میرے پاس آبیٹھا اور بولا "خدا کے کام دیکھ کر آدمی کے منہ پر مہر لگ جاتی ہے کچھ کہا نہیں جاتا۔ اس جاڑے میں میاں کے بیٹوں نے بھی پکا مکان بنا لیا ہے۔ میاں جو کچھ کرتا تھا اللہ کے نام پر کرتا تھا، انہیں دنیا کا لوبھ پڑ گیا، اونچی خانقاہ کے پاس ذرا نیچے میاں کی زمین میں ایک کھیت تھا اسے سب مولیوں والا کھیت کہتے تھے۔ اس میں خانقاہ کے پیروں کی طفیل برکت تھی، کسی طرح کا تپ ہو اس کی ایک مولی کھا کے دو اوک پانی کے خانقاہ کے کنوئیں سے پی لو اور دیکھو تپ کدھر جاتا ہے، پر ایک بات پکی تھی، مولی میاں کے ہاتھ سے لینی پڑتی تھی۔ میاں مولی دیتے وقت کہتا "پانچ پیسے کسی مسکین کو دے دو یا تیل مسجد میں چڑھا دو۔" تعویذ دھاگا بھی کر کے دیتا تو یہی بات کہتا، دھیلا اپنے لئے نہ مانگتا۔ اپنا گزارہ اپنی زمین کی فصل پر ہی کرتا مگر میاں کے بعد بیٹوں نے اسی کو بیوپار بنا لیا۔ کرنا خدا کا اگلی بار سیلاب آیا اور مولیوں والے کھیت تک پانی جا چڑھا۔ بہتیرا زور لگا چکے ہیں ایک بھی کام کی مولی کھیت سے نہیں نکلتی، سب سڑی اور کیڑا لگی ہوئی، تپ کیسے ٹوٹیں۔ رہا ٹونا ٹوٹکا اور تعویذ گنڈا تو اب اس سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ گاؤں کے بچے اسی طرح چیخیں مار مار کر روتے ہیں اور گائے بھینسیں اسی طرح تھنوں کو چھوٹے ٹاپنے لگتی ہیں۔ نیتوں میں طمع گھس جائے تو نہ دوا میں تاثیر رہتی ہے نہ کلام میں برکت، اور تو اور زمینوں کے زور گھٹ جاتے ہیں، گندم کے گٹھے کا جھاڑ پہلے سے آدھا بھی نہیں رہ گیا بیٹا......"

پھر وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے لمبی آہ بھر کے اٹھا تو میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میں نے کہا "باباجی! کاشتکاری بڑا مشکل کام ہے اور تمہاری عمر بھی ہے کوئی بچہ نہیں جو تمہارا بوجھ اٹھائے اور تمہارے پیچھے رہے؟"

ہنس کے بولا "بوجھ تو بیٹا اپنا اپنا اٹھاتے ہیں رہی بات پیچھے کی تو اللہ نے جو کیا اچھا کیا، کوئی ہوتا تو کیا پتہ آج مجھ سے چاہ بچے میں ٹانگیں ڈبونے کے بھی دام مانگ لیتا۔"

پھر گاؤں کی پگڈنڈی کی طرف دیکھ کے بولا ”وہ چلی آرہی ہے بھاگوان، تجھے جو کی روٹی اور بینگن کا بھرتا کھلانے، بابو پر کیا پتہ تیرے من کو بھائے بھائے۔“

میں نے کہا ”میں بڑا خوش ہو کے کھاؤں گا بابا جی۔ میں بھی بچپن میں ایک گاؤں میں رہا ہوں۔“

بولا ”اچھی بات ہے بیٹا پر شکار بھی تو گاؤں والوں کی طرح ہی کیا کرنا! ہمارے یہاں تو تجھے پتہ ہے جھینور جال بچھاتا ہے تو دانہ بھی ڈالتا ہے۔ غوث بندوق کا شکار نہیں کھاتا تھا۔ کہا کرتا تھا بھوکے جانور کو مارنا بڑی کمینہ بات ہے، دوسرے کی جان چاہو تو کچھ پلے سے بھی تو لگا دو نا!“

میرا خیال کھیلے میں پڑی فاختاؤں اور کبوتروں کی طرف گیا تو میں نے آنکھیں نیچی کر لیں اور میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

بڑھا کنوئیں سے پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھا کہ بابا نے گادھی سے کھدر کی چادر اٹھا کے میری طرف پھینکی اور بولا ”اسے باندھ کے ذرا پانی ڈال لے بیٹا پھر روکھی سوکھی ٹکیا کھا لیں۔“

میں نے پانی کی موٹی دھار کے نیچے سر رکھا تو یوں لگا جیسے شہر کی ساری پکّی اینٹوں کا تاؤ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

بہنا

جمیل الزّمان

وہ ابھی ریستوران میں آ کے بیٹھی ہی تھی کہ جمائیاں لیتا ہوا بیرا سینہ پر دونوں ہاتھ پھیرتا ہوا آہستہ آہستہ اس کے پاس آیا اور کشادہ ہال کے بائیں کونے میں ستونوں کے ساتھ آخری میز کے پیچھے اور داہنی طرف پردے سرکا کر بولا "حکم سرکار!"

"پہلے ٹھنڈا پانی لے آئیے۔"

یلبین نے لڑکی کے پسینے سے شرابور، گندمی چہرے پر ایک اچٹتی نگاہ دوڑائی اور سبزی مائل فرسودہ پیڈسٹل فین کا رُخ درست کرتا اُلٹے پاؤں چل دیا۔ کاؤنٹر کے پاس پنکھے کا پلگ لگاتے لگاتے یلبین نے اپنی مندتی آنکھوں پر ہاتھ ملتے سوچا۔ اس قدر تیز دھوپ میں دن کے اڑھائی بجے برقعہ اوڑھے کس سے ملنے چلی آئی ہے یہ یہاں؟ اور پھر ایک جگ میں پانی اور برف کی ننھی ڈلیاں ہلاتا دوسرے ہاتھ میں گلاس تھامے چپکے سے چند منٹ بعد میز پر دونوں چیزیں رکھ کر وہ ہال کے دروازے کی دہلیز کے قریب جا کھڑا ہوا تاکہ اس لڑکی کے ملاقاتی کا استقبال کر سکے۔

ریستوران میں اس وقت بالعموم کوئی گاہک موجود نہ ہوتا اور وہ اطمینان سے کاؤنٹر کلرک کی کرسی پر ٹیک لگائے اونگھتا رہتا۔ لیکن آج اس لڑکی نے کسی سے خوش گپیوں کا یہ انوکھا وقت نکال کر اس کے معمول میں خلل اندازی کی تھی۔ نہ جانے اس نے کیوں ملاقات کے لئے اس سنسان ریستوران کا انتخاب کیا تھا جو شارع عام سے ایک طرف ہٹ کر پُرسکون سڑک پر واقع تھا اور جہاں ملحقہ دفتروں کے ایک بجے بند ہونے کے ایک آدھ گھنٹہ بعد مکمل سکوت مسلّط ہو جاتا۔ دس پندرہ منٹ تو یلبین خالی الذہن دروازے اور کھڑکیوں کے باہر یونہی اِدھر اُدھر تاکتا رہا۔ چند گز پرے چوک کے ساتھ والی سڑک پر اکّا دُکّا تانگے گذر رہے تھے ہر ایک تانگے کو آتا دیکھ کر اسے گمان ہوتا کہ شاید اسی میں وہ ملاقاتی بیٹھا ہو جس سے یہ لڑکی ملنے آئی تھی۔ لیکن وقت یونہی گذرتا جا رہا تھا اور کوئی تانگہ کسی رنگین مزاج سواری کو بٹھائے ریستوران کی طرف مڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ پنکھے کی بجلی کب تک ٹھنڈے پانی پر ضائع ہوتی رہے گی۔ اسے اپنے کنجوس مالک کا یونہی خیال آ گیا جو اسے تنخواہ بالاقساط ادا کرتا تھا۔ دوپہر کی بخشش میں کاؤنٹر کلرک کو حصہ نہ دینا پڑتا تھا۔ لیکن لڑکی کے برقعے کا کپڑا سستی پاپلین قسم کا تھا اور اسے اس کے ہاتھوں کسی بخشش کی توقع بھی نہ تھی۔ چنانچہ تنگ آ کر یلبین دبے پاؤں ہال کے کونے کی طرف چل دیا اور پردے کے قریب کھانس کر آگے بڑھتا ہوا بولا "کسی اور چیز کی ضرورت ہے آپ کو؟"

سہمی ہوئی لڑکی نے اپنے کالے نقاب کا داہنا پلّو بائیں کندھے پر پھینکا۔ حسرت بھری آنکھیں پانی کے خالی گلاس سے اٹھائیں اور بولی ’’اور کیا مل جائے گا اس وقت؟‘‘

’’لیمن، سوڈا، روز، چائے جو آپ چاہیں۔‘‘

’’لیمن سستی ہوگی یا چائے؟‘‘ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

یٰسین یہ فقرہ سُن کر چوکنا ہو گیا اور اس کی رہی سہی نیند کافور ہو گئی۔ آج تک کسی گاہک نے اپنے منہ سے یہ بات یوں بے ٹوک نہ کہی تھی۔ اس نے لڑکی کے میز پر جھکے ہوئے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے اترے ہوئے چہرے پر پاؤڈر سُرخی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس کی کلائیوں کی نیلی رگیں ہاتھوں پر ابھر رہی تھیں۔ اس کے ناخن سُرخی سے ناآشنا تھے۔ اس نے جگ اٹھا کر پانی کا گلاس ازسرِنو بھرا اور پوچھا۔ ’’اخبار آتا ہے کوئی یہاں؟‘‘

’’مالک صبح انگریزی کا اخبار منگاتا ہے۔‘‘

’’وہی لے آئیے آپ۔‘‘ عام بابوؤں سے لیمن سوڈے یا چائے کی بجائے اخبار کا آرڈر لے کر یٰسین دل میں عموماً کڑھتا لیکن اس لڑکی کے طور اطوار دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا اور وہ اپنے پاس سے لیمن کی ایک بوتل اور گلاس لے کر انگریزی اخبار سمیت ہال کے آخری ستون کی طرف بڑھنے لگا تو ریستوران کے دروازے پر تیس ایک برس کا کھاتا پیتا شخص نمودار ہوا۔ یٰسین کے چلتے قدم رُک گئے۔ نووارد نے اپنی پتلون کی جیب سے سفید رومال نکال کر پسینہ پونچھتے ہوئے ہال کے گرد طائرانہ نگاہ ڈالی اور یٰسین کے قریب پہنچ کر قدرے تامل سے پوچھا۔ ’’اس پردے کے پیچھے جگہ خالی ہے؟‘‘

’’جناب کو کسی سے ملنا تھا یہاں؟‘‘ یٰسین نے اخبار کھینچتے ہوئے سوال کیا۔

اتنے میں ہال کے بائیں کونے میں کرسی سرکنے کی آواز آئی۔ یٰسین نے نووارد کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ دونوں کو لڑکی کی معصوم صورت پردے سے جھانکتی نظر آئی۔ نووارد اپنی بڑھتی ہوئی توند پر پتلون درست کرتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ یٰسین نے اخبار اور لیمن کی بوتل قریبی میز پر رکھ دی اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

چند لمحے بعد یٰسین آہستہ آہستہ آخری ستون کی جانب بڑھا اور پردے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ نووارد لڑکی سے دیر میں آنے کے لئے معذرت خواہ تھا اور لڑکی کہہ رہی تھی۔ ’’کوئی بات نہیں آپ میڈیکل سٹور میں اس قدر مصروف رہتے ہیں، کھانے کے بعد نیند تو آنا ہی تھی۔‘‘

یٰسین پردے کو ہٹا کر آگے بڑھا اور نووارد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

’’آپ کیا پئیں گی؟‘‘ نووارد نے لڑکی سے پوچھا۔

’’جو چیز بھی یہ لے آئیں مجھے قبول ہے۔‘‘ وہ کھسیانی ہو کر بولی۔

’’میں تو اس وقت چائے پیوں گا۔‘‘ نووارد نے یٰسین سے کہا۔

’’کچھ کھانے کے لئے بھی لے آؤں حضور؟‘‘ یٰسین نے حسبِ عادت گاہک کی استطاعت کا اندازہ لگانے کے لئے کہا اور نووارد کی ’’ہاں جو چاہو لے آؤ‘‘ سُن کر ریستوران کے باورچی خانے کی طرف ڈگ بھرنے لگا۔

یٰسین نووارد اور لڑکی کی گفتگو سننے کا خواہاں تھا چنانچہ اس نے جلدی جلدی پانی میں چائے اُبالی، دودھ کو آنچ دی، شکر میں چینی ملائی، کیک پیسٹری کے چند ٹکڑے ایک پلیٹ میں ڈالے اور ٹرے ہاتھ میں لئے پردے کے پاس پہنچا تو اسے نووارد کی آواز سنائی دی ’’میں وعدہ تو نہیں کر سکتا البتہ کوشش ضرور کروں گا۔‘‘

’’آپ چاہیں تو اسے ایک دن میں ملازمت دلوا سکتے ہیں۔‘‘ ملتجی لڑکی بولی۔

’’ہاں مگر آپ کے بھائی . . . .‘‘ نووارد کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن قدموں کی آہٹ سُن کر خاموش ہو گیا۔ یٰسین پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا

تو نووارد سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ یٰسین نے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس کے پاس میز پر ٹرے رکھی۔ جگ اور گلاس کو ایک طرف ہٹایا اور دونوں گاہکوں کے سامنے چائے کی پیالیاں اور پلیٹ وغیرہ سلیقے سے سجا کر ٹرے میں جگ اور گلاس دھرے اور واپس چل دیا۔

ٹرے واپس لیجاتے وقت یٰسین نے سوچا بیکاری کتنی بڑی مصیبت ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے ان بیکار نوجوانوں کے چہرے گھومنے لگے جو پچھلے دو تین روز سے ساتھ والے ایک نئے دفتر میں کلرکوں کی خالی آسامیوں کے متلاشی تھے اور اسکے ریستوران میں اکّا دکّا ایک پیالی چائے پینے یا ایک سگریٹ خریدنے چلے آتے تھے۔ نیا دفتر اس کے ایک مہربان گاہک نے کھولا تھا جسے دن کا کھانا یٰسین کھلانے جاتا اور اسے یقین تھا کہ اگر وہ کسی ایک لڑکے کی سفارش کر دے تو مالک اس کا کہا نہیں ٹالے گا۔ لیکن کسی لڑکے سے اس کی اتنی واقفیت نہ تھی کہ وہ اس شدید ضرورت میں اس کے کام آتا۔ اس کے پاس تو فقط وہ لڑکے آتے جو ریستوران میں بیرا گیری کی ملازمت حاصل کرنے کی سعئ لاحاصل کر رہے تھے۔

اسے خود بیرا گیری کے لئے جو جو پاپڑ بیلنا پڑے تھے وہ ابھی تک اس کے ذہن پر منقّش تھے۔ پڑوس میں عبدل بیرے کی بیوی سے یٰسین کی ماں کا پرانا جھگڑا چلا آتا تھا لیکن جب یٰسین سن بلوغ کو پہنچا تو اس کی ماں نے عبدل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی لڑاکا بیوی کے طعن و تشنیع کے باوجود یکدم چپ سادھ لی اور پھر دھیرے دھیرے عبدل کو اس بات پر راضی کر لیا کہ جب کبھی اس کے ہوٹل میں عید، بقر عید یا رام لیلا کے موقع پر ہجوم ہو تو وہ یٰسین کو بیرا گیری کا کام دلوا دیا کرے۔ عبدل کی بیوی نے یٰسین اور اس کی ماں کے کئی چکّر لگوائے تھے تب کہیں جاکر یٰسین کو بیرا گیری کا مستقل کام ملا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن اسے اپنا روزگار برقرار رکھنے اور بیکاری سے بچنے کے لئے کس طرح کولھو کے بیل کی طرح کتنی ہوٹلوں اور ریستورانوں میں متواتر صبح شام کام کرنا پڑا تھا۔

باورچی خانے میں تسلّی سے خالی ٹرے رکھ کر یٰسین کاؤنٹر کلرک کی کرسی پر آ براجمان ہوا تو اسے خیال آیا کہ اسے کاؤنٹر کلرک سے بخشش کی آمدن میں حصّہ دینے سے پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے کہیں وہ مالک سے کہہ کر کسی بہانے اسے فارغ خطی نہ دلوا دے۔ اب اگر وہ بیکار ہو گیا تو کیا کرے گا۔ اب نہ تو عبدل زندہ ہے نہ اس کی ماں —— اور پھر پردے کی طرف اس کی نظر گئی تو دفعتہً اس کے دماغ میں ایک گھناؤنا خیال کوندا۔ نہیں نہیں اس کی ماں تو ایسی عورت نہ تھی۔ اگرچہ عبدل کی رنگ رلیوں کے متعلق اسے کوئی غلط فہمی نہ تھی اور پھر وہ اپنی مونچھوں سے کھیلتا اسی چکّر میں پڑ رہا کہ کہیں اسے ملازمت دلوانے کے لئے اس کی ماں کو تو عبدل کبھی کسی ہوٹل میں نہیں لے گیا تھا؟ اسے یقین تھا کہ یہ ناممکن بات تھی لیکن پھر بھی پردے کی موجودگی میں اس کے ذہن کا بوجھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھاگ کر پردہ پھاڑ ڈالے اور نووارد اور لڑکی سے کہے کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو شام کو مالک اسے جوتے مار کر ریستوران سے باہر نکال دے گا اور وہ سڑکوں پر بے کار اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر میں مارا مارا پھرے گا۔

یٰسین اسی ذہنی اذیّت میں مبتلا تھا کہ ہال کے کونے میں نووارد کی آواز گونجی: ”بیرا ——!“

”آیا حضور!“ اس نے حسبِ عادت جوابی نعرہ تو لگا دیا لیکن حضور کا لفظ اس کے حلق سے ایسے نکلا جیسے اس نے گاہک کو ایک مغلّظ گالی لڑھکائی ہو۔ اس نے پاؤں میں چپلی پھنسائی اور پیڈسٹل فین کی جانب دبے پاؤں چل دیا۔ ستون سے دو تین قدم ادھر وہ خاموشی سے مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ لڑکی گڑگڑا کر نووارد سے کہہ رہی تھی: ”مجھے اپنی مجبوریوں کی داستان سناتے شرم آتی ہے لیکن کیا کروں بیرا اور کوئی سہارا نہیں۔“

”میں بھی معذور ہوں۔“ نووارد نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”میں آپ کی خدمت کے نا قابل ہوں، مجھے کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔“

"آپ کا بخار اتر جائے تو پھر کسی شام مفصّل بات چیت ہو گی۔"

نووارد کی یہ بات لیلین کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ اس کی غیرت نے جوش مارا، وہ ایک دم آگے بڑھا اور رعد آبلند آواز سے کھانس کر بولا "کیا حکم ہے؟"

"بل لے آؤ۔"

"بل تو اس وقت نہیں بنے گا۔ بابو جی ہوٹل میں نہیں ہیں۔" لیلین نے میز پر کیک اور پیسٹری کے ٹکڑوں کو اپنی سُرخ آنکھوں سے گنتے ہوئے کہا۔ "ایک روپیہ آٹھ آنے ہوئے۔"

نووارد نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میز پر روپے روپے کے دو نوٹ دھر دئے اور اٹھتے ہوئے بولا "باقی پیسے تم رکھ لو۔"

"مجھے ان کی ضرورت نہیں۔" لیلین نے اپنی پاکٹ سے آٹھ آنے نکال کر نووارد کے ہاتھ میں پکڑا کے اور اس کے بازو کو جھٹکا دے کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

نووارد اس غیر متوقع ردِّ عمل سے بھونچکا رہ گیا اس کے دل میں آئی کہ اس ٹکے کے بیرے کا دماغ درست کر دے لیکن اس کے جی کے چور نے اسے سمجھایا کہ یہاں سے خاموشی سے کھسک جانے میں ہی بھلائی ہے۔ اس نے مبہوت لڑکی کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اپنی نامرادی سے سراسیمہ تھی۔ وہ اپنا نقاب درست کرتی کرسی سے اٹھتے اٹھتے لڑکھڑائی تو لیلین بولا:

"تم ٹھہرو بہنا میں تمہارے بھائی کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔"

مومن کی واپسی

احمد سعید

اس گیراج میں پانچ افراد پر مشتمل مہاجرین کے ایک کنبہ کو پناہ دی گئی۔ یہ لوگ ہوشیار پور سے بچ بچا کر آئے تھے۔ ان میں دو مرد، ایک لڑکا اور دو عورتیں تھیں۔ ...... تایا، اس کی بھابی، بھتیجی اور بھتیجے۔ ان کی عمر بالترتیب ساٹھ، پچاس، سترہ، بائیس اور بارہ برس تھی۔ پچیس تیس آدمیوں پر مشتمل اس خاندان میں سے ماسوائے ایک نوجوان لڑکی کے جو بلوائیوں کے ہاتھ لگ گئی باقی سب شہید ہو گئے تھے۔ اس کے شوہر کا نام خوشی محمدؐ تھا جسے عام طور پر خوشیا کے نام سے پکارا جاتا۔

اس کے بیاہ کو ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا جب ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ اس کی بیوی، رحمت، نہایت جاذب نظر تھی۔ چک نمبر ۲۲ میں اس کا چندا ایک تیکھی اور بانکی مٹیار ایسا پٹاخہ جسے ہر نوجوان کو چلانے کا دل چاہتا۔ اس گاؤں کے نمبردار غلام رسول نے بھی اس کا رشتہ مانگا۔ وہ اس کے والدین کو منہ مانگی رقم دینے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن منہ زور رحمت کی آنکھ خوشی محمدؐ سے لڑ چکی تھی۔ وہ اسے دل دے چکا تھا اور ان کا آپس میں دل کا سودا ہو چکا تھا ——— نمبردار نے پہلے بھی تین عورتیں بیویاں بنا کر گھر میں ڈال رکھی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رحمت جیسی چڑیا کو بڑی کامیابی اور آسانی سے سفری پنجرے میں بند کر لیتا۔

چک نمبر ۲۲ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس میں سکھوں کی اکثریت تھی، مسلمانوں کے تو صرف پندرہ بیس گھر تھے۔ لیکن سب کا آپس میں کافی بھائی چارہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کے غم میں یکساں طور پر شریک ہوتے لیکن مسلمان لڑکیوں کو دیکھ کر ان کی وحشی رگیں بھی پھڑکنے لگتیں۔ گاؤں کی لڑکی اپنی ماں بہن یا لڑکی کے برابر ہوتی ہے اس لئے سب بے بس تھے۔ تاہم رحمتے کو دیکھ کر شاید ہی کوئی ایسا نوجوان ہو جو چٹخارہ نہ لیتا ہو، اس کے منہ میں پانی نہ بھر آتا ہو۔ اس سے شادی کے حقدار کنواروں میں خوشی محمدؐ کا نمبر اوّل تھا۔ اچھے کھاتے پیتے گھر کا لڑکا تھا اور پھر بیس پچیس بیگھہ زمین کا وارث تھا۔ گھر میں گائے، بھینس، گھوڑے اور بکریاں بھی تھیں۔ ایک کشادہ مکان۔ سارا گھر بڑی محنت کرتا۔ زمین کی دیکھ بھال کرتا۔ یہی ایک گھر تھا جو ساہوکار کی زد سے بچا ہوا تھا۔ اس لئے یہ غیر مسلمانوں کو دل ہی دل میں کھٹکتا تھا۔

خوشی محمدؐ کے باپ کو ایک حسرت تھی کہ گھر میں چاند جیسی بہو آئے۔ شریف خوشی محمدؐ نے جب چپکے چپکے رحمت سے شادی کے عہد و پیمان کر لئے اور گاؤں میں ان دونوں کے عشق کے چرچے ہونے لگے تو رحمت کے والدین نے لڑکی کو بدنامی سے بچانے کے لئے اس کی چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔ جب میاں بیوی راضی تھے تو قاضی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پھر ایسے رشتے بھی کہاں ملتے تھے! رحمت کی جوانی کا کھیت تو ابھی پکنا ہی شروع ہوا تھا۔ جوانی اس پر کس طرح برسات کی جھڑی

کی طرح آئی تھی، گاؤں والے اسے دیکھ دیکھ کر حیرت سے منہ میں انگلیاں دبا لیتے۔

چنانچہ رحمت کو پاکر خوشی محمد کی خوشی کی انتہا نہ رہی اُسے تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہو۔ ساون کے دن تھے آموں پر جھولے پڑے نئے بیاہتا جوڑے کی جوانی کی پینگیں چڑھیں۔ اتنے میں اچانک اس کے رستے کاٹ دیئے گئے۔ . . . . . . بٹوارہ ہوا۔ اور چک نمبر ۲۲ کا بلوائیوں نے بڑی درندگی سے محاصرہ کر لیا۔ ادھر وہ وقت جلد آپہنچا جب اسے پتہ چلا کہ خوشیا باپ بننے والا ہے۔ اُدھر ریاست پٹیالہ کی گدی کے بڑے حقدار راؤ محمد علی خاں کو اپنی رولز رائز گاڑی، پندرہ گاؤں کے سینکڑوں محافظین اور مزارعوں اور رعایا کے باوجود جان بچانی مشکل ہو گئی۔ اگر اس کا اسلحہ خانہ اور دولت اس کے لئے زرہ بکتر نہ بن سکے تو خوشیا ولد اللہ دتہ ارائیں کی کیا پیش چل سکتی تھی۔ کپور تھلہ اور پٹیالہ سے نہنگوں اور راشٹر سیوا سنگھیوں کے جتھے چاروں اطراف سے آکر بکھر گئے تھے۔ ضلع ہوشیار پور میں "مُسلوں" کی کافی تعداد تھی۔ جھٹکے کا کافی سامان تھا۔ ان کے ہرے بھرے، لہلہاتے، جوانی سے بھرپور کھیت دیکھ کر آزاد سے آزاد خیال انسان کو بھی ان پر قابض ہونے کی ایک بار تمنا پیدا ہو جاتی۔ ان کا ایک معمولی کارکن سردار ہرچرن سنگھ، زمیندار تھا۔ وہ اپنے آپ کو فقط "اتفاقاً" ایک امیر باپ کا بیٹا سمجھتا تھا۔

سردار ہرچرن سنگھ نے بلوائیوں کو امن اور شانتی رکھنے کی تلقین کی۔ اس نے انگریز سامراجی طاقت کے ہتھکنڈوں سے بچنے اور مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے سے رکنے کے لئے کہا۔ اس نے اپنی آزاد خیال قسم کی پارٹی اور کانگریس کے چند غیر متعصب اور مخلص کارکنوں کی مدد سے چک نمبر ۲۲ کے مسلمان بڈھوں، عورتوں، نوجوان لڑکیوں اور کم عمر بچوں کو محفوظ کرنے کا حتی الوسع بندوبست کیا۔ لیکن حملہ آور کہاں رکنے والے تھے۔ انہوں نے ہرچرن سنگھ اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ اگر انہوں نے "مُسلے" ان کے سپرد نہ کئے تو وہ اُس کا اور اُس کے خاندان کا بھی خاتمہ کر دیں گے اور اس کے گھروں کو جلا کر خس و خاشاک کر دیں گے۔ اس کا باپ، سردار ہردیال سنگھ تو پہلے ہی بیٹے کے سیاسی خیالات کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس نے اُسے گھر میں پناہ گزین مسلمانوں کو باہر نکلنے کو کہا۔ بیٹے کا اس وقت باپ سے مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اس نے حکمتِ عملی سے کام لینا چاہا۔ وہ یہ کہ وہ باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے اس سے ڈیڑھ ایک گھنٹہ کی مہلت مانگے۔ باپ نے یہ شرط مان لی۔ بیٹے کی التجا پر اس کا دل بھی پسیج گیا۔ چک نمبر ۲۲ سے کوئی پندرہ کوس کے فاصلے پر ملٹری اور پولیس کی چوکی تھی۔ وہاں سے مدد لانے کے لئے ہرچرن سنگھ نے اپنا ایک خاص آدمی گھوڑے پر بھگایا۔ اس نے اپنی جیپ خاص موقع پر استعمال کے لئے بوقت ضرورت رکھ چھوڑی۔

اس اثنا میں شام گہری ہوتی چلی گئی۔ ارد گرد کے گاؤں سے ڈھول اور سنکھ کی آوازوں کا شور بڑھتا گیا۔

جب ملٹری کو خبر ملی کہ چک نمبر ۲۲ پر حملہ ہونے والا تھا وہ پون گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچی۔ اس نے ہرچرن سنگھ کی زیر نگرانی پناہ گزین مسلمانوں کو اس کے گھر سے باہر نکلوایا۔

ملٹری دو جیپوں میں آٹھ دس مسلح آدمیوں پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ چند ایک خالی ٹرک تھے۔ گو اس کی پوسٹ قریب تھی۔ لیکن راستہ نہایت خطرناک اور دشوار گزار تھا۔ اسی لئے اس نے مہاجر مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ تیار کیا۔ اس میں عورتوں اور مردوں کو اس طرح ایک دوسرے سے الگ الگ کیا گیا کہ مرد فوج کے آگے رہے، عورتیں اس کے درمیان۔ اس قافلے کا محافظ اور فوجی دستہ کا انچارج لفٹننٹ وجے ماترے ایک مرہٹہ تھا۔ وہ نہایت سخت مزاج اور کم گو آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بڑا شکی۔ قافلہ ایک گھنٹے کے اندر اندر تیار ہو گیا۔ لیکن جب اس کے کوچ کا مقررہ وقت آیا تو ایک جیپ خراب ہو گئی۔ گو وہ جیپ ٹرک کے پیچھے باندھی جا سکتی تھی لیکن وجے ماترے اپنے سپاہیوں کو اپنے ساتھ پوزیشن میں رکھنا چاہتا تھا جس سے وہ سب محفوظ رہ سکیں اور اس کی ہدایات کی تعمیل کر سکیں۔ ٹرک کے پیچھے گاڑی باندھنے سے دستے کی نقل و حرکت میں اس طرح فرق آتا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق قافلے کو بھی زیادہ خطرہ پیدا ہو جانے کا امکان تھا۔ نتیجتاً گاڑی کو ٹھیک کرنے میں تیس چالیس منٹ لگ گئے۔ جس سے ہرچرن سنگھ بالخصوص زیادہ فکرمند ہوتا گیا۔ رات بڑھتی گئی۔ اندھیرا گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ قافلہ کو دوبارہ مرتب کرنے میں گیارہ بج گئے۔ تب میں جا کر لفٹننٹ وجے ماترے نے اسے چلنے کا حکم دیا۔

سہما سہما دہشت زدہ قافلہ پانچ دن تک متواتر چلتا گیا۔ اُسے ایک ایک میل دس دس کے برابر محسوس ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ پیشرو جیپ یکدم رک گئی۔ سب مہاجر ڈر کے مارے ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ اس وقت خوشیا رحمت کو ملنے کے لئے بہت مضطرب ہوا۔ دوسری طرف اُسے اپنی نوجوان بہن جیواں کا بھی

خیال تھا۔

آسمان پر بادل اُمڈے چلے آرہے تھے۔ تاریکی پر ایک اور سُرمئی پردہ پڑ گیا۔ اچانک، جیسے ہوا میں سے، آس پاس کے گھنے آموں کے درختوں میں سے ایک مسلح بلوائیوں کا جتھا نکل پڑا۔ اور آن واحد میں "ست سری اکال" کے نعرے لگاتا ہوا قافلے پر ٹوٹ پڑا۔ ہوا میں چند ایک خالی فائر ہوئے اور ٹارچ کی شعاعیں معنی خیز انداز میں لہرائیں۔

ہرچرن سنگھ نے قافلہ کو بچانے کے لئے دبے مانزے سے ——— 'بلوائیوں پر حملہ کرنے کی تجویز پیش کی۔' "ہم تو خود گھر گئے ہیں!" اس نے جواب دیا۔

در اصل ملٹری کو جوابی فائرنگ کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اس کے سب سپاہی ہندو تھے۔ چنانچہ قتل و غارت شروع ہوئی۔ گاہے گاہے قافلے پر بلوائیوں کی بیٹریوں کی مختلف اطراف سے روشنی کی شعاعیں پڑتیں۔ خوشیے کی آواز معاً رحمت کو پکارتی سُنائی دی۔ جواب میں رحمت کی آواز ایک بار تاریکی کو چیر کر اس تک پہنچی۔ اس کے بعد یہ یکدم بند ہوتی سُنائی دی۔ جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس وقت خوشیے کے بہن، تایا اور ماں تو ایک کھڈ میں جا چھپے۔ اُس کا چھوٹا بھائی، سردار، جلدی سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔

جب ٹارچ کی روشنی ہوتی نوجوان اور خوبصورت عورتیں وحشیوں کے پنجوں میں جاتی دکھائی دیتیں۔ ان کے پیچھے ان کے عزیز تلواریں لے کر انہیں بچانے کے لئے لپکتے۔ رات کی تاریکی میں "ہائے مر گیا" "کٹ گیا" کی آوازیں نکلتی سُنائی دیتیں۔

ہرچرن سنگھ اس منظر کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو کر گر گیا۔

جب قافلہ کٹ کر ایک چوتھائی رہ گیا تو فوجی دستہ کو کوچ کرنے کا حکم ہوا۔ بگڑی ہوئی جیپ ٹھیک ہو گئی تھی۔

اور اس طرح خوشیا اپنے گھرانے کے بچے کھچے افراد لے کر لاہور پہنچا۔

وہ رحمت کی تلاش میں ہر روز مہاجرین کے کیمپوں کا چکر لگاتا۔ ریڈیو سٹیشن خبر لینے جاتا کہ آیا اس کے پیغام کا کوئی جواب ملا ہے کہ نہیں۔

لیکن رحمت کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس نے اپنے علاقہ اور گاؤں کے بعد ازاں آئے ہوئے لوگوں سے اپنی بیوی کا اتا پتہ پوچھا لیکن بے سود۔ وہ لوگ مانگ تانگ کر کب تک گزارہ کر سکتے تھے لٹے ہوئے مومن مہاجرین کب تک خالی ایمان پر زندہ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے کئی دن فاقے کاٹے۔ اب وہ تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ اس کے کنبے کے افراد نے جگہ جگہ کام شروع کر دیا۔ جیواں کو چھوڑ کر باقی سب نے متروکہ کوٹھیوں کے نئے مہاجر اور مقامی مالکوں کے ہاں ملازمت کر لی۔ اس امید پر کہ انہیں جلد زمین مل جائے گی۔ وہ بڑا جٹ کر کام کرتے اور اپنی اپنی تنخواہ جیواں کے پاس جمع کرواتے۔ شروع میں ان کی مجموعی آمدنی ستر روپے ماہوار کے قریب بیٹھتی۔ جیواں کیونکہ اب تک کنواری تھی اس لئے انہوں نے اُسے گھر پر ہی رہنے دیا۔ ماں باپ کی یہ اکلوتی لڑکی ویسے بھی بڑی نک چڑھی تھی۔ خوشیا نے اُسے اور بھی سر پر چڑھا رکھا تھا۔ اس کا بس ہوتا تو اُسے گھر کا کام کاج تک نہ کرنے دیتا۔ اور اس کی ضرورت کوئی خاص زیادہ بھی نہ تھی۔ کیونکہ اس کی ماں کے علاوہ باقی سب مالکان کے ہاں ہی کھانا کھاتے۔ وہ اپنا کھانا گھر لے آتی اور جیواں سے مل کر کھاتی۔

رحمت کا انتظار کرتے کرتے جب سب مایوس ہو گئے تو خوشیا کی ماں نے ان سے تجویز پیش کی۔ کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ اس کے لئے مناسب لڑکی ڈھونڈنا کونسی مشکل بات تھی۔ لڑکا ملازم تھا۔ جوان تھا۔ ذات کا ارائیں۔ شادی شدہ مرد بیوی کے بغیر یوں محسوس کرتا ہے جیسے گھوڑی کے بغیر سوار۔ خوشیا کی ماں نے کہا۔ چنانچہ خوشیا کی دوسری شادی کرنے کا تین مہینے بعد فیصلہ ہو گیا۔ دلہن کے لئے ایک نتھ۔ کانوں کے بندے ایک چھلا، سب ملمع شدہ زیور اور ایک گوٹے کناری والا سرخ جوڑا تیار کیا گیا۔ خوشیا نے اپنے لئے تو صرف سفید کورے کپڑے ہی شادی پر پہننے تجویز کئے لیکن ماں اور تایا نے اسے منحوس شگن سمجھ کر اسے ایک رنگدار، دھاری دار ٹاسا کا کرتہ اور بھوٹے ریشم کا تہمد، پاؤں میں باٹا کا فلیٹ فٹ کا بوٹ اور سر پر جناح کیپ لے دیں۔ شادی پر لڑکے میٹھے چاول اور آلو گوشت پکاتے گئے۔ دو چار براتی آئے، نکاح پڑھا گیا، جس میں مبلغ سو روپیہ حق مہر طے کیا گیا، اور خوشیے کی شادی کر دی گئی۔

لڑکی ایک آنکھ سے قدرے بھینگی تھی۔ لیکن بلا کی تندرست اور متناسب الاعضاء۔ رنگ گندمی۔ جسے دیکھ کر اور محسوس کر کے خوشیا جیسے کسی شہر کو اتنا حق مہر باندھنا جائز معلوم ہوتا۔ تاہم رحمت اور اس میں بہت فرق تھا۔ اگر رحمت شوخ اور شریر تھی تو یہ اس کے برعکس، خاموش اور سنجیدہ۔ رحمت اگر غزال

تھی، تو بیگاں گائیے۔ اس کے جسم میں ایک خاص لطافت تھی جو خوشیا کو پسند تھی جس کے باعث وہ اس کا گرویدہ تھا۔ اور بیگاں اس سے ہمیشہ گھونگھٹ کاڑھتی۔ خوشیا کام کاج سے فارغ ہو کر رات کے دس بجے گھر واپس آتا اور صبح پانچ بجے چلا جاتا۔ جب کبھی فرصت ملتی تو دوپہر کے وقت گھر کا ایک آدھا پھیرا مار جاتا۔

اب ایک وقت پھر ایسا آیا جب اُسے یہ خبر ملی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اس خوشی میں اُس نے بیگاں کی یوں دیکھ بھال اور خاطر مدارات کرنا شروع کی جیسے وہ آم کا پودا ہو جسے بور آ گیا ہو۔

ایک دن اسے اچانک سرکار سے اطلاع ملی کہ اسے رحمت کا کچھ سراغ مل گیا ہے۔ اس کی خبر کے مطابق وہ چک نمبر ۲۲ سے ۲۰ میل کے فاصلے پر تھی جہاں فسادات کے زمانے میں ملٹری پوسٹ قائم کی گئی تھی۔

خوشیا کے لئے یہ خبر نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ اسے سُن کر اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اس نے چاہا کہ اُسے پر لگ جائیں اور وہ اپنی محبوبہ رحمت کے پاس پہنچ جائے۔ چنانچہ اسی روز سے اس کی توجہ بارڈر پار کرنے کے لئے ویزا اور پاسپورٹ حاصل کرنے نے سلب کر لی۔

اسے حاصل کرنے میں اُسے کئی ہفتے لگ گئے۔ دفاتر اور متعلقہ کاغذات کو مکمل کروانے کے لئے ادھر ادھر مارے پھرنے میں اس کی ساری تنخواہ صرف ہو گئی۔ کلرکوں، چپراسیوں کو خوش کرنا الگ رہا۔ جہاں ہزاروں لوگوں (جن میں کئی پرانے امیر اور بیشتر ٹھاٹھ والے شامل ہوتے) کو ان تک بڑی آسانی سے رسائی ہو جاتی۔ خوشی محمد ولد اللہ دتہ ارائیں کی کون سنتا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے، ایک پروانہ راہداری تیار ہوا، لیکن خوشیے کی ماں اور جیواں اس سے دن بدن بگڑتے گئے۔

”جہاں باقی شہید ہوئے، اُسے بھی سمجھ لو کہ اللہ کو پیاری ہو گئی ہے“ اس کی ماں کہتی۔

”نہ معلوم اب منہ کالا کرا کر کس کافر کے ہاں پڑی ہو گی۔“ جیواں تبصرہ کرتی۔

”لیکن بہن اس میں قصور کس کا ہے“۔ بیگاں دونوں کا ترش اور بے رحمانہ رویّہ دیکھ کر چپکے سے شوہر کی تسکین کی خاطر کہہ دیتی۔

”اور ہم جاتنی رقم خرچ کر کے تیرے لئے دوسری بیوی لائے ہیں، اُس کا تجھے کچھ خیال نہیں۔ ہمارے پاس وہ گھر چلانے کے لئے پیسے نہیں۔“

خوشیا ایسی باتیں سن کر بڑا تلملاتا۔ لیکن اس کا دل اس کے بس میں کب تھا۔

”میں تو تمہیں ہندوستان جانے کے لئے ایک کوڑی بھی نہ دوں گی“! جیواں، خزانچی، نے کہا۔

خوشیا کے مالک نے اُسے ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

”میں نے لوٹ مار کر کے دولت نہیں کمائی۔ گاڑھے پسینے سے“۔ اس نے صاف صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔

چنانچہ خوشی محمد نے ایک پٹھان سے سود پر پچاس روپے قرض لئے اور سوئے ہندوستان روانہ ہوا۔

وہ جالندھر سے ہوشیار پور پہنچا۔ مطلوب کاغذات دکھا کر پولیس اور دیگر اہلکاروں کو ساتھ لے کر، وہاں سے اجازت لے کر، وہ چک نمبر ۲۲ پہنچا۔

. . . . رحمت کا نیا گھر!

دوپہر کا وقت تھا۔ گاؤں کے بیشتر مرد اسی وقت باہر کام پر گئے ہوتے تھے۔ پولیس نے مہیّا کردہ سراغ اور ثبوت کے مطابق سردار ہرچرن سنگھ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ رحمت اب اس کی بیوی تھی۔

سردار کا نیا مکان دیکھ کر خوشیا دنگ رہ گیا۔ اس کے باہر ایک جیپ گاڑی کھڑی تھی۔ وہی جو اس نے تین برس پہلے اس کے پاس دیکھی تھی۔ ایک طرف دو چار گھوڑے کھڑے ہنہنا رہے تھے۔

مکان نہایت صاف ستھرا، پکّی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ایک کشادہ اور رعب دار حویلی نما گھر تھا۔ یہ اس کی ماں نے اسے بنوا کر دیا تھا۔ کیونکہ ہرچرن سنگھ کی اپنے باپ سے کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ جس کی بنیادی وجہ اس کے سیاسی نظریات تھے اور باپ کا مسلمانوں سے بے رحمانہ سلوک تھا، جس کے باعث کئی سو جانیں

لٹ ہوئی تھیں، وہ اس سے الگ ہو گیا۔

گھر میں کمین اور کارندے کام کرنے میں مصروف تھے۔ پولیس نے اپنی آمد اور مقصد کی اطلاع کروائی۔ دو بچے، نکر قمیص پہنے، صاف ستھرے، صحن میں ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے دکھائی دیئے۔ ان میں ایک قدرے سانولے رنگ کا تھا، دوسرا گورا چٹا۔

"گلاب، شمشیر۔ ادھر آؤ۔ چلو اندر۔" تراشیدہ داڑھی والے ایک سکھ ملازم نے پولیس کو دیکھ کر ٹھٹھک کر بچوں کو اندر چلے جانے کے لئے کہا۔

یہ خبر تو آگ کی مانند پھیل گئی تھی کہ پولیس رحمت بی بی زوجہ خوشی محمد ولد اللہ دتہ کو واپس لینے آئی تھی۔ عورت کا مسلمان شوہر اب تک زندہ تھا اور اُسے لینے آیا تھا۔

"تھانیدار صاحب، آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں سردار کو اطلاع کرواتا ہوں۔" نوکر نے بڑے اطمینان سے افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

خوشیا سانولے رنگ کے، بڑے بچے کو، بغور دیکھ رہا تھا جب نوکر اُسے اُٹھا کر اندر لے گیا۔ خوشیا کی شادی فسادات سے کوئی دو ایک مہینے ہی پہلے ہوئی تھی۔ سانولے رنگ کے لڑکے کی عمر اب تین ایک برس ہوگی۔ چھوٹا بمشکل ڈیڑھ ایک برس کا تھا۔

پاکستان سے کسی شخص کے اتنی مدت کے بعد گاؤں میں آمد کی خبر سن کر مکان کی بالائی منزل پر زنانہ حصہ کی ایک چک ہلی۔ ایک سڈول بازو نے جس پر سونے کا چوڑا چڑھا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں ہیرے کی دمکتی ہوئی انگوٹھی چک کو پرے ہٹایا اور اس کے پیچھے کسی کا چہرہ صحن میں بغور جھانکتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک چارپائی پر پولیس کے ایک سکھ سپاہی کے ہمراہ ایک جوان بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی گرد و غبار جما ہوا تھا۔ اور کپڑے بھی مسلسل سفر کی وجہ سے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ بہت مضطرب و متعجب دکھائی دیتا تھا۔ گھر کا ایک ملازم ان ملاقاتیوں کو دودھ کی لسی پلا رہا تھا۔ ان میں سے ایک خوشیا تھا۔

چک یکدم گر گئی۔ سردارنی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

اتنے میں سردار ہرچرن سنگھ نمودار ہوا۔ اس نے اب داڑھی اور کیس منڈوا دیئے تھے۔ اس کا باپ فسادات کے ایک سال بعد سورگ باش ہو گیا تھا۔ گو اس کا تمام عمر باپ سے نظریاتی اختلاف کی وجہ کھچاؤ رہا، جس کے باعث اس کی ماں نے اُسے الگ رہنے کے لئے اس جگہ، اپنے ننھیال، ایک نیا مکان بنوا دیا تھا۔ مدتوں ہرچرن سنگھ کے عاق ہو جانے کی خبریں بھی گرم رہیں لیکن ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں باپ کو نہایت پیارا تھا، اس لئے تمام جائداد اُسی کے حصے آئی۔ بڑے بڑے امیر کمیونسٹوں مثلاً دیوان مدن اور میاں نظام الدین کی مانند اس نے اُسے غریب کسانوں میں تقسیم کرنا بہتر نہ سمجھا۔ بلکہ سرمایہ دارانہ نظام سے لڑنے کے لئے روک رکھا۔ اور پارٹی کی وزارت کرنے کا ایک طریقہ۔ پولیس ایسے مشہور سیاسی کارکن کو کسی نہ کسی طرح گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کس کس کے گھر منسوبہ مسلمان عورتیں ہیں۔ یہ ایک مسئلہ تھا جس میں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جب کبھی ایسی لڑکیوں کے دعویداروں کی طرف سے بہت زور پڑتا اور عورت غائب کرنا بے سود ہوتا تو وہ ان کی بازیافتگی میں مدد دیتے۔ ورنہ ہر مذہب کے اغوا کنندوں کی طرح یہ لوگ اب ایسا کام کرنا بیشتر اپنی جوانمردی اور قوم کی خلاف شان سمجھتے تھے اس کی تہ میں کئی قسم کے انتقام چھپے پڑے تھے۔

خوشیا کو دیکھ کر سردار ہرچرن سنگھ کو گہرا دھچکا لگا۔ اس کا سر چکرا سا گیا۔

چک ایک لحظہ کے لئے پھر اُٹھی اور گر گئی۔

خوشیا کو بتلایا گیا کہ اس کی بیوی ایک بڑے گھر کی مالکن ہے۔ اُسے اس میں ہر قسم کا عیش و آرام تھا۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کی گھر میں عزت تھی اُسے مذہب تبدیل کرنے پر کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ اس کا نام اب بھی رحمت بی بی تھا۔

آخر کار خوشیا اور رحمت کا آمنا سامنا ہوا۔ خوشیا اس کے سونے کے زیورات کی تاب نہ لا سکا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ خوشیا نے اس سے لپٹ کر رونا چاہا۔

"آپ ..... آگئے ؟"

"ہاں"

"اتنی ... دیر"

"میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ....."

"چھوڑ جو گئے تھے"

"اب لینے آیا ہوں"

دونوں نے ایک طرف منہ پھیر لیا۔ اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں آئیں۔ کچھ وقفہ کے بعد خوشیا بولا۔

"میں غریب ہوں نا، ...... اس لئے ؟"

"....... اس وقت مجھے ذبح کروانے پیچھے چھوڑ گئے تھے !"

اتنے میں گلاب روتا روتا اندر آیا۔ اس کے پیچھے ہرچرن سنگھ تھا۔

"اگر تم چاہو تو جا سکتی ہو۔" ہرچرن کی آواز آئی۔ اس کی گھگی بندھی ہوئی محسوس ہوتی۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا .... اس کا پالن کرنا .... دونوں ملکوں کے درمیان اس بارے میں جو معاہدہ ہوا ہے اسے پورا کرنا، ہمارا فرض ہے۔"

"فرض بڑا ہوتا ہے یا دل ؟" ہرچرن سنگھ کی والدہ کی ایک طرف سے آواز آئی۔

"کئی بار فرض پر دل کو قربان کرنا پڑتا ہے۔"

رحمت گنگ ہو کر رہ گئی۔ مکان پر سنّاٹا چھا گیا۔

"خوشی محمدؐ .... میں تمہاری امانت تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ لیکن .... اس میں۔ میرا بھی کچھ حصّہ ہے۔ ابھی چند روز یہاں رہو۔ آخر واپس جانے کے لئے تیاری کی ضرورت ہے۔ اور تم تھکے ہوئے ہو۔ میں تمہیں خود جا کر چھوڑ آؤں گا۔" ہرچرن سنگھ نے کہا۔

لیکن رحمت نے "تیاری" بے جا سمجھی۔ وہ نہایت سادہ لباس میں ملبوس ہو کر، بچوں کو ساتھ لے کر چک نمبر ۲۲ سے رخصت ہوئی۔ اس نے اپنے تمام زیورات اتار کر اپنی ساس کے حوالے کر دیئے۔ وہ سب کو الوداع کہتے ہوئے اور اپنی کسی خطا یا غلطی کی معافی مانگتے ہوئے، گلاب، شمشیر کا بوجھ اٹھائے پاکستان روانہ ہوئی۔ ہرچرن سنگھ نے خوشیا کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی کہ دورانِ زچگی میں عورت کو سفر کرانا نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ افراتفری میں غیر آرام دہ سفر کرنے سے روکا۔ خوشیا کو اس بات سے چڑ آگئی۔ اس کے جی میں آیا کہ زچہ کا پیٹ پھاڑ کر اس میں سؤر کا بچّہ ضائع کر دے۔

سردار ہرچرن سنگھ نے بڑے آرام سے اپنی کار میں بٹھا کر اسے بارڈر تک پہنچایا۔ اس نے بچّوں کو اپنے پاس رکھنے کے لئے کہا لیکن رحمت نہ مانی۔ اس پر اس نے بطل اثبات میں سلیوٹ مارا جیسے وہ سٹالین کا حکم ہو۔

سرگرم کمیونسٹ کارکن ہوتے ہوئے اور وقت کی تنگی کے پیش نظر ہرچرن سنگھ کو پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے وہ رحمت اور خوشیا اور بچّوں کو مسرّت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بارڈر سے واپس لوٹا۔

بارڈر تک نوے میل کا سفر رحمت کے لئے اتنا تکلیف دہ ثابت نہ ہوا جتنا وہاں سے لاہور تک۔

رحمت کی حالت پہلے ہی غیر تھی۔ بس میں سفر کرنے سے اُسے اتنے جھٹکے لگتے محسوس ہوتے کہ اُسے دردزہ شروع ہو گئی۔ بیچاری ٹرک پٹرول اور اس کے دھوئیں سے کب مانوس تھی۔ اس سے طبیعت اور بھی بگڑ گئی۔ بچوں، گلاب اور شمشیر نے الگ رونا چلانا شروع کیا۔ ماں کی ناقابل سمجھ بے اعتنائی

اور ایک اجنبی ساتھی کی گھرکیاں، کھلی فضا سے نکل کر لاری کی قید نے ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ کر دی۔

جب خوشیا چوتھے روز بعد واپس گھر پہنچا اس نے صرف اپنے چھوٹے بھائی کو ان سب کا منتظر پایا۔ اس کے ساتھ دو بچے اور ایک متوقع کو دیکھ کر ان سب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بیوہ بیاہ لایا ہو۔ رحمت کی ساکس اسے دیکھ بڑے استہزا آمیز انداز میں مسکرا دی۔ اس نے بڑے تامّل سے اپنی سابق بہو کے سر پہ ہاتھ پھیرا جیسے اس کے چھو جانے سے اسے متعدی بیماری لگ جائے گی۔

جیواں نے اسے دیکھ ایک طرف حقارت سے منہ پھیر لیا۔

بیگاں نے اپنے مخصوص، غیر متکلّم انداز میں، اپنی سوت کی حالت کے پیش نظر فوراً چارپائی نکال کر اس پر کھیس بچھا دیا۔ اسے اس پر بہت رحم آیا۔ لیکن وہ اس کے مخالفین کا کس طرح مقابلہ کر سکتی تھی، انہیں کس طرح رام کر سکتی تھی۔ رحمت مظلوم تھی۔ اُسے دیکھ کر اس کا دل اندر ہی اندر پسیج گیا۔ اس نے بچوں کو پچکارا، پیار کیا۔ ان کو اور ان کی ماں کو شکر کا شربت بنا کر پلایا۔ رحمت بیہوش ہو کر اچانک چارپائی پر گر پڑی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر سب کو حیرت ہوئی۔

بڑی آئی نخرے والی اگر یہاں آکر بھی اس نے ایسے چونچلے کرنے تھے تو اُسے ہندوستان ہی چھوڑ آنا تھا، بھیّا۔" جیواں نے بڑی تلخی سے لال پیلے ہو کر کہا—

"جاؤ . . . . . کسی ڈاکٹر کو بُلا لاؤ۔ بیچاری مری جا رہی ہے۔"

"جیواں!" خوشیا نے بے تاب ہو کر بہن کو زبان بند کرنے کے لئے کہا۔ پھر اپنی ماں سے مخاطب ہو کر وہ بولا۔

"چاچی، تو ہی دیکھ . . . . . کیا تکلیف ہے اسے۔"

"ساتواں مہینہ ہے۔" ماں بولی۔

"خون بہہ رہا۔ جلدی کرو۔ لنگڑی دائی کو بلوا لاؤ۔" بیگاں نے ہمت کر کے شوہر سے کہا۔

"جاؤ۔ کہیں کوئی اور مصیبت نہ آ جائے" اب جیواں قدرے ہراساں انداز میں بولی۔

چنانچہ خوشیا فوراً بھاگا بھاگا لنگڑی مائی، دائی کو بلا کر لے آیا۔

دائی نے کہا کہ ہچکولے لگنے سے زچہ کی جان خطرے میں تھی۔ چوبیس گھنٹے میں بچہ پیدا ہونا لازمی تھا۔ قبل از وقت کیس کے لئے اسے فوراً ہسپتال پہنچانا ہوگا۔ گلاب اور شمشیر ماں کی ناگفتہ حالت دیکھ زار و قطار رونے لگے۔ وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتے۔ جیواں انہیں پکڑ پکڑ ایک طرف کھینچتی۔ شمشیر کو دیکھ کر اسے اور بھی غصہ آتا۔

"کافر کا بچّہ!" اس نے بے قابو ہو کر اس کے منہ پر زور سے طمانچہ رسید کیا۔ چپ ہوتا ہے کہ نہیں۔ ورنہ تیرا جھٹکا کر دوں گی۔"

"نہ بہن۔ اس میں اس معصوم کا کیا قصور ہے۔" بیگاں نے بچّے کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"واری۔ آج تو تجھے بھی پر لگ گئے ہیں۔ کس سپنولئے کو پالنے کی فکر کر رہی ہو!"

اتنے میں ان کا تایا بھی کام سے واپس آ گیا۔ نو واردوں کو دیکھ اس کے چہرے پر یکدم تاریکی کے بادل چھا گئے۔ لیکن یکدم غائب ہو گئے۔

جب رحمت نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں کھولیں تو اس نے اس سے کہا۔

"کاکی۔ رحمت۔ تو نے بڑا اچھا کیا جو واپس آ گئی۔"

"ان کے لئے پانی وانی کا بندوبست کیا ہے کہ نہیں۔ گھر میں شکر ہے کہ نہیں یا میں لا دوں۔ دیکھو بیگاں بیٹا تم جلدی جلدی ان کے لئے روٹی پکا لو۔ یہ . . . بچے بھی تو بھوکے ہوں گے پھر یہ کس کے ہیں!"

رحمت پر بار بار غشی طاری ہو جاتی۔ وہ اسی میں بڑبڑائی۔

"تیرا بھایا۔ ابا . . . . . . آیا ہے کہ نہیں۔ شمشیر۔" اس نے بڑی نرم اور نحیف آواز میں خود فکری کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لبوں پہ زہر خند پھیل گیا

جب اُس نے آنکھیں کھولیں وہ خلا میں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے ہمّت کر کے گلاب اور شمشیر کو جو اس کے سرہانے بیٹھے تھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا اور ایک چیخ مار کر پھر بیہوش ہو گئی۔

"پاگل ہو رہا تھا اسے لانے کے لئے!" رحمت کے تایا سسر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے بچّوں کی بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر شکر کے ساتھ کھلانے کے لئے بیگاں کو فرمائش کی۔

"لیکن، غضب ہے۔ دو بچوں کی ماں ہو کر اور تیسرے کے لئے تیار ہونے ہوئے بھی یہ بیگاں سے کتنی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے"۔ اس نے خوشیا کی ماں کو سرگوشی میں کہا۔

"اب یہ دیکھنا ہے کہ اس گھر میں کون رہتا ہے"۔ اس نے جواب میں کہا۔

"ابھی تو اس نے پٹھان کا ایک سو روپیہ دینا ہے۔ وہ اتارے گا یا اپنی بیوی کا خرچ چلائے گا۔" خوشیا کی ماں نے مزید تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

اتنے میں وہ ٹانگہ لے آیا اور رحمت کو اس پر لاد کر کرسچین ہسپتال لے گیا۔ جو وہاں سے کوئی ڈیڑھ ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

لنگڑی دائی کی تشخیص درست تھی۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر، بڑی تکلیف کے بعد، رحمت کے سات ماہی لڑکی پیدا ہوئی۔

ہسپتال کے جنرل وارڈ میں بھی خوشیا کا خرچ ایک دو روپے روزمرہ ہو جاتا۔ مناسب خوراک اور دوائیاں۔ ان سب کی ضرورت تھی۔ گو وہاں اُسے کافی آرام تھا۔ بہت سی چیزیں رعایتاً اور مفت بھی مل جاتیں۔ ہسپتال میں دوائیوں کی بلیک نہ ہوتی۔ مسیحائی دارالشفا میں محمود و ایاز مریضوں میں امتیاز نہ کیا جاتا۔ نرسیں اور دیگر عملہ اپنا خدمات کا معاوضہ طلب نہ کرتے۔ یسوع مسیح کا پیغام عملی طور پر غیر عیسائیوں تک پہنچایا جاتا۔

خوشیا کی یہی کوشش تھی کہ جس طرح ہو اس کی رحمت کی جان بچ جائے۔ نتیجتاً جب وہ اُسے گھر واپس لایا۔ تو وہ گل محمدؐ خان پٹھان کا اور مقروض ہو چکا تھا۔ اس نے اس سے پچیس روپے اور ادھار لئے تھے جس کے لئے اُس نے چھ روپے ماہوار بطور سود دینے الگ طے پایا تھا۔ یعنی کہ کل واجب الادا بیاج ایک اٹھارہ روپے بنتا تھا۔ اور خوشیا کی ماہوار تنخواہ بیس روپے تھی جس میں سے وہ ایک مہینہ چھٹّی پر رہا۔ اور ایڈوانس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی پہلی تنخواہ بہن جیواں کے پاس جمع تھی۔ جس کی یہی کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طرح اس میں سے زیادہ سے زیادہ روپے اپنی شادی، گہنے، کپڑے لتّے کے لئے کُتر لئے جائیں۔

جب وہ رحمت اور بچّوں کو لے کر واپس گھر آیا تو معلوم ہوا کہ گھر والے سب چند روز کے لئے سندھ چلے گئے تھے۔ انہیں زمین ملنے کی خبر ملی تھی۔ اس لئے اُسے دیکھنے گئے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے کلیم فارم دے رکھے تھے۔ کیا وہ اسے دھوکا دے جائیں گے؟ خوشیا کو یقین نہ آیا۔ لنگڑی مائی کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ بیگاں شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن نادان اور کم سمجھ تھی۔ ان کے جھانسے میں آ گئی۔ کہ خوشیا اس کی سوت کو لے کر سندھ ان کے پیچھے آ جائے گا۔ اس نے خود انہیں یہ ہدایت کی تھی۔ اس نے بیگاں کو اجازت دے دی تھی کہ اس سے ملے بغیر وہ سندھ چلی جائے۔ اس پر انہوں نے یہ کہہ کر اس کے کان بھرے کہ وہ تو اُسے طلاق دینا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی ملکہ آ گئی تھی۔" اب اس کی دال اس گھر میں کیسے گل سکتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سسرال کے جھانسے میں آ گئی۔

اس صورت میں خوشیا بیوی بچوں کو لے کر اپنے مالک کے ہاں چلا گیا۔ وہاں ایک کوارٹر خالی پڑا تھا۔ مالک نے اس پر ترس کھا کر اُسے بہ مفت دے دیا۔ اس شرط پر کہ اگر وہ ایک مہینے سے زیادہ وہاں رہا تو اسے باقاعدہ پانچ روپے کرایہ ادا کرنا پڑے گا۔ اُسے اس کوارٹر کے لینے کے لئے کئی پیش کشیں ہوئی تھیں۔ لیکن وہ چونکہ سو روپیہ پگڑی مانگتا تھا اس لئے کوئی بھی وہاں آنے پر تیار نہ ہوا۔

جوں جوں خوشیا کا وہاں وقت گزرتا گیا رحمت کی صحت بحال ہوتی گئی۔ اس پر نیا روپ آنے لگا۔ لیکن شمشیر۔ نوزائیدہ لڑکی، سلطانہ بلکہ گلاب تک خوشیا کو کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے۔ انہیں دیکھ کر اس پر نفرت کی لہر دوڑ جاتی۔

"ان کو یتیم خانے کیوں نہ چھوڑ آئیں"۔ ایک روز خوشیا نے رحمت سے کہا۔

"اس میں ان کا کیا قصور ہے، گلاب تو تمہارا ہے!" رحمت نے جواب دیا۔

"...... ہوں ...... مجھے۔ مجھے کیا معلوم!"

"...... ثبوت کے لئے میرے پاس اللہ کے سوا اور کون گواہ موجود ہے۔ اور وہ بھی تو بڑا بے پروا ہے۔ بڑا ....." رحمت نے ایک لمبی آہ بھر کر اپنی طرف سے فیصلہ کن جواب دیا۔

"لیکن تم انہیں ساتھ کیوں لے آئیں۔"

"اپنے آپ کو لٹوا کر انہیں بھی ....." رحمت کی گھگی بندھ گئی۔

"لیکن تم نے تو اس سے شادی کر لی تھی۔"

"جب، ــــ کسی طرف سے کوئی خبر نہ آئی تو کیا کرتی۔ دو جگہ چھپی بھی .... جب انہوں نے مجھے تلاش کر کے اپنے پاس ....."

"کون ...... ہرچرن سنگھ؟"

"........ ہاں ... اور گلاب کو۔ جو آپ کی اولاد ہے۔ میں کس طرح بے آسرا لئے پھرتی۔"

".... وہ ....."

"وہ سب میری عزت کرتے تھے۔"

"کیونکہ اس نے تمہیں اپنے گھر میں ڈال لیا تھا۔"

"یہ غلط ہے۔ انہوں نے مجھ سے شادی کر لی تھی۔"

"شادی کیسی۔"

"وہ بڑا نیک آدمی تھا۔"

"کیا تم سکھنی ہو؟"

"نہیں تو۔ انہوں نے کہا۔ کہ تم اگر چاہو تو اپنے مذہب پر قائم رہو۔ میں اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔"

خوشیا سوچ میں پڑ گیا۔

"لیکن تمہیں بچے چھوڑنے ہوں گے۔"

اس نے بچوں سے بہت برا برتاؤ کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں دودھ تک نہ پینے دیتا۔ اگر وہ کسی چیز کے لینے پر اصرار کرتے تو انہیں دو ہتڑوں سے پیٹتا۔ اس کے دوسرے نوکر دوستوں نے اس کے دل میں یہ شک پیدا کر دیا تھا کہ اگر اس نے بچوں کو علحدہ نہ کیا تو رحمت اس کی کبھی بن کر نہ رہ سکے گی۔ انہیں دیکھ کر اُسے اُن کے باپ کی یاد ستاتی رہے گی۔

ایک رات رحمت نے خوشیا کو یاد کرایا کہ ہرچرن سنگھ نے کہا تھا کہ وہ جب چاہیں بچے اُسے واپس بھیج دیں۔ وہ انہیں خود آ کر لے جائے گا۔ اوّل تو اس نے انہیں پہلے ہی دن اس کے پاس چھوڑ جانے کو کہا تھا لیکن رحمت نہ مانی۔ وہ بچوں کو یتیم خانہ میں چندہ اکٹھا کرنے یا یتیموں کے لئے کھالیں اکٹھی کرنے کے لئے ان کے سپرد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اس بارے میں کئی ذرائع سے پتہ کیا تھا۔ اس لئے بچوں کو ہندوستان بھجوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ننھی سلطانہ، جو ابھی دودھ پیتی تھی کا سوال اب بھی باقی رہ گیا تھا۔ خوشیا کے لئے یہ ایک اور ثابت شدہ جیتا جاگتا کلنک تھا۔

رحمت نے ہرچرن سنگھ کو بچے واپس لے جانے کے لئے خط لکھوایا۔

وہ ایک ہفتے کے اندر اندر انہیں لینے کے لئے بارڈر پر آیا۔ اپنے آنے کی اس نے پہلے اطلاع کر دی۔ سیاسی پابندیاں اب تک اس پر پڑی تھیں۔

سے پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے خوشیا اور سب کو ملنے کی بڑی خواہش ظاہر کی۔ اس کا سات آٹھ مہینے کے عرصے میں صرف ایک خط آیا تھا جس ں اس نے نہایت احتیاط سے بچوں کا حال احوال پوچھا تھا۔ خوشیے نے ہرچرن سنگھ کا نام پڑھ کر ہی اسے پھاڑ دیا۔ آج وہی ہرچرن سنگھ دوبارہ بارڈر پر آ رہا تھا۔

خوشیا نے سلطانہ کو بھی ماں کی گود سے چھین کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔

"اگر تم نے مجھے اسے حوالے نہ کیا تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"اس سے پہلے میں نہ اس کا گلا گھونٹ دوں گی بھلا۔"

بچوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا ہوتے دیکھ کر رحمت پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ اس خونچکاں نظارے کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے خوشیا کو اکیلے ہی جانے کو کہا۔

"میرے جانے سے کہیں بات بگڑ نہ جائے،" اس نے گلاب اور شمشیر کو آخری بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بیٹو۔ جہاں رہو، خوش رہو!"

واپسی کے وقت خوشیا نے بچوں کو آم، گنڈیریاں، خوبانیاں اور مٹھائی لے دی۔ انہیں کھلونے بھی لے دیئے۔ وہ اب انہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن بچے سب سے بڑے کھلونے۔ ماں۔ کو کھو بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں اداس و سوگوار تھیں وہ یوں خائف تھے جیسے کوئی انہیں مقتل کی طرف لئے جا رہا ہو۔

بارڈر پر ہرچرن سنگھ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت دُبلا دکھائی دیتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے پھل۔ نہایت عمدہ آم اور خربوزے لایا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو وہاں کئی آموں کے رسیا کو دوگنے بلیک کر سکتا تھا۔ اسکے پاس، علاوہ ازیں، پاپڑ اور بڑیاں تھیں جو وہ خوشیا کے لئے بطور تحفہ لایا تھا۔

خوشیا اور بچوں کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ گلاب کو دیکھ کر اس کی نظریں سوال سے خود بخود جواب میں بدل گئیں۔ بچوں کی واپسی کے لئے رسمی اور قانونی کارروائی ہو چکی تھی۔ اس نے انہیں سنبھالتے ہوئے نہایت مختصر الفاظ میں پوچھا۔

"اور سب خیریت ہے؟"

"ہاں۔ خدا کا فضل ہے۔ آپ ہو . . . . . کتنے دن؟"

"بارڈر پر تو وقت کا پتہ نہیں چلتا۔ یہاں آکر ذہن میں عجب عجب خیالات آتے ہیں۔ . . . . . ملکوں کی سرحدوں کی طرح مٹتے اور اُبھرتے، بنتے اور مٹتے ہیں۔!"

بارڈر بند ہونے والا تھا۔ خوشی محمد نے جلدی جلدی ہرچرن سنگھ سے اجازت لی۔ آخری وقت اس نے اسے اور بچوں کو یوں چھاتی سے بھینچ کر رخصت کیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے جیسے وہ سب کدورتیں بھول گیا ہو۔

ابھی وہ گھر بھی نہیں پہنچا تھا کہ اُسے معلوم ہوا کہ پٹھان گل محمد اصل سے دوگنی رقم بمعہ دو آنے فی سینکڑہ کے حساب سے سود کی عدم ادائیگی کے لئے عدالت سے خوشیا کے خلاف ڈگری لے کر اس کی چیزیں قرق کرا چکا ہے۔

جب وہ گھر پہنچا تو خوشی محمد نے سلطانہ کو مرا پایا۔ پتہ چلا کہ رحمت نے اُس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس مغویہ عورت اور کافری بیوی، جس پر خوشیا کا ایک دوست عاشق ہو گیا تھا، اس واردات کی اپنے عشق میں ناکام ہونے کی وجہ سے پولیس میں خبر کرا دی۔

پولیس موقعہ پر پہنچی۔ رحمت کو زیرِ حراست لے لیا گیا۔

یورپ میں اجنبی

منظور الٰہی

(۱)

اندلس کی فضائیں اداس ہیں اُس کے در و بام پر ایک ناقابلِ بیان افسردگی سحر کی طرح مسلط ہے ابھی نور کا تڑکا تھا گاڑی آہستہ آہستہ قرطبہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جو تاریخ کے فیصلہ کن موڑ پر خون میں نہا گئی تھیں، اُس خون میں طوائف الملوکی اور دولت پرستی کی بیسود قربانیاں بھی شامل تھیں۔ ایسی پہاڑیوں پر جذبۂ حب الوطنی میں سرشار نصرانیوں نے مذہب کے نام پر "وحشی" عربوں کو تہ تیغ کیا تھا، شاید اِس BROODING SADNESS کی وجہ ایک عیسائی مورخ نے لکھ دی ہے "عربوں نے اندلس کو گلزار کی طرح سجایا، جب یورپ میں چاروں سُو ظلمت تھی علم و ادب کی شمعیں روشن کیں، شیولری — CHIVALRY کے اصول وضع کئے۔ ہسپانویوں نے موروں کو جلاوطن کر کے کیا پایا؟ کچھ عرصہ ہسپانیہ چاند کی طرح مستعار روشنی سے چمکتا رہا، پھر گہن لگ گیا اور اُس وقت سے یہ ملک تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔" بتدریج اور مسلسل انحطاط زا اِن احساسات کو لئے قرطبہ کے نواحی علاقے میں پہنچتا ہے، ٹرین گھٹی گھٹی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اِن ویران پہاڑیوں پہ کبھی عربوں نے انجینئرنگ کے کمالات دکھائے تھے AQUEDUCTS بنائے تھے سیرا مورینا کے پہاڑوں سے پانی لا کر درجہ بدرجہ بند بنا کر سارے علاقے کو شاداب کیا تھا، انار آڑو خوبانی بادام کھجور اور سنگترہ مقامی پھلوں پر ایزاد کئے تھے، بعض پھلوں کو ہسپانیہ کی آب و ہوا قبول نہیں کرتی تھی لیکن عرب باغبانوں نے اپنے کمالِ فن سے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیئے۔ آج یہ علاقہ SOIL EROSION کا شکار ہے، مٹی کے ٹیلوں میں گہرے شگاف نظر آ رہے ہیں۔

بدنظمی کے ایک مختصر وقفے کے سوا قرطبہ اڑھائی سو سال مغرب کا عظیم ترین شہر رہا، اُس کے کمالِ عروج کا زمانہ دسویں صدی سے شروع ہوتا ہے، شہر کی آبادی دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، آبِ مصفّا بکثرت مہیا کیا گیا تھا، میلوں لمبے پختہ کوچے جہاں رات کو روشنی کی جاتی تھی۔ آئندہ دو سو سال تک یورپ میں کوئی ایسا شہر نہ تھا جہاں پختہ کوچے اور روشنی کا انتظام ہوتی، پبلک سکول اور حمام ایسی نعمتوں کا خیال کیا جا سکتا تھا

روزمرہ زندگی میں نفاست کو جو مقام حاصل تھا۔ شمالی ممالک اُس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے، قرطبہ کا منقش ظروف سازی اور چمڑے کا کام (CORDWAIN — تو اب تک محاورہ کی حیثیت رکھتا ہے) المیریا کا ریشم اور زری کا کام، فرسیا کے قالین، بلنسیہ کے پھول اور باغات، اشبیلیہ کی شراب

اور زیتون کا تیل، وادی الکبیر کا پھلدار درختوں سے پٹا ہوا میدان ...... لکھائی کے لئے عرب کاغذ کی بہترین قسم استعمال کرتے تھے۔ کتابیں مجلّد ہوتی تھیں مورخین متفق ہیں کہ الحکم کی لائبریری میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ الحکم کے کارندے اسی دُھن میں دور دراز ممالک کا سفر کرتے اور جہاں کوئی نادر یا نئی تصنیف شدہ کتاب دستیاب ہوتی۔ ہر قیمت پر خرید لیتے، قرطبہ کی یونیورسٹی نظامیہ بغداد اور الازہر کی ہم پلّہ تھی، بچّہ بچّہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا، یورپ میں ابھی تک جہالت کا دَور دَورہ تھا، چند راہبوں یا پادریوں کے علاوہ لوگ علم سے بے بہرہ تھے اور کتابوں کی تعداد معدودے چند تھی،

قدیم شہر کا محیط چودہ میل تھا لیکن خوشنما سوادِ شہر دریا کے کنارے پر پھیل گئے تھے، میلوں تک باغات اور مکانوں کا لامتناہی سلسلہ تھا، کوچے اِس نفاست سے PAVE کئے گئے تھے کہ آج بھی لکڑی کے پہیّوں والی گاڑی شور مچاتی اُن گول اور سخت پتھروں پر سے گذرتی ہے جو ایک ہزار سال ہوئے عربوں نے ترتیب سے جوڑے تھے۔ دیدہ زیب پُل دریا کے کناروں کو ملاتے تھے، سب سے بڑا پُل اب بھی وادی الکبیر کی حدِ سیلاب سے بلند دعوتِ نظر دیتا ہے

قرطبہ کے بھرے بازاروں میں سیاہ فام حبشی، گندمی رنگ والے بربر، یونانی تاجر، عرب علما اور کاریگر بھڑکیلی وردی پہنے خواجہ سرا اور شاہی محلوں کے پاسبان سفید ریشم میں ملبوس اُمرا، درمیانہ طبقہ کے تاجر اور عقب میں نسبتاً غریب کاریگر اور مزدور قافلہ بن کے گذر گئے۔ یہ کاروانِ رنگ و بو گذر چکا، آج سوادِ شہر میں بگولے اُٹھتے ہیں جیسے شوکتِ مرحوم کا ماتم کر رہے ہوں۔

قرطبہ نسبتاً چھوٹا شہر ہے لیکن وضع قطع سادگی اور دلکشی کے لحاظ سے اُس میں ایک ایسی جاذبیت تھی جس کا نقش ذہن پہ رہ گیا، اُمرا کے مکانات جیسے پرانی طرز کی حویلیاں، مکان کے اندر سنگِ مرمر کا صحن RATIO اور فوّارہ اردگرد ہرے بھرے بیل بوٹے، باہر صیقل شدہ جنگلہ، مکان مکین کی خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کا پتہ دیتے تھے، ہر چیز قرینے سے دھری تھی، گلی کوچے تنگ تھے لیکن بیحد صاف ستھرے۔ مسجد کا راستہ شہر کے پرانے حصے میں سے ہو کر جاتا ہے۔ مسجد کے قریب ایک چھوٹا سا چوراہا تھا اتنا دلفریب کہ ہلنے کو جی نہ چاہے پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں دو منزلہ مکانوں پر چڑھ گئی تھیں۔

مسجد اِس "عروس البلاد" کا دل تھی۔ مسجد کے اندر قدم دھرتے ہی جو چیز متوجہ کرتی ہے وہ اس کی وسعت اور کشادگی ہے، مسجد کی خوبصورتی اُس کی سادگی اور SWEEP میں پنہاں ہے۔ متناسب و متعدد ستون چھت کو سہارا دیئے ہوئے ہیں، آج ایک ہزار میں سے ۸۶۰ ستون قائم ہیں۔ باقی ستون گرا کر مسجد میں دو مختلف جگہ پر کلیسا بنا دیئے گئے ہیں۔ گو کلیسا کی تعمیر تناسبِ عمارت پہ اثر انداز ہوئی ہے اس کے باوجود مسجد کی وجاہت لازوال ہے۔ انسان اندرونی حصّہ کی کشادگی دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے، امتدادِ وقت نے بہت سے نقش و نگار مٹا ڈالے لیکن شیشے کے پھول پتیاں اور گلکاریاں اب بھی پرانی آب و تاب کی یاد دلاتی ہیں۔ ہمارے راہبر نے بتلایا کہ نصرانی ہونے کے باوجود قرطبہ کے بسنے والوں نے کلیسا بنانے کی سخت مخالفت کی تھی، وہ آخر دم تک کہتے رہے کہ کلیسا کی تعمیر سے مسجد کی خوبصورتی تباہ ہو جائے گی لیکن آرچ بشپ نے فیصلہ اُن کے خلاف دیا، دو سال بعد جب آرچ بشپ کا گذر قرطبہ سے ہوا تب اُسے پہلی بار مسجد دیکھنے کا موقع ملا اور اُس نے اپنے کئے پر اظہارِ تاسّف کرتے ہوئے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا مسجد اتنی جمیل ہے تو میں کبھی کلیسا تعمیر کرنے کا حکم نہ دیتا، یہ روایت قرطبہ کے میونسپل ہال میں ایک دستاویز کی شکل میں محفوظ ہے۔

ہمارے عیسائی راہبر نے کہا، مسجد کے بیچوں بیچ کلیساؤں کی تعمیر ایک افسوسناک امر ہے لیکن مجھے یہ سوچ کر اک گونہ تسلّی ہوتی ہے کہ اگر یہ دو کلیسا نہ ہوتے تو شاید اِس مسجد کا بھی وہی حشر ہوتا جو قرطبہ میں ۷۰۰ مساجد ۹۰۰ حمام کا ہوا یعنی ڈھونڈے سے بھی اِس کا نشان نہ ملتا۔ عالمِ خیال میں دیکھا کہ عمامہ باندھے حجازی شہسوار اپنی آرام گاہوں سے نکل کر کہہ رہے ہیں "باری تعالیٰ تو نے اپنے دیوانوں کو دیکھا، جہاں ایک ستون بس ہوتا ہم نے دس نصب کئے۔

تیرے عشق میں وہ مشقت بھی راحت تھی

چلیے خوب ہے کہ علامہ اقبال نے مسجد کو کسی مادّی چیز سے تشبیہہ نہیں دی، اُن کے نزدیک وہ ایسی مناسبت سے ماورا ہے ؎

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

پھر سے

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر   قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

مسجد سے باہر نکلے تو خیال آیا چند SOUVENIERS خرید لئے جائیں، بڑے دروازے کے سامنے ایک دکان میں چلے گئے۔ تین لڑکیاں دکانداری کے فرائض انجام دے رہی تھیں، خوش خلق، ہنس مکھ اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے پر ”بضد“ لیکن یہاں وہ قصّہ تھا کہ ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

زیادہ گفتگو اشاروں سے ہوئی اُن کی باتوں یا اشاروں میں کوئی عامیانہ پن نہ تھا جیسے فرانس یا اٹلی میں دیکھنے میں آیا۔ چلنے سے پہلے میں نے سوچا ہسپانیہ سے کچھ تعلق جتانا چاہیئے۔ لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

”ہسپانیہ پہ کبھی مور حکمران تھے؟“

”جی؟“ (لاعلمی کی مسکراہٹ)

”ہمارا موروں سے روحانی تعلق ہے ہم بھی مسلمان ہیں۔“

”جی“ (ایک اور مسکراہٹ)

”آپ زہرا ہو آئے ہیں؟“

”جی میں تو نہیں جا سکا لیکن آپ ہو آئیے، سُنتا ہوں قابلِ دید جگہ ہے“ ہوٹل کے مینیجر نے کہا۔

”آپ کو یہاں کتنے سال ہو گئے؟“

”آٹھ سال“!

عبدالرحمٰن الناصر کا تعمیر کردہ قصرِ زہرا اور اُس دُلہن کو اپنے ہاں رہنے کے لئے مدینۃ الزہرا۔ یہ یہاں آکر بسے گا چار سو دس ہم پایہ گا۔ الناصر کی چہیتی بیوی زہرا کی فرمائش پر قرطبہ سے چند میل، اس سوادِ یگانہ کی بنا رکھّی گئی۔ مختلف رنگ کا مرمر دنیا کے مختلف حصّوں سے لایا گیا، سلاطین قسطنطنیہ اور روم نے ستونوں کے تحائف بھیجے، البیریا کی کانیں دن رات سنگِ مرمر نکالنے میں مصروف ہوئیں، آبنوس افریقہ سے، خوشبودار لکڑی مشرق سے۔ سونے کے جانور مطلا و منقش ہال کمرے، پارے سے لبریز حوض سالم پتھر سے تراشی ہوئی پاکیزہ جھیل، اپنے عروج پر یہ قصر دُنیا کے نوادر سے بھرپور تھا۔

المنصور نے ایک اور عالیشان محل تعمیر کرایا وہ یہیں غیر ممالک کے سفیروں سے ملاقات کرتا اور صوبائی گورنروں کی رپورٹیں سُنتا۔ اس دُلہن کا سُہاگ بربروں کے ہاتھوں لُٹا تھا۔ تہذیب و تمدّن سے ناآشنا خونخوار افریقی سپاہی جو خلیفہ نے امداد کے لئے بُلائے تھے۔ ایک سیلاب کی طرح اس حسین عروس پر ٹوٹ پڑے۔ اور وحشیانہ نفرت کے ساتھ آرائش و زیبائش کی دھجیاں اُڑا دیں، پھر اس لٹے ہوئے قصر کو دیا سلائی دکھا دی۔

ایک عرصہ زمانہ کی گرد نے اِن کھنڈرات کو ڈھانپے رکھّا جو اب درجہ بدرجہ ظاہر ہو رہے ہیں، فرنیکو کا محکمہ آثارِ قدیمہ ٹکڑوں اور ٹھیکروں کی لمبی قطاریں لگائے ہوئے تھا جو کسی زمانے میں دیدہ زیب ظروف گلدان یا ستون تھے، ہسپانوی زہرا کو اپنی پہلی حالت پہ تو نہیں لا سکتے لیکن وہاں عجائب خانہ ضرور بنانا چاہتے ہیں۔

اشبیلیہ، اندلس کی روحِ معطّر، لخمی امیروں کا مغرور دارالسلطنت، ”القصر“ والا اشبیلیہ، وہاں فضا آج بھی یاسمین اور گلاب سے مہکی ہوئی ہے، سُنہری مچھلیاں خواب آلود محل کے شفاف چشموں میں اُبھرتی ہیں ”القصر“ کا ایوان السفیر آج بھی عظمتِ گزشتہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔

مسجد کا نام و نشان باقی نہیں لیکن رفیع مینار ”جیرالڈا“ اب بھی ناز سے سر اٹھائے شہر کو تک رہا ہے۔ ”جیرالڈا“ جس کی چوٹی پر عرب شہسوار ڈھلوان سے گھوڑا دوڑاتے پہنچ جاتے تھے، سات صدیاں گزریں یہ ایک عظیم مسجد کی نگہبانی کرتا تھا، اور جب رات کی چادر کائنات کو ڈھانپ لیتی تو علمائے ہیئت

کواکب کی حرکات کا مطالعہ کرتے، ستاروں کا درمیانی فاصلہ ناپتے اور کسوف و خسوف کا حساب لگاتے۔

PLAZA کے درمیان ایک جنگجو کا مجسمہ ایستادہ ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار موروں سے نبرد آزما ہونے جا رہا ہے، سرکش گھوڑے کے اگلے دو پاؤں اٹھے ہوئے ہیں۔ اشبیلیہ میں آسودگی ہے، مسکراہٹیں ہیں BULL FIGHTS شام کو پلازا میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔

"القصر" میں ہمارے راہبر نے شکوہ کیا خلیفہ حرم میں لاتعداد بیویاں باندیاں رکھتے تھے، رنگ رلیاں مناتے تھے اور بیچاری عیسائی رعایا ٹیکس ادا کرتی تھی۔ بھائی سچ ہے لیکن شمال میں عیسائی حکومتوں کے حالات، کون سے بہتر تھے اور سوچو تو آج بھی ....

یہ علم دوست علم پرور معتمد کا اشبیلیہ ہے۔ شمشیر زن معتمد، جنگِ زلاقہ میں اس کی ران تلے تین گھوڑے مرے۔ زرہ بکتر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ لیکن جو سامنے آیا زیر ہوا لیکن جو تلوار کا دھنی تھا لیکن قسمت کا دھنی نہ تھا۔ یوسف بن تاشفین اس کے بلوانے پر مراقش سے آیا کہ عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے سیل کو روکے۔ پھر معتمد خود یوسف بن تاشفین کے نائب کے خلاف جنگ آزما ہوتا ہے، شکست کھا کر قید ہوتا ہے ع مردِ حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج، یہ فلسفی ابن رُشد کا اشبیلیہ ہے جس نے یوسف بن عبدالمومن کے دربار میں عروج پایا، یوسف المواحدین ایسے "رجعت پسند" خاندان کا چشم و چراغ !!

غرناطہ۔

الحمرا۔ نہرِ رواں۔ شہتوت کے جھُنڈ۔

محمد ابنِ نصر الاحمر شہابِ ثاقب کی طرح اُندلس کے اُفق پر اس وقت نمودار ہوا جب ہسپانوی مسلمان باہم خانہ جنگی میں مصروف تھے اور عیسائیوں کے ہاتھوں پے در پے شکست کھا رہے تھے، الاحمر نے جس خانوادہ کی بنیاد رکھی اُسے اندلس میں نصرانی اقتدار کے اڑھائی سو برس بعد تک حکومت کرنا تھی۔ اُس نے غرناطہ کو دار السلطنت بنایا۔ اس فاتح کو جب لوگوں نے 'غالب' کا خطاب دیا تو اس کا جواب تھا لاغالب الا اللہ، یہ الفاظ الحمرا کے گوشے گوشے میں ایک ابدی حقیقت بن کر ثبت ہیں گو مرورِ زمانہ سے تحریر مدھم ہو گئی ہے۔

الحمرا آج بھی سطوتِ پارینہ کا آئینہ دار ہے۔ دار السرور۔ ایوان السفیر، ایوان الاسد۔ ایوان بنی سراج۔ چھت کی جواہر نگاری، زمردیں شگوفہ کاری۔ اور آرائش تو زمانہ کے بیرحم ہاتھ نے لوٹ لی لیکن نازک ستونوں کی قطاریں جالی کے کام کی نفاست، ٹائیلوں کی بناوٹ، خوشنما کھڑکیاں اور پتھر کے ٹکڑوں سے بنائے ہوئے نفیس جال اب بھی انسان کو محوِ حیرت کرتے ہیں، پسِ منظر میں سیرا نوادا کی برف پوش چوٹیاں ہیں، نیچے تنگ گھاٹی میں پانی کے چشمے اُبلتے ہیں۔ جھرنے شور مچاتے ہیں اور کف در دہاں لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں، قلعۂ کوہ آج بھی اِک لُٹے ہوئے قصر کو آغوش میں لئے ہے جس کے ایوانوں میں اِک مردِ حُر کی آواز آخری بار گونجی تھی "فرڈیننڈ اور ازابلا کے وعدوں کا اعتبار نہ کرو۔ اہلِ قسطیلہ نے پہلے کب اپنے وعدے ایفا کئے، تمہارا ناموس کوڑیوں کے مول نیلام ہوگا، اگر تم میں کچھ حمیت باقی ہے تو میرے پیچھے آؤ، بہادروں کی طرح میدان میں کٹ مرنا غلامی کی کربناک زندگی سے بدرجہا بہتر ہے"۔

موسیٰ بن ابی الغزن کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر اس کے پاس لوٹ آئی، ابو عبداللہ اور اس کے اُمرا کی نظریں زمین میں گڑی رہیں۔ غیرت و حمیت کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ "جو اللہ کی مرضی" موسیٰ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی، گھوڑے کے ٹاپ پختہ فرش سے ٹکراتے ایک اندوہناک خاموشی کو چیرتے ہوئے گزر گئے۔ فصیل کے باہر اُس کی مڈبھیڑ چند عیسائی KNIGHTS سے ہوئی، دست بدست لڑائی میں اُس نے چار پانچ کو ابدی نیند سلا دیا خود زخموں سے چور ہو کر دریا میں کود پڑا اور زرہ بکتر کے بوجھ سے اُس کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔

غرناطہ کے شجیع شہر سے باہر عیسائی KNIGHTS کو چیلنج کر کے دادِ شجاعت دیتے، ہسپانوی غرناطہ کے شہسواروں کا لوہا مانتے تھے۔

GENTLEMEN ALBEIT MOORS.

وہ شیولری کے آداب ملحوظ رکھتے، موسیقی کے دلدادہ، ہم پلہ حریف سے جنگ، بیکسوں کی حمایت .... نصرانی افواج کا محاصرہ بالآخر کامیاب ہوا۔ وہ طویل صلیبی جنگ جو ۷۷۷ سال جاری رہی جس میں تین ہزار سات سو معرکے ہوئے بالآخر یوں ختم ہوئی سقوطِ غرناطہ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔

غرناطہ کے اوپر پہاڑ کاٹ کر جپسیوں نے رہائش کے لئے گپھائیں بنائی ہیں۔ یہ گپھائیں رات کو بجلی کی روشنی میں جگمگ کرتی ہیں، جپسی رقاصہ بل کھا کھا کر تیزی سے رقص کرتی رہی، ہمارا راہبر تیزی سے سفید شراب کے گلاس خالی کرتا رہا اور سب سے زیادہ داد بھی اسی نے دی۔

دوسرے روز ریستوراں میں ایک خوش پوش جوڑا ہمارے ساتھ والی میز پر بیٹھ گیا، وہی بشاشت اور مسکراہٹ، وہی بات کرنے پر اصرار، آخر ہم نے ہار مان لی، کوئی کب تک اشاروں سے بات کر سکتا ہے۔

ہسپانویوں کا BOABDIL اہل غرناطہ کا سلطان الصغیر سر جھکائے آہستہ آہستہ جا رہا ہے، حرماں نصیب ابوعبداللہ، زوالِ اندلس کی مجسّم تصویر۔ غرناطہ کا آخری فرمانروا اپنی ماں عائشہ کے زیرِ اثر ایک مطلق العنان حکومت کا خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس گوہر کو حاصل کرنے کے لئے اسے فرڈیننڈ کی کٹھ پتلی بننا منظور کیا، اپنے جری باپ ابوالحسن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور بغاوت بھی اس وقت جب ابوالحسن اہلِ قسطیلہ سے الحامہ چھیننا ہی چاہتا تھا۔ ابوالحسن جس نے خراج طلبی پر فرڈیننڈ کو یہ پیغام لکھ بھیجا تھا "باجگذار فرمانروا مر گئے اب ہماری ٹکسال میں سکّوں کی بجائے شمشیر اور نیزے تیار ہوتے ہیں"۔

روایت ہے کہ فتحِ غرناطہ کے بعد جب ابوعبداللہ جلاوطنی کے دن گزارنے وادئ برشانہ کی سمت جا رہا تھا تو مڑ مڑ کر بصد حسرت الحمرا کی طرف دیکھتا، کچھ دیر بعد پادول کی چوٹی پر بیٹھ گیا اور آخری نظر اپنے محبوب شہر پر ڈالی۔ ایک طرف گلستان تھے، سرو مسلمانوں کے مقابر پر جھوم رہے تھے اور ان کے اوپر قصر الحمرا جلوہ گر تھا۔ دوسری طرف بیکراں سمندر تھا جس کی موجوں کو چیر کر طارق کی فوج ایک اجنبی ملک کو مسخر کرنے آئی تھی۔

دیدۂ خونبار نہ رو ایسی قوم کو زندہ رہنے کا حق نہ تھا۔ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر تھی، عرب۔ بربر۔ مولّد۔ ہسپانوی، نسلی تفاخر و امتیاز، فلسفہ اور فقہ میں لامتناہی نزاع۔ خود مختاری کی ہوس . . . . اس کی ہلاکت لابدی تھی۔ شمالی افریقہ کے صحراؤں سے تازہ دم مذہب کے نشے میں سرشار بربر "بدعتوں" سے متنفر تھے اور فلسفیوں کی جسارت حقارت سے دیکھتے تھے، شمال میں عیسائی حکمران اندلس کی غلامی اور ہلال کے عروج پر کڑھتے دراصل وہ عربوں کو کبھی معاف نہ کر سکے، یہ تھے چکی کے دو پاٹ جو مغرب ہسپانیہ کو پیس دینا چاہتے تھے۔

جواہر لال کہتے ہیں بعض لوگ تاریخ کی اہمیت نہیں سمجھتے، آج مجھے کس شدّت سے وہ احساس ہے وقت کا دھارا بہتا رہا ہے اس "تُند و سبک سیل" میں اندوہناک خانہ جنگیاں، جگمگاتے ہوئے شہر اور اک پُرشکوہ تمدّن خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

ہسپانوی مورخوں کا ایک گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نہ انہوں نے عربوں سے کچھ ورثہ میں پایا نہ ہی وہ کسی چیز کے لئے ان کے احسان مند ہیں، ان کا کہنا ہے کہ پانسو سے آٹھ سو سال تک حکومت کرنے کے باوجود عرب اور مور ان کی موجودہ طرزِ معاشرت اور ثقافت پر اثر انداز نہیں ہوئے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود اشبیلیہ میں ایک نسبتاً "ماڈرن" عمارت موجود ہے جو نمائش کے لئے بنائی گئی تھی اور جس کا ایک حصّہ بالکل مسجد کے مشابہ ہے مینار تک موجود ہے۔ نام اور کھانوں میں مشرقیت کی جھلک سے قطع نظر "خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں" اس حد تک کہ زبان سے اجنبیت کے باوجود باتیں کرنے پر مُصر، ٹرین میں کیفے میں خوش آمدید کہنے والے موجود، کوئی ہسپانوی ٹرین سے اُترے تو سب کو فرداً فرداً الوداعی سلام دوپہر کے طعام کے بعد تین چار گھنٹے آرام (SIESTA) MANANA یعنی "آج نہیں" کا بکثرت استعمال . . . . . کون کہہ سکتا ہے اندلسی ترانوں میں عرب کا سوز نہیں۔ راگ میں "انترا" اٹھاتے ہیں، رفقاء اور سامعین "اوے اوے" کہہ کر تال دیتے ہیں، بھڑکیلے لباس میں ماہ وش رقاصہ کبھی ایک انداز سے جھیرے بجاتی ہے کبھی پیتل کی تھالیاں ٹکرا کر نغمگی پیدا کرتی ہے اور ساتھ ساتھ طنبورہ بجانے والا اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ یہ ہارون الرشید کا بغداد نہیں ہسپانیہ کا مغربی صوبہ اندلس ہے جس کے شوخ رنگ لباس اور خون میں حدت پیدا کرنے والے گانے یورپ میں مشہور ہیں۔

(۲)

"ٹنٹرن ایبے" کا نواحی علاقہ تکلیف دہ طور پر خوبصورت تھا، وہ خوبصورتی ایک سیاح کے لئے نہ تھی! اک ذرا دم لو ہمارے خنک سائے میں دو گھڑی ٹھہرو مسافر جلدی کیا ہے نیچے ڈھلوان پر انگریز کرکٹ کھیل رہے تھے جو نہیں کھیل رہے تھے محض دیکھ رہے تھے! ایبے کے کھنڈرات نظر آ رہے تھے! اس وقت بھی کھنڈر تھے جب ورڈز ورتھ نے اپنی خوبصورت نظم کہی اور اب تو بنیادیں منہ چڑا رہی تھیں آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک صاحب گنج نکالے بکنگ آفس بنائے بیٹھے ہیں اور ٹکٹ طلب کر رہے ہیں، ہاف کراؤن یعنی اڑھائی شلنگ؟ ارے چھوڑیئے میرے ساتھی نے ناک بھوں چڑھائی اور ہم کھنڈرات کو چھوڑ اس حسین نظارے میں محو ہو گئے جو ایک خوش گوار خواب کی مانند تھا۔ بس بے تکان چلی جا رہی تھی، پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑک خاموش گھنیرے جنگلوں میں سے گزر رہی تھی! یہ WYE VALLEY تھی، نیچے کھڈ میں دریائے وائی بہہ رہا تھا، کوئی اِکّا دُکّا پرانا قلعہ یا ننھا شہر آ جاتا اور ایک نظر دیکھ کر ہم سرگرم سفر ہو جاتے وہ سُندرتا ازلی تھی، اُس میں دوام تھا، ثبات تھا، ٹھہراؤ تھا، نظارے کو جذب کرنے اور نظارے میں جذب ہو جانے کی دعوت تھی۔

چند باتوں میں انگریز خود بین ہے یا اُسے وہ زمانہ ابھی تک نہیں بھولا جب پیرس اور فرنچ ریویرا اُن کی جولاں گاہ تھے۔ "فرانسیسی سیکھنے کی کیا ضرورت ہے انگریزی سے کام چل جائے گا" ہمیں لندن میں مشورہ دیا گیا۔ پیرس میں یہ عالم تھا کہ شانز دی لیزے اور آرک ڈی ٹرائیمف ایسی سنٹرل جگہوں پر فرانسیسی کہنے والے بضد تھے کہ وہ انگریزی سے قطعاً نابلد ہیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس میں قومی تعلّی کو بھی دخل ہے جیسے کہہ رہے ہوں "انگریزی بول رہے ہو فرانسیسی سیکھتے موت آتی تھی؟" بہرحال رودبارِ انگلستان کے اُس پار اِک انوکھی دُنیا ہے۔ اگر نمبروار موازنہ کیا جائے تو کچھ ایسا نتیجہ نکلتا ہے۔

لندن	پیرس
لنچ پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتا ہے۔	لنچ دو اڑھائی گھنٹے میں ختم ہوتا ہے، ہر کورس کے ساتھ متنوع شراب۔
سستا لنچ تین چار شلنگ میں۔	سستا لنچ ایک ڈیڑھ پونڈ میں۔
فرنچ بین سے گھن آتی ہے۔	مکھن میں تلی ہوئی فرنچ بین سے دل خوش کن مہک اُٹھتی ہے۔
لنچ کے فوراً بعد کام۔	پیرس اور سپین میں لنچ کے بعد طویل قیلولہ
ٹریفک کا سپاہی لانبا تڑنگا اور وجیہہ۔	ٹریفک کا سپاہی پستہ قد، بس چلے تو راہ چلتی لڑکیوں سے مذاق بھی کر لیتا ہے۔

بحیرۂ روم کے نیلگوں ساحل کے ساتھ ساتھ نیس سے جنیوا کا سفر بے پناہ شہرت کا حامل ہے۔ جب ہم نے نیس کو خیرباد کہا سورج کی پہلی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ایک طرف اتھاہ نیلا سمندر تھا دوسری طرف بے آب و گیاہ پہاڑ جس کے اُس پار سورج کی شعاعیں بادلوں سے چھن چھن کر انہیں حیرت انگیز رنگ بخش رہی تھیں۔ چند منٹوں میں بس چوٹی پر تھی اور سارا منظر ایک کتاب کی طرح کھل گیا جیسے کسی آرٹسٹ نے تصویر کشی کے لئے ایک بڑا کینوس استادہ کیا ہو بلکہ اسے ایک جاذب پینٹنگ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ وسیع وادیاں، پہاڑ اور اُن کے اُوپر بادلوں میں آنکھ مچولی کرنے والا سورج، ایک مصوّر کو تصویر کشی کیلئے اس سے حسین ترین منظر ملنا دشوار ہوگا

ہم سہ پہر کو سرگرم سفر رہے، بس فرانسیسی ایلپس طے کرتی رہی، ہر سٹاپ پر سُرخ چہرے والا ڈرائیور چند جُرعے چڑھاتا رہا، برف پوش پہاڑ نظر آنے لگے، ہم قریب سے قریب تر ہوتے گئے حتیٰ کہ پہاڑوں پر برف کے PATTERNS صاف نظر آنے لگے، وہ عمومی PATTERNS نہیں تھے جیسے کسی نے آئس کریم کپ اوندھا کر دیا ہو بلکہ پہاڑ کی ڈھلوان برف کی سفید چادر نے قرینے سے ڈھانپ رکھی تھی۔ پانی کی رستی ہوئی بوندیں زمین چھونے سے پہلے یخ بستہ ہو کر منجمد جھرنوں میں تبدیل ہو گئی تھیں، جب ہم آگے بڑھے تو خود برف باری کی زد میں آ گئے۔ دودھیا برف دھیرے دھیرے گر رہی تھی۔ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی مانند، سارے منظر اور پسِ منظر کو نورانی چادر نے ڈھانپ لیا تھا، برف کے گالے ہماری جدوجہد سے بے خبر، زمانے کے رنج و غم سے بے خبر آہستہ آہستہ زمین

کی طرف آ رہے تھے جیسے فضا میں معلق ہوں جیسے کوئی جلدی نہ ہو اور میں نے سوچا اگر تطہیر اور پاکیزگی کے اِس مرقع کو اپنے رگ و پے میں سمولوں تو شاید میری رُوح کے داغ دُھل جائیں لیکن یہ خواہش ناپختہ تھی۔ بس کے پہیئے برف کا کھیت چیر کر رستہ بناتے رہے، برف پاروں نے ٹہنیوں اور پتّوں کا زیادہ حصّہ ڈھانپ لیا تھا کچھ حصّہ برف کا منتظر تھا اِس لئے بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ برف کی تہیں جمتی چلی گئیں، اندھیرا گھمبیر ہوتا گیا اور پہاڑ آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔

صبح سویرے ہم نے جنیوا کا رُخ کیا، موسم ماحول ویسا ہی تھا، ہمارے گرد و پیش سب چیزیں برف کی آغوش میں تھیں، اب ہم ایک خزاں زدہ علاقہ سے گزر رہے تھے، ٹہنیاں پتّوں سے یکسر خالی تھیں لیکن عُریاں نہیں، برف کی دبیز تہیں اُن پہ جم گئی تھیں، یہ منظر کرسمس کارڈ کی یاد دلاتا تھا، وہی دھندلکے اُجالے میں ایک برف پوش گرجا، برف کے بوجھ سے جھکی ہوئی شاخیں، فطرت کی الھڑ دوشیزگی و معصومیت کی تصویر۔

جینوا کا قیام پھیکا رہا، برف کی پھوار مسلسل پڑے جا رہی تھی، جینوا کی مشہور جھیل بھی یخ بستہ تھی اور ہماری CRUISING سے معذور طبیعت ایسی مکدر ہوئی کہ فوراً وہاں سے کوچ کر جانے کو جی چاہا، چنانچہ دوسرے روز ہی ہم جنگ فرا کی بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے، برقی ریل برف سے ڈھکی ہوئی وادیوں اور پہاڑیوں کو تراشتی ہوئی خاموشی سے گزرتی رہی، وینگن جنگ فرا کے دامن میں ہے، جب وہاں پہنچے۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ اسٹیشن کے نزدیک ایک ہوٹل میں قیام کیا، OFF SEASON ہونے کی وجہ سے ہوٹل قریباً خالی تھا تاہم CENTRAL HEATING کی سہولت میسّر تھی، علی الصبح ویٹرس ناشتہ لائی جس سے تازگی کی مہک اُٹھ رہی تھی، روٹی کے خستہ رول، دو قسم کا جیم اور چاکلیٹ دودھ، ٹرے رکھ کر ویٹرس میری طرف مڑی۔ بَنیتو؟ میں کچھ شرمندہ ہوا وہ مجھ سے COMPLIMENT کی متوقّع تھی۔ جس میں مجھے پہل کرنی چاہئے تھی، "بنیتو میکسی مادموازیل" میں نے کہا وینگن قصبہ کہلاتا تھا لیکن سب آسائشیں وہاں میسّر تھیں۔ بجلی ٹیلیفون، ریستوراں، CENTRALLY HEATED سٹیشن اور ڈاکخانہ، معیاری کیمروں اور گھڑیوں سے بھرپور دکانیں دوسرے روز یورپ کی سب سے اُونچی چوٹی کا رُخ کیا، ریل دو ڈبوں پہ مشتمل تھی اور تین پٹڑیوں پہ آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ راستے میں اِکّے دُکّے شوقین SKING کا سامان سنبھالے ملے، وہ مناسب مقام کی تلاش میں جا رہے تھے گاڑی ٹرمینس پہ پہنچی، سامنے ہی ایک ریستوران تھا جہاں گرم کھانا اور SOUVENIERS مہیا تھے، برف سے تراشا ہوا ریڈ کراس کا محل دیکھا پھر وہ میخانہ جس میں سب چیزیں برف کی تھیں، اِس دوران میں برف پڑتی رہی تھی اُس کے اثرات واپسی پہ ظاہر ہوئے جب گارڈ نے آ کر کہا "برف بہت پڑ چکی ہے، گاڑی اگلے سٹیشن تک نہ پہنچ سکے گی مجھے افسوس ہے آپ کو ڈیڑھ میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا، ہمارے قافلے میں ایک انگریز جوڑا مع دو بچیوں کے، ایک کیوبن اور امریکن جوڑا اور ایک خوش گپ امریکن بوڑھا شامل تھے، برف کا وہ طوفان کہ الحفیظ و الامان، برف کے باریک ذرّے تند جھکڑ کی صورت میں ہمارے رستے میں حائل ہو کر ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتے، جب برف کے ذرّوں نے نتھنوں اور پتلون کے پائینچوں میں گھسنا شروع کیا تو مجھے ملتان کی لُو یاد آ گئی، کون کہتا ہے کہ ٹھنڈا دوزخ نہیں ہو سکتا، ریلوے لائن کے ساتھ راستہ قدرے ٹھیک تھا۔ ذرا پاؤں ہٹا اور برف میں دھنس گئے، ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے، میرے سر پہ ٹوپی نہیں تھی جو میری حماقت تھی، ایک ہاتھ سے میں نے انگریز بچی کو تھاما ہوا تھا جسے چلّاتا چھوڑ کے اُس کے والدین آگے بڑھ گئے تھے وہ ڈیڑھ میل کا سفر خدا خدا کر کے ختم ہوا۔

وینس: دو دن اِس قدیم ری پبلک کی گرینڈ کینال کا نظارہ کیا اور شہر سے دُور سجیلے بجرے میں اُن بے لگام موجوں پر تیرتے رہے جو کسی زمانے میں لارڈ بائرن کی جولان گاہ رہی تھیں، آرٹ گیلریاں، اُمرا کے محل۔ دریا کے بیچوں بیچ پُر وقار کلیسا، BRIDGE OF SIGHS جس کو عبور کر کے حبسِ دوام کے بدقسمت قیدی زنداں میں داخل ہو جاتے، ڈوکل پیلس اُس کے سامنے فراخ میدان اور متناسب ستون بلاشبہ حد درجہ دلکش ہیں محراب قوس اور مینار کے لحاظ سے بہت کم جگہیں اتنی جاذب ہوں گی۔ میدان میں سفید کبوتر قطار اندر قطار موجود تھے میں اور اعظم جب ٹاور میں داخل ہو کر ٹکٹ خریدنے لگے تو دروازہ کھلا رہ گیا۔ سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا تو کھانستے ہوئے VENETIAN نے کہا۔

SHUT THE DOOR YOU INDIAN

بس پھر کچھ نہ پوچھئے جو اس کی درگت بنی ہم نے لمحہ بھر کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ اُس نے ہمیں غلط فہمی کی بنا پر انڈین کہا ہے۔ اس کی تصحیح تو کر دیں۔ وینس متعدد "بھٹیوں" پر شیشہ سازی کا کام نظر سے گزرا یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سارا کام "ہاتھ کی صفائی" سے ہوتا ہے۔ چابکدست کاریگر گرم پگھلا یا ہوا انگلیوں سے توڑ مروڑ کر مُنہ سے ہوا بھرتے اور چند لمحوں میں نفاست سے بھری ہوئی چیزیں تیار کر دیتے۔

سرِ شام وینس سے RAPIDO یعنی ایکسپریس گاڑی میں سوار ہوئے، تھرڈ کلاس کے ڈبے صاف ستھرے اور گدیلوں سے آراستہ تھے ٹرین CENTALLY HEATED تھی، عام ترین سروس کی نسبت کرایہ بھی کچھ زیادہ تھا، دو اطالوی بزنس مین پہلے تو بحث کرتے رہے جب بحث نے اتنی شدّت اختیار کی کہ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونا شروع ہوئے تو ایک صاحب نے لپک کر دروازہ کھول دیا اور خود RRIDOR میں کھڑے ہو کر بحث جاری رکھی۔ سرد ہوا اندر آنا شروع ہوئی تو ہم مروّت کی وجہ سے خاموش رہے لیکن جب دیکھا کہ بحث سے نجات ملے گی نہ سردی سے عرض کی کہ ...... خیر کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ میں نے انگریزی میں کہا۔ اور انہوں نے اِشارے کنائے سے سمجھا بہر حال دروازہ بند کر دیا، ماجد صاحب روم پہنچ کر نیا طریق نکالا کہ بس میں بیٹھے ہوئے اطالوی کنڈیکٹر سے اُردو میں فرما رہے ہیں "بھائی جان تو نہیں لینی، کرایہ لو گے نا، ذرا دم لو، دیئے دیتا ہوں" LOGIC یہ تھی کہ اطالوی کنڈیکٹر انگریزی سمجھتا ہے نہ اُردو تو کیا ضرور ہے کہ انگریزی میں گفتگو کی جائے لیکن عزیز صاحب کو پیرس میں شرمندگی ہوئی تھی جب فرانسیسی نیشنل اسمبلی کے دربان نے ٹوکا اور انہوں نے فرانسیسی زبان سے لاعلمی کا اظہار کیا تو اُس نے فقرہ کسا "مجھے تو اپنا مفہوم سمجھا نہیں سکتے اندر جا کر خاک پلّے پڑے گا"

سامنے سیٹ پر ایک اطالوی لڑکی بیٹھی تھی۔ شوخ و شنگ اور ضرورت سے زیادہ بیباک ع نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے ۔ لیکن جب معاملہ ایک حد سے گزر جائے تو گھٹیا پن کا احساس ہوتا ہے وہ بالخصوص ایک لحیم و شحیم امریکن نوجوان جرنلسٹ کی طرف مائل تھی جو مشرقِ وسطیٰ کا دورہ ختم کر کے "پولیٹی اِسلام" پہ تھیسس لکھ رہا تھا۔ یعنی کیا سیاسی طور پر اب بھی اسلام مختلف اقوام کو ایک مرکز پر لانے میں کامیاب ہے یا اس نقطۂ نظر سے عملی طور پر بے جان ہے؟ جب غزالہ نے اس کا پتہ لینے پر اصرار کیا تو اُس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "زندگی کے اُس فیصلہ کن موڑ پر آ چکی ہے جب ذرا سی لغزش اسے ہمیشہ کے بازارِ حُسن فروشاں میں لے جائے گی"۔

یہ بحث طلب ہے کہ درست کہاوت SEE NAPLES AND DIE ہے یا EE NAPLES BEFORE YOU DIE بہر حال یہ نہ سمجھ سکا کہ اطالوی نیپلز کا ذکر کرتے ہوئے موت کیوں بیچ میں لے آتے ہیں، اب تو فیکٹریوں نے اِس شہر کو کسی حد تک مسخ کر دیا ہے، وہاں ہوٹل میں قیام کیا جو سٹیشن کے قریب ایک چوک میں ہے، وکٹر امینوئیل اطالوی حریّت کا علمبردار جس کا نام اطالوی تاریخ ہمیشہ ادب کے ساتھ دُہرائے گی۔ جو فرمانروا ہونے کے باوجود عوام کی آزادی کے لئے ہر جدوجہد میں پیش پیش رہا۔

مجھے اعتراف ہے میلان پہنچتے پہنچتے میں تھک چکا تھا۔ لاتعداد کلیسا، آرٹ گیلریاں، عجائب خانے دیکھ کر طبیعت اُکتا گئی تھی۔ شوق کی جگہ نے لے لی تھی، میں بغاوت پر آمادہ تھا۔ اور اس بات کا تہیّہ کئے ہوئے تھا کہ اِس نیلگوں آسمان اور نیلے سمندر کی سرزمین میں آرٹ گیلریوں کے پیچ و خم میں اُلجھ نہیں رہ جاؤں گا۔ سرِ شام ساحل کی سیر کو جا نکلا تو دیکھا کہ وہی PATTERN ہے یعنی زمین کی ایک بڑی قوس البیلے سمندر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے پہ روشنیاں نصب ہیں بنچ رکھے ہیں، بائیں ہاتھ پر سورینتو اور سامنے اُفق پر کیپری کا جزیرہ معزول بادشاہوں کھلنڈرے شہزادوں اور آرٹسٹوں کی تفریح نیس میں بھی یہی قوس تھی، کیپری اور مونٹی کارلو میں یہی جلوہ کارفرما تھا۔ دونوں جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور سمندر کے لئے زمین کی آغوش تنگ ہو گئی میلان کے بازاروں میں گھومتے ہوئے ایک قہوہ خانے میں اطالوی BARTENDER سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گفتگو کی کوشش کی۔ اُس بتلایا مزدوروں کی حالت کچھ ایسی ہے جب بندرگاہ میں جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں تو کام ملتا ہے ورنہ

NO SHIPS NO WORK

اتنے میں بنیان پہنے ایک چوڑے چکلے سینے والا مزدور داخل ہوا اور باتوں میں شامل ہو گیا، کچھ دیر بعد مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم اینگلو مریکن ایجنٹ تو نہیں"۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ سیاسیات یا کسی SPY RING سے میرا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ بھرا بیٹھا تھا اور زبان کی دشواری حائل تھی گو BARTENDER میرا ہمنوا تھا پھر بھی میں نے کھسک جانے میں مصلحت سمجھی۔

جو سیاح کیپری جاتا ہے BLUE GROTTO کی زیارت ضرور کرتا ہے۔ سرما کی آمد آمد تھی لیکن تیز ہوا کی وجہ سے سمندر میں ہیجان تھا اور ہماری ھی کشتی ہچکولے کھاتی زیر و زبر ہوتی ہوئی بڑھتی رہی، ہم ان پہاڑیوں تلے گزرے جن کی چوٹیوں پر رومی سرداروں نے انگور کی بیلوں سے اٹی ہوئی VILLAS ارکھی تھیں اور جو اب بھی مغرور سنتریوں کی طرح ایستادہ، عہدِ رفتہ کی یاد دلاتی ہیں، چابکدست ملاح بڑے حیلے سے کشتیاں BLUE GROTTO کے ک دہانے سے گزارتے ہیں۔ اُس وقت سب لیٹ کر کشتی سے چپک جاتے ہیں لیکن اندر پہنچ کر سب کلفت دھل جاتی ہے، اندر خوابوں کی نیلگوں رانی اپنی م سحرکاریوں کے ساتھ جلوہ فرما ہے، خواب آلودہ نیلاہٹ فضا میں معلق ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک رومانی خواب منجمد ہو کے رہ گیا ہے۔ پہاڑی باغ مناظر، پتھریلے سجیلے کوچے اور نشیب و فراز پر آبادی کی تہیں کیپری کو خاص شخصیت بخشتی ہیں اور اسے DOLL'S HOUSE کہنا بے جا نہ ہوگا۔

برقی ریل انگور کی بیلوں اور سنگترے کے باغوں میں سے گزر رہی تھی، انگور کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ بیلیں مرجھا گئی تھیں، انگور کے خوشے کسی سرور انگیز اطالوی ب میں تحلیل ہو چکے تھے، البتہ سنگترے بھرپور جوانی پر تھے، میلوں لمبی قطاریں پھلدار درخت، سرخ اور سبز کا امتزاج، حیات و ممات کا تضاد بھی تو موجود تھا، انگور پکے تھے سنگترے شباب پر تھے۔

ہرے بھرے باغوں میں ٹنڈ منڈ درخت بھی سر نکالے کھڑے تھے۔ وہ پورے طور پر خزاں کی زد میں آ چکے تھے، ایک پتہ بھی باقی نہیں تھا، انگلستان اور فرانس سے خزاں کی لپیٹ میں تھے۔ خزاں شاید ہمیشہ تعاقب میں رہتی ہے؟

پومپیائی کی بہاروں کو بھی ایک ایسی خزاں نے دفعتاً تاراج کر دیا تھا، پومپیائی ایک ہرے بھرے چمن کی مانند اپنی بہاروں پر نازاں تھا۔ انگوروں کے یک پک چکے تھے مٹی کے بڑے بڑے مٹکوں میں شرابِ رسیدہ محفوظ تھی، حسن و جوانی عیشِ نعیم کے گہوارے میں جھول رہے تھے اور دفعتاً سب کچھ بے علس دینے والے لاوے کی لپیٹ میں تھا۔ آج پومپیائی کے عظیم کھنڈر عظمتِ پارینہ پر نوحہ کناں ہیں۔ معبد، تھیٹر، کوچے اور مکان مکینوں کی نفاست بتہ دیتے ہیں گو اُس نفاست میں بربریت بھی شامل تھی۔

ایمفی تھیٹر میں ہزاروں تماش بین بیٹھ سکتے تھے، یہاں تندرست و توانا غلاموں پہ بھوکے شیر چھوڑ دیئے جاتے تھے اور تماش بین اُن کی لڑائی سے محظوظ یا دو غلاموں کو لڑائی کا حکم دیا جاتا، غالب مفتوح کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا تھا، فاتح ایک پاؤں مفتوح کے سینے پر رکھ کر اوپر دیکھتا کہ اعلیٰ طبقہ سے کھنے والی خواتین انگوٹھے سے کس قسم کا اشارہ کرتی ہیں اُس اشارے سے مغلوب کی قسمت کا فیصلہ ہوتا تھا، زندگی اور موت کے درمیان کشمکش نیوں کے لئے سامانِ تفریح تھی، چند مکانوں میں استعمال کی چیزیں اب تک قرینہ سے رکھی ہیں جیسے مکین ابھی مکان چھوڑ کر گئے ہوں اور ہوا بھی یہی ا شہر آناً فاناً آتشیں لاوے کی لپیٹ میں آ گیا تھا یوں تو عجائب خانہ کی کئی چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔ منقش کوزے، کھانے پکانے کا سامان، جراحی ار۔ تراشیدہ اصنام لیکن جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اُس بدنصیب کا "خاکہ" تھا جسے لاوا نے گھیر لیا تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھا ہے اور ے کو بازوؤں کے ہالے میں لئے ہے جیسے کہہ رہا ہو "میرے اللہ یہ کیا آفت آئی؟" اور وہ گرم لاوا میں منجمد ہو کے رہ گیا۔ لاوا نے ایک ہیولیٰ سے زندہ جاوید کر دیا، رہے نام اللہ کا۔ قصر الحمرا میں جا بجا لاغالب الا اللہ لکھ رکھا۔ لاریب اللہ ہی ہے جو بالآخر غالب رہتا ہے۔ کسے مجال س کی ہمسری کا دعویٰ کرے "الحمرا" ایک خوبصورت نگینے کی طرح پہاڑوں کے درمیان جڑا ہے، جن شجیع و فن پرور عربوں نے یہ محل تعمیر کیا شاید ذہن میں یہ خیال ہمیشہ رہا کہیں ایسا نہ ہو جلال و جمال کے اس مرقع میں بیٹھ کر ہم میں نخوت آ جائے اور ہم یہ بات بھول جائیں کہ سروری تو فقط

اُس مالکِ حقیقی کو زیب دیتی ہے۔ آج بھی قصرِ الحمرا کے گوشے گوشے میں صدیوں پُرانی صدا گونجتی ہے لاغالب الا اللہ، پومپیائی کے باسیوں نے اِس حقیقت کا اعتراف نہ کیا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، پومپیائی کے کھنڈر آج بھی ببانگِ دُہل اعلان کر رہے ہیں لاغالب الا اللہ۔

لیکن بحیرۂ روم کا نیلگوں پانی ——— حملۂ مرگ و خزاں سے بے نیاز ——— زمین اور اہلِ زمین پہ ہنس رہا تھا اور زبانِ حال سے کہہ رہا تھا "صدیاں ہوئیں ہیں ایسا ہی تھا جب میرے شفاف سینے پر باہمت عربوں نے سفینے ڈال دیئے تھے اور صیقلیہ میں اسلام کا نشان گاڑ دیا تھا"۔ لیکن زندگی تو آگے ہی بڑھتی رہتی ہے اور برقی ریل بھی سُرعت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی، پہاڑیاں ڈھلوانیں اور میدان، گھاس اور کھیتوں سے ڈھکے ہوئے میدان خوبصورت شہروں کو اپنے ہالے میں لئے ہوئے میدان اور تین طرف سے سمندر کو گھیرے ہوئے پہاڑیاں گزرتی رہیں، کوہ ویسوویس کی چوٹی ——— باری تعالیٰ کی قہاری و جبروت کی مظہرِ اتم ——— اِن خوبصورت مناظر کو گھور رہی تھی لیکن بحیرہ روم کے خطّے کے انواع و اقسام کے درخت، مخملیں گھاس سے پٹے ہوئے میدان اور ہری بھری کیاریاں حیاتِ مُدام کا فریب دے رہی تھیں ع دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم

باغِ خُلد سے نکالے گئے، جنتِ ارضی میں جگہ پائی زندگی کے دکھ درد بلائے جان سہی لیکن وہ جینا کس کام تھا جو جذبات سے عاری تھا جس میں قعر نہ تھا نہ ہی تنوع۔ ؎

پیکرِ نوری کو گر سجدہ میسّر ہے تو کیا
اس کو میسّر نہیں سوز و گدازِ سجود

گر حضورِ خداوندی وصلِ مُدام کے مترادف تھا تو ہجر میں بھی اِک گونہ لذّت ہے۔

مجھے سرینتو کی وہ رات ہمیشہ یاد رہے گی ——— اندھیری رات میں پُراسرار سمندر کی لہریں کنارے سے ٹکرا کر اپنا زور کھو رہی تھیں۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا جیسے کسی ملّاح کی موت کا راگ الاپ رہی ہو، نیپلز کا شہر حدِ نظر پر ایک قوس کی شکل میں بکھر گیا تھا، اُس کی ٹمٹماتی روشنیوں پر پرستان کا دھوکا ہوتا تھا، سرینتو! عظیم المرتبت شاعروں اور فنکاروں نے تیری رعنائی کے گیت گائے جسے اطالوی دوشیزاؤں نے تانوں میں ڈھالا، آج ایک غریب الوطن کا خراج بھی قبول کر!

اے یورپ کے سمن زار الوداع! چند ماہ میں تمہارا مہمان رہا۔ ذہنِ لاشعور میں یہ ہمیشہ کھٹکا کیا کہ میری حیثیت مہمان کی سی ہے اگر میں نے تمہارا فریب کھایا تو جان بُوجھ کر کھایا، وہ فریب خوشگوار تھا اور بلائے جان بھی، شاید ہم دمِ واپسیں تک زندگی کا فریب بھی یوں ہی کھاتے رہتے ہیں۔ دیدہ دانستہ ؎

رام نہ گردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جز بکمندِ نیاز ناز نہ گردد اسیر

میں گیروا نہ کپڑے پہنے "تماشائے اہلِ کرم" دیکھتا رہا۔ میں بھی اُس ہجوم میں شامل ہو گیا تھا جو کوچہ بکوچہ اپنے زخموں کا درماں ڈھونڈتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ میرے زخموں کے لئے یہاں کوئی مرہم نہیں۔ اگر میں تشنہ لب رہا تو یہ میری محرومیِ قسمت تھی ورنہ تیرے میکدوں کے در کھلے تھے اور تیرے ماہ جبیں ہم آغوشی کے لئے بے تاب، زندگی کے یہ دن یوں گزرتے رہے جیسے ایک خواب ہو، ہمیشہ یہ احساس رہا کہ یہ سراب ہے حقیقت سے کہیں دُور جس کا طلسم کچھ دیر تک ٹوٹ جائے گا، بیداری کا شعور خواب کے تعاقب میں رہا اور یہ بھی نہیں کہ وہ خواب ہمیشہ خوشگوار ہی تھا، اُس میں NIGHT MARE کی تلخی بھی شامل رہی اور متعدد بار اِس خیال نے ستایا کہ یہ خواب ختم کیوں نہیں ہو چکتا۔

طنزیہ

غدر سن انیس سو ستاون کے اسباب

(ایک مؤرخ کے قلم سے ۲ر مئی ۱۹۹۵ء)

احمد جمال پاشا

غدر کے اسباب غدر کی اطلاع سب کو پہلے سے تھی۔ نجومیوں نے پیشنگوئی اور لیڈروں نے تقریروں کے ذریعہ پہلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ حکومت کی جانب سے محکمۂ حفظِ ماتقدم نے سروے ڈیپارٹمنٹ کی خدمات حاصل کر کے غدر کے طول و عرض کی پیمائش کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ عام بے چینی لوگوں میں پہلے سے تھی اور کسی خاص بے چینی کا انتظار تھا۔ یوں چھوٹے چھوٹے غدر پہلے بھی ہو چکے تھے۔ مگر مؤرخ کی حیثیت سے ہم زیادہ سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اہتمام منعقد کردہ غدر کے بعد سنہ ۴۷ء کے غدر کا نام لے سکتے ہیں مگر چونکہ یہ غدر آپس میں کچھ تقسیم ہو کر رہ گیا تھا اس وجہ سے اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے نہیں آنے پاتی پس ہم اس کو زیادہ سے زیادہ غت ربود کہہ سکتے ہیں۔

حکومت نے بطور حفظِ ماتقدم ہر وقت ڈگیاں پٹوائیں، اپیلیں کیں، لوگوں سے کہلوایا —— "جو غدر کا نام لے گا۔ اس کو غدار قرار دیا جائے گا ——" مگر لوگ ان سب باتوں سے متاثر نہ ہو سکے۔ ایوانِ حکومت نے حزبِ مخالف کی مخالفت کے باوجود یہ بل پاس کر دیا کہ —— "سن ستاون کے بجائے سن چھپن الف، اور سن چھپن، ب کر دیا جائے تاکہ نہ سن ستاون آئے اور نہ غدر ہو ——" مگر مخالف جماعت نے اچانک انڈر گراؤنڈ ہو کر سن ستاون کے کیلنڈر چھپوا کر سارے ملک کے طول و عرض میں تقسیم کرا دئے، لوگ پہلے ہی سے بارود کی طرح پھٹنے کو تیار بیٹھے تھے اوّل تو لوگ ملک آزاد کروانے پر کیا کم خفا تھے پھر ملک غلط طریقے پر آزاد کیا گیا تھا خواہ مخواہ ریاستیں اور زمینداریاں ضبط کر لی گئیں تھیں اگر ملک آزاد ہی کرنا تھا تو اتنی سی بات کے لئے انگریزوں سے ملک چھڑوانے کی کیا ضرورت تھی پھر تقسیم بھی غلط ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کافی عجلت سے کام لیا گیا تھا۔

آزاد ہندوستان کے پہلے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت جو پریس کانفرنس کی تھی اس میں پریس کے چند غیر ذمہ دار نمائندوں نے جو سوالات کئے تھے ان سے عوام میں کافی برہمی اور انتشار کے آثار نمایاں ہو چلے تھے —— قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم اس کے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں ——

"لارڈ صاحب آپ تو جا ہی رہے ہیں، اب تو بتا دیجئے کہ غدر کس نے کروایا تھا ——؟"

لارڈ صاحب نے منہ پھلا کر جواب دیا —— "ہم نے غدر نہیں کرایا تھا ——"

"آپ نے باغیوں کو گولی سے کیوں اُڑوا دیا تھا ——؟"

"باغیوں کو خود باغیوں نے مارا تھا یا گولیوں نے، یہ باغیوں اور گولیوں کا معاملہ ہے ہم اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتے ——"

"مگر آپ لوگوں نے جو قتلِ عام کروائے تھے ——؟"

"مثلاً ——"

"غدر —— جلیانوالہ باغ اور سن بیالیس وغیرہ ——"

"وہ تو برائے تنبیہہ چھوٹے چھوٹے اور ہلکے پھلکے لاٹھی چارج کروائے گئے تھے ——"

"اب دوبارہ آپ غدر کب کروا رہے ہیں ——؟"

"نہیں اب کے آپ کو کروانا پڑے گا ——"

"آپ دوبارہ واپس کب آ رہے ہیں ——؟" کسی نالائق نے سوال کیا اور لارڈ صاحب کا موڈ خراب ہو گیا، انہوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔

—— "ہماری گاڑی آگے بڑھائی جائے ——" (اقتباس دلّی کرانیکل)

اسباب بہت دنوں سے غدر نہیں ہوا تھا۔ لوگ خواہش مند تھے کہ اب غدر ہونا چاہئے اسی وجہ سے وہ اس ساون کا سنہری موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہتے تھے ملک میں ایک باقاعدہ غدر کی کمی شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی لوگوں کے مُنہ ۱۸۵۷ء کا خون لگ چکا تھا۔ بہت دنوں سے عوام کے بلوہ فساد کی حسرتوں کا خون ہو رہا تھا۔ ساری ایٹامک ایزجی بڑے بڑے تعمیری منصوبوں پر فضول ضائع کی جا رہی تھی۔ دنیا کے ہر ملک نے اپنی اپنی فوجوں کو زراعتی دستوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ خصوصاً روس، انگلستان، چین، امریکہ اور ہندوستان میں بڑی بڑی آرڈی ننیس فیکٹریوں اور بم سازی کے کارخانوں کو صنعتی و زراعتی دستوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہر چیز کی ارزانی ناقدری کی حد تک بڑھ چکی تھی۔ بموں اور مہلک ہتھیاروں، ٹینکوں کی جگہ ٹریکٹر ڈھالے جا رہے تھے۔ جبکہ عوام چاہتے تھے کہ مزید ہیروشیما و ناگاساکی بنائے جائیں۔ اٹم بم۔ ہائیڈروجن بم اور جراثیمی بم امن کمیٹیوں کی نگرانی میں سمندر کے سینوں میں برابر دفن کئے جا رہے تھے۔ عوام اس ملکی و قومی نقصان پر بہت برافروختہ تھے۔ وہ خفا تھے کہ حکومت منصوبے کیوں بناتی ہے آخر صوبے کیوں نہیں بناتی۔ صوبوں کی از سرِ نو تشکیل و علاقائی زبانوں پر غدر نہ ہونے دینے کا الزام حکومت عوام اور عوام حکومت کے سر تھوپنا چاہتے تھے ——

انڈیا آفس لائبریری لندن اور کولمبیا کمپنی کے ہز ماسٹر وائس ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ "اگر بجائے گرانی کے گرانی الاؤنس برقرار رکھا جاتا۔ تو یہ نوبت نہ آنے پاتی —— " اگر ملک کو بیرونی ممالک کی امداد کے ذریعہ گورستان، سکھستان، موپلستان، ناگستان، کشمیرستان، طفلستان اور قبرستان ایسے مجوّزہ کم از کم پچیس حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو نتائج اتنے ہولناک نہ ہونے پاتے ——" (مولا بخش لائبریری پٹنہ کا ریکارڈ) غدر کے ذمّہ دار سب سے زیادہ ملک کے مختلف متفرق رسائل اور پبلشرز ہیں جنہوں نے غدر نمبر نکالنے کے لئے غدر یہ حالات کو ہوا دی ——" محکمۂ موسم کی اطلاع کے مطابق غدر کا طوفان اپنے صحیح وقت پر آیا۔ غدر کا آنا ضروری تھا، اگر اُس وقت غدر نہ آتا تو زلزلہ آتا —— بقول سڈنی کاٹن —— "زلزلے سے غدر ہمیشہ بہتر ہوتا ہے ——" غدر کے صحیح حالات اور عینی مشاہدات کی نایابی کا سبب یہ ہے کہ غدر آتے ہی یا تو پریس والے چھٹی لے کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے یا گھر بیٹھ رہے جو ہوش میں تھے بیہوش ہو گئے اور ہوش آنے پر غدر فرو ہو چکا تھا۔

ملک کے سیاستدانوں اور ادیبوں میں غدر ہونے اور نہ ہونے پر وسیع پیمانے پر مناظرے چھڑ گئے تھے، کچھ لوگ چاہتے تھے کہ غدر کا خالی استقبال کیا جائے اور اُس کی شاندار جوبلی منائی جائے "غدر نمبر" اور "غدر ڈے" ہوں۔ یہ لوگ نرم جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اکثریت ان کے خلاف تھی۔ جن کا تعلق گرم پارٹی سے تھا۔ یہ ماضی کا ماتم نہ پسند کرتے تھے اور خواہاں تھے کہ ان کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء میں غدر کی جس تقریب کی بنیاد ڈالی تھی اُس کا جشن صد سالہ منائیں اور (جیسا کہ فرنگیوں نے کیا تھا) انسانیت کی لاش پر فاتحہ پڑھیں تاکہ اُس کا ایصال ثواب اُن کی روحوں کو پہنچ سکے اور ابلیس اعظم اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے

سکے۔ ماضی کی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے سن سینتالیس کی تقلید اشد ضروری تھی۔

تاریخ آل احمد سرور۔ فیض احمد فیض اور سردار جعفری وغیرہ نے غدر کی تاریخ کہی ——

فیض —— گلوں میں رنگ بھرا ہے بہار گذری ہے
کہ عندلیب غدر نغمہ بار گذری ہے
۲۷۴ + ۱۱۰۳ = ۱۳۷۷ھ

جعفری —— تفنگ و تیغ کی بڑھ کر ذرا سلامی دو
کہ سرخ پوش مرا غدر شہسوار آیا
۱۹۵۷ء

لٹن لائبریری علیگڈھ (شعبۂ مخطوطات) کے پرانے کرم خوردہ نسخہ جات میں ہم کو ایک تاریخ پروفیسر آلِ احمد سرور کی لکھی ہوئی ملتی ہے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے غدر داری
1957 A.D.

(بشکریہ لٹن لائبریری علی گڈھ)

شروعات غدر اچانک شروع ہوگیا، غدر صحیح وقت پر یعنی ۲۶ رجون ۱۹۵۷ء دن کے بارہ بجے شروع ہوا ہم اس کے بارے میں بالکل دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ غدر پنجاب سے شروع ہوا یا یوپی سے یا دونوں جگہ ساتھ ساتھ لیکن جو مواد دستیاب ہوا ہے اس سے یوپی کا نمبر آگے معلوم ہوتا ہے۔ غدر کا اہتمام ہندوستان ہی کیا گیا تھا مگر برِصغیر کے دوسرے ممالک لنکا، افغانستان، اور نیپال وغیرہ میں بھی پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ تاریخی دستاویز سے ثابت ہوتا ہے سب سے پہلے مرزا پور کی چھاؤنی میں مرزا پھویا کے گھر کے سامنے سے شروع ہوا۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسمی منگل پانڈے (کہ جن کے دادا منگل پانڈے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میرٹھ چھاؤنی میں چربی لگے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کرکے غدر کا آغاز کیا تھا) جب گورنمنٹ راشن ڈپو سے گیہوں لینے گیا تو دوکاندار نے اس کو گیہوں ایک روپیہ کے ڈھائی سیر کے عوض دس سیر اُس کے پلّے باندھنے کی کوشش کرکے اُس کے سادہ و معصوم جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی اُس نے لاکھ سمجھایا بھی —— "نہیں بھائی ہم روپیہ کے ڈھائی سیر ہمیشہ لے جاتے ہیں ہم کو ڈھائی سیر دو —— " مگر دوکاندار نے جھگڑا کرتے ہوئے کہا
"ہم دس سیر سے ایک تولہ کم نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ حکومت کا حکم ہے —— "

اس طرح دوکاندار نے سستا اور زیادہ سودا دینے کے فریب سے منگل پانڈے کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا تو وہ اور بھی مشتعل ہوگیا۔ شاید منگل پانڈے اس پر بھی صبر کر لیتا مگر جب اُس کو روپیہ کے چالیس آنے واپس لوٹانے کی کوشش کی گئی تو اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اُس نے غصّے میں پاگل ہوکر تین چار کو وہیں ڈھیر کردیا اور اپنا ریوالور بلند کرکے اعلان کردیا —— "ہم اُس حکومت کا خاتمہ کردیں گے جو اس قسم کے سستے سودے بازی کے ذریعہ مجھوتہ کرنا چاہتی ہے —"

فوج و سپاہیوں نے منگل کا ساتھ دیا اور دیکھتے دیکھتے منگل کی اولاد منگل نے جنگل کے منگل میں دنگل برپا کردیا —— چھاؤنی میں آگ لگادی گئی افسران کو گولی سے اڑا دیا گیا اور 'دلّی چلو' کا نعرہ بلند کردیا گیا ——

غدر انگریزوں کے اسباب باندھنے ہی کے وقت سے غدر کے اسباب پیدا ہو چلے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ مرزا پور کی بغاوت اور دلّی چلو کے نعرے نے پورے ملک میں بغاوت کی آگ پھیلادی۔ سب سے پہلے کشمیر کے بحری بیڑے نے اپنے باغی ہونے کی اطلاع بذریعہ تار وزیر حرب اور وزیر اعظم کو دی۔ حکومت کے ذمّہ داران نے باغیوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے کی خاطر اُن کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اور دلّی میں اُن کے استقبال کے لئے آل پارٹیز غدر کنونشن کی ایکشن کمیٹی نے ملک بھر کی تمام غدر یونٹس سے بذریعہ ریڈیو غدر کو کامیاب بنانے کی اپیل کی چھوٹی بڑی تعداد میں باغیوں کے دستے دلّی کی طرف بڑھنے لگے ساری خلقت دلّی کی طرف ٹوٹ پڑی روزانہ شام کو وزیر اعظم لال قلعے کی برجیوں پر کھڑے ہوکر دوربین سے باغیوں کا تماشہ دیکھتے، خود انہوں نے باغیوں کو سلامتی، امن اور Coexistence کا پیغام بھیجا جو آج تک لال قلعے کے تاریخی میوزیم کے غدر میموریل کارنر میں محفوظ ہے مگر میموریل کارنر اکالیوں اور مرہٹوں کی یورش میں انتہا ہو

گیا۔ امن کے پیغام نے مجاہدین کے سینوں میں آگ لگا دی۔ ویسے بھی برابر اطراف و جوانب سے خبریں آ رہی تھیں کہ باغی امن کمیٹیوں کے دفاتر تعلیمی درسگاہوں ہسپتال ریڈ کراس اور دوسرے سماجی اداروں میں آگ لگا اور تاپ رہے ہیں۔

حالات حالات بہت نازک تھے تمام فوجیں اور صوبے خود مختار ہو کر باغیوں میں شامل ہو گئے تھے ہر طرف بدامنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ مائیں اپنے جوان جوان کلیجے کے ٹکڑوں کو گھروں میں اپنے سینوں سے لگائے بیٹھی تھیں اگر وہ ذرا بازار میں سودا سلف خریدنے بھی نکلتے تو انہیں فوراً دفاتر کے ڈائریکٹر اور کمپنیوں کے مینیجر زبردستی پکڑ لیتے۔

"چلئے چل کر برما شیل کے مینیجر ہو جائیے ہم آپ کو چھ ہزار ماہانہ تنخواہ دیں گے ——" اب وہ لاکھ خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے —— "بھیا میں تو اپنی اماں کے لئے بازار سے دو پیسے کے پان لینے آیا تھا۔ اگر تم نے مجھے لے جا کر برما شیل کا مینیجر بنا دیا تو اماں کو پان لے جا کر کون دے گا۔ آسمان سے فرشتے یا زمین کے بھوت پھر میں تو صرف میٹرک پاس ہوں مجھے تو ساٹھ روپے کی کلرکی چاہئے ہے کلرکی مجھے اتنا بڑا افسر نہیں بننا ہے ——" اور تیل والے ہنستے —— "پھر خوشامدانہ لہجے میں کہتے۔ —— ارے ہم تو صرف آپ کو مینیجر بنا رہے ہیں۔ آپ ہم سے کچھ زیادہ تو مانگ کر دیکھئے —— آخر آپ تیل کا کام کر کے تیلی ہی تو رہیں گے پھر ہمارا کام تو صرف آٹھویں پاس سے بھی چل جاتا آپ تو میٹرک ہیں میٹرک —— ہمیں آپ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ آپ کے تیلی ہو جانے سے آپ کی ذات والا صفات پر جو بُرا اثر پڑے گا آپ بلا اُس کا لحاظ کئے ہمارا کام کریں گے۔" —— مگر نوجوان روتا پیٹتا —— "نہیں، نہیں —— خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو —— مجھے جانے دو —— میں کلرک پیدا ہوا ہوں مجھے کلرک ہی رہنے دو ظالمو —— مجھ سے میری کلرکی نہ چھینو —— مجھ پر رحم کرو رحم ——" اگر باغی بروقت انہیں بچا نہ لیتے تو اُن کو کمپنی یا دفتر والے زبردستی پکڑ کر کام دلانے لے جاتے۔ روزگار کا ہوّا لوگوں پر اس بُری طرح سوار تھا کہ وہ سرِ شام ہی اندر سے اپنے گھروں کے کواڑ بند کر بیٹھ رہتے۔ اگر مجبوراً یا بھولے بھٹکے کوئی دن میں بازار کی طرف نکل جاتا تو دوکاندار منوں غلّہ۔ کپڑوں کے تھان کے تھان ہر قسم کی ضروریات و آسائش زندگی۔ بے انتہا ریزگاری و نوٹ اُس کے سر منڈھ دیتے ——

شادی بیاہ اور روزگار کا یہ عالم تھا کہ سرکاری گرگے ہر طرف برابر تاک میں لگے رہتے اگر مخبری ہو جاتی کہ فلاں شخص، اُس کا لڑکا یا خاندان میں کہیں دور دراز میں کوئی بے روزگار یا کنوارا ہے یا اُس کے پاس صرف ایک مکان ہے یا محض ایک نوکری یا ایک بیوی ہے تو زبردستی سرکاری طور پر اس کا اغوا کر کے اُس کو نوکریوں اور چھوکریوں سے لاد دیا جاتا۔ اور جبراً قہراً کئی کئی کوٹھیوں اور بنگلوں کا مالک بننا پڑتا۔ لوگ انہی مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات پانے کے لئے جنگلوں کی طرف نکل بھاگے۔ بیچارے کنوارے اگر عیاشی کے لئے چکلوں کا رُخ کرتے تو اُنہیں اس سلسلے میں بڑی مایوسی ہوتی کیونکہ تمام طوائفیں تیرتھ یاتراؤں وغیرہ کے لئے چلدیں تھیں یا خیر سگالی وفد لے کر ممالک غیر میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کو سدھار چکی تھیں۔

ظلم و ستم کی حد یہ تھی کہ عوام طوائفیں چاہتے تھے اور حکومت اُن کے گلے بیویاں باندھنا چاہتی تھی ——

ملک میں لیڈروں کا پتہ نہ تھا بڑی مشکل سے باغیوں کو پتہ لگا کہ اجمیر میں ایک لیڈر موجود ہے باغی بڑی بھاری تعداد میں اُس کی زیارت کو جمع ہوئے اور اُس کی زندگی میں اُس کا بڑا شاندار عرس و نوچندی کر دی۔ پھر اُسے عجائب گھر میں محفوظ کر کے اُس پر ٹکٹ لگا دیا۔ تعلیم کا یہ عالم تھا کہ لوگ جبراً بڑی بڑی جماعتوں میں پڑھنے کے لئے بھیج دیئے جاتے تھے، مقابلے کے امتحانوں کا سال بھر برابر اشتہار نکلتا رہتا۔ آخر میں مجبور ہو کر حکومت باغیوں سے چھپ کر آبادیوں میں چھاپے مارتی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اغوا کر لیتی۔ سرکاری سپاہی اِن اغوا شدگان کو امتحانات کے ہال میں لے جا کر بند کر دیتے، کامیاب ہونے کے لئے صرف امتحان میں شرکت ضروری ہوتی۔ اگر کوئی رشوت یا پگڑی دینے کی کوشش کرتا تو افسران اسے سمجھ نہ پاتے۔ آخر میں باغیوں کا زور اتنا بڑھ گیا اور لوگ نوکری کرنے کے لئے کسی بھاؤ راضی نہ ہوتے تو حکومت نے مجبوراً نجومیوں اور رمّالوں کو پیش کش کی وہ اپنے علم و عمل سے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بتائیں جو ہمارے کام آ سکیں۔ نجومیوں کی نشاندہی پر حکومت کے چھاپہ مار دستے کلرکوں اور ریٹائرڈ ملازموں تک کو اعلیٰ عہدوں پر تعینات کرنے کے لئے اُن کے گھروں سے برآمد کرتے اکثر اس سلسلے میں باغیوں و چھاپہ مار دستوں میں بڑی سخت جنگ بھی ہوتی۔

عدالتوں کو گواہ نہ ملتے لوگ ڈر کے مارے گواہی دینے نہ آتے کہ کہیں اسی بہانے بلوا کر ہم کو سرکاری افسر یا وزیر نہ بنا دیا جائے۔

ڈگریاں ترکاری کی طرح سڑکوں پر اس طرح بکتیں جس طرح آغا لگ، دوائیں بیچتے ہیں سوائے چند دیہاتیوں کے جو گھر سجانے کے لئے لے جاتے۔ بقیہ انہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے یا معصوم بچے لے جا کر پتنگیں بنا کر اڑاتے۔ حکومت نے باغیوں کے سامنے بارہا پیش کش بھی کی کہ —— "ہم تنخواہیں اور بونس بڑھا دیں گے۔ تعلیم اور سستی کر دیں گے، عقل سے کام لیں گے، نوکریاں عام کر دیں، گے ٹیکس معقول کر دیں گے ——" مگر باغی یہ سب چاہتے ہی نہ تھے ان باتوں سے وہ اور بھی مشتعل ہو جاتے ——

باغیوں کا راج | پروفیسر جاگو ناتھ پرکار اور ایلیشوری پرساد کی سند سے یہ بات، پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ دلّی پر باغیوں کا قبضہ ڈھائی دن اور تین گھڑی رہا۔

لوٹ مار و قتلِ عام | باغیوں نے امن کمیٹیوں، ہسپتالوں، تعلیم گاہوں - ریڈ کراس کے دفاتر - منصوبہ بنانے والے مرکز، ٹڈی مارنے والے جہازوں - آگ بجھانے والے انجنوں، دفتر روزگار اور تاریخ دکھانے والے دفتروں، حفاظتی چوکیوں، پانی گھروں - بجلی گھروں اور صنعتی و زراعتی کارخانوں کو خوب لوٹا انہیں جو بھی رہبری یا کام کرتا ملا اسے انہوں نے سولی پر چڑھا دیا۔

باغیوں میں پھوٹ | عین اس وقت جب غدر اپنے نقطۂ انتہا پر پہنچ چکا تھا باغیوں میں پھوٹ پڑ گئی اس کے بارے میں لوگ مختلف الرائے ہیں کچھ کہتے ہیں کہ باغیوں نے پھوٹ کھائی تھی مگر بقیہ کچھ اور سبب بتاتے ہیں یعنی یہ کہ لوگ غدر کی جوبلی منانا چاہتے تھے - انہوں نے اس لوٹ مار کو پسند نہیں کیا —— اور حکومت سے جو فرار ہو کر اپنے موسم گرما کے پہاڑی دفاتر میں روپوش ہو گئی تھی اور باغی ابھی اُن بلندیوں تک نہ پہنچ سکے تھے، انہوں نے حکومت سے خفیہ ساز باز کر لی سازش کامیاب ہوئی، غدر کرنے والے رات کو خود اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کر لئے گئے۔

واقعہ | واقعہ ہوا کہ نرم پارٹی جو صرف جوبلی منانا اور غدر نمبر نکالنا چاہتی تھی گرم پارٹی سے جو غارت گری پر آمادہ تھی، سے الگ ہونے کے باوجود بظاہر ملی ہوئی تھی اس نے جشنِ غدر منانے کے بہانے مٹھائی کے ٹوکروں میں اپنے سپاہی اور میگزین منگوا لئے اور رات کے پچھلے پہر ان مسلح سپاہیوں نے دلّی دروازہ کھول دیا - حکومت کی فوجوں نے اچانک شبخون مارا جو کامیاب رہا - باغیوں کے تمام سرغنہ گرفتار کر لئے گئے معمولی جھڑپوں کے بعد تمام باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور عام معافی و امن و امان کی پیشکش کی۔

گرفتاریاں اور معافیاں | عام باغیوں کو جرمانے ادا کرنے یا تا برخاست عدالت، کی سزا دے کر چھوڑ دیا گیا - نابالغوں اور طالبعلموں کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے سال سال بھر کے نیک چلنی کے ضمانت و مچلکے بھروا کر چھوڑ دیا گیا۔

مقدمے و سزائیں | جن کو سزا دینا تھا اُن کو طویل و مختصر سزاؤں کا حکم سُنا دیا گیا پھر بھی باغیوں کی بڑی تعداد پر سختی کر کے انہیں رہا کر دیا گیا - اُس کے بعد غدر کے قائدین پر مقدمہ چلانے کی تحریک ہوئی۔

تاریخی مقدمہ | لال قلعے میں غدر کرانے والے باغیوں کے سرغنہ پر تاریخی مقدمہ چلایا گیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی کوئی تاریخ نہیں مقرر کی گئی تھی پھر بھی غالباً وہ سنیچر کا دن تھا باغیوں کے بیانات شروع ہوئے مجمع اس کثرت سے تھا کہ مجبوراً تماشائیوں پر ٹکٹ لگا دیا گیا، بالغ نصف اور نابالغ دگنے دام ادا کر کے تماشائیوں کی گیلری میں بیٹھ سکتے تھے - پریس - وکلاء - مجرمین - گواہان اور جیوری پر کوئی ٹکٹ نہیں لگایا گیا تھا صرف اُن سے پیسے لے لئے گئے تھے -

باغیوں کے بیانات اور سزائیں | سب سے پہلے باغیوں کے قائد ننگل پانڈے کو کمرۂ عدالت میں پیش کیا گیا - اُن کے برآمد ہوتے ہی مجمع قابو سے باہر ہو گیا - شیم شیم اور ہیئر ہیئر کے نعروں اور پھولوں و گندے انڈوں کی بارش میں ننگل کو دوست و دشمن کی تمیز کرنا مشکل ہو گئی - مگر پھر بھی اُس نے سب کا شکریہ ادا کیا کیونکہ مقدمہ لال قلعے کے فوجی کورٹ میں بصورت کورٹ مارشل ہوا تھا اس لئے مارشل نے ننگل سے اُس کا بیانِ حلفی شروع کرنے کا حکم دیا ——

مارشل —— "تم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

بنگل —— " صفائی کی ضرورت مجھے نہیں تم کو ہے —— "

"تم نے غدر کروایا! کیا یہ الزام درست ہے — بولو —— ؟"

"ہاں مجھے فخر ہے کہ میں نے غدر کروایا —— "

"عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ایسا کیوں ہُوا —— "

"عدالت اس کے اسباب جانتی ہے —— "

"اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم حکومت کے باغی ہو —— "

"ہاں مجھے اپنے باغی ہونے پہ ناز ہے —— "

"اور بغاوت کی سزا کیا ہے یہ بھی جانتے ہو —— "

"تمہاری سزاؤں کی جس کو پرواہ ہو وہ اِن کو جاننے کی کوشش کرے۔ بنگل اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔"

"حکومت تمہاری شکایات جاننا چاہتی ہے —— "

"کیا حکومت یہ جاننا چاہتی ہے کہ بنگل باغی کیوں ہُوا کیا حکومت کو یہ علم نہیں کہ اُس نے روپیہ کے چالیس آنے اور ڈھائی سیر کے بجائے دس سیر کا اج کر دیا۔ کیا حکومت نے ریاستیں و زمینداریاں نہیں ضبط کیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ حکومت نے اس کے لئے عوام کے نمائندوں کی بھی رائے لی تھی۔ ان کے جذبات بھی خیال کیا تھا۔ (عوام کے نعرے شیم شیم اور عدالت کی آڈر آڈر کی صدائیں) کیا حکومت نے منصوبے نہیں بنائے۔ ہر پانچ سال بعد ایک منصوبہ، آخر کوئی دعبی) ہے اس تعمیر کی۔ اسے کوئی برداشت کر سکتا ہے کیا آج مجھے گرفتار کرنے والے بتا سکیں گے کہ انہوں نے بیروزگاری کو کیوں ختم کر دیا۔ طوائفوں کو کیوں تم کیا۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں کہ ہمارے لئے تعلیم کو سستا اور آسان نہیں کیا گیا۔ پھر جب ہر چیز سستی اور آسان کر دی جائے گی تب ہماری نسل میں تلاشِ معاش فاقہ مستی کا خمیر اور جستجو کا مادہ کہاں سے آئے گا۔ کیا حکومت کو علم نہیں کہ روزگار دلانے والے دفتروں نے ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کو زبردستی روزگار دلا کر ہمارے ینوں پر کدال اور پھاوڑے ٹریکٹر نہیں چلائے۔ ہماری معصوم حسرتوں نے ہمارے ناگاساکی اور ہیروشیما بنانے کے سنہرے خوابوں کو مسمار نہیں کیا۔

میں پوچھتا ہوں۔ کہاں ہیں آج وہ اربابِ حکومت جو اس وقت انگریزوں کو ملک سے نکال رہے تھے۔ جنہوں نے ملک کو تقسیم کرتے وقت مقامی و اقائی آزادیوں و خودمختاریوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ جنہوں نے اپنی حکومت اور طاقت کے گھمنڈ میں صوبائی و علاقائی و سیاسی تعصب اور متعصب جماعتوں ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سُلا دیا۔ میں کہتا ہوں کیا وہ ملک کے اور مزید حصے نہیں کر سکتے تھے۔ کیا ہمارے وزیروں اور لیڈروں نے اپنے پیٹ کاٹ ٹ کر اور پیدل دورے کر کر کے ہماری ناک دوسرے ممالک کے سامنے نیچی نہیں کی۔ انہوں نے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس کٹوا کٹوا کر کیا ہماری دل آزاری سلب کی۔ کیا اب بھی وہ ہمارے نمائندے رہ گئے۔ کیا وہ رشوتیں نہیں لے سکتے تھے۔ کیا وہ اپنی تنخواہیں نہیں بڑھوا سکتے تھے۔ کیا ایسا کرتے انہیں شرم محسوس ہوتی تھی۔ کیا اسی دن کے لئے وہ ہم سے ووٹ مانگنے آئے کیا حکومت نے چوریوں ڈاکوں اور بے ایمانیوں کو ختم کر کے جیل پولیس اور عدالتوں کو مفلوج نہیں کر دیا۔ کیا جنگ نہ کرنے کے معاہدے نے ہماری فوجوں کو بیکار نہیں کیا۔ کیا فوجوں کا یہی کام ہے کہ وہ گھاس ں اور بجائے ٹینک کے ٹریکٹر چلائیں —— کیا ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی حکومت سمجھتی ہے کہ غدر نہ ہوتا۔ کیا یہ حالات غدر کرانے کے لئے کم تھے کیا حکومت کو غدر کروانے کے لئے آسمان سے یامت کے نازل ہونے کا انتظار تھا —— "

تقریر کرتے کرتے بنگل پانڈے شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر دم لینے کیلئے بیٹھ گیا۔ تماشائیوں میں بنگل پانڈے کی جے جے کار ہونے لگی اور مارشل نے "آڈر آڈر" کی اپیل کے بعد حکم دیا —— "چڑھا دو سولی پر اس باغی اور غدار کو —— ہم اس کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ بقیہ باغیوں کا مقدمہ اگلی بیٹھک پر بند کمرے میں چلایا جائے —— ورنہ خطرہ ہے کہ دوبارہ ت کی چنگاریاں بھڑک کر شعلوں میں نہ تبدیل ہو جائیں —— " مارشل کے اس حکم اور جیوری کی اتفاقِ رائے سے امر شہید بنگل کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ پھر نہ پتہ چلا کہ بقیہ باغی سرداروں ن کھا گئی یا آسمان —— اب غدر کے چرچے رہ گئے ہیں —— تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے ہمیں غدر کے بارے میں صرف اتنا ہی مواد ملتا ہے ——

زندہ لاش

(ترجنیف)

سیّدہ ثریّا سلطانہ

ایک فرانسیسی کہاوت ہے کہ بھیگا شکاری اور خشک مچھیرا دونوں قابلِ رحم ہیں۔ مجھے کبھی مچھلی کے شکار کا شوق نہیں رہا اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ کھلے خوشگوار دنوں میں مچھیرا کیسا محسوس کرتا ہوگا اور برے موسم میں مچھلیوں کی افراط بھیگنے کی تکلیف کو کتنا کم کر دیتی ہوگی۔ یہ تو حقیقت ہے کہ شکاری کے لئے بارش بڑی مصیبت بن جاتی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ضلع بے لیو میں برملائی اور میں تیتر کے شکار کو نکلے تو اسی مصیبت میں پھنس گئے۔ اس دن صبح سویرے سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس سے بچنے کے لئے ہم نے کیا نہیں کیا تھا؟ سروں پر ہم نے برساتیاں ڈالیں اور درختوں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ برساتی پہن کر نشانہ ٹھیک نہیں پڑتا تھا اور پانی ہمارے کپڑوں میں بری طرح گھس رہا تھا۔ شروع میں تو درختوں کے نیچے امن تھا مگر پھر پتّوں میں پانی اس قدر جمع ہو گیا تھا کہ ہر شاخ سے فوّارہ کی طرح پانی ہم پر گر رہا تھا اور اس کی برف جیسی ٹھنڈی دھار گردن سے ریڑھ کی ہڈی تک بہہ رہی تھی۔ گھبرا کر برملائی نے کہا۔ "بھئی حد ہو گئی پیٹر پیٹروچ! اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بارش اتنی زیادہ ہے کہ آج شکار ممکن نہیں۔ کتّے سست پڑ گئے ہیں۔ اور کارتوس بھی گیلے ہو گئے ہیں۔ اوف! کمبخت بڑی مصیبت ہے"

میں نے پوچھا "تو پھر کیا کیا جائے؟" وہ بولا "چلو الیکسیوکا چلیں۔ یہ تمہاری والدہ کا چھوٹا سا گاؤں ہے جو یہاں سے سات میل دور ہے رات وہاں ٹھیریں گے اور کل ——"

"یہاں واپس آجائیں گے؟"

"نہیں یہاں نہیں۔ میں کچھ ایسے مقامات الیکسیوکا سے آگے جانتا ہوں جہاں یہاں سے زیادہ تیتر ملیں گے"

میں فوراً اپنے وفادار ملازم کی بات مان گیا اور اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو اب تک مجھے وہاں کیوں نہیں لے گیا تھا۔ اسی وقت ہم دونوں اس گاؤں کی طرف چل پڑے جس کے وجود کا اس سے پہلے مجھے کوئی علم نہ تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا بنگلہ ہے یہ بنگلہ پرانا اور فرسودہ تھا لیکن صاف ستھرا ہونے کی وجہ سے رات کافی آرام سے گذر گئی۔

دوسرے دن میں سویرے جلدی اٹھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ ہر چیز دھلی دھلی اور چمکدار تھی۔ میرے لئے جب تک گاڑی جوتی جائے میں

نگلہ کے باغیچہ میں ٹہلنے نکل گیا جو اب، لاپرواہی کے ہاتھوں جنگل بن گیا تھا۔ مگر یہاں کی کھلی نیلی فضا اور ٹھنڈی تازہ ہوا میں مجھے عجیب قسم کا سرور حاصل ہو رہا تھا۔ جہاں دے مزے سے چہک رہے تھے۔ ان کی آوازیں شبنم کی سی نرمی اور لطافت تھی۔ میں نے ٹوپی اتاری اور اطمینان کی لمبی سانس لی۔ باڑھ کے پاس ڈھلوان پر شہد کی مکھیوں کے چھتے لٹکائے گئے تھے اس طرف بل کھاتی ہوئی ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جا رہی تھی۔ میں اس پگڈنڈی پر ہو لیا اور چھتوں تک پہنچ گیا۔

چھتوں کے پاس سرکنڈوں کی ایک جھونپڑی تھی جہاں سردیوں میں چھتے رکھے جاتے تھے۔ میں نے جھونپڑی کے ادھ کھلے دروازہ میں جھانکا۔ اندر اندھیرا تھا پودینہ اور دوسری خوشبودار بوٹیوں کی مہک اڑ رہی تھی۔ ایک کونہ میں کھٹولی پر رضائی میں لپٹی کوئی چیز پڑی تھی۔ میں وہاں سے چلنے لگا تو ایک بہت ہلکی آواز سنائی دی۔ جس میں ایسی سرسراہٹ تھی جیسے گھاس میں ہوا چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ "سرکار! سرکار پیٹر پیٹروچ!" میں رک گیا۔ آواز اس کونہ سے ابھر آئی، جہاں کھٹولی پڑی تھی—— "پیٹر پیٹروچ! مہربانی سے ذرا اندر تو آئیے۔" میں قریب گیا دیکھا تو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میرے سامنے ایک زندہ انسان تو ضرور تھا مگر عجیب و غریب مخلوق معلوم ہوتا تھا اس کا چہرہ مرجھایا ہوا اور بے رنگ تھا۔ ناک سکڑ کر چھری کی طرح نوکدار ہو گئی تھی۔ ہونٹ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پورے چہرہ میں صرف سفید دانت اور بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سر پر رومال بندھا تھا جس میں سے دو چار سنہری لٹیں ماتھے پر نکل آئی تھیں۔ ٹھوڑی کے پاس رضائی کے نیچے سے دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ ہل رہے تھے۔ ان کا رنگ بھی نیلا پڑ گیا تھا۔ انگلیاں کانپ رہی تھیں اور لکڑی کی طرح سخت تھیں۔ میں نے جب اس چہرہ کو غور سے دیکھا تو یہ بد صورت نہیں تھا بلکہ واقعی خوبصورت تھا مگر اس خوبصورتی بڑے ڈراؤنے قسم کی تھی۔ یہ چہرہ اور بھی ڈراؤنا ہو جاتا جب بے جان گالوں پر مسکراہٹ آنے کی ناکام کوشش کرتی اور کمزوری کی وجہ سے محض ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ جاتے۔ آواز پھر سرسرائی اور میں نے بمشکل سنا۔ "سرکار کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ اور سچ تو ہے آپ مجھے پہچانتے بھی کیسے؟ مالک میں لی کیریا ہوں۔ وہی جو آپ کی والدہ کے ہاں ناچ کود اور گانے بجانے میں آگے آگے رہتی تھی۔ آپ کو یاد آیا اب؟"

"لی کیریا! سچ بتاؤ۔ یقین نہیں آتا کہ تم وہی لی کیریا ہو......"

"ہاں سرکار میں...... میں ہی لی کیریا ہو..."

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ حیرت سے میں اس ساکت پیلے چہرے کو تک رہا تھا جس کی بڑی بڑی مردہ آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لاش وہی لی کیریا ہے جس کی خوبصورتی ہمارے سارے گھرانے میں مشہور تھی۔ لانبی۔ گداز۔ سرخ و سفید۔ ہنستی گاتی ناچتی ہوئی چنچل لڑکی حسین لی کیریا جس کے پیچھے ہم سب لڑکے دیوانے تھے۔ اس وقت میں سولہ برس کا تھا۔ میں نے چھپ کر اکثر اس کے لئے آہیں بھری تھیں۔ اس وقت کی لی کیریا میرے ذہن میں کوند گئی اور میں نے بے چین ہو کر پوچھا "ارے لی کیریا یہ تمہیں ہو کیا گیا؟"

"مجھ پر بڑی مصیبتیں پڑی ہیں صاحب۔ مگر میرا کوئی خیال نہ کیجئے اور سرکار میری حالت سے گھن نہ کھائیے۔ اس تپائی پر بیٹھ جائیے اور میرے ذرا نزدیک آ جائیے ورنہ میری آواز آپ کو سنائی نہیں دے گی۔ آج کل میری آواز بہت ہلکی پڑ گئی ہے...... آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کیسے آج الیکسیوکا تشریف لے آئے؟"

لی کیریا آہستہ آہستہ برابر بول رہی تھی۔

"مجھے شکاری یہاں ادھر لایا۔ مگر تم اپنا حال تو بتاؤ؟"

"بہت اچھا اب تک جو کچھ مجھ پر گزری ہے آپ کو سناتی ہوں۔ یہ چھ سات برس پہلے کی بات ہے۔ میری انہی دنوں وسیلی پولیاکوف سے منگنی ہوئی تھی۔ وہ بڑا خوبصورت وجیہہ آدمی تھا۔ اس کے بال گھونگھریالے تھے اور وہ آپ کی والدہ کے ہاں کام کرتا تھا۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو کیونکہ اس زمانہ میں آپ تعلیم کی غرض سے ماسکو میں رہتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ وہ ہر وقت خیال میں میرے ساتھ رہتا۔ بہار کا موسم تھا آخر رات تھی۔ میری نیند اچٹ ہو گئی۔ بلبل باغ میں بڑی مٹھاس سے گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ مجھ سے نہیں رہا گیا پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سننے لگی۔ وہ گا رہی تھی۔ اور میں اس کی سریلی درد بھری آواز میں ڈوب گئی تھی۔ ایکدم مجھے ایسا لگا جیسے وسیلی نے آہستہ سے پکارا ہو "لی کیریا۔ پیاری لی کیریا!"—— ابھی میں نیند میں تھی۔ چونک کر دیکھنے کے لئے جو مڑی تو میرا پاؤں پھسلا اور میں سیڑھیوں سے نیچے زمین پر آ رہی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی......

ایک منٹ رک گئے صاحب۔ میں ذرا سانس لے لوں۔" لی کیریا خاموش ہو گئی اور میں اس کو حیرت سے تکتا رہا۔ مجھے تعجب تھا کہ بغیر کسی کرب اور شکایت کے کیسے صبر سے وہ اپنی کہانی سنا رہی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں تو اس حادثہ کے بعد میں برابر مرجھاتی اور دبلی ہوتی گئی۔ میرا رنگ سنولا گیا۔ مجھ سے چلنا دوبھر ہو گیا۔ میرے پیر ہی نہیں اُٹھتے تھے۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد تو میری ٹانگیں بالکل بیکار ہو گئیں۔ اب نہ میں کھڑی ہو سکتی ہوں اور نہ بیٹھ سکتی ہوں صرف لیٹی رہتی ہوں ہاں تو میری بھوک پیاس اڑ گئی تھی اور حالت دن بدن بدتر ہو رہی تھی۔ آپ کی والدہ کو میری حالت پر بہت ترس آیا۔ خدا انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ مجھے انہوں نے کئی ایک ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ہسپتال بھی بھیجا مگر میرا علاج نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر یہ بھی تشخیص نہ کر سکے کہ میری بیماری کیا ہے؟ انہوں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ کبھی میری ریڑھ کی ہڈی کو گرم لوہے سے جلایا گیا تو کبھی مجھے برف کی سلیوں میں لٹایا گیا۔ مگر کوئی چیز کارگر نہیں ہوئی۔ آخر میں میرا جسم بالکل سُن ہو گیا۔ مالکہ نے جب یہ دیکھا کہ میں کسی طرح اچھی نہیں ہو پاتی تو علاج چھوڑ دیا۔ مجھ جیسی اپاہج کا کوٹھی میں سوائے پڑے رہنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھے یہاں میرے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا۔ چنانچہ جیسا آپ دیکھ رہے ہیں میں یہاں رہتی ہوں۔" اب لی کیریا خاموش ہو گئی تھی۔ پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔

"لی کیریا یہ تو غضب ہو گیا۔ مگر وسیل کہاں گیا؟" میرے اس حماقت آمیز سوال پر لی کیریا کی آنکھوں میں پریشانی دوڑ گئی بولی۔

"پولایا کرمت! وہ تھوڑے دن رنجیدہ رہا۔ پھر اس نے گلی نوئی کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ جس کا نام اگرانینا ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا مگر جوان آدمی تھا کیسے اکیلے رہتا اور میں بھلا اس کی کیا ساتھی بن سکتی تھی؟ جس عورت سے اُس نے شادی کی ہے وہ اچھی ہے۔ ان کے بچے ہیں۔ گھر ہے۔ وہ یہیں قریب رہتا ہے اور پاس ہی ایک جگہ کلرک ہے۔ آپ کی والدہ نے اُسے آزاد کر دیا تھا اور شکر خدا کا کہ اس کی اچھی گزر رہی ہے۔"

"اور تم یہاں ہر وقت کیا اسی طرح پڑی رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی سرکار میں یہاں سات سال سے ہوں۔ گرمیوں میں اس جھونپڑی میں پڑی رہتی ہوں اور جب سردی ہو جاتی ہے تو یہ لوگ مجھے حمام کی کوٹھڑی میں ڈال دیتے ہیں۔"

"کوئی تمہاری دیکھ بھال بھی کرتا ہے؟"

"جی ہاں سرکار۔ یہاں بھی اچھے لوگ بستے ہیں۔ انہوں نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے۔ میری تھوڑی بہت رکھوالی ہو ہی جاتی ہے۔ میں کھاتی کچھ خاص نہیں ہوں۔ پانی یہاں گھڑے میں میرے پاس رکھا رہتا ہے اور گھڑا ہمیشہ چشمہ کے ٹھنڈے پانی سے بھرا رہتا ہے۔ میرا ایک ہاتھ ابھی تھوڑا بہت کام کرتا ہے۔ اس لئے جب جی چاہتا ہے گھڑے سے پانی لے لیتی ہوں۔ ایک یتیم بچی یہاں رہتی ہے اور کبھی کبھی مجھے دیکھنے آ جاتی ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے وہ یہاں تھی۔ کیا آپ نے جاتے اسے نہیں دیکھا؟ بڑی اچھی خوبصورت سی تیز لڑکی ہے۔ وہ میرے لئے پھول لاتی ہے۔ پہلے یہاں باغ میں پھول ہوتے تھے مگر اب تو سب اجڑ گیا ہے۔ جنگلی پھول بھی اچھے ہوتے ہیں بلکہ باغ کے پھولوں سے زیادہ خوشبودار۔ مثلاً سوسن کی خوشبو کیسی بھینی بھینی ہوتی ہے۔"

"اس تنہائی سے کیا تمہارا جی نہیں گھبراتا پیاری لی کیریا؟"

"مگر کوئی کرے بھی کیا۔ میں جھوٹ کیوں بولوں شروع میں تو بہت گھبراتی تھی۔ بعد میں عادت پڑ گئی اور صبر آ گیا۔ میں سوچنے لگی یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اب بھی بہتوں سے بہتر ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"بہت سے ایسے ہیں جن کے پاس میری جیسی جھونپڑی بھی نہیں ہے۔ اور کوئی اندھا ہے تو کوئی بہرا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں سب دیکھ سکتی ہوں اور ایک ایک چیز سن سکتی ہوں۔ جب چھچھوندر زمین کریدتی ہے تو میں سن لیتی ہوں اسی طرح ہلکی سے ہلکی خوشبو بھی سونگھ لیتی ہوں۔ مثلاً جب جو پھوٹتے ہیں یا نیبو کے درخت پر پھول آتے ہیں تو مجھے سب سے پہلے پتہ چل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ تندرست آدمی تو گناہ میں آسانی سے مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ دیکھئے کہ میں گناہ سے بھی محروم ہوں۔

چند منٹ ہوئے پادری صاحب میرے پاس آئے۔ بیٹھے کہنے لگے تمہیں اعتراف کی ضرورت نہیں بھلا تم ایسی حالت میں کیا گناہ کرو گی؟ میں نے کہا۔ انسان اپنے خیالات میں بھی تو گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ وہ ہنسے اور بولے۔ ہاں یہ کوئی بڑا گناہ نہیں۔ لیکن جناب میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح بھی میں کوئی بڑی گنہگار نہیں ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنا لیا ہے کہ زیادہ نہ سوچوں اور خاص طریقہ پر پرانی زندگی اور باتیں یاد نہ کروں۔ اس طرح وقت اچھا گزر جاتا ہے۔“

”اکیلے میں آدمی سوچے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ لی کیریا تم اپنے آپ کو سوچنے سے کیسے باز رکھ سکتی ہو؟“ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”کیا ہر وقت سوتی رہتی ہو؟“

”نہیں جناب ہر وقت کیسے سو سکتی ہوں۔ ویسے میرے جسم میں کسی خاص جگہ تو سخت درد نہیں ہے مگر ہڈی ہڈی میں کچھ ایسی دکھن سرایت کر گئی ہے کہ اس کی وجہ سے اچھی طرح سو بھی نہیں پاتی۔ میں پڑی رہتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ سوچوں بھی نہیں۔ میں خوش ہوں کہ زندہ ہوں۔ سانس لیتی ہوں۔ دیکھ اور سن سکتی ہوں۔ یہ کچھ کم ہے؟ پتنگے ہیں، مکھیوں کی بھنبھناہٹ، چھت پر کبوتر کی غٹرغوں۔ مرغی کا چوزوں کے ساتھ روٹی کے ٹکڑوں کو چگنا۔ گوریا اور تتلیوں کا اندر جھونپڑی میں اڑنا میری تفریح کا سامان ہیں۔ پار سال ابابیلوں نے یہاں کونے میں گھونسلے بنائے تھے۔ جس میں انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش بڑے مزے سے کی تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے دیکھتی کہ ایک ابابیل گھونسلے پر آتی بچوں کو اپنی چونچ سے کھلاتی اور اڑ جاتی۔ آنکھ جھپکتے ہی دوسری اس کی جگہ لے لیتی۔ کبھی کوئی ابابیل یوں ہی گھونسلہ کے پاس سے گزرتی تو ان کے چھوٹے چھوٹے بچے دیکھ کر چہکتے اور اپنی چونچ کھول دیتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سوچتی تھی کہ اگلے سال پھر وہ یہاں اپنے گھونسلے بنائیں گی۔ مگر میں نے سنا ہے کہ کسی شکاری نے ان کو مار ڈالا۔ بھلا شکاری کو اتنی چھوٹی چڑیا کے مارنے سے کیا فائدہ ہوا ہو گا۔ تم شکاری جی، کیسے ظالم ہوتے ہو۔“

”میں تو ابابیلوں کو کبھی نہیں مارتا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”اور ایک دن بہت مزہ آیا۔“ لی کیریا کہنے لگی۔ ”جب خرگوش یہاں اندر میری جھونپڑی میں دوڑ آیا۔ شکاری کتے غالباً اس کا پیچھا کر رہے تھے وہ تیزی سے لڑھکتا ہوا دروازہ میں داخل ہوا اور میری پلنگڑی کے بہت نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت سہما ہوا تھا کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ وہ اپنی ناک سے برابر سوں سوں کر کے سونگھتا رہا اور کسی بڑے افسر کی طرح اپنی مونچھیں ہلاتا رہا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میری طرف سے اسے کوئی خطرہ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کودتا ہوا دروازہ تک گیا۔ سر نکال کر چاروں طرف دیکھا اور پھر نہایت سرعت سے غائب ہو گیا۔ کیسا مسخرہ تھا وہ!“ یہ کہتے ہوئے لی کیریا نے میری طرف دیکھا۔ اس کو خوش کرنے کے لئے میں بھی ہنس دیا۔ لی کیریا نے زبان ہونٹوں پر پھیری اور کہنے لگی۔ ”جاڑے بہت مشکل سے کٹتے ہیں کیونکہ زیادہ وقت اندھیرا رہتا ہے۔ موم بتی سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ میں پڑھنا تو جانتی ہوں اور پڑھنے کا بڑا شوق بھی ہے مگر میرے پاس کوئی کتاب نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو میں اسے ٹھیک سے نہیں اٹھا سکتی۔ ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ پادری صاحب میرے لئے تصویروں والی جنتری لائے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ میں اٹھا نہیں سکتی تو واپس لے گئے۔ اندھیرے میں بھی کوئی نہ کوئی آواز سن لیتی ہوں۔ کبھی جھینگری بولتی ہے تو کبھی چوہے کے کترنے کی آواز آتی ہے۔ اگر میں سوچنے لگوں تو نہ معلوم کہاں کہاں خیال جائے۔ نہ سوچنا ہی بہتر ہے۔“ لی کیریا ذرا دیر سانس لینے کو رکی پھر بولی۔ ”میں سورتیں اور آیتیں دہراتی رہتی ہوں۔ مجھے بہت تو یاد نہیں مگر جتنی بھی یاد ہیں ان کو اکثر پڑھتی رہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی التجاؤں اور دعاؤں سے اپنے خدا کو تکلیف دوں۔ میں اس سے مانگ بھی کیا سکتی ہوں۔ اسے میری ضروریات کا مجھ سے زیادہ علم ہے۔ یہ میرے صبر کی آزمائش ہے خدا مجھے چاہتا ہے جبھی تو میرا امتحان لے رہا ہے۔ میں سورتیں پڑھتی رہتی ہوں تو سب دکھ بیماری بھول جاتی ہوں۔

دو منٹ گزر گئے۔ میں چھوٹی تپائی پر ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس بدنصیب عورت کی محرومی اور بھیانک تنہائی میرے اندر سرایت کر گئی اور میں بھی سن سا ہو گیا۔ میں نے اپنے حواس کو جمع کرتے ہوئے کہا۔ ”لی کیریا! میری بات ذرا غور سے سنو۔ یہ کیسا رہے اگر میں تمہارے لئے کسی اچھے ہسپتال میں معقول انتظام کر دوں؟ شاید تم اب بھی اچھی ہو جاؤ اور کم از کم تم وہاں اکیلی تو نہیں ہو گی۔“ لی کیریا کی بھنووں میں خفیف سی کپکپی پیدا ہوئی اور اس نے گھبرا کر کہا۔ ”ارے نہیں صاحب۔ مجھے ہسپتال نہ لے جائیے۔ مجھے وہاں جا کر اور زیادہ تکلیف ہو گی۔ اب میں اچھی نہیں ہو سکتی۔ یہاں ایک ڈاکٹر آیا تھا۔ مجھے دیکھنا تھا۔ میں نے اس کی بہت خوشامد کی کہ مجھے مت چھیڑو مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس نے مجھے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کو ٹھوکا پیٹا اور خوب کھینچا تانی کی وہ کہنے لگا کہ میں یہ سب سائنس کی خاطر کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی خدمات کے لئے تمغہ بھی ملا ہے۔ میں سائنسدان ہوں اور تمہارے جیسے جاہلوں کے لئے محنت کر رہا ہوں۔ تمہیں چاہئے کہ مجھے اچھی طرح دیکھنے دو۔ اس کے بعد اس نے مجھے اچھی طرح لیج

کر دیکھا اور میری بیماری کا نام بھی مجھے بتایا تھا . . . . . . بہت لمبا سا نام تھا . . . . . . اس کے بعد وہ چلا گیا لیکن ہفتہ بھر تک میری ہڈی ہڈی اور جوڑ جوڑ دکھتا رہا۔ آپ کہتے ہیں کہ میں ہر وقت اکیلی رہتی ہوں۔ نہیں نہیں لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ میں خاموش رہتی ہوں اور ان لوگوں کو کوئی زحمت نہیں دیتی۔ اکثر گاؤں کی لڑکیاں مجھ سے آکر باتیں کرتی ہیں۔ کبھی کوئی زیارت کرنے والی عورت آجاتی ہے تو مجھے یروشلم خدا اور دوسری زیارتوں کے قصے سناتی ہے۔ میں تنہائی سے نہیں گھبراتی بلکہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ نہیں نہیں مجھے مت چھونا اور مجھے کسی ہسپتال نہ بھیجنا۔ شکریہ۔ سچ مچ آپ بہت اچھے ہیں لیکن مجھے ایسے ہی رہنے دیجئے۔ للّٰہ مجھے یہاں سے مت ہٹائیے۔

"اچھا اچھا تمہاری مرضی۔ لی کیریا میں تو تمہاری اچھائی کے لئے ہی کہتا تھا . . . . . ."

"میں جانتی ہوں مالک کہ آپ میری بھلائی کے لئے کہتے ہیں مگر عزیز آقا دوسرے کی کوئی کہاں تک مدد کر سکتا ہے۔ کسی کے دل کی بات کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ ہر ایک کو خود ہی اپنے لئے راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ کہ میں کبھی کبھی بڑی اکیلی ہو جاتی ہوں اور یوں لگتا ہے کہ بس میں ہی اکیلی زندہ ہوں لیکن تھوڑی دیر میں اپنے آپ ہی سنبھل جاتی ہوں۔ سرکار میں عجیب و غریب خواب دیکھتی ہوں۔"

"کیسے خواب دیکھتی ہو لی کیریا؟"

"میں ٹھیک سے بیان نہیں کر سکتی مالک اور میں بھول بھی جاتی ہوں۔ خواب بادل کی طرح آتے ہیں۔ برستے ہیں اور مجھے تروتازہ کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب میرے پاس دوسرے لوگ ہوتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان کی موجودگی سے اپنی محرومی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ دوسرے اعضاء کی طرح اس کی سانس بھی اکھڑی تھی۔ "لیکن مالک میرے لئے آپ کو اتنا پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ اب بھی . . . . آپ کو یاد ہوگا کہ میں اپنے زمانہ میں کتنا ہنستی کھیلتی اور گاتی تھی اب بھی جب میں گیت گاتی ہوں تو سکون ملتا ہے۔"

"کیا تم اب بھی گا لیتی ہو؟"

"جی ہاں سب پرانے گیت گاتی ہوں۔ مجھے بہت گیت آتے ہیں۔ ہر قسم کے۔ اور سب یاد ہیں مجھے۔"

"تم گا سکتی ہو یا گنگناتی ہو؟"

"گاتی بھی ہوں اور گنگناتی بھی۔ زیادہ زور سے تو نہیں گا سکتی مگر دوسرے کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ ایک چھوٹی سی یتیم لڑکی میرے پاس آتی ہے۔ وہ بہت ہوشیار ہے اس نے تھوڑے ہی دنوں میں مجھ سے چار گیت سیکھ لئے ہیں . . . . . . آپ کو یقین نہیں آتا تو ٹھہریئے میں آپ کو سناتی ہوں۔"

لی کیریا نے لمبی سانس لی۔ اس خیال سے کہ اب یہ ادھ مری لڑکی گانے کی کوشش کرے گی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں اس نے آہستہ سے ایک لمبی الاپ چھیڑ دی جس کے سُر پکے اور بالکل صحیح تھے۔ ابھی یہ آلاپ میرے کانوں تک پہنچی ہی تھی کہ اس نے دوسرا اور تیسرا سُر اٹھایا۔ "ہرے بھرے کھیتوں میں . . . . . ." لی کیریا گاتی رہی۔ وہ گاتی رہی مگر اس کے پتھر کی طرح جامد چہرہ پر کوئی تاثر نہ تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی ایک جگہ ٹھہری تھیں لیکن اس کی چھوٹی سی آواز جو بڑی مشکل سے نکل رہی تھی دھوئیں کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی۔ اس میں کتنا درد اور سوز تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ گیت میں اپنے دل کا سارا دکھ درد بھر دے . . . . . . اب مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا بلکہ اس کے لئے میرا دل رحم سے بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ "ارے مجھ سے نہیں جاتا۔" اس نے ایک دم کہا۔ "مجھ میں طاقت ہی نہیں ہے میں آپ کو دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو گئی ہوں۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی برف جیسی ٹھنڈی انگلیوں پر رکھ دیا۔ اس نے میرے اوپر نظر ڈالی۔ اس کے سیاہی مائل پپوٹے جن کے کناروں پر سنہری پلکیں تھیں پھر سے بند ہو گئے وہ بت کی طرح ساکت اور بے جان تھے۔ ایک لمحہ کے بعد وہ نیم اندھیرے میں چمکے تو آنسوؤں سے تر تھے۔ میں پہلے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ "ہائے مجھے کیا ہو گیا۔ میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔" لی کیریا نے غیر متوقع بلند آواز سے کہا اور اپنی آنکھیں کھول دیں اس نے آنکھیں بھینچ کر آنسو ٹپکائے اور کہنے لگی "مجھے شرم آنی چاہئے۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ بہت دن کے بعد میں ایسا محسوس کر رہی تھی۔ ہاں ایک دن میں نے اسی طرح اور محسوس کیا تھا۔ پچھلی بہار میں وسیلی پولیاکوف آیا تھا وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ جب تک وہ باتیں کرتا رہا تو میں ٹھیک رہی مگر اس کے جانے کے بعد میں اکیلے میں کتنا روئی ہوں۔ اتنے آنسو نہ معلوم کہاں سے آ گئے تھے۔ ہم لڑکیوں کے آنسو تو یوں ہی آجاتے ہیں سرکار۔ ان کا کیا ہے۔ آپ کے پاس رومال تو ہوگا مہربانی سے ذرا میری آنکھیں پونچھ دیجئے۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے اور رومال اس کے پاس چھوڑ دیا۔ رومال سادہ تھا لیکن صاف اور سفید تھا۔ پہلے تو اس نے لینے سے انکار کیا بولی "میں اس تحفہ کا کیا کروں گی؟" پھر اس نے اس کو اپنی کمزور انگلیوں سے دبا لیا اور چھوڑا نہیں۔ میں اب اس اندھیرے کا عادی ہو گیا تھا جس میں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ چنانچہ میں اس کے ناک نقشہ کو اب پہچاننے لگا تھا۔ اس کے بے رنگ چہرہ پر جو ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی وہ بھی مجھے اب نظر آنے لگی تھی۔ اس کے چہرہ پر پچھلے حسن کی پرچھائیاں بھی اب میں دیکھ سکتا تھا۔

"صاحب! میرے سونے کے بارہ میں آپ پوچھ رہے تھے۔" لی کیریا کہنے لگی۔ "تو میں بہت کم سوتی ہوں لیکن جب بھی سوتی ہوں۔ میں خواب دیکھتی ہوں بہت اچھے اچھے۔ شاندار۔ میں خواب میں بیمار نہیں ہوتی۔ ہمیشہ تندرست اور جوان ...... میرا سارا دکھ درد جاتا رہتا ہے لیکن جب میں جاگتی ہوں تو انگڑائی لینے کو بہت جی چاہتا ہے اس وقت مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں زنجیر میں جکڑے ہیں۔ مجھے اپنی تکلیف کا احساس شروع ہو جاتا ہے تو بڑا افسوس ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے بے انتہا اچھا خواب دیکھا ...... کیا میں آپ کو بتاؤں! اچھا تو سنئے۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک ہرے بھرے کھیت میں کھڑی ہوں۔ میرے چاروں طرف گیہوں کی لمبی لمبی پکی سنہری بالیاں لگی ہیں۔ میرے ساتھ ایک بھورا کتّا تھا۔ وہ کتّا بڑا خوفناک تھا۔ برابر مجھے کاٹنے کی فکر میں تھا میرے ہاتھ میں ایک درانتی تھی۔ یہ درانتی معمولی نہ تھی بلکہ وہ چاند معلوم ہوتی تھی۔ شروع دنوں میں چاند کی شکل درانتی کی طرح ہوتی بھی ہے۔ ہاں تو مجھے اسی چاند والی درانتی سے گیہوں کاٹنے تھے۔ مگر گرمی کی شدت سے میں بہت تھکی ہوئی تھی اور اپنے ہاتھ والے چاند سے چکا چوند ہو رہی تھی۔ مجھے سستی محسوس ہو رہی تھی۔ چاروں طرف بڑے بڑے نیلے رنگ کے پھول کھلے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنے سر میری طرف جھکائے۔ میں نے خواب میں سوچا کہ ان کو توڑ لوں وسیلی نے آنے کا وعدہ کیا تھا تو پہلے ایک ہار بنا لوں پھر کٹائی کروں گی کیونکہ گیہوں کاٹنے کے لئے میرے پاس کافی وقت تھا۔ چنانچہ میں نے نیلے نیلے پھولوں کو چننا شروع کیا مگر وہ میرے ہاتھوں میں آتے ہی پگھلنے لگے۔ میں نے بہتیری حفاظت کی مگر وہ پگھلتے ہی گئے۔ میں ہار نہیں گوندھ سکی اتنے میں کسی کے قدموں کی آہٹ میں نے سُنی اور بہت پاس سے کسی نے پکارا "لی کیریا۔ لی کیریا ......" "ارے میں نے دل میں کہا کتنا بُرا ہوا کہ میں اب تک ہار نہ گوندھ سکی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں اب نیلے بڑے پھولوں کی جگہ چاند کو اپنے سر پر رکھ لوں گی۔ میں نے تاج کی طرح اسے سر پر پہن لیا۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ سارا کھیت چمک اُٹھا اور سنہری بالیوں کے اوپر سے ایک شخص جلدی سے میری طرف بڑھتا ہوا آیا۔ وہ شخص وسیلی نہیں تھا بلکہ حضرت عیسیٰؑ تھے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں ان کو کیسے پہچان گئی کیونکہ تصویروں میں ان کی اور ہی شکل بنی ہوتی ہے۔ وہ خوبصورت وجیہہ جوان تھے۔ داڑھی ان کے نہیں تھی وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ صرف پیٹی ان کی سنہری تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے لئے بڑھایا اور کہا۔ "ڈرو نہیں۔ میری سجی ہوئی دلھن۔ میرے پیچھے آؤ۔ جنت کے گیت اور ناچ کے راگ اب تم عرش پر گانا"۔ میں نے مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کتا اچانک میرے پیروں پر جھپٹا لیکن اسی وقت ہم اوپر اُٹھنے لگے۔ حضرت عیسیٰؑ آگے آگے تھے۔ ان کے شہپر پورے آسمان پر پھیل گئے تھے۔ اور میں ان کے پیچھے تھی۔ کتے کو نیچے ہی رکنا پڑا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ وہ کتا میری بیماری تھا اور عرش معلّیٰ پر اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔" لی کیریا ایک منٹ ٹھیر گئی پھر بولی۔ "میں نے ایک اور خواب دیکھا یا یہ محض الہام ہو۔ میں ٹھیک نہیں بتا سکتی۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی جھونپڑی میں لیٹی ہوں۔ میرے مرحوم والدین میرے پاس آئے اور آکر تعظیماً میرے سامنے جھک گئے۔ میں نے پوچھا "امّاں ابّا ارے آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "تم نے دنیا میں بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ صرف تم نے اپنے روح کو ہی پاکیزہ نہیں رکھا بلکہ ہمارے بوجھ کو بھی ہلکا کر دیا ہے اور ہماری آخرت کو سنوارا ہے۔ تم نے ہمارے گناہ دھو دیئے۔ یہ کہتے ہوئے میرے والدین ایک دفعہ اور میرے سامنے جُھک گئے پھر وہ مجھے نظر نہیں آئے۔ سوائے دیواروں کے کچھ اور دکھائی نہیں دیا۔ میں بڑے پس و پیش میں تھی کہ اس کا کیا مطلب ہوا۔ پادری صاحب سے جب میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا یہ الہام نہیں ہو سکتا کیونکہ الہام تو صرف پہنچے ہوئے لوگوں ہی کو ہوتا ہے۔"

"میں آپ کو ایک خواب اور سُناتی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میں بڑی سڑک پر درخت کے نیچے بیٹھی ہوں۔ میرے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ میری پیٹھ پر گٹھڑی تھی اور میرے سر پر رومال بندھا تھا بالکل زائر عورتوں کی طرح۔ مجھے کہیں بہت دور زیارت کے لئے جانا تھا۔ زائرین میرے پاس سے آہستہ آہستہ گذر رہے تھے وہ سب ایک ہی طرف کو جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر تھکن تھی اور دیکھنے میں وہ سب ایک سے تھے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ان لوگوں میں ایک عورت تھی جس کا سر اوروں سے نکل

رہا تھا۔ وہ عجیب سا لباس پہنے تھی ہم روسیوں سے بہت مختلف۔ اس کا چہرہ عجیب تھا۔ کرخت اور تھکا ماندہ۔ جدھر وہ جاتی سب لوگ اُدھر سے فوراً ہٹ جاتے۔ وہ ایک دم مڑی اور سیدھی میری طرف آئی۔ میرے پاس آ کر وہ رُکی اور غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں عقاب کی طرح بڑی بڑی اور پیلی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا "تم کون ہو؟" کہنے لگی میں تمہاری موت ہوں۔ یہ سُن کر بجائے ڈرنے کے میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے جلدی سے سینہ پر صلیب کا نشان بنایا۔ یہ دیکھ کر وہ عورت کہنے لگی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی" میں سن کر بہت رنجیدہ ہوئی اور بولی "مجھے لے چلو اپنے ساتھ پیاری ماں موت مجھے لے چلو" میری موت جُھک کر مجھ سے کچھ کہنے لگی جو بہت مبہم اور غیر واضح تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میری موت کا وقت بتا رہی تھی۔ سینٹ پیٹر کے تہوار کے بعد...... میری آنکھ کھل گئی۔ جناب میں غضب کے خواب دیکھتی ہوں مگر مجھے کبھی پورے پورے ہفتہ نیند نہیں آتی۔ پچھلے سال ایک خاتون مجھے دیکھنے آئیں اور چلتے وقت مجھے نیند کی دوا کی ایک شیشی دے گئیں۔ اس سے بہت فائدہ ہوا۔ روز نیند آ جاتی تھی۔ لیکن عرصہ ہوا وہ دوا ختم ہو گئی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کونسی دوا ہے اور کہاں سے مل سکتی ہے؟"

ظاہر ہے اس خاتون نے لی کیریا کو افیم دی ہو گی۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اس قسم کی دوا کی شیشی ضرور لا دوں گا۔ اور تعجب سے میں نے کہا۔ "بھلا تم اتنا صبر کیسے کر لیتی ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرا صبر ہی کیا۔ صبر تو سائمن اسٹائیلائٹ کا مشہور ہے جو ایک کھمبے پر تیس سال کھڑا رہا۔ ایک اور بزرگ تھے جنہوں نے سینہ تک اپنے آپ کو مٹی میں دبوا دیا تھا۔ چیونٹیاں ان کا چہرہ کھا گئیں مگر انہوں نے جنبش نہ کی۔ انجیل کے ایک پڑھنے والے نے مجھے بتایا کہ ایک ملک تھا جہاں مسلمانوں نے دھاوا بولا۔ وہاں کے سینکڑوں ہزاروں باشندوں کو مار ڈالا اور سخت اذیتیں پہنچائیں۔ وہاں کے انسانوں کو کسی طرح ان سے نجات نہیں ملتی تھی۔ سب سخت پریشان تھے کہ خدا کی رحمت سے ایک فرشتہ صفت لڑکی ان میں نمودار ہوئی۔ اس نے من بھر کی زرہ بکتر پہن رکھی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اس نے تلوار اٹھائی اور انہیں سمندر سے پرے نکال باہر کیا۔ نکال دینے کے بعد اس نے کہا۔ "اب مجھے جلا دو۔ یہ میری قسم تھی کہ اپنے ہم وطنوں کی خاطر آگ میں جل کر مر جاؤں گی۔" مسلمان اس کو لے گئے اور زندہ جلا دیا۔ اس وقت سے وہاں کے باشندے آزاد ہیں۔ بڑا نیک کام کیا تھا اس نے۔ مگر میں نے کیا کیا ہے اور میرے صبر کی بھلا حقیقت ہی کیا؟"

مجھے تعجب ہوا کہ جون آف آرک کی کہانی کس طرح مسخ ہو کر اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔ ذرا رُک کر میں نے پوچھا۔ "اس کی عمر بھلا کیا ہو گی؟"

اٹھائیس ۲۸ یا انتیس ۲۹ کی ہو گی۔ تیس ۳۰ سے کم۔ مگر سال گننے سے کیا فائدہ۔ مجھے ابھی آپ سے اور باتیں کرنی ہیں۔"

اس کو ایکدم زور سے پھندا لگا اور وہ کراہی۔

"لی کیریا تم بہت باتیں کر رہی ہو۔ کہیں تمہاری طبیعت اور خراب نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"ہاں سچ تو ہے۔" اس نے بہت مدھم آواز میں کہا۔ "مگر کیا فرق پڑتا ہے اب آپ چلے جائیں گے تو میں چپ ہی پڑی رہونگی میں اپنے کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کر رہی ہوں کیونکہ اپنا دل کھول کر میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا اور میری بھڑاس نکل گئی۔"

میں جانے کے لئے اُٹھا۔ خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کی مطلوبہ دوا بھیج دوں گا۔ یہ بھی دریافت کیا کہ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔ "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ہر طرح قانع اور مطمئن ہوں۔ مگر مالک آپ یہ کیجئے کہ یہاں کے بے کس غریب کسانوں کی سفارش اپنی والدہ سے کر دیجئے گا۔ ان کے پاس جنگل زمین کچھ زیادہ نہیں۔ کتنا اچھا ہو اگر ان کا لگان کم ہو جائے۔ بڑے مفلوک الحال لوگ ہیں۔ آپ کو دعائیں دیں گے۔ خدا آپ کو تندرست اور خوش رکھے۔ بس۔ مجھے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں چاہئے۔" میں نے لی کیریا سے وعدہ کیا کہ میں اس کی خواہش پوری کر دوں گا۔ میں رخصت ہو کر دروازہ تک پہنچا تھا کہ اُس نے آواز دے کر پھر بلایا۔ "آپ کو یاد ہے میرے بال کتنے لانبے اور گھنے ہوا کرتے تھے۔ گھٹنوں تک آتے تھے۔ مگر بیماری میں ان کو صاف رکھنا اور ٹھیک سے کنگھی کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ بڑے پس و پیش کے بعد ہمت کر کے آخر میں نے کٹوا ہی دیئے۔ اچھا خدا حافظ صاحب! اب میں زیادہ بول نہیں سکتی" اُس دن شکار جانے سے پہلے گاؤں کے چوکیدار سے لی کیریا کے بارہ میں میری بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ گاؤں میں لی کیریا کو زندہ لاش کہتے ہیں۔ وہ کسی

کو کوئی تکلیف نہیں دیتی اور نہ ہی شکوہ شکایت کرتی ہے۔ وہ کچھ نہیں مانگتی جو کچھ مل جاتا ہے اس کے لئے شکر گزار ہوتی ہے۔ بڑی نیک لڑکی معلوم ہوتی ہے مگر توبہ کرنی چاہئے کہ اس نے نہ معلوم ایسے کیا گناہ کئے جس کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ہم تفصیل کیا جانیں اس کی۔

چند ہفتوں کے بعد میں نے سُنا کہ لی کیریا مر گئی۔ وہ عورت .... موت اُس کو لینے آئی تھی، سینٹ پیٹر کے تہوار کے بعد ..... میں نے سُنا کہ جس دن وہ مری برابر گرجا کی گھنٹیوں کی آوازیں سنتی رہی۔ حالانکہ گرجا اس جگہ سے پانچ میل دور تھا اور اتوار بھی نہیں تھی۔ لی کیریا کہتی رہی کہ گھنٹیوں کی یہ آوازیں گرجا سے نہیں اُوپر سے آرہی ہیں لیکن جنت کا نام لینے کی اُسے ہمت نہیں ہوئی۔

شیخ محمد اکرام

غالب پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں

اب وہ

حکیم فرزانہ

کے نام سے

ایک اور معرکۃ الآرا کتاب

پیش کر رہے ہیں

(زیر طبع)

فیروز سنز لاہور

چھبّیس اور ایک

(میکسم گورکی)

ترجمہ:۔ انوار حسن ہاشمی

ہم چھبیس تھے ـــــــ چھبیس زندہ مشینیں، جنہیں ایک تہ خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہاں ہوا مرطوب اور بوجھل تھی اور جہاں ہم صبح سے شام تک کیک اور بسکٹ بنانے کے لئے، آٹا گوندھتے اور خمیر تیار کرتے۔

کھڑکیوں میں سے تہ خانے کے اندر جھانکنے پر یوں نظر آتا جیسے ایک خندق منہ پھیلائے پڑی ہے۔ اس میں اینٹیں بھری ہیں اور اس پر کائی کی سبزی پھیلی ہوئی ہے۔ کھڑکیوں کے فریم پر باہر لوہے کا جنگلا تھا اور اندر شیشوں پر آٹے کی گرد کی موٹی تہ جمی تھی جس کی وجہ سے شیشے اتنے دھندلا گئے تھے کہ سورج کی روشنی ہم تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ کارخانہ کے مالک نے کھڑکیوں پر لوہے کی چادر چڑھوا دی تھی تاکہ ہم کسی غریب کو بسکٹ یا روٹی کا ٹکڑا نہ دے سکیں یا اپنے ان بدقسمت دوستوں کی طرف جو بے روزگاری کی وجہ سے مارے مارے پھرتے تھے اور جن پر کئی کئی وقت کے فاقے گذر جاتے، کھانے کی کوئی چیز نہ پھینک سکیں۔ کارخانہ کا مالک ہمیں کمینے، غلام اور بدمعاش جیسے لفظوں سے یاد کرتا اور دونوں وقت، گلی سڑی اوجھڑی کھانے کو دیتا۔

یہ بہت ہی گھٹی ہوئی زندگی تھی جو ہم پتھروں کے اس تنگ و تاریک پنجرے میں بسر کر رہے تھے۔ اس کی چھت بھاری بھرکم شہتیروں اور لکڑیوں سے پٹی ہوئی اور دھوئیں کی سیاہی میں رچی ہوئی تھی اور موٹی موٹی دیواروں پر جا بجا پھپھوندی اور کیچڑ تھپی ہوئی تھی۔ ہمیں روزانہ صبح کو پانچ بجے اٹھنا پڑتا جبکہ ابھی ہماری نیندیں بھی پوری نہ ہوئی ہوتیں اور ٹھیک چھ بجے ہم بے چون و چرا کارخانے کی میز پر پہنچ جاتے۔ جہاں ہمارے لئے گندھا ہوا آٹا تیار رکھا ہوتا اور ہم اس کے بسکٹ بنانے شروع کر دیتے۔

صبح سے رات کے دس بجے تک کچھ لوگ بسکٹ بناتے اور کچھ گوندھے ہوئے آٹے کو پھینٹتے رہتے۔ کچھ خشک آٹے میں پانی ملا کر گوندھتے اور تمام دن یہی کام آٹومیٹک مشین کی طرح ہوتا رہتا۔ بسکٹوں کو بھاپ میں سینکنے کیلئے دن بھر دیگ میں پانی کھولتا رہتا جس کی مغموم سنسناہٹ تہ خانے کی فضا پر چھائی رہتی۔ ادھر مستری[1] کا بیلچہ تندور میں کھڑکھڑاتا رہتا۔ صبح سے شام تک آتش دان میں لکڑیاں جلتی رہتیں اور کارخانے کی دیواروں پر شعلوں کی سرخ روشنی یوں رقص

---

[1] بسکٹوں کا نانبائی۔

کرتی جیسے ہماری حالتِ زار پر چپکے چپکے ہنس رہی ہو۔ آتش دان کا دہانہ کسی الف لیلوی دیو کا سر دکھائی دیتا جس کا دھڑ زمین میں مدفون اور گردن باہر رکھی ہو اور وہ دہکتی آگ سے بھرا منہ پھیلائے گرم گرم پھنکاریں مار رہا ہو۔ آتش دان پر دود کش کی ہوا کے دو سوراخ اس عفریت کی دو آنکھیں معلوم ہوتے تھے ایسی آنکھیں جو رحم و کرم سے خالی ہوں اور جو برابر ہمارے مشقت طلب کام کی کڑی نگرانی کر رہی ہوں۔ ہمارے سامنے وہ ہمیشہ ایک ہی طرح سکوت و سکون کی حالت میں کھلی رہتیں جیسے وہ اپنے غلاموں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی ہوں۔ اور ہم سے انسانیت کی کوئی اُمید نہ رکھتی ہوں بلکہ ہمیں کامیابی کے دامن کا بدنما داغ سمجھ کر حقارت سے ٹھکرا چکی ہوں۔ مدتوں سے ہم گرد و غبار سے بھری ہوئی فضا میں اس کیچڑ میں جو باہر سے پیروں میں لگ آتی اور سارے فرش پر پھیل جاتی اور بھاپ کے کثیف اور متعفن بخارات میں بسکٹوں کا آٹا گوندھتے پھینٹتے اور بسکٹ بنانے میں مشغول رہتے۔ آٹے اور بسکٹوں پر ہمارا پسینہ ٹپکتا رہتا اسی لئے ہمیں اس پیشہ سے سخت نفرت تھی جو مال ہم بناتے اسے چکھنا بھی گوارا نہ کرتے ساری روٹیوں کے مقابلہ میں ہمیں یہ بسکٹ کبھی پسند نہ آتے بسکٹ بنانے کی لمبی میز پر ہم میں سے بیک وقت اٹھارہ آدمی کام کرتے آمنے سامنے نو ادھر اور نو اُدھر۔ ہماری اُنگلیاں صبح سے شام تک مشین کی طرح چلتی رہتیں۔ ایک عرصۂ دراز سے یہی کام کرتے کرتے ہمارے اعصاب اتنے عادی ہو چکے تھے کہ چاہے ہم کچھ سوچ رہے ہوں، کسی طرف کو دیکھ رہے ہوں، کیسی ہی گفتگو کر رہے ہوں، کام میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اتنی بار دیکھا اور پہچانا تھا کہ چہرے کی جھرّیوں اور شکنوں کی خصوصیات تک سے واقف تھے۔ ہم اکثر سارا سارا دن خاموش رہتے اور بعض دفعہ اسی حالت میں کئی کئی دن گزر جاتے ہم کلام ہونے کی نوبت، عام طور پر اس وقت آتی جب آپس میں تنازعہ ہو جاتا۔ لڑنے کے لئے ذرا سا بہانا کافی ہے۔ جو لوگ ایک ساتھ کام کرتے ہوں، ان کے لئے اپنے ساتھیوں سے اس کی تقریب پیدا کرنے کا ہر وقت موقع ہے۔ لیکن یہاں تو لڑنے کی نوبت بھی شاذ و نادر ہی آتی تھی۔ اور سارا وقت خاموشی ہی میں گذر جاتا۔ جو شخص نیم مردہ ہو جس کی حالت پتھر کی مورت کی سی ہو اور جس کے احساسات کو کام کے مسلسل دباؤ نے کند کر دیا ہو وہ یقیناً تنوع کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا لیکن خاموشی انہی لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے جو ہر قسم کی باتیں کہہ چکے ہوں اور اب ان کے پاس کچھ کہنے کے لئے نہ رہا ہو جن لوگوں نے شروع ہی سے زبانیں بند رکھی ہوں ان کے لئے خاموش رہنا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں کبھی کبھی ہم کوئی گیت الاپتے اور یہ اس طرح شروع ہوتا کہ ہم میں سے کوئی کام کرتے کرتے، تھکے ہوئے گھوڑے کی مانند اچانک ہنہناتا اور نہایت دھیمے لیکن لمبے سروں میں کوئی ہلکا پھلکا مغموم گیت شروع کر دیتا ایسا مغموم گیت جس سے گانے والے کا مقصد مضمحل روح میں تازگی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ تنہا نغمہ کچھ دیر کے لئے دئیے کی لو کی طرح جھلملاتا اور بجھ جاتا جیسے سرمئی موسم بہار کی راتوں میں جب سائبریا کے لق و دق میدانوں پر آسمان ایک خاکستری سائبان کی صورت میں ٹنگ جاتا ہے۔ کہیں دُور خیمے میں ذرا سی آگ روشن ہوتی ہے اور چند ساعتوں میں بجھ جاتی ہے پھر ذرا دیر بعد دوسرے ساتھی کی مغموم آواز ابھرتی اور پہلے کی ہم نوا ہو جاتی۔ یہ دونوں غمگین آوازیں دو متوازی شعلوں کی طرح تہ خانہ کی دم گھونٹ دینے والی اور گرم ہوا سے ماورا ہو کر لہرانے لگتیں پھر کئی اور گلوں سے سُر بلند ہوتا اور پہلی آواز کے منجدھار میں آ ملتا اور یوں گیت پایاب پانی کے دائرے بناتی ہوئی لہروں کی طرح دھیرے دھیرے فضا میں پھیلنے لگتا، اس کی آواز بلند تر ہو جاتی اور ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ زنداں نما تہ خانہ کی بھاری بھرکم دیواروں کو دھکیلتا اور اس کی فضا کو کشادہ کرتا چلا جا رہا ہے اسی طرح رفتہ رفتہ ہم چھبیسوں گانے میں مشغول ہو جاتے یہاں تک کہ گیت کی بڑھتی ہوئی تانیں تمام تہ خانہ کو لہروں سے بھر دیتیں جیسے اب تہ خانہ کی وسعت مزید لہروں کی متحمل نہیں ہو سکے گی۔ یہ گیت پتھریلی دیواروں سے ٹکراتا، کراہتا، روتا اور انگھتا ہوا دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا اور ایک میٹھی کسک پیدا کرتا۔ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے اور رگ رگ میں سوز و گداز کی لہر دوڑ جاتی۔ گانے والے ساتھی گہری اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے پھر کوئی گاتے گاتے اچانک رک جاتا اور باقی آوازوں کو بڑے غور سے سننے لگتا۔ ذرا دیر بعد پھر اس کی آواز ہجوم کی آوازوں کے مد و جزر میں آ ملتی۔ پھر کوئی ایک آہِ سرد بھرتا مراقبہ میں بیٹھے ہوئے صوفی کی طرح آنکھیں بند کر کے کسی تصوّر میں کھو جاتا اور اسی حالت میں پھر گانے لگتا جیسے اس نے اس گیت کو ایک وسیع شاہراہ سمجھ لیا ہو جو بہت دور تک پھیلی ہو اور سورج کی روشنی میں صاف نظر آ رہی ہو۔ اور اس شاہ راہ پر وہ اکیلا ہی بڑھتا چلا جا رہا ہو۔

آتش دان کے شعلے لپکتے اور بھڑکتے رہتے۔ مستری کا بیلچہ اینٹوں کے فرش پر کھڑ کھڑ چلتا رہتا۔ کھولتے پانی کی مغموم سنسناہٹ برابر جاری رہتی اور آگ کا عکس دیواروں پر زرد زرد روشنی بکھیرتا رہتا اور ہم لوگوں کی حالت پر چپکے چپکے ہنستا۔ ہم سورج کی روشنی اور ہوا سے محروم چند زندہ متنفس اپنی صعوبت ناک حالت

اور غلاموں کی سی عقوبت کا اظہار گیت کے بولوں میں کرتے رہتے زندگی ہمارے کندھوں پر اسی طرح بوجھ بن کر سوار تھی جیسے تہ خانہ کی دیواروں پہ بالائی منزلیں۔

گانے کے علاوہ ہمارا ایک اور شغل بھی تھا۔ نہایت عزیز شغل۔ جو اس گھٹی ہوئی اور تاریک فضا میں سورج کی کرن کی طرح روشنی اور زندگی کا سہارا تھا۔ دوسری منزل پہ کارچوبی کا ایک کارخانہ تھا جہاں بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں انہی میں ایک دوشیزہ تھی جس کا نام ٹانیا تھا۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سال کی ہوگی وہ روزانہ سویرے کارخانہ کے پھاٹک کی کھڑکی سامنے آ کھڑی ہوتی شیشوں پہ گلاب سا چہرہ رکھ کر خوشی سے چھلکتی ہوئی نیلی گول آنکھوں سے اندر جھانکتی اور کہتی! "مظلوم قیدیو! مجھے تھوڑے سے بسکٹ دے دو!"

اس کی جانی پہچانی دلکش آواز فضا میں گونجتے ہی سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اس کے بھولے بھالے مسکراتے چہرے کو بڑے پیار سے دیکھتے۔ کھڑکی کے شیشے پر دبی ہوئی چھوٹی سی چپٹی ناک اور تبسم سے کھلے ہوئے ہونٹوں کے درمیان موتیوں جیسے دانت ہمارے لئے روزانہ کا نظارہ بن گئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ دروازہ کھلوانے کے لئے کواڑوں کو جھنجھوڑتی اور یہ سعادت حاصل کرنے کی خاطر ہم میں سے ہر ایک یہ چاہتا کہ سب سے پہلے اٹھ کر دروازے تک پہنچ جائے۔ دروازہ کھول دیا جاتا اب وہ دہلیز پہ کھڑی ہو جاتی ہنستی مسکراتی ایپرن کا دامن ہاتھوں میں تھامتی اور اسی طرح مسکراتی رہتی اُس کی لمبی لمبی سنہری زلفیں کندھوں سے گزر کر سینہ پہ لٹکتی ہوتیں۔ اور ہم میلے کچیلے چھبیسوں آدمی جن کا بخت ان کے جسم اور لباس کی طرح سیاہ تھا وہیں کھڑے اس کا منہ دیکھا کرتے۔ دہلیز فرش سے تقریباً چار فٹ بلند تھی اور اس کا وصل چار سیڑھیوں کے ذریعے ہوتا تھا اس لئے ہمیں ٹانیا کو دیکھنے کے لئے اپنے سروں کو ذرا پیچھے اور اُوپر اُٹھانا پڑتا تھا ہمیں اس کے صبح کے سلام کی ادا بے حد پسند تھی اور ہم اس سے ہمیشہ ایک خاص انداز میں گفتگو کیا کرتے۔ اس موقعہ پر ہمارے الفاظ ایک نیا رخ اختیار کر لیتے۔ ہماری زبانوں پر صرف ستھرے اور نکھرے ہوئے لفظ آتے اور آواز میں معمول کے خلاف ایک نرمی اور انکساری پیدا ہو جاتی اور مذاق بھی عامیانہ سطح سے اُبھر کر شاعرانہ سا رنگ اختیار کر لیتا اور یہ سب ہمارے ارادوں کے بغیر خود بخود ہوتا صرف ٹانیا کی خاطر۔ مستری تنور میں بیلچہ چلا کر خوب سنکے ہوئے لال لال بسکٹ نکالتا اور ٹانیا کے دامن میں بھر دیتا۔

"ہوشیار رہنا کہیں مالک نہ دیکھ لے!" یہ ہدایت ہم ہر روز ٹانیا کے گوش گزار کرتے اور وہ شرارت سے ہنس کر جواب دیتی "اچھا خدا حافظ قیدیو!" پھر ایک دم ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔

اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک ہم اس کی باتیں کرتے رہتے صبح سے شام تک یہی ایسا وقت ہوتا جب ہم محبت سے ہم کلام ہوتے۔ روزانہ تقریباً ایک ہی انداز کی گفتگو ہوتی اس گفتگو کے تواتر اور یکسانی میں کبھی فرق نہ آیا۔ اور فرق آتا بھی کیسے جبکہ ٹانیا ہم اور ہمارے گرد و پیش ہر چیز اسی طرح یکساں اور متواتر تھی انسان کے لئے ایسی جگہ رہنا جہاں کوئی تنوع نہ ہو جہاں آس پاس ہر چیز یکساں ہو، بڑی ہی دردناک عقوبت ہے خاص کر ایسی حالت میں جبکہ اس ماحول کے ہاتھوں اس کی روح بالکل فنا نہ ہو چکی ہو اور اس میں احساس کا کچھ شائبہ باقی ہو ماحول کا جمود و خمود نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے کیونکہ زندگی کے ساتھ ساتھ اس جمود و خمود کا احساس روز بروز تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

عورتوں کے بارے میں ہم نے بیسیوں دفعہ آپس میں باتیں کیں اور ہمیشہ ان کے لئے نہایت نازیبا الفاظ ہماری زبانوں پہ آتے۔ حتّٰی کہ بسا اوقات اپنی بد زبانی خود ہمیں بھی ناگوار محسوس ہوتی۔ یہ بات بھی تھی کہ جن عورتوں کو ہم جانتے تھے وہ اس قماش کی تھیں کہ ان کے لئے کسی اچھے انداز میں اظہار خیال کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن ٹانیا کے متعلق ہم نے کبھی غیر مہذب رویّہ اختیار نہیں کیا نہ کسی نے اس کے لئے بُرے الفاظ زبان سے نکالے نہ اس طرح بے باکی سے گفتگو کی جرأت کی کہ دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں بے تکلفی ظاہر ہو شاید یہ وجہ ہو کہ وہ ہم میں زیادہ دیر نہ ٹھیرتی تھی ہماری نظروں کے سامنے وہ ٹوٹتے تارے کی مانند ذرا دیر کو جھلملاتی اور غائب ہو جاتی لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ کم سِن اور حسین تھی اور حسن خواہ کہیں بھی ہو ہر طبقہ کے لوگوں سے اپنا احترام کرا ہی لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگرچہ اس کٹھن زندگی نے ہمارے احساسات اور ذہنوں کو اس حد تک پامال کر دیا تھا کہ ہم جانوروں کی سطح کے قریب پہنچ چکے تھے تاہم ابھی ہم میں انسانیت کی رمق باقی تھی اور انسانی فطرت

کے مطابق کسی پرستش کرنے کی خواہش بھی ہم میں موجود تھی۔ اس خواہش کے تحت لوگ مختلف پیرایوں میں مختلف چیزوں کو پوجتے ہیں ہم نے ٹانیا کو اپنا معبود بنا لیا تھا وہ ہماری روح کا ایک حصہ تھی جب تک اس کے دیدار سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جاتیں دل کو چین نصیب نہ ہوتا ہماری نظر میں دنیا کی کوئی چیز اس سے بہتر نہ تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ کارخانہ کی اس پوری زندگی میں صرف ٹانیا ہی ایسی ہستی تھی جس نے ہم غلاموں کو درخورِ اعتنا سمجھا تھا اور عرصہ سے بلاناغہ ہمارے پاس آنے کی زحمت گوارا کر رہی تھی۔ رہنے کو آس پاس اور بھی بہت سے لوگ تھے لیکن ہمیں کوئی ایسا آدمی یاد نہیں پڑتا جس کے رویہ سے کبھی یہ ظاہر ہوا ہو کہ اسے ہم تہ خانہ کے مزدوروں سے بھی کوئی دلچسپی ہے۔ ہم سب ٹانیا کو اپنی متاعِ عزیز سمجھتے تھے۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ بسکٹوں کے حقیر نذرانے کا زندہ ثمرہ ہے۔ سب بڑی بے چینی سے اس کے منتظر رہتے اور تازے تازے گرما گرم بسکٹ اس کی خدمت میں پیش کرتے۔ یہ کام ہمارے لئے مقدس فرض کے برابر تھا۔ وہ محبت کی دیوی تھی اور ہم پجاری۔ ہر گزرنے والا دن ہمیں پہلے سے زیادہ اس کا حلقہ بگوش غلام بنا رہا تھا۔ بسکٹوں کے علاوہ ہم ٹانیا کو بعض مفید مشورے بھی دیتے مثلاً "ٹانیا یہ کپڑے جو تم پہنے ہو کافی گرم نہیں ہیں۔ ذرا زیادہ گرم کپڑے پہنا کرو۔ سیڑھیاں چڑھنے میں جلدی مت کیا کرو۔ لکڑیوں کے بھاری بھاری گٹھے نہ اٹھایا کرو۔" وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ مشورے سن کر مسکراتی اور جواب میں بس ایک قہقہہ لگاتی۔ جس کی گونج میں ہماری تمام ہدایات وہیں دب کر رہ جاتیں۔ اس لئے کہ ٹانیا نے کبھی ہمارے ان مشوروں پر عمل نہیں کیا تھا۔ لیکن ہم نے اس بے اعتنائی کا برا نہیں مانا ہمارا مقصد صرف اسے یہ جتانا تھا کہ ہم اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ ہم سے مختلف کاموں کے لئے کہتی مثلاً آتے اور جاتے تہ خانہ کا بھاری دروازہ کھولنے کے لئے ہمیں بلاتی کبھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹنے کی فرمائش کرتی اور ہم بڑی خوشی اور فخر کے ساتھ اس کا ہر حکم بجا لاتے۔

لیکن جب ایک دفعہ ہمارے ایک ساتھی نے اس سے اپنی اکلوتی قمیص پر رفو کرنے کو کہا تو اس نے نفرت سے ناک سکیڑ کر جواب دیا تھا "حد ہو گئی! تم سمجھتے ہو میں ایسے ہی فضول کاموں کے لئے ہوں!"

اور ہم سب اپنے اس سادہ لوح ساتھی پر ہنس پڑے تھے اور اس دن کے بعد سے کسی نے ٹانیا سے کوئی فرمائش نہ کی تھی۔ ہم اس سے محبت کریں ہمارے لئے بس اتنا ہی کافی تھا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں افراط و تفریط کی راہیں بھی خود بخود کھل جاتی ہیں اور اسی کے تحت بسا اوقات انسان محبوب کی ذات سے ایسی دور از کار توقعات وابستہ کر لیتا ہے کہ بسا اوقات محبوب کی شخصیت اور محبت دونوں چکنا چور ہو جاتے ہیں کبھی وہ اپنے ساتھیوں اور ہمسایوں کی زندگی میں محض اس بنا پر زہر گھول دیتا ہے کہ جو اس کا منظورِ نظر ہے۔ اس کے دوست اور ساتھی بھی اس کا احترام کیوں نہیں کرتے۔ ہم ٹانیا کی محبت میں اس لئے گرفتار ہوئے تھے کہ ہمارے لئے اظہارِ محبت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا اور اب ہم یہ بھی جانتے تھے کہ ہر شخص اس میں اچھائیاں ہی دیکھے۔

کبھی کبھی ہمارا کوئی ساتھی اس قسم کا منطقیانہ استدلال شروع کر دیتا کہ ہم اس کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں کس لئے اس کے ساتھ خود کو ملوّث کرنے کے درپے ہیں آخر اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ ہم نے اس کے بارے میں خواہ مخواہ ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے لیکن ابھی کہنے والے کے فقرے پورے بھی نہ ہو پاتے کہ سب اسے ڈپٹ کر خاموش کر دیتے ٹانیا ہماری محبت کا واحد مرکز تھی اور ہم چاہتے تھے کہ وہ ہر قسم کی نکتہ چینیوں اور ملامتوں سے پاک رہے کیونکہ وہ ہمارے لئے ایک مقدس مزار کی طرح قابلِ تعظیم و تکریم تھی اس معاملہ میں ہمارے جذبات اس قدر انتہا کو پہنچے ہوئے تھے کہ جو بھی اس کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالتا وہی ہمارا دشمن ہو جاتا۔

اس بسکٹ فیکٹری کے علاوہ کارخانہ کے مالک کی ایک اعلیٰ بیکری بھی تھی جو اسی تہ خانہ کے ایک حصہ میں واقع تھی۔ دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ بیکری میں چار آدمی کام کرتے تھے یہ چاروں ہم سے کھنچے کھنچے رہتے کیونکہ وہ اپنے کام کو ہم سے برتر اور صاف ستھرا خیال کرتے اور اپنے کو بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ وہ ہمارے کارخانہ میں کبھی نہ آتے اور جب کبھی ان سے باہر میدان میں ملاقات ہوتی تو وہ ہماری زندگی اور کام کا مضحکہ اڑاتے ہم بھی ان سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مالک کی یہ ہدایت تھی کہ ہمارا کوئی آدمی بیکری میں نہ جانے پائے کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ ہم وہاں سے کیک اور پیسٹریاں چرا لیں گے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر

بیکری والوں سے دوستی پیدا کرنے کا خیال کبھی ہمارے دل میں نہ آیا۔ ہمیں ان سے حسد تھا کیونکہ ان کا کام ہم سے آسان تھا، انہیں ہم سے زیادہ معاوضہ ملتا اور کھانے کو بھی اچھی اچھی چیزیں میسّر آتی تھیں۔ ان کا کارخانہ ہم سے زیادہ صاف اور روشن تھا اور ان کے جسم اور لباس کی حالت ہم سے ہزار گنا بہتر تھی صفائی اور صحت میں وہ ہمارے برعکس تھے ہم سب زرد رُو تھے۔ تین کی صحت خراب تھی کچھ دق کا استقبال کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے ایک کو گٹھیا نے اپاہج کر رکھا تھا بیکری کے ملازم تقریبات کے موقعوں پر اور فالتو اوقات میں بحری سفر کا لمبا کوٹ اور چرچر بولتے ہوئے بوٹ پہنتے ان میں سے دو کے پاس ہاتھ کا باجا (کنسٹرٹنیا) بھی تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے ان کی ٹولیاں پارک میں گھوما کرتیں۔ ہم لوگ جب باہر نکلتے اور ادھر ادھر جاتے تو ہمارا لباس کارخانے کے لباس سے کچھ ہی بہتر ہوتا پاؤں میں نیچی ایڑی کے سلیپر ہوتے۔ یا پھر چٹائی کے جوتے۔ پولیس ہمیں پارک میں گھسنے نہ دیتی۔ اتنے عظیم تفاوت کے باوصف، ہم بیکری والوں سے ملنا کیسے پسند کر سکتے تھے۔

چند روز بعد معلوم ہوا کہ ان کا اوورسیر شراب پیتا ہوا پکڑا گیا جس کی پاداش میں مالک نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا ہے اور اس کی جگہ ایک اور آدمی رکھ لیا ہے یہ نووارد ایک فوجی تھا۔ وہ کارخانے سے باہر جب بھی جاتا قیمتی ساٹن کی صدری زیب تن کرتا اور کبھی کبھی طلائی زنجیر بھی پہن لیتا ہمیں اس کا شریفانہ رکھ رکھاؤ بہت پسند آیا اور ہم اس سے ملنے کی خواہش کرنے لگے اسی خیال سے ہم سب باری باری صحن میں جاتے رہے کہ کسی نہ کسی سے اس کی دعا سلام ہو جائے اور راہ و رسم کا سلسلہ شروع ہو۔

ایک روز وہ خود ہی ہمارے کارخانہ میں چلا آیا اس نے ٹھوکر مار کر دروازے کا پٹ کھولا اور کھلا ہی چھوڑ کر دہلیز میں کھڑا ہو گیا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا بولا "خدا تمہیں سلامت رکھے میرے بچو! سلام" برف سے لدی ہوئی ہوا کثیف بادلوں کی صورت میں دروازہ میں گھسی اور اس کے پاؤں سے لپٹ کر دہلیز میں چکرانے لگی وہ دہلیز ہی میں کھڑا ہماری طرف دیکھتا رہا۔ ہماری جگہ نیچی تھی اس لئے اس کی بڑی بڑی تابدار مونچھوں کی اوٹ میں سے پیلے پیلے دانت نظر آ رہے تھے۔ اس وقت وہ نیلے رنگ کی ایک قیمتی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جو واقعی خواص کا لباس معلوم ہوتی تھی۔ اس پر زردوزی کے پھول اور جابجا شہاب ثاقب کی طرح چھوٹتی ہوئی پھلجھڑیاں کاڑھی گئی تھیں۔ اس کے بٹن ننھے ننھے موتیوں سے بنائے گئے تھے اور ان میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔

وہ قبول صورت اور سجیلا تھا جیسے ایک سپاہی کو ہونا چاہئے۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم انگارا سے رخسار، بڑی بڑی روشن آنکھیں جن سے خلوص اور ملنساری عیاں تھی۔

وہ ایک سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا جس کا تار تار چست اور ہموار تھا۔ اس کے پالش سے چمچماتے بوٹوں پر روشنی کا عکس سفید سفید انڈوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔

مستری نے اس سے کہا، "مہربانی کر کے دروازہ بند کر دو۔"

اس نے دروازہ بند کر دیا اور اندر آ گیا۔ اور ہم سے کارخانے کے مالک کے بارے میں مختلف سوالات پوچھنے لگا۔

اس موضوع پر ہمارے دماغوں میں اتنا مواد محفوظ تھا کہ وہ ایک بات پوچھتا اور ہم سب بیک زبان جواب دیتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ ہم نے اسے بتایا کہ مالک غریبوں کا خون چوستا ہے ہمارے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کرتا ہے بڑا ہی اذیت پسند ہے غرض اسی طرح کی سیکڑوں باتیں جو ہمارے دلی احساسات کی آئینہ دار تھیں اس وقت برجستہ زبانوں پر آ گئیں۔ فوجی نے انہیں غور سے سُنا۔ اپنی تابدار مونچھوں کو اور تاؤ دیا اور ہمیں بڑی میٹھی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

پھر وہ اچانک بولا "غالباً آج کل تمہارے آس پاس کچھ چھوکریاں بھی ضرور ہوں گی؟"

کوئی ادب کے ساتھ ہنسا کسی نے کھسیانا منہ بنا لیا اور ایک نے بالکل صاف صاف کہہ دیا کہ یہاں آس پاس درجنوں چھوکریاں ہیں۔

"تو کیا وہ تمہیں تفریح کے لئے مل جاتی ہیں؟" فوجی نے آنکھ مارتے ہوئے پوچھا؟ ہم پھر ہنس پڑے اور ہمارے چہروں پر کشمکش سی نمودار ہوئی۔ ہمارے کئی ساتھی فوجی کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ وہ معاملات عیش و نشاط میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ لیکن کسی نے صاف صاف یہ بات نہیں کہی۔ ایک نے بڑبڑاتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا "کیوں نہیں؟ یہیں بیٹھے بیٹھے ......"

"لیکن تم جیسے لوگوں کے لئے یہ بڑا ہی دشوار مسئلہ ہے۔" فوجی نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ اور ہمیں گھورتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہیں پہلے اپنی حالت بدلنی چاہئے جس حالت پر تم اس وقت ہو وہ ہرگز تمہیں کامیاب نہیں کر سکتی۔ تم بڑے بدنصیب لوگ ہو۔ کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ اس راز کو سمجھنے پر منحصر ہے کہ چیزوں کا ظاہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ عورتیں ہمیشہ اس شخص کو پسند کرتی ہیں جو اپنے آپ کو نوک پلک سے درست رکھے۔ مرد کو مردانہ حسن کا نمونہ بن کر رہنا چاہئے کہ ہر چیز صاف اور چست ہو۔ سمجھے؟ اس کے علاوہ عورت جسمانی طاقت اور صحت کا بھی بہت احترام کرتی ہے۔ مردانہ کلائی کا تصور تمہارے نزدیک کیا ہے؟"

پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ جیب سے نکالا قمیص کی آستین کہنی تک چڑھائی اور اپنی کلائی برہنہ کر دی۔ یہ واقعی ایک آہنی اور تنومند کلائی تھی۔ سرخ سپید رنگ اور چمکیلے سنہرے بالوں سے ڈھکی ہوئی۔

"ٹانگوں اور سینہ کو بھی ایسے ہی سمجھو، وہ بھی ایسے ہی تنومند اور توانا ہیں۔ ہاں اور یاد رکھو کہ آدمی کا لباس بہت باوضع ہونا چاہئے۔ اور اس کے پاس عمدہ عمدہ چیزیں ہونی چاہئیں مجھے دیکھو تمام عورتیں مجھ پر مرتی ہیں میں انہیں کبھی اپنے پاس نہیں بلاتا انہیں کبھی اشارہ تک نہیں کرتا۔ لیکن وہ جنون مجھ پر پروانہ وار گرتی ہیں۔ وہ آٹے کے ٹوکرے پر بیٹھ گیا اور کافی دیر تک ہم سے یہی بحث کرتا رہا کہ عورتیں کیونکر اسے اتنا چاہتی ہیں اور کس جرأت کے ساتھ ان سے قرب پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔ دروازہ چرچرایا اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے بند ہو گیا۔ ہم کافی دیر تک خاموش رہے۔ ہم اسی کی ذات کے بارے میں سوچتے رہے تھوڑی دیر بعد ہم سب اچانک بول پڑے اور اس کے عجیب و غریب طرز گفتگو پر قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ مختصر سی بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ ایک دلچسپ کافی بے تکلف اور زندہ دل آدمی ہے جب ہی تو وہ ہمارے پاس سیدھا اندر چلا آیا اور جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا اور اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے مدتوں کا شناسا ہو۔ اس سے پہلے اتنے دوستانہ انداز میں کسی نے ہم سے گفتگو نہیں کی تھی۔ ہم یہی باتیں کرتے رہے کہ وہ کیسا عجیب و غریب آدمی ہے اور کارچوبی کے کارخانے کی لڑکیوں کے ساتھ اس کا مستقبل کیا ہوگا یہ لڑکیاں جب بھی ہمیں میدان میں ملتیں تو ہماری طرف دیکھ کر کبھی نفرت سے ہونٹ بچکا دیتیں۔ کبھی ہم سے بہت بچ کر نکل جاتیں یا اس شان بے اعتنائی سے گزر جاتیں کہ جیسے ان کے نزدیک ہمارا وجود کوئی چیز ہی نہیں۔ بہر حال جب بھی وہ ہمیں ملتیں ہم آنکھیں ضرور سینک لیتے اور یہی ہماری سب سے بڑی فتح تھی۔ یہ لڑکیاں سردیوں میں سنجاب و سمور کی چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں اوڑھتیں۔ سموری کا جامہ زیب تن ہوتا گرمیوں میں وہ ہیٹ پہنتیں جن میں خوبصورت پھول سجے ہوتے اور ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگ کی چھوٹی خوبصورت چھتریاں ہوتیں جب آپس میں ہم ان کا ذکر لے کر بیٹھتے تو اس انداز میں کہ گویا وہ سب کچھ سن رہی ہیں۔ ابھی ان کے کان میں بھنک پڑے گی تو وہ غیظ و غضب سے دیوانی اور شرم و ندامت سے پانی پانی ہو جائیں گی۔

"لیکن ٹانیا کا کیا بنے گا۔ مجھے تو امید نہیں کہ وہ غریب اس فوجی کی بوالہوسی سے محفوظ رہے گی"۔ مستری نے بڑے افسردہ لہجہ میں کہا۔ ہمیں ان الفاظ نے اتنا متاثر کر دیا کہ سب پر خاموشی طاری ہو گئی۔

ہم ٹانیا کو قریب قریب بھول ہی گئے تھے —— گویا فوجی اپنے حسین و جمیل خد و خال دکھا کر ٹانیا کو ہم سے بہت دور لے گیا تھا۔ ذرا دیر بعد اس معاملہ پر گرما گرم بحث ہونے لگی بعض کہتے تھے کہ ٹانیا اپنے آپ کو ہرگز ملوث نہ ہونے دے گی کچھ اس پر زور دیتے کہ وہ فوجی کے ٹھاٹ باٹ اور ہوسناکی کے مقابلہ میں ثابت قدم نہیں رہ سکتی آخر میں ایک تیسرے گروہ نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اگر ٹانیا کے بارے میں فوجی کے ارادے ذرا بھی بدلے ہوئے دکھائی دیں۔ تو ہم اس کی ہڈی پسلی توڑ دیں گے۔ بہر حال یہ جھگڑا اس پر ختم ہوا کہ ٹانیا اور فوجی کی نگرانی کی جائے۔ اور ٹانیا کو اس کے خطرناک رجحان سے خبردار کر دیا جائے۔

ایک مہینہ گزر گیا فوجی اپنی بیکری میں اعلیٰ کیک اور کریم رول بناتا رہا۔ کارخانہ کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہا اور ہمارے کارخانہ میں اکثر آتا رہا۔ لیکن اس نے چھوکریوں کو جیت لینے کے بارے میں پہلی دفعہ کے بعد کبھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ اب وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا اور چٹخارے لے لے کر ہونٹ چاٹا کرتا۔

ٹانیا حسب معمول صبح سویرے بسکٹ لینے آتی اور خوش دکھائی دیتی۔ ہم لوگوں کے ساتھ اس کی پرخلوص اور شریفانہ محبت اسی طرح قائم تھی ہم نے کئی مرتبہ اس سے جی کے بارے میں باتیں کرنی چاہیں لیکن وہ اسے "عینک پوش بھیڑیے" یا اور ایسے ہی مضحکہ خیز ناموں سے یاد کیا کرتی جس سے ہمیں پختہ یقین ہو گیا کہ وہ فوجی کے دام

میں آنے والی نہیں۔ ہم دیکھتے کہ کارخانہ کی دوسری لڑکیاں پروانہ وار فوجی کے گرد پھرتی تھیں لیکن ٹانیا اُسے منہ نہیں لگاتی۔ اس بات پر ہمیں بڑا فخر تھا۔

ٹانیا کا پروقار اور منفرد عمل ہم سب کے حوصلے بڑھاتا رہا۔ ہم خود کو ٹانیا کا رہبر سمجھنے لگے اور فوجی کا وقار بھی اب ہماری نظروں میں گر گیا۔ اب ہمیں ٹانیا پہلے سے بہت زیادہ عزیز تھی۔ آسس سے روزانہ ملاقاتیں ہوتیں۔ لیکن اب ان ملاقاتوں میں ہمارے لئے زیادہ لگاؤ خوشی اور آسودگی شامل ہوگئی تھی۔

ایک دن فوجی ہمارے پاس آیا وہ بہت پیئے ہوئے تھا اسی وجہ سے وہ قدرے مضمحل دکھائی دیتا تھا وہ ایک دم بیٹھ گیا اور ہنسنے لگا اور جب ہم نے اس سے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو بولا۔

"دو چھوکریاں لڈّی اور گیرٹی میرے لئے آپس میں لڑ پڑیں انہوں نے ایک دوسری کو خوب خوب گالیاں دیں! ہا ہا ہا! ایک نے دوسری کے بال پکڑ لئے اور چشم زدن میں دونوں دھڑام سے زمین پر گر پڑیں۔ کبھی لڈّی گیرٹی کے سینہ پر چڑھ بیٹھتی کبھی گیرٹی لڈّی کو چت کر دیتی۔ ہا ہا ہا! دونوں نے خوب ایک دوسرے کے منہ نوچے اور دونوں خوب زخمی ہوئیں اور میرا ہنسی کے مارے بُرا حال ہوگیا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ عورتیں آپس میں باقاعدہ کیوں نہیں لڑتیں وہ ہمیشہ نوچ گھسوٹ ہی کیوں کرتی ہیں؟ ہا ہا ہا؟

وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا بڑا پرامید اور صحت مند دکھائی دیتا تھا اور ہنسے جا رہا تھا۔ ہم خاموش تھے۔ اس وقت وہ ہمیں نہ جانے کیوں بُرا لگ رہا تھا۔

"نہیں، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ عورتوں کے معاملہ میں میں نے ایسی عجیب اور مہمل قسمت کیوں پائی ہے۔ اِدھر میں اشارہ کرتا ہوں اُدھر وہ رام ہو جاتی ہیں۔ یہ تو اچھی خاصی مصیبت ہے۔ اس کے سرخ سپید بازو فضا میں اُوپر اٹھے اور ایک زوردار چٹاخے کے ساتھ اس کے گھٹنوں پر جا گرے پھر وہ ہماری طرف بڑے اچنبھے کے ساتھ اس طرح متوجہ ہُوا جیسے عورتوں کے لطف کی فراوانی سے وہ رِیجھ گیا ہو۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ خوشی سے دمکتا رہا۔ اور وہ زور زور اپنے ہونٹ چاٹتا رہا۔

مستری نے بیلچہ کو تنور میں ڈال کر زور سے حرکت دی جیسے بڑے طیش میں ہو پھر وہ دفعتاً مسکرایا اور بولا صنوبر کے ننھے پودے کا اکھاڑ پھینکنا کوئی بڑی بات نہیں ہے ہاں جب نشوونما پا کر پورا درخت بن چکا ہو اس وقت کوئی اسے گرا دے تو بات ہے۔

فوجی نے پوچھا۔

کیا تمہارا اشارہ میری طرف ہے؟

ہاں تمہاری طرف ہے۔

تمہارا مطلب؟

کچھ نہیں کوئی خاص بات نہیں۔

نہیں نہیں مجھے سمجھاؤ کہ وہ صنوبر کے درخت والی بات کیا ہے؟

مستری نے کوئی جواب نہ دیا اور تنور سے بسکٹ نکالنے میں پھر مشغول ہوگیا جو بسکٹ تیار ہوتے رہے انہیں نکال نکال کر تنور سے فرش پر لڑکوں کے آگے ڈالتا رہا جو انہیں چٹائی پر قطار میں رکھتے جاتے اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ فوجی کو اور اپنے اور اس کے مکالمہ کو بھول چکا ہے۔ لیکن فوجی یکایک تیز ہوگیا وہ اُٹھا اور آتش دان کی طرف اس تیزی سے لپکا کہ بیلچہ کا دستہ اس کے سینے میں ٹکرا گیا۔

"ادھر آؤ اب کہو تمہارا کیا مطلب ہے"؟ تم نے میری توہین کی ہے مجھے کسی عورت کے آگے آج تک شکست نہیں اُٹھانی پڑی۔ اس پر بھی تم میری شان میں اس قسم کے ہتک آمیز فقرے استعمال کرتے ہو۔

وہ واقعی غضب ناک دکھائی دے رہا تھا۔ عورتوں کو جیتنے کی صلاحیت کے سوائے اسے اپنی ذات میں کوئی اور قابل ذکر وصف نظر ہی نہ آتا تھا۔

شاید اس کے علاوہ اس کی ذات میں زندگی کا کوئی اور جوہر تھا ہی نہیں۔ وہ محض اسی وصف کے سہارے خود کو زندوں میں شمار کرتا تھا۔

بعض لوگ اپنے کسی جسمانی یا نفسیاتی مرض کو عزیز ترین شے کی طرح زندگی بھر پالتے پوستے رہتے ہیں اور صرف اسی کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ گو وہ اس کی بدولت طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں تاہم یہ ان کے لئے ہوا اور پانی کی طرح ضروری ہوتی ہے وہ دوسرے لوگوں سے مختلف پیرایوں میں اس کا دکھڑا روتے ہیں اور اسی کے ذریعے خود کو اپنے ہم جنسوں کی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ وہ اُسے ہمدردی حاصل کرنے کا ایک آلہ قرار دے لیتے ہیں اس سے علٰحدہ ان کا وجود کچھ نہیں رہتا۔ اگر آپ ان کا علاج کر کے اس بیماری کو ان سے جدا کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ زندگی کی مسرت ہی سے محروم ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک جو اصل حیات تھی وہ آپ نے ان سے چھین لی۔ اس وقت وہ بالکل کھوکھلے دکھائی دینے لگیں گے بعض اوقات انسان کی زندگی اس حد تک مفلس و قلاش ہوتی ہے کہ وہ گناہ یا معصیت ہی کو گراں مایہ چیز سمجھ لیتا ہے۔ اور اسی کے سہارے زندہ رہتا ہے اسی طرح اکثر لوگ معمولی برائی کو اہمیت دے کر سنگین مجرم بن جاتے ہیں۔

فوجی کو بُری طرح غصہ آ رہا تھا۔ وہ مستری کی طرف لپکا اور گرج کر بولا صاف بات بتاؤ! کون ہے وہ؟

صاف صاف بتا دوں؟

ہاں ہاں بالکل!

"تم ٹانیا کو جانتے ہو؟"

"خوب اچھی طرح۔"

"تو پھر میدان میں آؤ اور اس کے لئے کوشش کرو"

"میں"

"ہاں تم"

"اونہہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔"

"آخر ہم بھی دیکھیں۔"

"تم دیکھ لوگے ہاہا!"

"وہ تمہاری منتظر ہے۔"

مجھے ایک مہینہ کی مہلت دو!

"یار تم کتنی شیخیاں مارتے تھے۔"

اچھا صرف پندرہ دن کی مہلت دے دو میں تمہیں دکھا دوں گا کہ اس بیچاری کی کیا ہستی ہے بڑی آئی ٹانیا اونہہ۔

"اچھا جاؤ منظور ہے۔"

پندرہ دن۔ اجی ہاں۔ صرف پندرہ دن! بس سمجھ لو کہ یہ کام ہو گیا۔"

"ہاں ہاں اب یہاں سے چلے جاؤ"

مستری کا مزاج ایک دم برہم ہو گیا اور اس نے تندور میں بیلچہ تیزی سے چلانا شروع کر دیا۔ فوجی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہوا دور ہٹ گیا اور ہم سے بھی کوئی بات نہ کی ذرا دیر بعد اس نے بڑی مہیب متانت کے ساتھ کہا۔ "بہت خوب" اور باہر چلا گیا۔

اس بحث کے دوران ہم سب خاموش رہے جب فوجی چلا گیا تو اچانک ہم سب بول اٹھے۔

"پال! تم نے بہت ہی اچھا مشغلہ چھیڑ دیا۔"

"جاؤ جاؤ کام پر بیٹھو،" مستری نے تنک کر جواب دیا۔

ہمیں محسوس ہوا کہ فوجی پوری طاقت سے اس مہم کو شروع کرے گا۔ اور ٹانیا خطرہ میں ہے۔ ہمارے ذہنوں پر ایک ناخوشگوار تجسس چھا گیا اب کیا ہوگا۔ کیا ٹانیا اس فوجی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکے گی؟ اور قریب قریب سب کے سب بیک زبان پکار اُٹھے۔

"معصوم ٹانیا' ضرور ثابت قدم رہے گی۔"

وہ بت جسے اپنی آرزوؤں کے صنم کدے میں ہم نے اتنی محنت و کاوش کے بعد تراش کر نصب کیا تھا۔ اب ہمارے دل میں اسے خود ہی ایک بڑی آزمائش میں ڈالنے کی خوفناک خواہش ابھر آئی تھی۔ ہم اسی مسئلہ پر دیر تک بحث کرتے اور ایک دوسرے پر بڑے جوش و خروش سے یہ ثابت کرتے رہے کہ ہمارا بت کسی طاقت سے ٹوٹنے والا نہیں اور اس مقابلہ میں ٹانیا ہی فتح مند ہوگی۔ چند روز بعد ہمیں یہ احساس ہوا کہ شاید فوجی اُس معرکہ اور اُس دن کے جھگڑے کو بھول ہی گیا ہے۔ اور ہمیں اس کی خود پسندی کو مہمیز کرنے کے لئے پھر کوئی قدم اُٹھانا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ اس مہم کو چلانے کے لئے کچھ کر رہا ہے۔ اس دن سے ہماری زندگی میں ایک خاص تناؤ اور کشمکش شروع ہو گئی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ اب ہم اس معاملہ پر بحث کیا کرتے اور بحث کرتے وقت اکثر لڑ پڑتے اس لئے کہ ہر شخص اپنے آپ کو زیادہ دانش مند سمجھتا تھا۔ ہم نے ایک شیطانی کھیل کی بنا ڈال دی تھی۔ اور ہماری امیدوں کا واحد سہارا ٹانیا تھی۔ اور جب ہم نے بیکری کے دوسرے ملازموں سے یہ سُنا کہ فوجی نے ٹانیا کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ تو ہمارے کرب و اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان دنوں ہمیں یہ بھی محسوس نہ ہو سکا کہ کارخانہ کا مالک چپکے چپکے ہمارے جوش و خروش سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے اور اس نے ہماری کارکردگی میں (۵۶۰ پونڈ) آٹے کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ قریب قریب ہم سارا وقت ہی کام میں جٹے رہتے اور ٹانیا کا نام ایک لمحہ کو بھی ہماری زبان سے جدا نہ ہوتا۔ اب ہم ہر روز ایک نئے اضطراب کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتے اس معرکہ کے متعلق جو بیکری کے ملازموں کے بیان کے مطابق شروع ہو چکا تھا ہم نے ٹانیا سے کبھی کوئی بات نہ کی اس سے کوئی سوال نہ پوچھا اور اسی طرح خلوص اور ملاطفت کے ساتھ پیش آتے رہے تاہم ان دنوں غیر محسوس طور پر ہم میں ایک نئی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ تھی ایک چبھتا ہوا تجسس، نشتر کی طرح تیز۔

"دوستو! آج وقت پورا ہو چکا" مستری نے ایک روز صبح کو اعلان کیا۔ اس کی یاد دہانی کے بغیر بھی ہمیں اس بات کا علم تھا، لیکن جب اس نے یہ اعلان کیا تو نہ جانے کیوں پھر بھی سب لرز اُٹھے۔

پھر مستری نے کہا۔ "وہ ابھی ابھی آتی ہوگی۔ آج ذرا غور سے اس کا جائزہ لینا۔"

پھر کوئی درد بھری آواز میں بولا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے آنکھیں ہر چیز کو دیکھ سکتی ہیں۔"

پھر ہمارے درمیان ایک ہنگامہ خیز مباحثہ شروع ہو گیا۔

آج سب یہ جاننے کے لئے بیتاب تھے کہ جس نہاں خانہ میں ہم نے اپنی متاعِ عقیدت کو رکھا تھا وہ کس حد تک محفوظ تھی اس روز بھی سب کو پہلے دن کی طرح یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم کوئی بڑا شیطانی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور ہماری مقدس محبت کا یہ امتحان اتنا کٹھن ہے کہ خود ہمارے ہاتھوں سے اس کے پارہ پارہ ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ گزشتہ چند روز میں ہم نے یہ سُنا تھا کہ فوجی ٹانیا کو اپنی طرف مائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ لیکن یہ کتنی عجیب بات تھی کہ ہم نے ٹانیا سے اس کے اور فوجی کے تعلقات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ہمارے پاس بسکٹوں کے لئے بدستور آتی رہی اور اس کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس روز بھی وہ تھوڑی دیر کے بعد حسبِ دستور مسکراتی اور چہکتی آ پہنچی۔ "قیدیو! میں آگئی ہوں" ہم اس سے ملنے کے لئے بڑی بے تابی سے آگے بڑھے اور جب

وہ اندر آ گئی تو خلاف معمول سب اسی کے چہرے پر نظریں جمائے بت بنے کھڑے تھے اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے کیا کہیں اور کیا پوچھیں۔ سب کے چہروں پر قنوطی افسردگی بن کر چھائی ہوئی تھی۔ اس خلاف معمول انداز استقبال پہ وہ حیران تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ دفعتاً اس کا رنگ فق ہو گیا ہے اور ذہنی کشمکش سے دوچار ہے۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"تم اپنی کہو! تمہارا کیا حشر ہے؟" مستری نے بڑے ملول لہجے میں ٹانیا سے پوچھا اور اس کی نگاہیں ٹانیا کے چہرے پر جمی رہیں۔

"میرا حشر! تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"اوہو۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں!"

"ادھر آؤ اور مجھے بسکٹ دو۔ جلدی کرو!"

اس سے پہلے ٹانیا نے ہم سے اتنی تیز گفتگو کبھی نہیں کی تھی۔

"اوہو، تمہیں بہت جلدی ہے۔" مستری نے کہا وہ اپنی جگہ کھڑا رہا اور اس کی نگاہیں ٹانیا کے چہرے سے نہ ہٹیں۔ پھر ٹانیا یکایک مڑی اور دروازے کی طرف لپک کر ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔

مستری نے اپنا بیلچہ اٹھا لیا اور بھٹی کی طرف چلتے ہوئے چپکے سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے ہی خود کو فوجی کے حوالے کر چکی ہے۔ آہ فوجی! لچّے، بدمعاش۔ ڈاکو۔"

ہم بھیڑوں کی طرح کندھے سے کندھا رگڑتے میز کی طرف بڑھے، خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اور تیزی سے اپنے کام میں لگ گئے۔

ذرا دیر بعد کسی نے کہا "کیا ایسا ممکن ہے؟"

مستری زور سے چلّایا۔ "ارے اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔"

ہم سب اسے اپنے سے کہیں زیادہ دانشمند سمجھتے تھے اس کے اظہار تأسف پر ہمیں کامل یقین ہو گیا کہ فوجی نے معرکہ جیت لیا ہے —— ہم پر ایک کرب ناک مایوسی چھا گئی۔

بارہ بجے جب کھانے کا وقت ہوا —— فوجی کارخانہ میں آیا وہ حسب معمول نہایت اجلے لباس میں ملبوس تھا اور اپنی عادت کے مطابق —— ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ لیکن ہم نے اس کی طرف دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔

میرے قابل قدر دوستو! اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنی فوجیانہ دلیری کا تھوڑا سا منظر دکھاؤں۔ اس نے فخر سے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔ تم لوگ ملحقہ مکان میں چلے آؤ۔ اور چوبی دیوار کی جھریوں میں سے تماشہ دیکھو۔ ہم ایک دوسرے کے ٹھوکے مارتے اس طرف کو باہر گئے اور تختوں کی دیوار کے شگافوں میں اپنی آنکھیں ٹانک دیں۔ اور صحن کا نظارہ دیکھنے لگے ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ٹانیا جلد جلد تیز تیز قدم اٹھاتی اور گھبرائی ہوئی آئی۔ کیچڑ اور برف سے ڈھکی ہوئی زمین پر اچھلتی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ویسی ہی تیزی اور پھرتی کے ساتھ اچھلتا اور سیٹی بجاتا ہوا فوجی نمودار ہوا اور اسی طرف چل دیا جدھر ٹانیا گئی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے ملاقات کی کوئی جگہ مقرر کر لی ہے۔ فوجی کے ہاتھ جیبوں میں دور تک گھُسے ہوئے تھے۔ اور اس کی مونچھیں اوپر نیچے پھڑک رہی تھیں۔ وہ بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر بارش شروع ہو گئی۔ ہم گیلی زمین پر پڑتی ہوئی بوندوں کو دیکھتے رہے اور بوندوں کی چوٹ سے زمین پر ننھے ننھے نشان بنتے رہے۔ سماں ابر کی وجہ سے سرمئی اور بھیگا ہوا تھا۔ نہایت اکتا دینے والا اور بوجھل موسم تھا۔ برف ابھی تک چھتوں پر پڑی تھی اور زمین پر کیچڑ کے سیاہ دھبے ہر طرف بکھرے تھے چھتوں کی برف بھی دھوئیں کی سیاہ کاجل سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بارش ایک مغموم آواز کے ساتھ مدھم ہو گئی۔ یہاں انتظار میں کھڑے کھڑے ہمیں بہت سردی اور بے آرامی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ہمارے دلوں میں ٹانیا کی طرف سے بہت غصہ بھرا ہوا تھا کہ اس نے ہمیں (اپنے پرستاروں) کو ایک نو وارد فوجی کی خاطر چھوڑ

دیا اور اب ہم ایک جلاد کی سی مہیب خوشی کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ ٹانیا واپس آ رہی ہے اس کی آنکھیں مسرت و شادمانی سے چمک رہی ہیں اور اس کے ہونٹوں پر تبسم کی شادابی بکھری ہوئی ہے وہ اس طرح جھوم جھوم کر چل رہی تھی جیسے عالم خواب میں ہو یا جیسے اس نے شراب پی لی ہو۔

اس صورت حال کو ہم خاموشی سے برداشت نہ کر سکتے تھے۔ سب کے سب غصہ اور حقارت سے عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے اچھل اچھل کر صحن میں آ گئے اور اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہمیں اس حالت میں دیکھ کر وہ گھبرائی اور ہم اسے ایک دم سڑی سڑی گالیاں دینے لگے معقولیت کا لفظ بھی ہمارے منہ سے نہ نکلا۔ کیونکہ ہمیں جو اضطراب تھا اس نے اتنی مہلت ہی نہ دی وہ ہمارے درمیان گھری ہوئی تھی ہمارے گھیرے سے نکل کر کہیں نہ جا سکتی تھی۔ ایسی حالت میں ہم اس پر جس طرح چاہتے غصہ اتار سکتے تھے۔ لیکن کسی نے اس پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ کیوں؟ اس کی وجہ میں نہیں بتا سکتا۔ وہ ہمارے درمیان کھڑی تھی اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اب ہماری زہر میں بجھی ہوئی گالیوں کی بوچھاڑ اور بھی تیز ہو چکی تھی اس کا رنگ فق ہو گیا اس کی نیلی آنکھیں جو ذرا دیر پہلے خوشی کی چمک سے روشن نظر آ رہی تھیں۔ پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کا سینہ زور زور حرکت کرنے لگا اور ہونٹ کپکپانے لگے۔

ہم لوگ اس کو گھیرے کھڑے تھے اور دشنام طرازی کے ذریعہ اپنے دلوں کا بخار نکال رہے تھے کیونکہ اس نے ہمیں دھوکہ دیکر لٹوا دیا تھا۔ وہ ہم سے وابستہ تھی۔ ہم نے اپنی بہترین پونجی اس پر نثار کی تھی اگرچہ یہ بہترین پونجی بھکاری کے روکھے سوکھے ٹکڑے ہی سہی۔

ہم چھبیس تھے اور وہ تنہا اس لئے ہم فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ اسے اس لغزش کی سزا کیا دی جائے۔ ہم نے اسے کیا نہیں کہا، لیکن وہ شروع سے آخر تک خاموش ہی رہی۔ شروع سے آخر تک وہ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح دیکھتی رہی جیسے شکار کا جانور وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ ہم نے اسے گالیاں دیں اس کا منہ چڑایا اور مذاق اڑایا اور لوگ بھی آ گئے اور تماشہ دیکھنے لگے۔ پھر ہمارے ایک ساتھی نے ٹانیا کی آستین پکڑ کر کھینچ لی۔

اس کی آنکھیں یکایک دمک اٹھیں۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ ہاتھ سر کی طرف اُٹھائے اور بالوں کو سنوار کر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا پھر بلند آواز سے لیکن پر سکون لہجے میں بولی۔

”توبہ۔ توبہ“ تم تو نرے پنجرے کے پنچھی ہو تم قابل رحم ہو۔

اور کسی جھجک کے بغیر وہ گھیرے میں سے سیدھی آگے بڑھتی چلی گئی جیسے ہم اس کے سامنے کھڑے ہی نہ تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ ہماری طرف بڑھی تو کوئی اس کا رستہ نہ روک سکا اور جب وہ آگے بڑھ رہی تھی تو اس نے بلند آواز میں بڑی تمکنت کے ساتھ کہا۔

”اُف تم لوگ بڑے رذیل ہو۔ گندے کمینے کہیں کے!“

وہ اسی طرح گردن لانبی کئے، سینہ تانے اپنی اس ہیئت کی تمام رعنائیوں کے ساتھ ہم سے دور ہوتی چلی گئی —— ہم کیچڑ اور بارش میں سورج سے محروم سیاہ آسمان کے نیچے کھڑے رہ گئے۔

کچھ دیر بعد ہم سب منہ لٹکائے اپنے سیاہ زمین دوز محبس میں واپس آ گئے۔ جہاں ہمیشہ کی طرح کھڑکی سے سورج نے کبھی اپنی کرنیں اندر نہیں بکھیریں۔ اور ٹانیا دوبارہ نہ آئی۔

چور

سعادت حسن منٹو

مجھے بے شمار لوگوں کا قرض ادا کرنا تھا اور یہ سب شراب نوشی کی بدولت تھا۔ رات کو جب میں سونے کے لئے چارپائی پر لیٹتا تو میرا ہر قرض خواہ میرے سرہانے موجود ہوتا ــــ کہتے ہیں کہ شرابی کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ میرے ضمیر کا معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ ہر روز مجھے سرزنش کرتا اور میں خفیف ہو کے رہ جاتا۔

واقعی میں نے بیسیوں آدمیوں سے قرض لیا تھا۔ میں نے ایک رات سونے سے پہلے، بلکہ یوں کہئے کہ سونے کی ناکام کوشش کرنے سے پہلے حساب لگایا تو قریب قریب ڈیڑھ ہزار روپے میرے ذمے نکلے ــ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا یہ ڈیڑھ ہزار روپے کیسے ادا ہوں گے۔ بیس پچیس روپے روزانہ کی آمدن ہے لیکن وہ میری شراب کے لئے بمشکل کافی ہوتے ہیں۔

آپ یوں سمجھئے نا کہ ہر روز کی ایک بوتل ــــ تھرڈ کلاس رم کی ــــ دام ملاحظہ ہوں ــ سولہ روپے ــ سولہ روپے تو ایک طرف رہے، ان کے حاصل کرنے میں کم از کم تین روپے ٹانگے پر صرف ہو جاتے تھے۔ کام ہوتا نہیں تھا، بس پیشگی پر گذارہ تھا لیکن جب پیشگی دینے والے تنگ آ گئے تو انہوں نے میری شکل دیکھتے ہی کوئی بہانہ تراش لیا یا اس سے پیشتر کہ میں ان سے ملوں کہیں غائب ہو گئے۔ آخر کب تک وہ مجھے پیشگی دیتے رہتے ــــ لیکن میں مایوس نہ ہوتا اور خدا پر بھروسہ رکھ کے کسی نہ کسی حیلے سے دس پندرہ روپے ادھار لینے میں کامیاب ہو جاتا۔

مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ لوگ میری عزت کرتے تھے مگر اب وہ میری شکل دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے ــــ سب کو افسوس تھا کہ اتنا اچھا میکینک تباہ ہو رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت اچھا میکینک تھا۔ مجھے کوئی بھی بگڑی مشین دے دی جاتی میں اس کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد یوں چٹکیوں میں ٹھیک کر دیتا لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری یہ ذہانت صرف شراب ملنے کی امید پر قائم تھی اس لئے کہ میں پہلے طے کر لیا کرتا تھا کہ اگر کام ٹھیک ہو گیا تو وہ مجھے اتنے روپے دیں گے جن سے میری دو روز کی شراب چل سکے۔

وہ لوگ خوش تھے۔ مجھے وہ تین چار روز کی شراب کے دام ادا کر دیتے، اس لئے کہ جو کام میں نے کیا تھا وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا تھا۔

لوگ مجھے لوٹ رہے تھے — میری ذہانت و ذکاوت پر میری اجازت سے ڈاکے ڈال رہے تھے — اور لطف یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ میں انہیں لوٹ رہا ہوں — ان کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہوں — اصل میں مجھے اپنی صلاحیتوں کی کوئی قدر نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ میکنزم بالکل ایسی ہے جیسے کھانا کھانا یا شراب پینا۔ میں نے جب بھی کوئی کام ہاتھ میں لیا مجھے کوفت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ جب شام کے چھ بجنے لگتے تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی کام مکمل ہو چکا ہوتا مگر میں ایک دو پیچ غائب کر دیتا تاکہ دوسرے روز بھی آمدن کا سلسلہ قائم رہے — یہ شراب حرامزادی کتنی بُری چیز ہے کہ آدمی کو بے ایمان بھی بنا دیتی ہے۔

میں قریب قریب ہر روز کام کرتا تھا۔ میری مانگ بہت زیادہ تھی اس لئے کہ مجھ ایسا کاریگر ملک بھر میں نایاب تھا — ستار باجا اور راگ بوجھا والا حساب تھا۔ میں مشین دیکھتے ہی سمجھ جاتا تھا کہ اس میں کیا قصور ہے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں۔ مشینری کتنی بھی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو اس کو ٹھیک کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگنا چاہیئے۔ لیکن اگر اس میں نئے پرزوں کی ضرورت ہو اور وہ آسانی سے دستیاب نہ ہو رہے ہوں تو اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

میں بلاناغہ شراب پیتا تھا اور سوتے وقت بلاناغہ اپنے قرض کے متعلق سوچتا تھا جو مجھے مختلف آدمیوں کو ادا کرنا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا، پینے کے باوجود اضطراب کے باعث مجھے نیند نہ آتی — دماغ میں سینکڑوں اسکیمیں آتی تھیں۔ بس میری یہ خواہش تھی کہ کہیں سے دس ہزار روپے آ جائیں تو میری جان میں جان آئے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ قرض کا فی الفور ادا کر دوں۔ ایک ٹیکسی لوں اور ہر قرض خواہ کے پاس جا کر معذرت طلب کروں اور جیب سے روپے نکال کر ان کو دے دوں۔ جو روپے باقی بچیں ان سے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خرید لوں اور شراب پینا چھوڑ دوں۔

پھر یہ خیال آتا کہ نہیں، دس ہزار سے کام نہیں چلے گا۔ کم از کم پچاس ہزار ہونے چاہئیں — میں سوچنے لگتا کہ اگر اتنے روپے آ جائیں، جو یقیناً آنے چاہئیں تو سب سے پہلے میں ایک ہزار نادار لوگوں میں تقسیم کر دوں گا — ایسے لوگوں میں جو روپیہ لے کر کچھ کاروبار کر سکیں۔

باقی رہے انچاس ہزار — اس رقم میں سے میں نے دس ہزار اپنی بیوی کو دینے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ فکسڈ ڈپوزٹ ہونا چاہیئے — گیارہ ہزار ہو گئے، باقی رہے انتالیس ہزار — میرے لئے بہت کافی تھے۔ میں نے سوچا یہ میری زیادتی ہے چنانچہ میں نے بیوی کا حصہ دوگنا کر دیا، یعنی بیس ہزار۔ اب بچے انتیس ہزار — میں نے سوچا کہ پندرہ ہزار اپنی بیوہ بہن کو دے دوں۔ اب میرے پاس چودہ ہزار رہے۔ ان میں سے آپ سمجھئے کہ دو ہزار قرض کے نکل گئے۔ باقی بچے بارہ ہزار — ایک ہزار روپے کی اچھی شراب آنی چاہیئے — لیکن میں نے فوراً تھو کر دیا اور یہ سوچا کہ پہاڑ پر چلا جاؤں گا اور وہاں کم از کم چھ مہینے رہوں گا تاکہ صحت درست ہو جائے۔ شراب کے بجائے دودھ پیا کروں گا۔

بس ایسے ہی خیالات میں دن رات گزر رہے تھے — پچاس ہزار کہاں سے آئیں گے، یہ مجھے معلوم نہیں تھا — ویسے دو تین اسکیمیں ذہن میں تھیں۔ شمع دہلی کے معمے حل کروں اور پہلا انعام حاصل کر لوں — ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ خرید لوں — چوری کروں اور بڑی صفائی سے —

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہیئے۔ بہرحال یہ طے تھا کہ مجھے پچاس ہزار روپے حاصل کرنا ہیں — یوں ملیں یا ووں ملیں۔ اسکیمیں سوچ سوچ کر میرا دماغ چکرا گیا — رات کو نیند نہیں آتی تھی، جو بہت بڑا عذاب تھا۔ قرض خواہ بے چارے تقاضا نہیں کرتے تھے لیکن جب میں ان کی شکل دیکھتا تھا تو ندامت کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا — بعض اوقات تو میرا سانس رُکنے لگتا اور میرا جی چاہتا کہ خودکشی کر لوں اور اس عذاب سے نجات پاؤں۔

مجھے معلوم نہیں، کیسے اور کب میں نے تہیہ کر لیا کہ چوری کروں گا — مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ محلے میں ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کے پاس بے اندازہ دولت ہے — اکیلی رہتی ہے — میں وہاں رات کے دو بجے پہنچا۔ یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دوسری منزل پر رہتی ہے — نیچے پٹھان کا پہرہ تھا، میں نے سوچا کوئی اور ترکیب سوچنی چاہیئے اوپر جانے کے لئے — میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے خود کو اس پارسی لیڈی

کے فلیٹ کے اندر پایا — میرا خیال ہے کہ میں پائپ کے ذریعے سے اوپر چڑھ گیا تھا — ٹارچ میرے پاس تھی — اس کی روشنی میں میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بہت بڑا سیف تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی سیف کھولا تھا نہ بند کیا تھا لیکن اس وقت جانے مجھے کہاں سے ہدایت ملی کہ میں نے ایک معمولی تار سے اسے کھول ڈالا۔ اندر زیور ہی زیور تھے۔ بہت بیش قیمت — میں نے سب سمیٹے اور ٹکّے مار دینے والے زرد رومال میں باندھ لئے — کوئی پچاس ساٹھ ہزار روپے کا مال ہوگا — میں نے کہا ٹھیک ہے بس اتنا ہی چاہئے تھا — کہ اچانک دوسرے کمرے سے ایک بڑھیا پارسی عورت نمودار ہوئی — اس کا چہرہ جھرّیوں سے بھرا ہوا تھا — مجھے دیکھ کر پوپلی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے — میں نے اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال کر تان دیا — اس کی پوپلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ اس نے مجھ سے بڑے پیار سے پوچھا۔

"آپ یہاں کیسے آئے؟"

میں نے سیدھا سا جواب دیا۔" چوری کرنے۔"

"اوہ!" بڑھیا کے چہرے کی جھرّیاں مسکرانے لگیں۔" تو بیٹھو — میرے گھر میں تو نقدی کی صورت میں صرف ڈیڑھ روپیہ ہے — تم نے زیور چرایا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم پکڑے جاؤ گے کیونکہ ان زیوروں کو صرف کوئی بڑا جوہری ہی لے سکتا ہے — اور ہر بڑا جوہری انہیں پہچانتا ہے —"

یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی — میں بہت پریشان کہ یا الٰہی یہ سلسلہ کیا ہے۔ میں نے چوری کی ہے اور بڑی بی مسکرا مسکرا کر مجھ سے باتیں کر رہی ہیں — کیوں؟

لیکن فوراً اس کیوں کا مطلب سمجھ میں آگیا جب ماناجی نے آگے بڑھ کر میرے پستول کی پروا نہ کرتے ہوئے میرے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا اور اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں — اس وقت خدا کی قسم میرا جی چاہا کہ زیوروں کی گٹھڑی ایک طرف پھینکوں اور وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر وہ تسمہ پا عورت نکلی۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں مطلقاً ہل جل نہ سکا — اصل میں میرے ہر رگ و ریشے میں ایک عجیب و غریب قسم کا خوف سرایت کر گیا تھا۔ میں اسے ڈائن سمجھنے لگا تھا جو میرا کلیجہ نکال کر کھانا چاہتی تھی۔

میری زندگی میں کسی عورت کا دخل نہیں تھا۔ میں غیر شادی شدہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے تیس برسوں میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر پہلی رات جب کہ میں چوری کرنے کے لئے نکلا تو مجھے یہ پھاپھا کٹنی مل گئی جس نے مجھ سے عشق کرنا شروع کر دیا — آپ کی جان کی قسم میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ وہ بہت ہی کریہہ المنظر تھی۔ میں نے اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔" ماناجی مجھے بخشو — یہ پڑے ہیں آپ کے زیور — مجھے اجازت دیجئے۔"

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔" تم نہیں جا سکتے — تمہارا پستول میرے پاس ہے — اگر تم نے ذرا سی جنبش بھی کی تو میں ٹز کر دوں گی — یا ٹیلیفون کر کے پولیس کو اطلاع دے دوں گی کہ وہ آکر تمہیں گرفتار کر لیں — لیکن جانِ من میں ایسا نہیں کروں گی — مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے — میں ابھی تک کنواری ہوں — میرا خیال ہے کہ شاید میں اس عمر تک صرف تمہارے لئے کنواری رہی ہوں — اب تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

یہ سن کر میں قریب تھا کہ بیہوش ہو جاؤں کہ ٹن ٹن شروع ہوئی۔ دور کوئی کلاک صبح کے پانچ بجنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ میں نے بڑی بی کی ٹھوڑی پکڑی اور اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ لے کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔" میں نے اپنی زندگی میں سیکڑوں عورتیں دیکھی ہیں لیکن خدا واحد شاہد ہے کہ تم ایسی عورت سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ تم کسی بھی مرد کیلئے نعمتِ غیر مترقبہ ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی پہلی چوری تمہارے مکان سے شروع کی۔ یہ زیور پڑے ہیں۔ میں کل آؤنگا بشرطیکہ تم وعدہ کرو کہ مکان میں اور کوئی نہیں ہوگا۔"

بڑھیا یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔" ضرور آؤ — تم اگر چاہو گے تو گھر میں ایک مچھر تک بھی نہیں ہوگا جو تمہارے کانوں کو تکلیف دے — مجھے افسوس ہے کہ گھر میں صرف ایک روپیہ اور آٹھ آنے تھے — لیکن تم کل آؤ گے تو میں تمہارے لئے بیس پچیس ہزار بنک سے نکلوا لوں گی — یہ لو اپنا پستول۔"

میں نے اپنا پستول لیا اور وہاں سے دم دبا کر بھاگا — پہلا وار خالی گیا تھا — میں نے سوچا کہیں اور کوشش کرنی چاہئے۔ فرض ادا کرنے ہیں اور جو میں نے پلان بنایا ہے اس کی تکمیل بھی ہونا چاہئے۔

چنانچہ میں نے ایک جگہ اور [illegible] سب گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں

— مجھے ایک مکان کا پتہ تھا کہ اس کا جو مالک ہے بڑا مالدار ہے — بہت کنجوس ہے۔ اپنا روپیہ بینک میں نہیں رکھتا۔ گھر میں رکھتا ہے۔ میں نے سوچا اس کے ہاں چلنا چاہیئے۔

میں وہاں پہنچ گیا۔ کن مشکلوں سے اندر داخل ہوا؟ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال پہنچ گیا۔ صاحبِ خانہ جو ماشاءاللہ جوان تھے، سو رہے تھے۔ میں نے ان کے سرہانے سے چابیاں نکالیں اور الماریاں کھولنا شروع کر دیں۔

ایک الماری میں کاغذات تھے اور کچھ فرنچ لیدر۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص جو کنوارا ہے فرنچ لیدر کہاں استعمال کرتا ہے — دوسری الماری میں کپڑے تھے۔ تیسری بالکل خالی تھی، معلوم نہیں اس میں تالا کیوں پڑا ہوا تھا۔

اور کوئی الماری نہیں تھی۔ میں نے تمام مکان کی تلاشی لی، لیکن مجھے ایک پیسہ بھی نظر نہ آیا — میں نے سوچا، اس شخص نے ضرور اپنی دولت کہیں دبا کے رکھی ہو گی — چنانچہ میں نے اس کے سینے پر بھرا ہوا پستول رکھ کر اسے جگایا۔

وہ ایسا چونکا اور بدکا کہ میرا پستول فرش پر جا پڑا۔ میں نے ایک دم پستول اٹھایا اور اس سے کہا ”میں چور ہوں — یہاں چوری کرنے آیا ہوں — لیکن تمہاری تینوں الماریوں سے مجھے ایک دمڑی بھی نہیں ملی — حالانکہ میں نے سنا تھا کہ تم بڑے مالدار آدمی ہو۔“

وہ شخص جس کا نام مجھے اب یاد نہیں، مسکرایا۔ انگڑائی لے کر اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا ”یار، تم چور ہو تو تم نے مجھے پہلے اطلاع دی ہوتی — مجھے چوروں سے بہت پیار ہے — یہاں جو بھی آتا ہے وہ خود کو بڑا شریف آدمی کہتا ہے، حالانکہ وہ اوّل درجے کا کالا چور ہوتا ہے — مگر تم چور ہو — تم نے اپنے آپ کو چھپایا نہیں ہے — میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد ریفریجیٹر کھولا۔ میں سمجھا کہ شاید میری تواضع شربت وغیرہ سے کرے گا۔ لیکن اس نے مجھے بلایا اور کھلے ہوئے ریفریجیٹر کے پاس لے جا کر کہا ”دوست میں اپنا سارا روپیہ اس میں رکھتا ہوں — یہ صندوقچی دیکھتے ہو — اس میں قریب قریب ایک لاکھ روپیہ پڑا ہے — تمہیں کتنا چاہیئے؟“

اس نے صندوقچی باہر نکالی جو یخ بستہ تھی۔ اسے کھولا۔ اندر سبز رنگ کے نوٹوں کی گڈیاں چنی تھیں، ایک گڈی نکال کر اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا ”بس اتنے کافی ہوں گے — دس ہزار ہیں۔“

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں تو چوری کرنے آیا تھا — میں نے گڈی اس کو واپس دی اور کہا ”صاحب! مجھے کچھ نہیں چاہیئے — مجھے معافی دیجیئے — پھر کبھی حاضر ہوں گا۔“

میں وہاں سے، آپ سمجھیئے کہ دم دبا کر بھاگا، گھر پہنچا تو سورج نکل چکا تھا — میں نے سوچا کہ چوری کا ارادہ ترک کر دینا چاہیئے — دو جگہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا — دوسری رات کو کوشش کرتا تو کامیابی یقینی نہیں تھی — لیکن قرض بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا جو مجھے بہت تنگ کر رہا تھا — حلق میں یوں سمجھیئے کہ ایک پھانس سی اٹک گئی تھی — میں نے بالآخر یہ ارادہ کر لیا کہ جب اچھی طرح سو چکوں گا تو اٹھ کر خودکشی کر لوں گا۔

سو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی — میں اٹھا — دروازہ کھولا — ایک بزرگ آدمی کھڑے تھے۔ میں نے ان کو آداب عرض کیا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا ”یہ لفافہ دینا تھا اس لئے آپ کو تکلیف دی — معاف فرمایئے گا، آپ سو رہے تھے۔“

میں نے ان سے لفافہ لیا۔ وہ سلام کر کے چلے گئے — میں نے دروازہ بند کیا — لفافہ کافی وزنی تھا — میں نے اسے کھولا اور دیکھا کہ سو سو روپے کے بے شمار نوٹ ہیں۔ گنے تو پچاس ہزار نکلے — ایک مختصر سا رقعہ تھا، جس میں لکھا تھا کہ آپ کے یہ روپے مجھے بہت دیر سے ادا کرنے تھے — افسوس ہے کہ میں اب ادا کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

میں نے بہت غور کیا کہ یہ صاحب کون ہو سکتے ہیں جنہوں نے مجھ سے قرض لیا ——— سوچتے سوچتے میں نے آخر سوچا کہ ہو سکتا ہے کسی نے مجھ سے قرض لیا ہو جو مجھے یاد نہ رہا ہو۔

لفافہ تکیے کے نیچے رکھ کر میں نے سارا حساب کر لیا۔

بیس ہزار اپنی بیوی کو ——— پندرہ ہزار روپے اپنی بیوہ بہن کو ——— دو ہزار قرض کے ——— باقی بچے بارہ ہزار ——— ایک ہزار میں نے اچھی شراب کے لئے رکھ لئے ——— پہاڑ پر جانے اور دودھ پینے کا خیال میں نے چھوڑ دیا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی ——— اٹھ کر باہر گیا۔ دروازہ کھولا تو میرا ایک قرض خواہ کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پانچ سو روپے لینا تھے ——— میں لپک کر اندر گیا ——— تکیے کے نیچے، نوٹوں کا لفافہ دیکھا مگر وہاں کچھ موجود ہی نہیں تھا۔

صاحب

آپ کی کتاب "صاحب" ملی۔ اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آج تک کسی کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھا ہو۔ اس کتاب کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ اُسے کوئی صاحب چُرا کر ہی لے گئے۔ یوں تو مجھے سارے ہی مضمون پسند آئے۔ مگر احسان دانش والا مضمون سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس انداز کے اور اتنے کامیاب مضمون اور کسی نے نہیں لکھے۔ آپ اور ادیبوں پر بھی لکھیں۔ آپ نے جن پر لکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر کو خود بھی جانتی تھی۔ آپ کی کتاب پڑھ کر یوں محسوس ہوا، جیسے نہیں جانتی تھی۔ آپ نے کسی خاتون پر مضمون نہیں لکھا۔ یہ زیادتی کیوں ؟

"عصمت چغتائی"

۲۰۹ ی،
سندھ مُسلم ہاؤسِنگ سوسائٹی،
کراچی۔
۶ ۱/۵۶

حضرت، آپ کراچی تشریف لائے، اور میرے وُجود کی نفی کر کے، مُجھ سے مِلنے تک نہیں آئے۔

آپ جب دہلی آتے تھے، تو ایک خورد کی حیثیت سے، میرے پاس ہمیشہ آتے تھے، لیکن اب، چوں کہ میں پاکستانی ہو چکا ہوں، اِس بناء پر، آپ کی نظروں میں، اپنی توقیر کھو چکا ہوں۔

آپ اپنے ذی قدر پرچے میں ایسے شخص کا کلام شائع فرما کر رُسوائی کیوں مول لیں، جس سے اِسلامی دُنیا مُنھ پھیر چکی ہے۔

جاؤ، بالیں سے ہٹو بھی، موت کو آنے تو دو
چین سے جینے نہیں دیتے ہو، مر جانے تو دو!

جوش

جگر مرادآبادی

اک یہی حُسن یقیں تسکینِ جان و دل سہی
مجھ سے وہ غافل نہیں ہے اُس سے میں غافل سہی

پھر بھی آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اک سراپا ناز کو
زندگی میں ہر تجلّی حُسن کی شامل سہی

پھر بھی کِتنی دل نشیں ہے، پھر بھی کِتنی دل فزا
حُسن کی ایک ایک ادا ظالم سہی قاتل سہی

جو بھی مِل جائے محبّت میں وہی انعامِ دوست
لطفِ محرومی سہی، کیفِ شکستِ دل سہی

عشق ہی کی فطرتِ سرکش کا لیکن کیا جواب
ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی، منزل سہی

کس کو ملتی ہے جگرؔ یہ دولتِ بیدادِ دوست
لاکھ جامِ جم کے بدلے ایک ٹوٹا دل سہی

سیماب اکبرآبادی

(۴۵ء کی ایک غیر مطبوعہ غزل)

جو درپردہ اُنھیں جلوہ نمائی کی نہ خُو ہوتی
میں سچ کہتا ہوں دنیا آرزو ہی آرزو ہوتی

متاعِ ضبط وقتِ واپسیں کی رائگاں میں نے
نگاہِ حسن میں ایک اشک کی کیا آبرو ہوتی

مسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تجھے منزل
اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جستجو ہوتی

حدیثِ طور و موسیٰ اور وہ بھی چار لفظوں میں
ہوئی تھی گفتگو اُن سے تو کھل کر گفتگو ہوتی

غلط ہے عشق پر الزام آوارہ نگاہی کا
جو ہوتا حسن یک سو، تو نظر کیوں چار سُو ہوتی

دل اک قطرہ تھا۔ ژولیدہ، چکیدہ سیلِ غم دیدہ
ذرا سی بُوند پھر کیا اشک بنتی کیا لہو ہوتی

میں برقِ حسن کو روکے ہوئے ہوں دل پہ اے دُنیا
اگر یہ کوند کر گرتی تو مَیں ہوتا نہ تُو ہوتی

وہ ذوق و شوقِ موسیٰ اور وہ اک کم سے کم جلوہ!
جزائے آرزو یارب، بقدرِ آرزو ہوتی

دل اے سیماب خالی آرزو سے رہ نہ سکتا تھا

نہ ہوتی آرزو، تو آرزو کی آرزو ہوتی

عابد علی عابد

یہی تھا وقت تری محفلِ طرب کے لئے
چراغِ دل کہ سلگتا ہے آج سب کے لئے

کبھی میں جرأتِ اظہارِ مدعا تو کروں
کوئی جواز تو ہو لطفِ بے سبب کے لئے

افق سے چاند کی چمپا کلی ابھرتی ہے
سجائے جاتے ہیں زیور نگارِ شب کے لئے

ترے گدا نے بھی ساغر کا نقرئی آنچل
کہیں سے مانگ لیا دخترِ عنب کے لئے

تمام عمر بہ فیضِ نگاہ لالہ رخاں
سند رہا ہوں اشاراتِ چشم و لب کے لئے

چمن سے پھول کے دھوکے میں چن لئے شعلے
کفِ وفا کے لئے دامنِ طلب کے لئے

کہیں جو پرسشِ احوال پر وہ مائل ہوں!
کہ ہم نے دل کو سنبھالا ہوا ہے جب کے لئے

مجھے خبر ہے بہت ہے متاعِ ذوقِ نظر
دکانِ کاکل و رخسار و چشم و لب کے لئے

ستارہ صبح کا روشن تھا شام سے عابد
یہی تھی موت حریفانِ بزمِ شب کے لئے

تین نامکمّل غزلیں

احمد ندیم قاسمی

ہاتھ میں آتے ہی گُل کچھ اس طرح کملائے ہیں
ہم نے جتنے دھوکے کھائے ہیں وہ سب یاد آئے ہیں

کتنی امّیدوں کی شمعوں میں گھری ہے زندگی
جتنی روشن ہیں لویں، اتنے ہی گہرے سائے ہیں

میری یادوں کے افق پر آپ کے وعدوں کے چاند
اس قدر چمکے نہیں ہیں جس قدر گہنائے ہیں

دھوپ نکلے گی تو کلیاں بھی چٹک لیں گی ندیمؔ
کٹ چکی ہے شب مگر مشرق پہ بادل چھائے ہیں

* * *

دیدنی ہے شبِ فراق کا حُسن
موت آئی تو ہم بھی سو لیں گے

جبر پر اتنا اختیار تو ہے
کچھ نہ بن آئے گی تو رو لیں گے

بادل اُمڈے ہیں۔ آگ برسے گی
باغ مہکے ہیں۔ زاغ بولیں گے

زندگی راز ہو تو چُپ بھی رہیں
جب بھرم کُھل چکا، تو بولیں گے

* * *

شب نے جب بھیگ کے لی انگڑائی
پَو اجالے کا سندیسہ لائی

صبح تیری ہے تو اے خالقِ صبح
رات ہے کس کی کرم فرمائی

اک سفینہ ہے تری یاد اگر
اک سمندر ہے مری تنہائی

سراج لکھنوی

فطرتِ عشق گنہگار ہوئی جاتی ہے
فکرِ دنیا بھی غمِ یار ہوئی جاتی ہے

کتنا نازک ہے خدا رکھے محبّت کا مزاج
اب تسلّی بھی دلآزار ہوئی جاتی ہے

جب سے چھینی ہے تری یاد نے نیند آنکھوں کی
دل کی جو حس ہے وہ بیدار ہوئی جاتی ہے

آہ پابندیٔ آدابِ محبت توبہ!
ٹھنڈی ہر سانس گناہگار ہوئی جاتی ہے

چھُو لیا عرش کو منصور کی انگڑائی نے
صاف گوئی رسن و دار ہوئی جاتی ہے

ہر تجلّی ہے تیرے سامنے شرمندہ سی
چاندنی سایۂ دیوار ہوئی جاتی ہے

شکریہ شوخیٔ حسُنِ پسِ پردہ کا سراج
آنکھ بے دیکھے گناہگار ہوئی جاتی ہے

آنند نرائن مُلّا

کتنی کرنیں جو افقِ پُر نور کا بُنتی تھیں جال
اِک ذرا اُبھریں افق سے اور گھٹائیں ہو گئیں

عقل کے مینار بابل میں انھیں سنتا ہے کون
دل کی تانیں آج صحرا کی صدائیں ہو گئیں

اچھے اچھوں کی نہیں چلتی ہے پیشِ حُسن کچھ
تم تو انساں تھے فرشتوں سے خطائیں ہو گئیں

زندگی کی جہد میں ہارا بھی دل جیتا بھی دل
کچھ خطائیں ہو نہ پائیں کچھ خطائیں ہو گئیں

یہ عوامی دور ہے مُلّاؔ وہی بینا ہے آج
جس کے حق میں کچھ سوا اندھوں کی راہیں ہو گئیں

جذبی

چمن میں آؤ ذرا سیرِ نوبہار کریں
گلوں کی طرح جگر چاک دل فگار کریں

کہیں عذابِ جفا ہے کہیں نشاطِ وفا
یہیں کہیں سے تماشائے روزگار کریں

رہا نہ اپنا گریباں ہی جب تو دیوانے
تمھارا دامنِ رنگیں نہ تار تار کریں

ستم نصیبوں کا پیغام صرف اِتنا ہے
ہماری رسمِ وفا آپ اختیار کریں

کھُلی زبان نہ یوں بزمِ نامراداں میں
کہ سوگواروں کو کیا اور سوگوار کریں

وہ مبتلائے شبِ غم ہیں حضرتِ جذبیؔ
سحر سے دُور سحر کا جو انتظار کریں

سہاروں کی تلاش

اختر انصاری

اب گِرا ہی چاہتا ہوں بے سہارا ہو کے میں
اے فریبِ سوز و دردِ آرزو! لینا مجھے

ریگ زارِ تشنگی کی نذر ہو جانے کو ہوں
اَے سرابِ رنگ و نور و کیف و بو! لینا مجھے

اک سکوتِ مرگ طاری ہو رہا ہے روح پر
اے طلسمِ نائے و نوش و ہاؤ ہُو! لینا مجھے

ڈھل رہا ہے نشّۂ ذوقِ طرب تیزی کے ساتھ
اے ہوائے بادہ و جام و سبُو! لینا مجھے

دل کشاکش سے تہی، خالی ہے کاوش سے جگر
اے فسونِ سعیٔ و جہد و جستجو! لینا مجھے

نقشِ خاکِ رہگذر بننے کو ہے میرا وجود
اے جنونِ جست و خیزِ کُو بکو! لینا مجھے

چھُٹ رہا ہے ہاتھ سے سر رشتۂ توقیرِ زیست
اے سرِ ناموس و زعمِ آبرو! لینا مجھے

ہے عجب اک ہولناک افتادگی کا سامنا
تھامنا، فکر و تخیّل کے سہارو! تھامنا

عدم

جہاں بھی اُس مہ جبیں کے عہدِ شباب کی بات ہو رہی تھی
وہیں ہمارے دلِ تباہ و خراب کی بات ہو رہی تھی

چلے گئے بزمِ حشر میں ہم، تو صرف اتنی سی بات سُن کر
سُنا تھا اُس انجمن کے اندر جناب کی بات ہو رہی تھی

میں کس طرح مان لوُں کہ سرکار مائلِ اختلاط ہیں اب
ابھی ابھی تو جنابِ من اجتناب کی بات ہو رہی تھی

ہے بات میرے اور اُن کے دو دن کے پیار کی کچھ تو صرف اتنی
کہ خواب میں دو دِلوں کے مابین خواب کی بات ہو رہی تھی

نظر مِلا کے حضوُر نے کیوں نظر ہٹانے کا حشر ڈھایا!
بہار کا ذکر چھڑ رہا تھا، شراب کی بات ہو رہی تھی

میں مسکرا کے عدم قیامت کی بزمِ دانش سے لوٹ آیا
وہاں بھی دیکھا تو خیر سے، احتساب کی بات ہو رہی تھی

بڑی صدا

عدم

تمام اقوالِ مصلحت ہیں، ضرورتِ وقت رُو نما ہے۔

ضرورتِ وقت روشنی ہے، ضرورتِ وقت ارتقا ہے

سیاستوں کے بلند محلوں میں شور جس صدق کا بپا ہے

وہ مختلف نظریوں کی غارت گری کا اک جشنِ دلربا ہے

مگر یہ انسان جانتا ہے ضمیر سب سے بڑی صدا ہے

ضمیر اِک عکسِ بُزدلی ہے، یہ قول بھی سربسر بجا ہے

ضمیر اِک مرقدِ کہن ہے، یہ عرصۂ نو کا فیصلا ہے!

نشیب ہو یا فراز، سارا نظام اک وہم خوشنما ہے

نہ کوئی پستی کی ماہیت ہے، نہ کچھ بلندی کا مدّعا ہے

مگر یہ انسان جانتا ہے ضمیر سب سے بڑی صدا ہے

سُنا ہے مایا کا رُوپ اس خاکداں کی سب سے بڑی ضیا ہے

کوئی یہ کہتا ہے ترکِ دُنیا، وسیلۂ رحمتِ خدا ہے

کوئی یہ کہتا ہے یہ غلط ہے، کوئی یہ کہتا ہے وہ بجا ہے

قیاس کی الجھنوں کی گرچہ نہ ابتدا ہے۔ نہ اِنتہا ہے

مگر یہ انسان جانتا ہے ضمیر سب سے بڑی صدا ہے

فضل احمد کریم فضلی

تعمیرِ نو قضا و قدر کی نظر میں ہے
آج ایک زلزلہ سا ہر اک بام و در میں ہے
کتنے چراغ امید کے جل جل کے بجھ گئے
کیا جانے کتنی دیر طلوعِ سحر میں ہے
ہر اک ہے سوئے منزلِ جاناں رواں دواں
ہر ذرّہ کائنات کا پیہم سفر میں ہے
گم کردہ راہ ہو کے بھی ان سے ہوئے نہ دور
گم گشتگی بھی ہے تو اسی رہگذر میں ہے
آئی کہاں سے دیر و حرم میں یہ روشنی
میری جبیں کا نور مرے سنگِ در میں ہے
گذری روش روش میں جلاتی ہوئی چراغ
شانِ خرام یار نسیمِ سحر میں ہے
تم جو نہیں تو گھر میں وہ اب بات ہی نہیں
دیوار و در کی بات تو دیوار و در میں ہے
دل بھی دھڑک رہا ہے، نگاہیں بھی در پہ ہیں
اک خاص لطف وعدۂ نامعتبر میں ہے
ڈر ہے کہیں مجھی کو یہ پہلے ڈبو نہ دے
طوفانِ التجا جو مری چشمِ تر میں ہے
ساحل تک آئی موج یہ کہہ کر پلٹ گئی
جینے کا لطف زندگیٔ پُرخطر میں ہے
خنجر بکف ہے یہ تو وہ خنجر در آستیں
اتنا سا فرق راہزن و راہبر میں ہے
آئی جگر فگار حوادث کے فیض سے
شوخی جو ان دنوں مرے خونِ جگر میں ہے
اہلِ ہنر کے دل میں دھڑکتے ہیں سب کے دل
“سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے”
افشائے رازِ دل تو بڑا عیب ہے مگر
ہو گر ادب کے ساتھ تو داخل ہنر میں ہے
آنکھوں میں بے ہنر کی کھٹکتا ہے بن کے عیب
یہ اک عجیب بات کمالِ ہنر میں ہے

ہوتا ہے بزمِ غیر میں بھی اب جو ذکرِ خیر،
کوئی تو بات فضلیؔ آشفتہ سر میں ہے

عرشی رامپوری

ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا
نہیں جب ہوش میں ہم، جلوہ فرمانے سے کیا ہوگا

جنوں کے ساتھ تھوڑی سی فضائے لامکاں بھی دے
مری وحشت کو اس دنیا کے ویرانے کیا ہوگا

ہے مرجانا کلیدِ فتح، سمجھایا تھا رندوں نے
مگر ناصح یہ کہتا ہے کہ مرجانے سے کیا ہوگا

زہے قسمت، اگر حضرت خود اپنا جائزہ بھی لیں
ہماری زندگی پہ تیر برسانے سے کیا ہوگا

اگر ہمدرد بنتے ہو، تو زنجیریں ذرا کھولو
مری پابستگی پر یونہی غم کھانے سے کیا ہوگا

درِ پیرِ مغاں چھوڑیں، یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
کوئی واعظ سے کہہ دو، تیرے بہکانے سے کیا ہوگا

جسے دیکھو، وہ ہے سرمستِ صہبائے خرد یکسر
خداوندا! یہاں اک تیرے دیوانے سے کیا ہوگا

نہیں قلب و جگر میں خون کا قطرہ کوئی باقی
عزیزو، اب ہمارے ہوش میں آنے سے کیا ہوگا

دکھوں کو کھو نہیں سکتے اگر اہلِ خرد، عرشیؔ
تو خالی سینۂ افلاک برمانے سے کیا ہوگا

شاد عارفی

ستمگر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں   غلط کہہ رہا ہوں، مگر کہہ رہا ہوں

بُتوں میں اُسے جلوہ گہ کہہ رہا ہوں   بڑی بات ہے، مختصر کہہ رہا ہوں

مجھے آج کانٹوں کے منہ چُومنے دو   بہاروں کا رُخ دیکھ کر کہہ رہا ہوں

یہ ماتھے پہ شکنیں یہ دانتوں میں آنچل   تو افسانۂ معتبر کہہ رہا ہوں

اُسی وقت آتی ہیں چہرے پہ زلفیں   اُنھیں جب میں نورِ سحر کہہ رہا ہوں

زمانہ کے منہ پہ زمانے کی باتیں   سمجھنے لگا ہوں اگر کہہ رہا ہوں

یہ دیوانگی ہے کہ حالاتِ حائل   وہ سُنتے نہیں ہیں مگر کہہ رہا ہوں

عتاب و تغافل ہی اچھے تھے مجھ کو   مآلِ کرم دیکھ کر کہہ رہا ہوں

بجھی شادؔ۔ شاعر کو کہتے ہیں جھوٹا
خزاں میں بھی میں شعرِ تر کہہ رہا ہوں

نوّاب اشک رامپوری

سرد مہری سے تری دل جو تپاں رکھتے ہیں
ہمہ تن برف ہیں آہوں میں دھواں رکھتے ہیں

سیلِ غم آنکھ کے پردے میں نہاں رکھتے ہیں
ناتواں بھی ترے کیا تاب و تواں رکھتے ہیں

فرشِ رہ کس کے لئے ہم دل و جاں رکھتے ہیں
خوبرو پاؤں زمیں پر ہی کہاں رکھتے ہیں

بات میں بات اُسی کی ہے سنو تم جس کی
یوں تو کہنے کو سبھی منہ میں زباں رکھتے ہیں

جب سے دشوار ہوا سانس کا آنا جانا
ہم نگاہوں میں جہانِ گذراں رکھتے ہیں

کس سے بے دردیٔ احباب کا شکوہ کیجے
نام بے تابیٔ دل کا خفقاں رکھتے ہیں

آنکھ کھولی ہے تو صیّاد کے گھر کھولی ہے
ہم قفس پر ہی نشیمن کا گماں رکھتے ہیں

پھول بھی منہ سے جھڑیں بات بھی کانٹے کی رہے
یہ ادا اور سخن ساز کہاں رکھتے ہیں

لوگ روتے بھی ہیں تو بت ہیں لپٹا کر اے اشک
اور سینے پہ بھی اک سنگِ گراں رکھتے ہیں

شورؔ علیگ

دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے　　ہم فریبِ زندگی میں آ گئے

جب ہجومِ شوق سے گھبرا گئے　　کھو گئے خود اور تم کو پا گئے

چین بھی لینے نہیں دیتے مجھے　　میں ابھی بھولا تھا پھر یاد آ گئے

میں کہاں جاؤں نظر کو کیا کروں　　آپ تو ساری فضا پہ چھا گئے

دل ہی دل میں اُف وہ دردِ ناگہاں　　آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھا گئے

رُخ سے آنچل بھی نہ سرکا تھا ابھی　　نیچی نظریں ہو گئیں شرما گئے

اُف یہ غنچوں کا تبسم یہ بہار　　حیف اگر یہ غنچے کل مُرجھا گئے

جس قدر غنچے کھلے تھے نو بہ نو　　میری آنکھوں سے لہو برسا گئے

پوچھتے کیا ہو ان اشکوں کا سبب　　واقعاتِ رفتہ پھر یاد آ گئے

اب تو شورؔ اپنا فسانہ ختم کر

اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

ابر و باد

شور علیگ

یہ بادلوں کا تنفّس یہ سرد سرد ہوا
یہ سنسناتی ہوائیں، یہ بولتے ہوئے ساز
کسے خبر تھی کہ تجھ کو پکارتے اے دوست
اِنہی فضاؤں میں کھو جائے گی مری آواز!

کسے خبر تھی کہ اس رنگ و بو کے طوفاں میں
گل و سمن کے سفینے بھی ڈوب جائیں گے
تھپک کے جن کو سلائے گی رات بھر شبنم
وہ غنچے صبح کی لو سے بھی کپکپائیں گے

تجھے بھی یاد ہے ان بدلیوں کے سائے میں
تری نگاہ سے ٹوٹے ہیں کتنے پیمانے
مگر یہ کون اُٹھا آج تیری محفل سے
سُلگ رہے ہیں چراغوں سے دور پروانے

سمجھ سکے تو سمجھ کتنی ظلمتوں کے حضور
کیا گیا ہے مہ و آفتاب سے انکار
لیا ہے کتنے بہشتوں سے انتقام نہ پوچھ
گلوں کے دام خریدے ہیں کتنے برق و شرار

کہا ہے کتنی نگاہوں نے "فی امان اللہ!"
ہوئے ہیں ساکت و مبہوت کتنے بام و در
اٹھے ہیں بہرِ دعا کتنے کانپتے ہوئے ہاتھ
کس اہتمام سے باندھا گیا ہے رختِ سفر

کراہتے رہے راہی پکارتے رہے خضر
ٹھہر سکا نہ مگر کاروانِ نجم و قمر
زمیں پہ آدم و حوّا کے خون کا ماتم
مگر افق کی جبیں پر وہی ہے نورِ سحر

کسے خبر مری غربت مجھے کہاں لے جائے
ترا دیار مرے راستے میں آئے نہ آئے
مری نگاہ میں رقصاں ہیں سینکڑوں طوفاں
مگر خدا نہ کرے کوئی موج تجھ کو جگائے

غموں کی دھوپ سے رکھّے تجھے خدا محفوظ
غبارِ وقت سے میلا ترا شباب نہ ہو
کسی ملال کی بے نجم و ماہ راتوں میں
غروب تیری جوانی کا آفتاب نہ ہو

رباعیات

قتیل شفائی

حالات کے ہر موڑ پہ مُڑ جاتے ہیں
پانی کی طرح ٹوٹ کے جُڑ جاتے ہیں
یہ وقت کے بندے یہ خیاباں زادے
شبنم کی طرح دھوپ میں اُڑ جاتے ہیں

نظارے نظر کو چھُو کے رُوپوش ہوئے
پنچھی بھی چہک چہک کے خاموش ہوئے
اُن لمحوں کا وقت کر رہا ہے ماتم
جو صبح کے لاشے سے ہم آغوش ہوئے

ظلمات کا عفریت جیئے یا نہ جیئے
کیوں موت کے بالیں پہ جلاتی ہے دیئے
اے رات سمیٹ لے ستارے اپنے
انسان ترس گیا ہے سورج کے لئے

یوں شاخِ نشیمن پہ نہ بجلی ٹوٹے
اس طرح شگوفوں کو نہ صرصر لوٹے
گلشن پہ جو سایہ فگن ہو جائیں
کانٹوں کے مسامات سے خوشبو پھوٹے

وا ہو گئی راہِ کامرانی شاید
ٹوٹا ہے طلسمِ حکمرانی شاید
اب لوح و قلم آ گئے انسان کے ہاتھ
قسمت کے بدل گئے معانی شاید

مخلص ہیں تو ہم خاک بسر اچھے ہیں
افلاس کے مارے ہیں مگر اچھے ہیں
جن محلوں میں سازشیں ہوں انساں کے خلاف
ان محلوں سے اجڑے ہوئے گھر اچھے ہیں

یاد

غلام ربانی تاباں

ظالم وہ تری پہلی نظر یاد رہے گی
میں بھولنا چاہوں بھی مگر یاد رہے گی
اک قاتل و معصوم ادا نقش ہے دل پر
اک سادہ و پرکار نظر یاد رہے گی
ہونٹوں سے چھلکتا ہوا نازک سا تبسّم
تابندگیٔ سلکِ گہر یاد رہے گی
برسات کا بھرپور سماں یاد رہے گا
زلفوں کی گھٹا تا بہ کمر یاد رہے گی
آرائش و زیبائشِ جنّت کے نظارے
آسودگیٔ ذوقِ نظر یاد رہے گی
تجدید مراعات کے دلچسپ بہانے
ہر ”پرسشِ خم بارِ دگر“ یاد رہے گی
وہ عشق کا موسم، وہ بہاروں کا زمانہ
بالیدگیٔ کیف و اثر یاد رہے گی
ہر روز مناتے تھے جہاں جشنِ ملاقات
وہ راہگذر راہگذر یاد رہے گی
گلگشتِ چمن — ساحلِ گنگا کے مناظر
آوارگیٔ شام و سحر یاد رہے گی
آزردگیٔ شوق پہ اک خاص ادا سے
تسکیں بہ اشاراتِ نظر یاد رہے گی
ظلمت کدۂ دل میں جلائی تھی جو تو نے
ہر سو دہ ہیں وہ شمعِ ضرر یاد رہے گی
پابندیٔ آدابِ محبّت پہ وہ اصرار
فہمائشِ دزدیدہ نظر یاد رہے گی
دل اپنی ہزیمت کو تو اب بھول چلا ہے
ہاں دوست تری فتح و ظفر یاد رہے گی
جس شام مجھے ترکِ محبّت کا ملا حکم
وہ شام بہ عنوانِ دگر یاد رہے گی

گو چھوٹ چکا مجھ سے گلستانِ فتح گڑھ
تا عمر تری اے گُلِ تر یاد رہے گی

حیرت شملوی

ایک تو خود اپنی غمگینی　　اُس پر ان کی نکتہ چینی
اپنی شیرینی بھی تلخی　　اُن کی تلخی بھی شیرینی
کھل جائے گا یہ بھی اک دن　　کس نے کس کی راحت چھینی
کافی ہے کیا یہ کہہ دینا　　"سب حالات کی ہے سنگینی"
کر نہیں سکتی ہم کو قائل　　صرف عبارت کی رنگینی
ہے یہ وفا، وہ جُرمِ محبت　　ہے جس کی پاداش یقینی
کیا معلوم، کسی کی مشکل　　خودداری ہے یا خودبینی
آپ کی رائے عالی کیا ہے　　دین ہے بہتر یا بے دینی
کیا کہنا اُس ہوش و خرد کا　　سُوجھتی ہے جس کو شوقینی
اپنے دامن کو بھی دیکھیں　　ہو منظور جنھیں گُل چینی

اچھّے اچھّوں کو، اے حیرتؔ
لے ڈوبی ہے بے آئینی

انجم رومانی

دن ہو کہ رات، کنجِ قفس ہو کہ صحنِ باغ
آلامِ روزگار سے حاصل نہیں فراغ

رغبت کسے کہ لیجئے عیش و طرب کا نام
فرصت کہاں کہ کیجیے صہبا سے پُر ایاغ

ویرانۂ حیات میں آسودہ خاطری
کس کو ملا اس آہوئے رم خوردہ کا سراغ

آثارِ کوئے دوست ہیں اور پا شکستگی
خوشبوئے زلفِ یار ہے اور ہم سے بے دماغ

کس کی جبیں پہ ہیں یہ ستارے عرق عرق
کس کے لہو سے چاند کا دامن ہے داغ داغ

کرتے ہیں کسبِ نور اسی تیرگی سے ہم
انجم ہیں دل کے داغ گہر ہائے شب چراغ

جگن ناتھ آزاد

دن سے خوف آتا ہے اب رات سے جی ڈرتا ہے
سحر و شام کے لمحات سے جی ڈرتا ہے

وہ ہو غیروں کی جفا یا ہو وفا اپنوں کی
اب تو دنیا تری ہر بات سے جی ڈرتا ہے

ستم و جورِ عزیزاں کا گلہ کیا کیجے
اپنے معصوم خیالات سے جی ڈرتا ہے

مجھ کو بگڑے ہوئے اطوارِ زمانہ کی قسم
اپنے سنورے ہوئے حالات سے جی ڈرتا ہے

اس شکر خائی و شیریں سخنی کے باوصف
زندگی! تلخیٔ حالات سے جی ڈرتا ہے

جورِ اغیار کی آزاد! شکایت کیسی
اب تو اپنوں کی ملاقات سے جی ڈرتا ہے

راز مراد آبادی

چمن میں آتشِ گل بھی نہیں دھواں بھی نہیں
بہار تو یہ نہیں ہے مگر خزاں بھی نہیں

بچھڑ گئے ہیں کہاں ہم سفر خدا جانے
نقوشِ پا بھی نہیں گردِ کارواں بھی نہیں

طوافِ کعبہ کیا، بت کدہ بھی دیکھ آئے
سکونِ قلب یہاں بھی نہیں، وہاں بھی نہیں

قفس ہے گوشۂ راحت، قفس ہے دارِ اماں
غمِ چمن بھی نہیں، فکرِ آشیاں بھی نہیں

کہاں کے گیت، کہاں کی غزل کہ ہم سخنو!
بہت دنوں سے ہمیں جرأتِ فغاں بھی نہیں

ناصر کاظمی

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے، سونا ہوئے رخسار بھی

درد کے جھونکوں نے اب کے دل ہی ٹھنڈا کر دیا
آگ برساتا تھا آگے دیدۂ خونبار بھی

بیٹھے بیٹھے جانے کیوں بیتاب ہو جاتا ہے دل
پوچھتے کیا ہو میاں! اچھا بھی ہوں، بیمار بھی

شوقِ آزادی لیے جاتا ہے عالم سے پرے
روکتی ہے ہر قدم آوازِ پائے یار بھی

سادگی سے تم نہ سمجھے ترکِ دنیا کا سبب
ورنہ وہ درویش تھے پردے میں دنیا دار بھی

کس طرح گزرے گا ناصرؔ فرصتِ ہستی کا دن
جم گیا دیوار بن کر سایۂ دیوار بھی

گھونگٹ اوٹ

سوامی مارہروی

ایک کٹھن پربت سے بھاری، اُلجھی کو سُلجھاوے کون
کاگد لیکھا سب کوئی بانچے[1]، من کی اُلجھن بانچے کون

ندیا کنارے گُپ چُپ ٹھاڑی، اب یہ بھید بتاوے کون
دو دو نیّا، دو دو کھوئیّا، جیون پار لگاوے کون

دیکھ سکھی! دھن وان[2] ہیں کیسے؟ تجھ کو نردھن[3] لاگے کون
پریم کی مایا، مُکتی[4] چھایا، پوچھ تو ان میں راکھے کون

ایک تو مورے جیون ساتھی، اُن سے مجھ کو پیارے کون
دُوجے بس میں مرنا جینا، وہ جو جیاٹے مارے کون

پوتھی پترا پنڈت بانچیں، من کو بانچے جانے کون
من کی پہیلی کن سے بوجھوں، اب یہ بات بتاوے کون

گھونگٹ اوٹ کروں میں کت لنگ[5]، کن کو دیکھوں تھام
اک لنگ مورے پریتم ٹھاڑے، اک لنگ ٹھاڑے رام

---

[1] بانچے = پڑھے [2] دھن وان = دولت مند [3] نردھن = مفلس
[4] مکتی = بخشش [5] کت لنگ = کس طرف

ظہور نظر

ہر گھڑی قیامت تھی، یہ نہ پوچھ کب گذری
بس یہی غنیمت ہے تیرے بعد شب گذری
کُنجِ غم میں اک گل بھی کھل نہیں سکا پورا
اس بلا کی تیزی سے صرصرِ طرب گذری
جانے کیا ہوا ہم کو، اب کے فصلِ گُل میں بھی
برگِ دل نہیں لرزا تیری یاد جب گذری
ایک ساتھ رہ کر بھی دور ہی رہے ہم تم
دھوپ اور چھاؤں کی دوستی عجب گذری
کس طرح تراشو گے تہمتِ ہوس ہم پر
زندگی ہماری تو ساری بے طلب گذری
بے قرار و بیکل ہے جاں سکوں کے صحرا میں
آج تک نہ دیکھی تھی یہ گھڑی جو اب گذری
بعدِ ترکِ الفت بھی یوں تو ہم جئے، لیکن
وقت بے طرح بیتا، عمر بے سبب گذری
پھر نظر پہ حاوی ہیں وہ مناظرِ خوش رنگ
ایک عمر سے جن کی عمرِ تاب و تب گذری

غروب

ظہور نظر

ڈوبتی کرنوں کی مدھم آنچ میں
نیلگوں بادل کا ٹکڑا اجل گیا
آگ، گہری سرخ، پیلی، قرمزی
ہر طرف دہکا کے سورج ڈھل گیا
ملگجی ٹیلے، سنہرے ہو گئے
ریت پر رنگوں کا جادو چل گیا
ہولے ہولے سرمئی ہونے لگی
سبز، گہرے سبز پیڑوں کی قطار
کھو گئیں آغازِ شب کی دھند میں
کونپلیں، جو ہو رہی تھیں زرنگار
بن گیا اطلس کی شہرنگی ردا
نہر کا پانی کہ تھا آئینہ دار

میں یہاں آیا تھا خود سے بھاگ کر
دل کو بہلانے سکوں کو ڈھونڈنے
سوچتا ہوں ذہن و دل کو کیا ملا
اپنے رنگوں میں سلگتی شام سے
صرف اک لمحے کا لمس جانگداز!
صرف اک لمحے کی رنگیں روشنی!!
صرف اک بوسہ لبِ احساس پر!
اور وہ بھی گرمیٔ خوں سے تہی!!

شاعر لکھنوی

اُن کا غم بھی نہ رہا پاس تو پھر کیا ہوگا
لُٹ گئی دولتِ احساس تو پھر کیا ہوگا

کون تا صبح جلائے گا تمنّا کے چراغ
شام سے ٹوٹ گئی آس تو پھر کیا ہوگا

جن کی دوری میں وہ لذّت ہے کہ بیتاب ہے دل
آ گئے وہ جو کہیں پاس تو پھر کیا ہوگا

تم سے زندہ ہے تمنّائے مذاقِ احساس
تم ہوئے دشمنِ احساس تو پھر کیا ہوگا

دل غمِ دوست پہ مغرور بہت ہے لیکن
غم بھی آیا نہ اگر راس تو پھر کیا ہوگا

اپنی مخمور نگاہوں کو نہ دو اذنِ خرام
بڑھ گئی اور اگر پیاس تو پھر کیا ہوگا

ہم پریشاں تھے پریشاں ہیں پریشاں ہوں گے
تم کو آئی نہ خوشی راس تو پھر کیا ہوگا

عظمتِ عشق ہے خودداریٔ دل تک شاعرؔ
بجھ گیا شعلۂ احساس تو پھر کیا ہوگا

نور بجنوری

چمکنے لگا ہے ترا غم بہت
دیے ہو چلے اب تو مدّھم بہت
گھٹاؤں میں طوفاں کے آثار ہیں
تری زلف ہے آج برہم بہت
یہاں لہلہائے ہیں اشکوں میں باغ
نہ اترا اے پھولوں پہ شبنم بہت
یہ وہ دور ہے جس کا درماں نہیں
یہ وہ راز ہے جس کے محرم بہت
یہ دامانِ وحشت کی کچھ دھجّیاں
بنائیں گے لوگ ان سے پرچم بہت
گدائے محبّت کی خودداریاں
ملے راہ میں خسرو و جم بہت
سلگتی رہی رات بھر چاندنی
شبِ ہجر تھی روشنی کم بہت
نہ جائے گی دل سے کبھی آرزو
یہ بنیاد ہے آہ محکم بہت

پولونیئس

(شیکسپیر بھائی کا ایک ویلن)

مصطفیٰ زیدی

میں اُس افسانے کا کردار ہوں جس کا ہیرو
عرش پر چلتا ہے، تاروں پہ قدم رکھتا ہے
اُس کی تحویل میں یونان کے بُت رہتے ہیں
وہ کنیزوں میں نگارانِ مجسم رکھتا ہے
تخت و طاؤس و طرب زار و غزال و نکہت
دیر و فردوس و صنادید و حرم رکھتا ہے

وہ اُس افسانے کا ہیرو ہے، جس افسانے میں
میں جب آتا ہوں تو بے جیب و قبا آتا ہوں
رنگ اور نور کے سیلاب میں میری صورت
آئینہ دیکھنے لگتا ہے تو شرماتا ہوں
دِن گذرتا ہے نئے زخموں کو گنتے گنتے
رات آتی ہے تو ہر زخم کو سہلاتا ہوں

وہ تو بس ایک ہے اور مجھ سے گریباں بیزار
اتنی تعداد میں ہیں جیسے کہیں مور و مگس
ہیملٹ اس کے لبادے کے تلے چلتا ہے
اور مرے دل میں دھڑکتا ہے سوالوں کا جرس
آخر اک عمر کی محنت مرے کس کام آئی؟
اس بڑھاپے کی سعادت مرے کس کام آئی؟
میری بچّی کو بہا لے گئی چھوٹی سی ندی،
سیکڑوں سال کی حکمت مرے کس کام آئی؟

میں اُس افسانے کا کردار ہوں جس کے کردار
اک ذرا دھوپ میں نکلیں تو پگھل کر رہ جائیں
خواب اور گھر کی آغوش میں رہنے والے
وقت کی آنچ میں آجائیں تو جل کر رہ جائیں
ہم کسی اور شب و روز سے مانوس نہیں
اپنی اقلیم سے نکلیں تو نکل کر رہ جائیں

اسی خطرے سے نہ ماضی کی طرف آنکھ اُٹھی
مڑ کے دیکھیں گے تو بن جائیں گے ہم سنگِ نمک
نہ کوئی غم غمِ آخر، نہ مسرّت بے لوث
اپنے امروز پہ تنقید نہ فردا پہ کسک
یہ چمکتی ہوئی باتیں، یہ دمکتے ہوئے ذہن
محض غازے کی عنایات فقط نوکِ پلک

صرف میرے دلِ شوریدہ و ناشستہ کو
کچھ نہ کچھ بننے کی حسرت تھی مگر بن نہ سکا
ایک شعلے کو بھی حاصل نہ ہوا رقصِ دوام
ایک آنسو بھی، مقدّر سے، گہر بن نہ سکا
میں نے ہر چند ہواؤں میں بچھائے شہتیر
کوئی چوکھٹ، کوئی گوشہ، کوئی گھر بن نہ سکا

جس نے دیکھی مری پرواز، تمسخر سمجھا
اپنے بھی مجھ پہ ہنسے، خیر سے بیگانے بھی
میری اس بے پر و بالی کا تماشہ کرنے
اہلِ ادراک بھی آجاتے تھے، دیوانے بھی
اُس کے یونان کے بُت دیکھ کے سب بھول گئے
اِنھی اطراف میں ہیں میرے صنمخانے بھی

کتنے ہنگامے ہیں اِس شہر میں سب جانتے ہیں
کتنے ہنگامے ہیں اس قصر میں کس کو معلوم
اُس کے دربار کے پالے ہوئے بد شکل غلام
اُس کی بے نام حسیناؤں کا حُسنِ محروم
اُس کی راہوں میں سُلگتے ہوئے عنبر کا دھواں
اُس کی خدمت میں مذاہب کے طلسمانہ رسوم

لوگ سائے کی طرح چلتے ہیں، کھو جاتے ہیں
تھمتے جلتے ہیں، دوکان سجی رہتی ہے
برف جم جاتی ہے ہر راہ پہ لیکن جس میں
میری بچّی کی لحد ہے وہ ندی بہتی ہے
اس کے نغموں میں جو آہنگ ہے اس کی بابت
میں نہیں کہتا، مری نوحہ گری کہتی ہے

میں وہ کردار ہوں جس کو غمِ دل کے باوصف
لوگ کہتے ہیں کہ بے حس ہے خراباتی ہے
سانس چلتی ہے تو بے لذّتِ رفتارِ خرام
موت آتی ہے تو بے رختِ سفر آتی ہے
میرا جو کام ہے وہ نقص ہے اور نقصِ ضعیف
اُس کی جو بات ہے وہ وصف ہے اور ذاتی ہے

میری سازش پہ تو راتوں نے گواہی دی ہے
اس کی سازش کو نسیمِ سحری سے پوچھو
کون دیوانہ تھا، اور کون نہایت ہشیار
پوچھنے والوں کی افسانہ گری سے پوچھو
کون سے جرم میں برباد ہوا روزنکرانٹز
میرے ہیرو کی فراستِ نظری سے پوچھو

آج کی رات پھر اسٹیج پہ رونق ہوگی
اولڈوِک شہرِ طلسمات نظر آئے گا
دیکھنے والوں کو ہر سازشِ خوں کے پیچھے
میرا فتراک، مراہات نظر آئے گا
اور میں رسم و روایات کی ضد کے باوصف
آج اک جست کو سیماب کی سیرت دے کر
اپنی افسانوی ہیئت کو بدل ڈالوں گا
جب مری روح برافگندہ نقاب آئے گی
لوگ گھبرا کے چلے جائیں گے، اور میں چپ چاپ
اِن نئے زخموں کو ویرانے میں سہلاؤں گا!

اشارات:-

۱- پولونیئس : شیکسپیر کے ڈرامے "ہیملٹ" کا جہاں دیدہ وزیر
۲- روزنکرانٹز : ہیملٹ کا دوست جو بعد میں ہیملٹ کے ہاتوں ہی مارا گیا
۳- اولڈوِک : لندن کا شیکسپیئرین تھیئٹر- انگلستان کا قومی اسٹیج-

منیر نیازی

اشارے

شہر کے مکانوں سے
سرد سائبانوں کے
دلربا تھکے سائے
خواہشوں سے گھبرائے
رہروؤں سے کہتے ہیں
"رات کتنی ویراں ہے
موت بال افشاں ہے
اس گھنے اندھیرے میں
خواہشوں کے ڈیرے ہیں
لاکھ دل دھڑکتے ہیں
ان کے پاس جانے کے
لاکھ چور رستے ہیں"

بے وفائی

رنگ کی سل کو اُٹھا کر
دور تک جانا بہت دشوار ہے
ہر در و دیوار سے مل کر جُدا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار ہے
آنکھ کے آنسو کو
ہیرے کی طرح دل میں چھپانا بھی بہت دشوار ہے

دُوریوں پر بیٹھ کر ہنستی ہیں سکھ کی دُلہنیں
شرم کے فانوس سے جلتے ہیں شہروں کے مکاں
جذبۂ شب کی کلیدِ احمریں
کھولتی ہے عشرتوں کے سیل کا قفلِ گراں
رینگتے چلتے ہیں دشتِ شوق میں
حسن کے جادو میں ڈوبے محملوں کے کارواں

لاکھ کوئی دوریوں پر بیٹھ کر روتا رہے
رنگ کی سل کو اُٹھا کر
دُور تک جانا بہت دشوار تھا
ہر در و دیوار سے مل کر غمیں ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار تھا

وحید قریشی

کوئی نہ چاہنے والا تھا حسنِ رسوا کا
دیارِ غم میں رہا دل کو پاس دنیا کا
فریبِ صبحِ بہاراں بھی ہے قبول ہمیں
کوئی نقیب تو آیا پیامِ فردا کا
ہم آج راہِ تمنا میں جی کو ہار آئے
نہ درد و غم کا بھروسا رہا نہ دنیا کا
تری وفا نے دیا درسِ آگہی ہم کو
ترے جنوں نے کیا کام چشمِ بینا کا
الجھ کے رہ گئی ہر تان سے نوائے سروش
طلسم ٹوٹ گیا حسنِ نغمہ پیرا کا
شبِ فراق میں تارے گنے تو نیند آئی
یہ حال ہو گیا آخر تمہارے شیدا کا
وحید گرمیٔ اندیشہ نے غضب ڈھایا
سلگ رہا ہے ابھی ہاتھ خامہ فرسا کا

تعبیر

حمایت علی شاعر

کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی
دیواروں کی رنگت فق، دروازوں پہ چُپ طاری
مبہوت سی خاموشی، گم سُم سی فضا ساری
ہر دل پہ گراں دھڑکن، ہر روح پہ تن بھاری
کعبہ ہو کہ بت خانہ، پتھر کی عمل داری

کیا چشم و لب و عارض، کیا زلف، گلو، شانے
ہر رخ پہ منقّش ہیں تہذیب کے ویرانے
دم توڑتے جاتے ہیں جلتے ہوئے پروانے
اور شمع نہیں جانے اپنے ہیں کہ بیگانے

یہ بزمِ طرب اور یہ آدابِ عزاداری
نغموں کی کشاکش سے ہر ساز کا دل عاری
ساقی ہے تو ساقی کی نظروں میں وہ پُرکاری
ہر رند تہی ساغر اور فیضِ کرم جاری

جس سمت نظر کیجے، اک عالمِ حیرانی
یا زیست کی ویرانی، یا موت کی ارزانی
نے زہد شراب آگیں، نے کفرِ مسلمانی
کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی !

یہ اُونچے دریچے

احمد ریاض

یہ اونچے شبستاں یہ گلرنگ چلمن
یہ کھلتے کبھی بند ہوتے دریچے
وفا سے جفا تک کئی روپ بدلیں
کبھی گُل بکھیریں کبھی خوں رُلائیں
کبھی دامنوں میں ستارے سمیٹیں
کبھی آنسوؤں سے چراغاں منائیں

اجڑتے زمانوں کے دکھ درد بانٹیں
گرانبار صدیوں کے نوحے سنائیں
پُراسرار خوابوں کے اسرار کھولیں
چھپی آرزوؤں کے گھونگھٹ اٹھائیں

یہ گلرنگ چلمن یہ تابندہ چلمن
ہزاروں شکستوں کے افسانہ خواں ہیں
ہزاروں دبی خواہشوں کے دفینے
ہزاروں تپاں وحشتوں کی زباں ہیں

یہ کھُلتے کبھی بند ہوتے دریچے
سناتے ہیں دام و قفس کی کہانی
دکھاتے ہیں تصویرِ مرگِ تمنّا
سناتے ہیں جور و ہوس کی کہانی

یہ اُونچے شبستاں یہ خوشیوں کے مقتل
یہاں عاشقی خوں فشاں نیم جاں ہے
یہاں کوئی آنچل نہ دامن مقدّس
یہاں دلبری صیدِ قہرِ شہاں ہے

یہ اونچے شبستاں دریچے کہ چلمن
محبّت کو آواز تک دے نہ پائے
کبھی حسن پر نغمہ بن کر نہ برسے
کبھی عشق کو ساز تک دے نہ پائے

انھیں عشق نے مرکزِ دل سمجھ کر
یہاں اپنی خوشیوں کے سجدے لٹائے
انھیں بارگاہِ تمنّا سمجھ کر
عقیدت کا خوں دے کے گلشن کھلائے

مگر عشق تو عشق اِن محفلوں میں
کبھی حسن نے اپنا منصب نہ پایا
کبھی عظمتِ گلعذاراں نہ جاگی
کبھی شوق نے عرضِ مطلب نہ پایا
وفا سے جفا تک کئی روپ بدلیں
یہ زرّیں شبستاں یہ اونچے دریچے

تعبیر

آغا صادق

مَیں نے پھولوں کے خواب دیکھے تھے   میرا کانٹوں سے بھر گیا دامن!
میں نے جینے کی آرزو کی تھی   مجھ کو پہنایا زندگی نے کفن!

روشنی کے لئے پکارا تھا!   مجھ کو تاریکیوں نے گھیر لیا!
میں نے آبِ حیات مانگا تھا   خضر نے اس میں زہر گھول دیا!

میں نے چاہا تھا پونچھ لوں آنسو   پھُوٹ نکلے لہو کے فوّارے!
ابرِ رحمت پہ تھی نظر میری   مجھ پہ برسے فلک سے انگارے!

منتظر تھا بہارِ جنّت کا!   مجھ پہ لپکے شرر جہنّم کے!
سازِ عشرت کے تار چھیڑے تھے   اس سے نالے نکل پڑے غم کے!

کیا خبر تھی کہ نو عروسِ بہار   یوں لٹا کر سہاگ نکلے گی!
رس بھری کونپلوں کے ہونٹوں سے   کیا خبر تھی کہ آگ نکلے گی!

میں نے کلیوں کے ہار گوندھے تھے   طوقِ آہن بنا دیے کس نے؟
دوستی کو جو ہاتھ اُٹّھے تھے   اُن میں خنجر تھما دیے کس نے؟

پریم وار برٹنی

ہو گیا ہوں ہر طرف بدنام تیرے شہر میں   یہ ملا ہے پیار کا انعام تیرے شہر میں
تو نے جب پہلے پہل شرما کے دیکھا تھا مجھے   ہائے کیا رنگین تھی وہ شام تیرے شہر میں
ایک مَیں ہی تھا کہ اس عالم میں بھی زندہ رہا   مجھ پہ آئے سینکڑوں الزام تیرے شہر میں
اس قدر پابندیاں آخر یہ کیا اندھیر ہے   لے نہیں سکتے ترا ہی نام تیرے شہر میں
اب تو یادوں کے افق پہ چاند بن کر مسکرا   روتے روتے ہو گئی ہے شام تیرے شہر میں
کب کھلے گا تیرے میخانے کا در میرے لئے   پھر رہا ہوں لے کے خالی جام تیرے شہر میں
کیا کبھی تو نے بھی سوچا ہے کہ دیوانہ ترا   ہو گیا کیوں اس قدر بدنام تیرے شہر میں
تیری عظمت نے کیا آذر کے فن کو شرمسار   یوں تو تھے کچھ اور بھی اصنام تیرے شہر میں
ہم نے دیکھا حسن کو چھپ کر لہو روتے ہوئے   ہم نے دیکھا عشق کا انجام تیرے شہر میں
تیرے در پہ ایک سجدہ کی اجازت بھی نہیں   زندگی ہے موت کا پیغام تیرے شہر میں
جانتا تھا کون مجھ سے شاعرِ گمنام کو   تجھ سے ہی روشن ہے میرا نام تیرے شہر میں
جب سنہری چوڑیاں بجتی ہیں دل کے ساز پہ   ناچتی ہے گردشِ ایام تیرے شہر میں

پھر چلا ہوں میں تری دھن میں غزل گاتا ہوا
پھر کھلے ہیں گیسوؤں کے دام تیرے شہر میں

نگارِ شہر

مظہر امام

نہیں نگار کو اُلفت، نہ ہو، نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے
(غالب)

مری نگارِ دل آرا! گراں ہے سنگِ حیات
غمِ وفا سے بہت چُور ہو گیا ہوں میں
فسونِ عشق سلامت، مگر یہی ہے مآل
کہ تم سے ہو کے قریں، دور ہو گیا ہوں میں
تمھاری چارہ گری پر نہیں ہے کچھ الزام
جو قلبِ وقت کا ناسور ہو گیا ہوں میں

مجھے خبر ہے کہ تم کو بھی کچھ قرار نہیں
سکونِ دل تھا، علاجِ فسردگی تھا میں
ہے رنگ و نور سے عاری اگرچہ میری حیات
تمھارے عارضِ گلگوں کی دل کشی تھا میں
چراغِ کشتۂ ایام ہی سہی، لیکن
تمھاری محفلِ عشرت کی روشنی تھا میں

مجھے گلہ ہے خود اپنے ہی دل کی وحشت سے
بجائے خار، جو پھولوں کو چُننے لگتا ہے
وہ نغمے آج تلک ہیں جو نا سرائیدہ
یہ خود فریب ہے، ان کو بھی سننے لگتا ہے
بس ایک سادہ و بے لوث مسکراہٹ سے
نئی اُمید، نئے خواب بُننے لگتا ہے

بجھی بجھی سی ہے شوخی، بجھا بجھا سا حجاب
بجھی بجھی سی خموشی، بجھی بجھی آواز
بجھی بجھی سی جوانی، بجھا بجھا سا جمال
بجھی بجھی سی ادائیں، بجھے بجھے انداز
بجھی بجھی سی تمنّا، بجھی بجھی سی اُمنگ
بجھے بجھے سے ہیں نغمے، بجھے سے ہیں ساز

ہوئی نہیں ہو شگفتہ بہ قدرِ ذوقِ نظر
یہ اور بات ہے سلطانۂ بہار ہو تم
خبر نہیں کہ ہیں دامن پہ خون کے چھینٹے
غرورِ بے گنہی کی گناہ گار ہو تم
کمند چاند ستاروں پہ ڈالتی ہو، مگر
خود اپنی ظلمتِ ماحول کا شکار ہو تم

یہ بزمِ نازِ نگارانِ شہر ہے جس میں
مرے کلام، مری شاعری کا چرچا ہے
مرے شعور کی، میری خرد کی باتیں ہیں
مرے جنوں کا، مری عاشقی کا چرچا ہے
مگر یہ روح، کہ ہے تشنہ کام ہی اب تک
ہزار بادۂ آسودگی کا چرچا ہے

جو بارِ خاطرِ نازک نہ ہو تو عرض کروں
تمھاری راہ ہے مسدود، میری نامسدود
قدم قدم پہ ہے احساسِ خستگی تم کو
ملے گی کیسے تمھیں اپنی منزلِ مقصود؟
دلوں کے ساز میں آہنگ کیسے پیدا ہو؟
تمھاری فکر ہے محدود، میری لامحدود

کہاں کا ذکرِ بہاراں، کہ اپنے گلشن میں
فریب خوردۂ جوشِ نمو رہا ہوں میں
خزانہ ہائے محبت لٹا دیے ہیں نے
مگر خود اپنے سکوں کا عدو رہا ہوں میں
نہ کیف یاب ہوا وصفِ انکسار و خلوص
کہ مے کشِ قدحِ "ما و تو" رہا ہوں میں

میں چاہتا تو نہ تھا غم کا تذکرہ کرنا
مگر میں غم کی شکایت کروں تو کس سے کروں؟
ستا رہا ہے یہ احساس مجھ کو برسوں سے
بیانِ دل کی حقیقت کروں تو کس سے کروں؟
یہ سچ سہی، کہ جنوں وفا نہ راس آیا
مگر میں ترکِ محبت کروں تو کس سے کروں؟

جمیل ملک

کِھلا کِھلا سا ہر اک گام پر چمن دیکھا
تمھارے شہر کی گلیوں کا بانکپن دیکھا

جو اپنی سمت نظر کی تو دل کے پاس ملا
دمن دمن جسے ڈھونڈھا، چمن چمن دیکھا

تجھی سے محفلِ کون و مکاں میں ہنگامے!
کہاں کہاں نہ تجھے جانِ انجمن دیکھا!

ہماری قدر جو ہونا تھی سو ہوئی لیکن
لٹا لٹا سا تجھے بھی عروسِ فن دیکھا

نہیں تھا اذنِ تکلّم مگر سرِ مقتل
ہر ایک دل میں تلاطم سا موجزن دیکھا

یہ خوابناکیِ وحشت، یہ شورِ بربط و چنگ!
کبھی حضور نے دُنیا کا بھی چلن دیکھا!!

چلو جمیلؔ بدل دیں جنوں کی رسمِ کہن،
سبھی کو خاک بسر، چاک پیرہن دیکھا

اختر ہوشیارپوری

ہم سے پوچھو کہ بے کراں تھے پھول
کبھی دل تھے کبھی جہاں تھے پھول
بوئے گل لوٹ کر نہیں آئی !
کن بہاروں کے رازداں تھے پھول
ہم ہیں اب اور اُجاڑ تنہائی
اپنے دل کا کبھی نشاں تھے پھول
کوئی سمجھا کوئی نہیں سمجھا
زندگی کے فسانہ خواں تھے پھول
رنگ ہی رنگ تھا نگاہوں میں
آنکھ جھپکی تو پھر کہاں تھے پھول
تھے جہاں پر وہیں رہے کانٹے
اور ہر انجمن کی جاں تھے پھول
چاکِ دامن ہی دل کا تھا غمّاز
اور کیا کرتے بے زباں تھے پھول
مجھ کو ایسا کبھی گماں بھی نہ تھا
صرفِ تعمیرِ آشیاں تھے پھول
اک تبسّم تھی زندگی ان کی
پھر رہینِ غمِ خزاں تھے پھول
ماہ و اختر تو تھے تماشائی
میری راتوں کے ہم زباں تھے پھول

شکیب جلالی

زنجیر کی جھنکار کو سنگیت میں ڈھالا
زنداں میں بھی جینے کا عجب ڈھنگ نکالا

اک آپ کہ زلفوں میں پروتے ہیں ستارے
اک ہم کہ میسّر نہیں اشکوں کی بھی مالا

وہ خاک نکھاریں گے خد و خال سحر کے
جو چہرۂ ماہتاب پہ بُنتے رہے جالا

تپتے ہوئے صحرا کے کسی کام نہ آیا
گلگشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

ہم نے جسے آزاد کیا حلقۂ شب سے
حاصل نہیں ہم کو اسی سورج کا اجالا

انسان کی عظمت کی گواہی کے لئے ہو
کعبہ ہو کہ بت خانہ، کلیسا کہ شوالا

مظہر امام

ہوں خندہ بلب، زورِ الم یوں تو بہت ہے
روشن ہے نگہ، ظلمتِ غم یوں تو بہت ہے
اے کاش! ترے سایۂ گیسو میں کٹے عمر
آرام ترے سر کی قسم یوں تو بہت ہے
کس کام کی مے جب دلِ ساقی سے نہ چھلکے؟
ہونے کو مئے ساغرِ جم یوں تو بہت ہے
ہونٹوں تلک افسردۂ انگور نہ آیا
ساقی کی نگاہوں کا کرم یوں تو بہت ہے
ہے پیچ و خمِ راہِ صنم خانہ بہ دستور
آرائشِ گیسوئے صنم یوں تو بہت ہے
تیری نگہِ لطف بھی کچھ کم تو نہیں ہے
اے دوست! زمانے کا ستم یوں تو بہت ہے
سورج کے نکلنے پہ بھی رہ جائیں تو جائیں!
رہنے کو اندھیروں کا بھرم یوں تو بہت ہے
ہو آئیں اماؔم! آج ذرا اُن کی گلی سے
مشہور گلستانِ ارم یوں تو بہت ہے

باقر مہدی

کون بھلا یہ کہتا ہے خود آکے ہم کو منائیں آپ!
ٹوٹا دل اب کیسے جڑے گا، جھوٹی قسمیں نہ کھائیں آپ!

پتھّر سینے پر رکھ لیں گے، جیتے جی مر جائیں گے
آپ کو قاتل کون کہے گا، کیوں ناحق گھبرائیں آپ؟

راہِ وفا پر چلتے چلتے، اپنی عظمت بھول گئے تھے
چھوڑی ہم نے رسمِ پرستش، اب نہ کرم فرمائیں آپ

سحر کیا، اعجاز کیا ہے، درد کا شعلہ برف بنا ہے
ترکِ محبت ہم کو مبارک، کیوں ناحق پچھتائیں آپ؟

جوشِ جنوں کا دور نہیں ہے، دل کے سکوں کا دور نہیں ہے،
غم ہے نیا کیسے کم ہوگا آئیں آپ نہ آئیں آپ

تشنہ لبی کچھ اور بڑھی ہے میخواری کی دھوم مچی ہے
آخر ہم سے رندِ بلاکش، کیسے پیاس بجھائیں آپ؟

جلیل ہاشمی

جو تیری افشاں سنواریں زندگی اے زندگی
روز و شب ایسے گذاریں زندگی اے زندگی
بڑھ گیا دریا کا پانی کف اڑاتا موج موج
اُڑ گئیں کونجوں کی ڈاریں زندگی اے زندگی
ہر طرف چھایا ہوا ہے اک سکوتِ بے کراں
پھر بھی ہم تجھ کو پکاریں زندگی اے زندگی
تیری صورت پر گمانِ دشت و صحرا ہائے ہائے
تیرے قدموں میں بہاریں زندگی اے زندگی
سر اٹھائیں دار پر یا دیں سرِ مقتل صدا
نقش تیرے ہی اُبھاریں زندگی اے زندگی
جن کے ہونٹوں پر سدا رہتے ہیں تیرے زمزمے
اُن کے سینوں میں کٹاریں زندگی اے زندگی
شہر ہے آخر یہ کوئی سرو ویرانہ نہیں!
جینے والے دم نہ ماریں زندگی اے زندگی
دیں جو تجھ کو فرصتِ یک دو نفس کی تہمتیں
اُن سے بھی ہم لوگ ہاریں زندگی اے زندگی
دور تک ملتا نہ ہو نام و نشاں تیرا جہاں
ہم وہاں دامن پساریں زندگی اے زندگی

تقریظ

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۹۰ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ جنھوں نے اسی سال انٹرنس (یا آجکل کی اصطلاح میں میٹریکیولیشن) کا امتحان پاس کیا تھا، بریلی کے اسکول سے علی گڈھ کے مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کے لئے آیا۔ میرے منجھلے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر غالباً ہم سے پہلے ہی علی گڈھ آچکے تھے۔ اس "نیچر گڈھ" میں تقریباً سبھی طلبار کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص، جراب، انگریزی جوتا یہی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ ترکی کوٹ پہنا کرتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا، کوئی کبھی کبھی کرتہ بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدھ کے سب کی منڈی ہوئی ہوتی تھیں گو مونچھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بال سب کے آگے سے بڑھے ہوئے، پیچھے سے بتدریج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج ہمارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنہیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتروانا قبول کر لیا ہے اور جو "ایٹن کراپ" کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس کچی بارک میں ہم تینوں بھائی رہتے تھے اسی کے پاس والی کچی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک عرصہ سے "ٹول ہاؤس" بن گیا ہے ایک دراز قامت مگر خاصے دبلے پتلے صاحب رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی پرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے، جن کی ٹوپی ان کے وطن آمروہہ[۱] کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی (جس کو اب "گاندھی کیپ" کہا جاتا ہے)، جن کا جوتا دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے تھے اور اگرچہ "بر دوش" نہ سہی لیکن "تا بنا گوش" ضرور آتے تھے تاکہ ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے، وہ گردن میں ایک سپید خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سرسید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی لیکن علی گڈھ جیسے "نیچر گڈھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ

---

[۱] امروہہ (یو پی) کی کشتی نما ساخت کی ٹوپی میں اور "گاندھی کیپ" میں نمایاں فرق یہ تھا کہ گاندھی کیپ تو عموماً سپید کھدر کی ہوتی تھی اور امروہہ ساخت کی ٹوپی ریشم اور کلابتون کی کڑھی ہوئی ہوتی تھی۔

نمایاں تھا جتنا کہ کسی یوروپین لیڈی کا آج بڑے بال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور سینہ اور گردن، بازوؤں اور باہوں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا نمایاں ہوگا اس لیے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انہیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب وغریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دلعزیز جو جماعت تھی اور جس میں محمد حبیب اللہ[1] خان صاحب، احمد حسین[2] مرحوم، قسیم بیگ[3] صاحب چغتائی جیسے طلبا شامل تھے اس کے سردار یہی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلبہ کا مجمع رہا کرتا تھا جن میں میرے بھائی ذوالفقار[4] علی خان گوہرؔ بھی ہوتے تھے، حیدر آباد کے ممتاز افسر مال قطب الدین[5] صاحب دہلوی (ڈٹو) بھی ہوتے تھے، چودھری ممتاز حسین[6] صاحب بھی ہوتے تھے اور چڑیا کوٹ کے ایک صاحب جن کا نام غالباً احمد معظم[7] صاحب تھا اور بورڈنگ کے باہر اپنے والد بزرگوار خان بہادر سید زین العابدین[8] صاحب کی کوٹھی پر رہنے والے سید زین الدین بھی ہر روز وہیں آیا کرتے تھے۔ میں ان ممتاز طلبہ کی جماعت کے پاس ہی رہنے سے خوش بھی تھا مگر ساتھ ہی ساتھ تنگ بھی آگیا تھا کیونکہ ان حضرات کو کسی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ مجھے گدگدی بے حد لگتی ہے، اور مجھے پکڑ کر بے حد گدگدایا کرتے تھے۔ مولانا طفیل احمد[9] صاحب اور داؤد صاحب تو اس قدر مقطع اور سنجیدہ بزرگ تھے کہ وہ کسی کو کیا دق کرتے مگر حبیب اللہ خان صاحب، قسیم بیگ صاحب اور زین الدین[10] صاحب مجھے بے حد پریشان کیا کرتے تھے، ایک میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا

---

[1] یعنی خان بہادر الحاج محمد حبیب اللہ خان صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق کلکٹر یو۔ پی جنہوں نے مدت العمر اپنے مادر علمی کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس پیرانہ سالی میں انجام دے رہے ہیں اور علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔

[2] احمد حسین بی۔ اے مرحوم ۱۸۸۱ء میں کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے عرصہ ہوا انتقال ہوگیا۔

[3] مرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ) آگرہ کے رہنے والے ۱۸۸۵ء میں کالج میں فرسٹ ایر میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں بی۔ اے پاس کر کے اوّل علی گڑھ کے ایک کلکٹر "کنیڈی" کے جس کی آنکھیں خراب تھیں، پرسنل اسسٹنٹ ہوئے پھر ججی میں مترجم ہوگئے اس کے بعد آگرہ کالج میں وارڈن رہے اور پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوئے، خان بہادر کا خطاب حاصل کیا آخر میں جودھپور میں بھی رہے۔ بڑے لطیفہ گو تھے ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ادبیات و افسانہ نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی۔

[4] یہ قادیانی فرقہ میں شامل ہو کر قادیان میں بھی مقیم رہے ان کے ہمعصروں کا قول ان کے بارے میں ہے کہ بڑے لغو گو تھے۔

[5] یہ دہلی کے نہیں بارہ بنکی کے رہنے والے تھے ۱۸۸۰ء میں کالج میں آئے اور ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے کیا ابتداءً فوج میں ملازمت کی پھر ریاست حیدر آباد میں تعلقداری کا عہدہ ملا اور افسر مال رہے۔

[6] چودھری ممتاز حسین ولد علی بخش خاں ساکن پانی پت ۱۰ جون ۱۸۸۹ء میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں انٹرمیڈیٹ کر کے نائب تحصیلدار پھر تحصیلدار ہوئے کچھ عرصہ ریاست دوجانہ میں مینجر بھی رہے۔

[7] مولوی احمد معظم عباسی ساکن چڑیا کوٹ علی گڑھ سے جا کر حیدر آباد میں کسی منصب پر فائز ہوئے۔

[8] خان بہادر سید زین العابدین مرحوم سر سیدؒ کے احباب خاص میں تھے۔ علی گڑھ میں عرصہ تک سب جج رہے۔

[9] مولانا طفیل احمد مرحوم ۱۸۷۹ء میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں فورتھ ایر سے آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوئے طبیعت کی یکسانیت کی وجہ سے داؤد صاحب سے ان کے بڑے گہرے تعلقات مدت العمر تک رہے۔ کالج و یونیورسٹی و کانفرنس کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔

[10] سید زین الدین ایم اے (علیگ) ابتداءً ڈپٹی کلکٹر ہوئے پھر کلکٹر۔ ریٹائر ہو کر ریاست رام پور میں ریونیو منسٹر رہے، شروع شروع میں بڑے فیشن ایبل تھے آخر میں اعمال مذہبی کے حد درجہ پابند صوفی منش ہوگئے تھے۔

دوسرا دونوں ٹانگیں، جب میں اس طرح "پا بدست دگرے دست بدست دگرے" ان رندانِ باصفا کی صحبت میں گرفتار ہوتا تو تیسرا پیٹ میں گدگدی کرتا اور میں بیتاب ہو جایا کرتا۔ اس کے بعد تو بری پریشانی نے اس قدر ترقی کی کہ حبیب اللہ خاں صاحب مجھے دور ہی سے دیکھتے تو اس طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے کہ گویا مجھے گدگدا رہے ہیں اور میں دور ہی سے بیتاب ہونے لگتا۔

اس زمانہ میں یونین کے افسروں کا انتخاب ہوا اور چونکہ اس وقت تک اسکول کے طلبہ بھی یونین کے ممبر ہو سکتے تھے ہم بھی انتخاب میں رائے دینے کی غرض سے ممبر بنائے گئے اور مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے بھی داؤد صاحب کی پوری پارٹی کے لئے بالکل اسی فہرست کے مطابق رائے دی جو ہم سب کو پہلے سے دے دی گئی تھی تاکہ ہم اس کے نام یاد کر لیں۔ بیسیوں نئے ممبر دونوں طرف سے بنائے گئے تھے اور بیک[1] صاحب خوش خوش پھر رہے تھے کہ یونین[2] کی آمدنی بھی بڑھی اور خیر اسی وجہ سے سہی نئے ممبر تو داخل ہو گئے۔ اس سال غالباً مظہر الحق[3] صاحب "بھائی بھشتو" جن کے اس عرف کے لئے کالج کے کورس کا یہ شعر گھڑا گیا تھا ؎

عجب ہے بھنگ کا پیالہ اہا ہا ہا اہو ہو ہو
ہوا بھشتو کا منہ کالا اہا ہا ہا اہو ہو ہو)

وائس پریذیڈنٹ اور محمد داؤد صاحب سیکرٹری منتخب ہوئے۔ دوسرے سال احمد حسین صاحب مرحوم اور حبیب اللہ خاں صاحب ان عہدوں کے لئے منتخب ہوئے اور غالباً تیسرے سال سیّد زین الدین صاحب اور مولانا شوکت علی۔ یونین نے ایک نظم کے لئے انعام کا بھی اعلان کیا تھا اور جن دو نظموں کے لکھنے والوں میں مقابلہ تھا ان میں سے ایک گورکھپور کے محمد اسمٰعیل[4] صاحب عرف "بخار" مرحوم نے لکھی تھی اور ایک اس خاکسار نے اور غالباً کسی کو یہ سن کر تعجب نہ ہوگا کہ انعام "بخار" صاحب ہی کے حصّہ میں گیا اور ہم یوں ہی رہ گئے اور مولانا شبلی مرحوم کی سخندانی پر ایک عرصہ تک بے حد شک کرتے رہے کیونکہ انعام کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

شعر نے جس شخص کے لئے اتنی کم عمری میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ "گر دو فن او" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق نہ ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سنا تھا کہ چودھری ممتاز حسین صاحب کو آج کل کے کلکٹر سیّد زین الدین صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کو آپریٹروں[5] پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بیچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم کیا تھا اور ۱۸۹۱ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ہے ؎

نہ ہوا سرد تھی، نہ سر پہ چھاؤں   اس پہ طرّہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

---

[1] مسٹر ٹی بیک ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۹ء تک کالج کے پرنسپل رہے۔

[2] علی گڑھ کالج کی مشہور یونین کا نام "سڈنس یونین" ہے جو مسٹر سڈنس (ہیڈ ماسٹر ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۳ء) کے ریٹائر ہونے کے بعد مسٹر بیک نے ان کے نام سے قائم کی تھی۔

[3] ۱۷ جنوری ۱۸۷۸ء میں کالج میں داخل ہوئے، ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے کر کے پہلے نائب تحصیلدار پھر اکسائز انسپکٹر اور بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔

[4] محمد اسمٰعیل مرحوم ولد نور الحق ساکن مچھلی شہر ۱۲ جون ۱۸۹۰ء کو فرسٹ ایر میں داخل ہوئے تھے۔

[5] یعنی تحریکِ عدمِ موالات و تعاون جو کانگریس نے حکومت کے خلاف چلائی تھی۔

اس مثنوی کو ہمیں بھلا کون دکھاتا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سُن لیا تھا اور گو ذیابیطس کے باعث اب حافظہ بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمد للہ بچپن کے سنے سنائے شعر اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی[1] کو وہ پھر شائع کرائیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے، پایا۔ افسوس کہ رختِ سفر باندھنے اور "ہمدرد" سے رخصت ہونے اور لڑکی کی شادی کرنے میں اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ اس مثنوی کو پڑھ سکتا البتہ "خمخانہ جاوید" میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور یوسف خان مرحوم کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف شاعری اور ان کے سہلِ ممتنع کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بھی بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا اندوختہ مجھے عطا کیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ؎

یہ جھوٹ اور ہم سے، بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو رات جھانک رہے تھے دراڑ سے

البتہ اب جبکہ میری عمر غالباً داؤد صاحب مرحوم کی عمر سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اس شعر کے "معاملہ" پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان جیسا سنجیدہ اور مقطع بزرگ بھی کم از کم شعر میں دراڑ سے جھانک سکتا تھا! خدا نہ کرے کہ یہ شعر بھی مثنوی کی طرح صوبجات متحدہ کے نان کوآپرٹروں پر ایک قہرمان مسلمان کلکٹر کی شان میں کہا گیا ہو! مگر باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد صاحب مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالیؒ کی ایک مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین انہوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالیؔ تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں صرف میرا تخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش میرا خدا خوش مگر تضمین بھی بلا کی تھی۔ ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شعر کا ستیاناس کر دیا، سنئے ؎

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں
پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سُن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے ہاں
ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

بزرگوں کی شان میں داؤد صاحب نے حرف بھی ایک گستاخی نہیں کی تھی۔ کالج میں ایک عرصہ تک ہر "نسل" میں ایک طالب علم کو "بوم" کا لقب عطا ہوتا تھا۔ اس نسل کے "بوم" کو مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کا عشق تھا۔ جب کالج کا گروپ فوٹو کھنچنے لگا تو "بوم" صاحب فوراً مولانا شبلیؔ کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے جس پر داؤد صاحب نے اسی وقت لکھ دیا ؎

آج کالج میں مچ رہی ہے دھوم
طلبہ کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روحِ سعدیٔ مرحوم
"کس نہ آید بزیرِ سایۂ بوم"
الّا مولانا شبلیٔ مخدوم

چودھری خوشی محمد خان[2] صاحب کالج کے "پوئٹ لاریٹ" اور اپنے قد کے لحاظ سے "لانگ فیلو" تھے اور آرنلڈ صاحب اور مولانا شبلی خاص طور سے

---

[1] داؤد صاحب مرحوم کے کل مجموعۂ کلام کو شائع کرنا مقصود تھا۔

[2] چودھری صاحب نے ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ سے فرسٹ ڈویژن میں انگریزی و فارسی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے کیا۔ عرصہ تک ریاست کشمیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ قومی نظمیں بہت بہت لکھی ہیں۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسوں میں خاص طور سے پڑھتے تھے۔

ان کے مدّاح تھے مگر چودھری صاحب کو زبان پر پوری قدرت نہ تھی اس لئے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحق[1] صاحب (جو آج کل اورنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور اس زمانہ میں کالج میں "سینٹ پال" کے عرف سے معروف تھے) چودھری صاحب کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے ٹامسن کی نظم "سیزنس" (مختلف موسم) پڑھ کر جو ان کے کورس میں داخل تھی، ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا شبلی کے مشورہ سے آرنلڈ صاحب نے انہیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا۔ اس میں ایک موقعہ پر چودھری صاحب لکھ گئے تھے کہ ع ناظر اب سیر سبزہ کر ڈالو ——— ناظر آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ 'انظر الی الابل کیف خلقت'، اس لئے ناممکن ہو گیا کہ اس مصرع کی داد نہ دی جائے جو اس پر داؤد صاحب نے لگایا تھا:

ناظر صاحب فرماتے ہیں ——— ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو
داؤد صاحب اسی پر فرماتے ہیں ——— اپنے آگے کی گھانس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدر آباد چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے اور وہ طلبہ جو سر سیّدؒ کے ڈنڈے سے ڈرتے تھے اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڈھ کے سدا بہار کھانے کی حسبِ دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی "حسبِ دستور" اصلاح کے بہت سے وعدے کئے۔ ان وعدوں سے خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا قافیہ "جان" اور "نان" تھا اور مولوی شبلی کے شاگردِ رشید اور محبوبِ خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے یونین میں پڑھا۔ ان کے بہت سے شاگرد آج نقل اتار سکتے ہوں گے۔ اسی بحر اور قافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا، وہ یہ تھا ؎

"خوب تر صحرا نوردی می کند   اشتر پنجاب در ہندوستان"

اب قارئین کرام داؤد صاحب کے لگائے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے ؎

ناظر! اب سیرِ سبزہ کر ڈالو   اپنے آگے کی گھانس چر ڈالو

مگر جہاں تک مجھے یاد تھا اسی قسم کی ایک اور گستاخی کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے مشہور خاندان کی شان میں داؤد صاحب نے نہیں کی تھی بلکہ وہ میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خان صاحب گوہرؔ کی شرارت[2] تھی۔ محمد سلیمان صاحب اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس کے "پراکٹر" تھے تو اس وقت ان کا لقب

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (بابائے اردو) ولد منشی علی حسین مرحوم ساکن ہاپوڑ ضلع میرٹھ ۳؍ اپریل ۱۸۹۰ء کو درجہ نہم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں فرسٹ ڈویژن بی۔ اے کیا۔ عرصہ دراز تک ریاست حیدر آباد میں بسلسلہ ملازمت رہے اور اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی کے زمانہ میں انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اردو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں سے دہلی چلے آئے اور انجمن ترقی اردو کا دفتر، کتب خانہ اور پریس بھی وہیں منتقل کیا جو فسادات کے زمانہ میں سب لٹ لٹا گیا، اس تباہی کے بعد کراچی آئے اور یہاں از سرِ نو انجمن کا دفتر، کتب خانہ، پریس قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب ایک اعلیٰ پایہ درس گاہ ہے۔

[2] یہ گوہرؔ کی شرارت نہ تھی، داؤد صاحب مرحوم ہی کی بذلہ سنجی تھی۔ گوہرؔ کے کالج میں آنے اور ۱۸۸۹ء میں داخلہ لینے سے بقول خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خان صاحب برسوں پہلے سے داؤد صاحب کا یہ لطیفہ کالج میں مشہور اور زبان زد خاص و عام تھا۔ مولانا ظفر علی خان صاحب نے جو گوہرؔ صاحب سے سالہا سال پہلے سے کالج کے طالب علم تھے، اپنے اخبار "زمیندار" کی ایک اشاعت میں ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم کے ایک تلمیذ رشید تھے مبداء فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا، شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ سے

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

”مینجر“ تھا جسے وہ اس طرح لکھا کرتے تھے کہ عام طور پر طلبہ اسے ”خچر“ پڑھا کرتے تھے۔ مولوی سعید احمد صاحب غالباً محاسب تھے، مولوی بدرالحسن صاحب مرحوم (بھائی بدو) تیسرے درجہ کے استاد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی علاءالحسن صاحب اس وقت تک طالب علم ہی تھے اس خاندان کو کالج کے ساتھ عشق تھا اور متعدد منتظمین اور طلبہ اس نے کالج کو بخشے تھے مگر کالج کے ساتھ اس عشق کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاصہ اس خاندان کا اور بھی تھا جس کو گوہر نے اس طرح باندھا تھا ؎

آتا ہے جو وہاں سے وہ لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے کاندھلے میں لٹایا خزانہ کیا

قارئینِ کرام کو یقیناً آتش کا مشہور شعر یاد ہوگا ؎

نکلا جو گل زمیں سے سو آیا وہ زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

یہ اسی مشہور شعر کی خرابی کی گئی ہے اور علاءالحسن صاحب مرحوم کی شان میں یہ تصرف کیا گیا تھا۔ محمود احمد صاحب عباسی کا خیال تھا کہ یہ ان کے مرحوم بھائی کا تصرف تھا کیونکہ انہوں نے داؤد صاحب کو ضرور اسے پڑھتے سنا ہوگا مگر مجھے یاد تھا کہ یہ تصرف میرے بڑے بھائی نے کیا تھا چنانچہ میری لڑکی کی شادی میں جب وہ تشریف لائے تو خود ان سے پوچھا گیا اور میرا حافظہ صحیح نکلا[1]۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جتنے لوگ علی گڈھ آئے سب کے سب امام شعرانی کی ضد واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو نہیں لیکن سروں کو ضرور فکرِ معاش سے فارغ البال کر رکھا تھا اس پر مرحوم کو ذیل کی پھبتی سوجھ گئی جو اسی وقت کالج کے ہر بے فکرے کی زبان پر تھی ؎

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا“

خود مولانا شوکت علی مرحوم نے اپنے مضمون میں جو داؤد صاحب مرحوم کے حالات پر لکھا تھا، اس لطیفہ کو مرحوم ہی سے منسوب کیا ہے۔

[1] مولانا ظفر علی خان و خان بہادر محمد حبیب اللہ خان و مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم وغیرہ جو بہ نسبت مولانا محمد علی مرحوم کے اس زمانہ کے حالات سے زیادہ واقف تھے اور ان سے دس بارہ سال پہلے سے کالج میں موجود تھے اس لطیفہ کو داؤد مرحوم ہی کی شگفتہ طبعی سے منسوب کرتے رہے ہیں علاوہ بریں گوہر صاحب کے کالج میں داخل ہونے سے بارہ برس پہلے سے کاندھلہ کا یہ خاندان وہاں موجود تھا۔ مولوی محمد اکبر مرحوم ۱۸۷۵ء سے عربی کے استاد تھے اور ان کے چھوٹے بھائی محمد سلیمان مرحوم بورڈنگ کے مینجر تھے۔ یہ دونوں بھائی سر سیدؒ کے استاد مولوی نورالحسن کے فرزند تھے اور مولوی نورالحسن مفتی الٰہی بخش مرحوم ساکن کاندھلہ کے پوتے تھے۔ مفتی صاحب نے مثنوی مولانا روم کا ساتواں دفتر لکھا تھا جو طرزِ ادا میں مولانا رومی کے کلام کے برابر تھا۔ مفتی صاحب اپنے زمانہ کے جیّد عالم ہونے کے باوجود بڑے سادہ مزاج اور سید احمد شہیدؒ کے دست گرفتہ تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ساری عمر ہم نے مذہبی علوم کو پیسا، وہ دلیہ تھا سید احمد شہید سے بیعت کرنے کے بعد وہ میدہ ہوا۔ سر سیدؒ کو چونکہ اس خاندان سے شاگردی کا تعلق تھا انہوں نے کالج کے ابتداء ڈالنے کے وقت سے ہی مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد سعید کو کالج میں لاکر رکھا۔ مولوی محمد اکبر کے بڑے بیٹے بدرالحسن (بھائی بدو) ۲۶ رجون ۱۸۷۵ء کو کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے ۱۸۸۵ء سے فورتھ ایر سے تعلیم چھوڑ کر کچھ عرصہ اسکول میں مدرس رہے پھر سید محمود مرحوم کی سفارش سے منصف ہوئے اور سب ججی تک ترقی کی۔ علاءالحسن ۱۸۷۷ء میں جب داؤد صاحب مرحوم نے داخلہ لیا ہے اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ سید محمود مرحوم کی سفارش پر ڈپٹی کلکٹر ہوئے ان کے فرزند ظہیر الحسن بی۔ اے رئیس کاندھلہ ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم نے یہ شعر بھی غلط نقل کیا ہے بعض الفاظ کا ردّ و بدل ہو گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب نے صحیح لکھا ہے، دونوں کے فرق کا اندازہ اہلِ ذوق بخوبی کر سکتے ہیں۔ آتش کے مشہور شعر کا پہلا مصرعہ بھی مولانا غلط لکھ گئے ہیں اصل مصرعہ ہے ع زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف۔ اس میں تصرف کر کے داؤد صاحب نے فرمایا تھا ؎

”آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

یہ سب اس گئے ہوئے پُرلطف زمانہ کی یاد تھی جو آگئی اور علی گڑھ کی موجودہ تباہی پر ایک بار اور آنسو گروا گئی۔ بھلا اس کو کس طرح تقریظ کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام داؤد صاحب مرحوم کے اشعار کو خود ہی پڑھیں گے اور ان کا حظ اٹھائیں گے، میں حاجب اور دربان بن کر ان کو زیادہ دیر تک روکنا نہیں چاہتا۔ پردہ اٹھا دیا گیا، دروازہ کھلا ہے، آگے بڑھئے اور داؤد صاحب کی شگفتہ ترین طبیعت سے ملاقات کیجئے اور ان کی روح پر فاتحہ پڑھ جائیے۔ میں بھی دست بدعا ہوں اور اشک ریز، لیکن اس دیدۂ تر کے ساتھ ہی ساتھ اس وقت ہونٹوں پر تبسم آئے بغیر بھی نہیں رہتا جب اس کا خیال آتا ہے جو لڑکا آج سے ۳۸[۱] برس پیشتر داؤد صاحب کی وضع قطع پر تعجب کرتا تھا کہ علی گڑھ جیسے مقام پر رہ کر وہ لانبے بال رکھتے ہیں اور امروہہ کی کشتی نما ٹوپی اوڑھتے ہیں، گلے میں رومال باندھتے ہیں اور دیسی اچکن پہنتے ہیں اور دہلی کا سلیم شاہی جوتہ، آج اس کے بال بھی ان ہی کی طرح لانبے ہیں، وہ بھی گاڑھے کا کرتہ اور پاجامہ پہنے بیٹھا ہے، ایک نئی وضع کا جوتا پیروں میں ہے، داڑھی لانبی ہے، اچکن بھی نہیں بلکہ عبا پہنے ہوئے ہے اور علی گڑھ ہی نہیں آکسفورڈ میں پڑھ چکا ہے اور اس وقت پی اینڈ او کمپنی کے جہاز پر صاحب لوگوں اور میموں اور فیشن ایبل ہندوستانیوں کے درمیان "ڈیک" پر بیٹھا ہوا یہ "تقریظ" لکھ رہا ہے اور مرتے مرتے یورپ کے دستِ شفا کو بھی آزما دیکھنے کی غرض سے عازمِ انگلستان ہے۔

ع رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

(غیر مطبوعہ)

---

[۱] مولانا مرحوم نے یہ تقریظ ۱۹۲۸ء میں لکھی تھی جب وہ بغرضِ علاج انگلستان کے سفر پر جا رہے تھے۔

قول و قرار

یہ عدمؔ کا مجموعۂ کلام ہے۔ عدمؔ اردو کا ایک ایسا غزل گو شاعر ہے جو بڑے سادے سے انداز میں عشق و محبت کے معاملات کو پانی کر کے رکھ دیتا ہے۔ بھاری بھرکم ترکیبوں اور استعاروں سے ان کا ذہن اور قلم بغاوت پر آمادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر غزل میں بناوٹ نہیں ہے بلکہ فن کی تمام لطافتوں کے ساتھ ایک حقیقت ہے۔

قیمت ۔/۳

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

نذیر احمدؒ کا ایک ناول

مولانا عبدالماجد دریابادی

اب آپ چاہے اسے پسند کریں یا ناپسند، عیب سمجھیں یا ہنر، بہرحال ہے یہ، کہ نذیر احمدؒ اُن لوگوں میں نہ تھے، جو ادب کو برائے ادب پسند کرتے ہوں، یا ناول کے لئے قلم اُٹھاتے ہوں، تو بس اس لئے کہ وہ ناول ہے۔ نذیر احمدؒ مولوی تھے، مسلمان تھے، مشرقی تھے اور بڑی بات یہ کہ زندگی کے بامعنی ہونے کے قائل تھے۔ زندگی کی ہر سانس ایک معنی لئے ہوئے۔ دل کی ہر دھڑکن ایک غایت و مقصد رکھے ہوئے۔ یہ نہیں، کہ بس جب بولنے کو جی چاہا، زبان اُٹھائی اور دے ماری، اور جب لکھنے کی موج آئی، تو قلم اُٹھا کاغذ پر گھسیٹنا شروع کر دیا —— تو اس کینڈے کا آدمی جب ناول لکھے گا، تو سوچ سمجھ کر، منزل و نشان منزل کی طرف آنکھیں گڑو کر۔

ناول کا جواب جو اصطلاحی مفہوم بعد کو متعین ہوا، اور اس کا فنی معیار بعد کو قرار پایا، اس کے اعتبار سے چلیے تو نذیر احمدؒ کے ناولوں کو ناول کہنا ہی مشکل ہے۔ لیکن اصطلاحی نام جو کچھ بھی رکھئے، اسی زمانہ میں تھیں اس قسم کی کتابیں کچھ نئی نئی سی۔ نئے خیال والوں کو اپنی جدّتوں سے، ندرتوں سے، لبھانے والی، رجھانے والی، پرچانے والی۔ اور پُرانے دماغ والوں کو وحشت سے بھڑکانے والی، ہٹانے والی، بھگانے والی —— یہ جدید و قدیم کی پُرانی آویزش بھی ایک عجب دنگل ہے۔ شاید روزِ ازل ہی سے چلی آرہی ہے۔ اور حق ہے کہ کبھی اِدھر ہو جاتا ہے، کبھی اُدھر۔ کبھی باپ کے مقابلہ میں ابراہیم خلیلؑ کے ساتھ اور کبھی بیٹے کے مقابلہ میں نوح نبیؑ کے ساتھ! —— اچھا تو نذیر احمد ٹھہرے مصلح، اور انہیں بھی ہر دوسرے مصلح کی طرح قوم کی اصلاح سوجھی، اور ملّت کی فلاح کی دھن سمائی۔ اس سے پہلے اکبری اصغری کی کہانی لکھ ہی چکے تھے۔ نام سنئے تو رعب دار اور ہیبت فگن مرآۃ العروس، اور پڑھنے بیٹھئے تو میٹھے میٹھے بول، اور دل میں اتر جانے والا انداز۔ اب ہمّت کا قدم اس سے کہیں بڑے کام کے لئے اٹھایا۔

حکمت ایمانی نے کان میں پھونکا کہ ساری نیکیوں کی جڑ تو خوفِ خدا ہے۔ اور ہزار اصلاحوں کی ایک اصلاح ہے بندہ کے دل میں پُرسشِ اعمال کا احساس۔ تو آپ کی غفلت کے مہلک مرض کے لئے جو حبّ شفا تیار کیجئے۔ اس کونین کی گولی کو خوب افسانہ کی شکر میں لپیٹئے، اور حُسنِ بیان کا وہ رنگ جمائیے کہ مریض لپک کر آئے اور للک کے ساتھ دوا کو غٹاغٹ اُتارتا جائے —— غالبؔ نے "مہ رخوں کے لئے" آخر "مصوّری" سیکھی تھی، تو کیا نذیر احمدؒ "تقریب بہر ملاقات" کے لئے افسانہ نگاری کے حربہ سے بھی گئے گزرے تھے!۔

نصوح کا نام دنیائے ادب کے لئے نیا نہ تھا۔ صدیوں پیشتر مولانائے روم اپنی مثنوی معنوی میں ایک نصوح اور ان کی توبہ کا قصہ سُنا چکے تھے اور اس سے بھی قبل خود قرآن مجید میں لفظ توبۃً نصوحًا مخلصانہ توبہ کے معنی میں آچکا تھا۔ تو نذیر احمدؒ کو کتاب کے نام کے لئے فکر و تامل کی ضرورت نہ پڑی۔ اچھا خاصا ترشا ترشایا چھلا چھلایا نام توبۃ النصوح از خود ہاتھ آگیا۔ اور اسی نام ہی کو مرکز بنا، صنعت کار نے تین سوا تین سو صفحہ کے پلاٹ کا پورا دائرہ اس کے اردگرد کھینچ دیا۔

قصّہ کا خاکہ سادہ بھی ہے اور ذرا سا پیچیدہ بھی۔ پُرانی بولی میں "سادگی و پرکاری" اسی کو کہتے ہیں۔ نصوح نامے دہلی کے ایک شریف خوش باش ہیں، کھاتا پیتا گھر، بےفکریوں میں ڈوبا ہوا۔ اللہ کا کرنا کہ ایک سال شہر میں ہیضہ کی وبا پھوٹی اور نصوح مبتلا ہو کر یہ سمجھے کہ اب چل چلاؤ کا وقت آگیا۔ اسی عالمِ ہراس میں، خواب آور دوا پی کر آنکھ جو لگی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میدانِ حشر کا منظر ہے اور اب دوسروں کے علاوہ خود نصوح سے دھکڑ پکڑ شروع ہوئی۔ حاکمانہ و جابرانہ نہیں تمام تر عادلانہ لیکن غفلت کے مارے ہوئے اور مستیوں میں ڈوبے ہوئے نصوح کے پاس سرمایۂ عمل تھا ہی کیا۔ ایک بات کا بھی جواب نہ بن پڑا۔ فردِ جرم ہر قسم کی لگ گئی۔ عالمِ یاس میں آنکھ کھل گئی، لیکن اب خواب حقیقت بن کر سامنے تھا، اور آنکھ کے ساتھ دل بھی بیدار ہو چکا تھا۔ دیکھی اور گزری ہوئی ایک ایک بات لوحِ دل پر پتھر کی لکیر ہو کر رہی تھی۔ فکرمند دل سے اپنی اور اپنے کنبہ کی اصلاح کی کوشش شروع ہوئی۔ کنبہ میں بیوی کے علاوہ دو بیٹیاں تھیں اور تین بیٹے۔ بیوی اور کم سِن اولاد کا معاملہ تو آسان رہا۔ بڑی لڑکی اور بڑے لڑکے سے نپٹنے میں لوہے لگ گئے اور صاحبزادی تو پھر آخر رام ہو کر رہیں۔ صاحبزادہ خیر سے شاعر بھی تھے اور "کلیم" تخلّص کرتے تھے۔ ان کا بگڑا ہوا جن کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ اور ان حضرت نے وہ وہ "لن ترانیاں" بگھاریں، کہ ماں باپ دونوں تھک کر عاجز آگئے۔ یہ گھر سے نکل گئے اور باہر ہر طرح کی ٹھوکریں کھا کر برسوں کے بعد آخر جب خستہ و نزار، دل زخمی اور جسم فگار واپس آئے ہیں، تو موت کے مہمان بن کر۔ علاج معالجہ بہتیرا ہوا، لیکن مدت موعود پوری ہو چکی تھی۔ کلیم ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے دنیا سے رخصت ہوا، لیکن اب تائب و نادم ہو کر اپنے خدا سے اکڑا ہوا نہیں، اس کے آگے جھکا ہوا، گرا ہوا اور آس تمام تر اس کی رحمت و مغفرت سے لگائے ہوئے۔

قصّہ کے ہیرو بڑے میاں یعنی خود نصوح ہیں، اور ان کا خواب جس پر ہزاروں بیداریاں قربان ہوں، کتاب کی جان —— اور چونکہ قصّہ حسن و عشق کی داستان سرائی سے خالی ہے، اس لئے ہیرو کے ساتھ کسی ہیروئن کی تلاش بھی بے حاصل ہے لیکن کردار کی مصوری کی جو پوچھئے، تو میاں کلیم اور ان کے یار آشنا مرزا ظاہر دار بیگ اور میاں فطرت کے کردار بڑے ہی جاندار ہیں اور بے جان تو کتاب کے چھوٹے بڑے سارے کرداروں میں خیر کوئی بھی نہیں —— اور اسے نذیر احمد کے قلم کا اعجاز سمجھئے، یا جو کچھ، کہ کتاب ہے عربی لفظوں، عربی ترکیبوں، عربی عبارتوں سے ٹھنسی ہوئی۔ اس پر بھی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ کہیں سے کوئی ورق کھول لیجئے، جی بند کرنے کو نہ چاہے گا، بس یہی چاہے جائے گا کہ ابھی کچھ اور، ابھی کچھ اور۔

آپ تو خیر اس وقت کتاب کھول کر سامنے رکھنے سے رہے، آپ کی یہ خدمت یہ بات چیت کرنے والا ہی آپ کے لئے انجام دئے دیتا ہے، اور آپ کی نظروں سے اوجھل رہ کر دو ایک مقاموں کی سیر آپ کو کرائے دیتا ہے۔ منوں غلّہ کے ذخیرہ کا اندازہ آخر غلّہ کی مٹھی بھر بانگی ہی سے لگایا جاتا ہے۔ بس آپ بھی اسی اجمالی سیر پر قناعت کیجئے، اور دس بیس سطریں اِدھر اُدھر سے سُن سُنا، سینکڑوں صفحوں کی معنویت و اہمیت کا نقشہ دل میں قائم کر لیجئے۔ نصوح کے چھوٹے صاحبزادہ میاں سلیم ابھی ۸، ۱۰ سال کے ہیں، اور شہر کے آوارہ منش لڑکوں کی صحبتوں میں رہ کر خود بھی آوارگی کے کوچہ میں کسی سے دو قدم پیچھے نہیں۔ ایک دن محلّہ کے ایک لڑکے سے نوبت ہاتھا پائی لپاڈگی کی آگئی۔ اس کا ماجرا انہی کی زبان سے سنیئے :۔

”عین انہی کے دروازہ پر لڑائی ہو پڑی۔ سخت کلامی کے بعد گالی گلوچ تک نوبت پہنچی۔ پھر مار کٹائی ہونے لگی۔ لڑکا مجھ سے تھا کمزور۔ اڑنگے پر چڑھ جا ایک پٹخنی دیتا ہوں چاروں شانے چت۔ پھر تو میں اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بچا کو ایسے گھسّے دیئے کہ یاد ہی کئے ہوں گے۔ اگر لوگ چھڑا نہ دیتے تو میں اس کو ادھ مُوا کر ہی چکا تھا۔ بارے دو چار آدمیوں نے مجھ کو اس پر سے اُتارا اور دو ایک نے میری پیٹھ ٹھوکی کر شاباش بچے شاباش۔ لیکن وہ لڑکا ایسا چیند باز تھا کہ پھر خم ٹھونک کر سامنے آکھڑا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ پھر گتھ ہو جاؤں۔ اتنے میں اندر سے اُسی میرے ہم جماعت نے آواز دی۔ ادھر لوگوں نے کہا کہ میاں جانے بھی دو، یہ تمہارے جوڑ کا نہیں ہے، غرض میں اندر چلا گیا۔ میرے ہم جماعت نے پوچھا، کیوں جی کس سے لڑ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ اجی کنجڑے والا رمضانی، اکڑ وہ مار کھانے کی نشانی لیکن خدا کی قسم میں نے بھی اس کو ایسا رگڑا ہے کہ یاد ہی تو کرے گا۔“ یہ عبارت ص ۹۰ کی تھی۔ ڈیڑھ سو صفحہ چھوڑ اب ذرا شاعر اور شاعر مزاج اور زعم و پندار کے مرض میں مبتلا کلیم کی بھی ذہنیت کی بھی ایک جھلک

ملاحظہ فرمالیجئے۔ اور یہ اُس وقت کی، جب وہ اپنے والد ماجد کی پند و موعظت سے بگڑ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اب ص ۲۵۳ کھول رہا ہوں۔

"کلیم کے ذہن میں از خود یہ خنّاس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستانی سرکاریں اس کے قدوم میمنت لزوم کی متمنی اور منتظر ہیں اور جس طرف کو وہ چل کھڑا ہوگا وہاں کا والئی ملک اُس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا۔ گھر سے نکلا۔ تو محض تہی دست، لیکن اس خیال میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے مالک خزائن الارض بننے والا ہوں۔ چلا جوتیاں چٹخاتا ہوا مگر اس تصور میں مست کہ فیل کوہ پیکر مع ہودج زر اس کی سواری کے لئے آ رہا ہے۔ باوجودیکہ شب خوابی کے کپڑوں کے سوا بدن پر کچھ نہ تھا، تاہم خلعت ہفت پارچہ کی امید میں تھا۔"

کلیم کی یہ جھلکیں ہلکی اور سرسری سہی، پھر بھی آپ نے اسے دیکھ لیا تو گویا کلیم کو پڑھ لیا۔ اب ذرا قدم بڑھائے ہوئے، کلیم کے لنگوٹیئے یار، اسم بامسمّیٰ مرزا ظاہر دار بیگ کے چہرہ مہرہ کا جلوہ بھی اس آئینہ میں دیکھتے چلئے۔ جہاں تک تعلّی، شیخی، اور بناوٹ کا تعلق ہے، یہ حضرت کلیم سے بھی دس جوتے آگے تھے۔ ص ۲۵۵ پر کھولئے۔ تو مرزا کی سج دھج عین مین نظر کے سامنے آجائے۔

"مرزا کو جب دیکھو، پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی، سر پر بھاری بیل کی کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو دو، انگرکھے اوپر شبنم یا ہلکی تنزیب، نیچے کوئی طرحدار ساڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہو تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی، جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سرخ نیفہ۔ پائجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا ہو تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے، اور اگر تنگ مُہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں، اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اسی ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جاتے ہیں۔"

اب کوئی عیب جوئی کی خوردبین لگا کر دیکھنے پر آجائے تو دنیا کے کس بندہ بشر کی کتاب کمزوریوں، لغزشوں، ناہمواریوں سے پاک صاف نکل سکتی ہے؟ باقی یہ کہ ناول نویسی کے معیار سے دیکھئے تو، اور لطف زبان، حُسن بیان کے اعتبار سے جانچئے تو کتاب سونے میں تولنے کے قابل، اور سر و آنکھوں پر رکھنے ہی کے لائق نظر آئے گی۔ اور جہاں تک سبق آموزی کا تعلق ہے، یہ سمجھئے کہ کتاب کا شجرۂ نسب مثنوی رومی اور گلستان سعدی کے خاندان سے جا ملتا ہے" انہی کی حکایتوں کا ایک لمبا چوڑا ضمیمہ، انیسویں، بیسویں صدی کے اڈیشن کے حسب حال، یا اسی قسم کے پھولوں کی ایک پنکھڑی! کلیم کی گفتگو ایک ریاست کے دیوان سے، یا ظاہر دار بیگ کی زبان سے بھنے ہوئے چنوں کی داستان لذیذ، اور سب سے بڑھ چڑھ کر نصوح کا پُر اثر اور دل ہلا دینے والا خواب۔ یہ سب بھی اگر کہیں چھڑ گئے، تو وجد سے مفر نہ ادھر سنانے والے کو رہے گا نہ اُدھر سننے والوں کو۔ خیریت اسی میں ہے کہ یہ ناتمام ہی داستان بس یہیں تمام ہو جائے۔

غالب کی مقبولیت کے اسباب

شیخ محمد اکرام

کلامِ غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوّع ہے۔ مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن دقیق اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے لیے یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے وہ نمونے ہیں جو دیوانِ غنیؔ میں بھی مشکل سے ملیں گے۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لیے شوخی و ظرافت ہے اور انسانی فطرت کی داستان سننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ہیں کہ جوں جوں چشمِ بصیرت کھلتی جائے گی ان کا لطف بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔

اس ساز میں بے شمار نغمے ہیں اور ہر نغمہ دل آویز ہے۔ اس دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلامِ غالب سُنی سنائی باتوں کا بیان نہیں بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دستِ قدرت نے سارے سُر ایک ایک کر کے بجائے ہیں اور دیوانِ غالب انہی سُروں کی صدائے بازگشت ہے۔

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

سر واٹر رالے نے شیکسپیئر کے متعلق لکھا ہے "وہ کمیاب ترین چیز تھا۔ یعنی ایک پورا انسان"۔ شیکسپیئر کے متعلق تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعے پر مبنی ہے لیکن جن گوناگوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ شیکسپیئر کے حالات سے کریں تو مرزا کا پلّہ شیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہے گا۔ مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے ان کے متعلق طنزاً لکھا تھا "آپ انتخابِ زماں ہیں، یکۂ دوراں ہیں۔ جس طرف طبیعت آئی اس کی خاک اڑائی۔ چنانچہ دخترِ رز سے جو ناک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ مینائے گردوں میں شرابِ شفق فاضئ آفتاب بادب پیش کش لایا اور قمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میرِ بساط اور بکھرے داؤں کھانے لگے۔" (گلستانِ بیخبراں)

لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر مے خانے اور قمار خانے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے تو شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے دو بڑے عالم فضل حق خیرآبادی اور مولانا صدرالدین ان کے عزیز دوست تھے اور جس نفاست سے صوفیانہ راز و نیاز کی باتیں ان کے اشعار میں ادا ہوئی ہیں اردو کے بہت تھوڑے شعرا کے کلام میں ملیں گی۔ وہ رنگ رلیوں میں پل کر جوان ہوئے تھے لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے

سارے تیر ان پر چلائے اور اگر وہ بزمِ نشاط اور محفلِ عشرت میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے تو دردمندوں کے مصائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میخوار ہو یا محتسب، شوخی اور ظرافت کا دلدادہ ہو یا غمزدہ، فلسفی ہو یا عاشق مزاج، ان سب کے لئے کلامِ غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئے طرز کے آدمی تھے اور ان کے خیالات کا جو اسلوب تھا آج زمانہ اس کی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے، اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی، نئے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھی بلکہ لغت، شعر، انشا اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشروؤں اور معاصروں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور ان پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے۔ جب کلکتہ میں ان کے اشعار پر یہ اعتراض ہوا کہ انہوں نے قتیلؔ کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انہوں نے بڑے جوش سے کہا تھا ؎

من ہمایم، مگس چرا باشم
زلّہ بردارِ کس چرا باشم

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت عمر بھر ان کی امتیازی خصوصیت رہی اور قومی خیالات کے موجودہ عبوری دور میں بھی یہی طرزِ عمل زیادہ مقبول ہے۔

اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے وہ عام طور پر اگرچہ بلند پایہ نہیں لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تقاریظ میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورے پر مضمون اور خیال کو مقدّم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالبؔ میں موجود ہے مغربی شاعری کے اصولِ تنقید بھی اس کے حامی ہیں۔ مرزا نے اردو مکتوب نویسی میں جو رنگ اختیار کیا وہ فارسی فنِ انشا کی نسبت انگریزی خطوط نویسی سے زیادہ قریب تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے مرزا کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہے۔

دورِ حاضر میں غالبؔ کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ عام خیال کہ غالبؔ کے معاصرین نے اس کی بالکل قدر نہ کی، واقعات کے غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ اگر غالبؔ کی شاعری اور نثر نگاری کی تدریجی تبدیلیوں اور ترقیوں کو ذہن میں رکھیں تو خیال آتا ہے کہ اگر غالبؔ کے اردو کلام کو فوری مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تو اس کا بڑا سبب کلامِ غالب کے اصلاح طلب پہلو تھے۔ ایک مدت تک مرزا رنگِ بیدلؔ پر فریفتہ رہے۔ پھر چند روز کیلئے سنبھلے تو اردو چھوڑ کر فارسی شاعری شروع کی اور ایک ایسے گلستان کی آبیاری کی جس میں عوام الناس کو بار نہ تھا۔ فارسی نثر نگاری میں غالبؔ نے ان اساتذہ کی پیروی کی جن کی پُرتصنّع اور پُرتکلّف نثر، بیدلؔ کی مصنوعی شعریت کا جواب تھی۔ اگر معاصرینِ غالب نے ان چیزوں کو سر آنکھوں پر نہ رکھا اور انہیں قبولِ عام کی سند نہ ملی تو ہمیں حیران نہ ہونا چاہئے کیونکہ انہیں تو اب بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں اور اگر تمام حالات کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ بعض اہم امور میں زمانہ غالبؔ کی نہیں بلکہ معاصرینِ غالب کی تائید کر رہا ہے۔

عوام الناس مرزا کا یہ مصرع

ع شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے   مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ رباعی حکیم آغا جان عیشؔ کی ہے جو شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے لیکن شعر فہمی میں ان کا وہ مرتبہ نہ تھا جو اس رباعی سے اختلاف رکھنے والے کئی دوسرے معاصرین (مثلاً نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ) کو حاصل تھا اور آخر یہ رباعی اسی منتخب دیوان کے متعلق نہیں جس کو سب شعر فہم حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں جن اشعار کے دقیق ہونے کی شکایت ہے انہیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شائع کرنے کے قابل نہ سمجھا اور لکھا کہ منتخب دیوان سے باہر جو میرے اشعار ملیں

انہیں برا نہ سمجھا جائے۔ اگر مرزا کی اس تحریر کے بعد بھی اس مسئلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی تو اس کا جواب نسخۂ حمیدیہ ہے جس میں خارج شدہ اشعار شائع ہوئے ہیں اور جنہیں دیکھ کر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا تو ان پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں ہوتا بلکہ اردو ادب ان کا ممنون ہے کہ انہوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو سُرخ و سپید خزف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا اور ان کی توجہ اس بحرِ شعر و سخن کی طرف کھینچی جس میں غوّاصی کا صلہ وہ بیش بہا موتی ہیں جو اردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

موجودہ نسل کو پرانی طرز کے غزل گو شعرا میں سے غالبؔ سب سے زیادہ پسند ہے لیکن جن لوگوں نے فنِ تنقید کے عام اصولوں سے گزر کر جزوی اور فروعی امور میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معراج سمجھا ہے۔ انہوں نے غالبؔ کے کلام پر کئی اعتراض کئے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالبؔ کے متعلق نہیں بلکہ تمام مشرقی شاعری پر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ غالبؔ نے بیشتر غزلیں لکھیں اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط، ردیف اور قافیے کی وجہ سے ہوتا ہے مضمون کی وحدت سے نہیں اور غالبؔ کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے گلدستے ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے مسلسل اظہار کی بجائے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے لئے وقف ہیں لیکن آخر یہ غالبؔ کی بدقسمتی تھی کہ جب اس نے شعر گوئی شروع کی تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنفِ شاعری مقبول نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس امر کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہے کہ غالبؔ کے دیوان میں مسلسل غزلیات اور قطعہ بند اشعار کی جو کثرت ہے وہ کسی اور اردو شاعر کے کلام میں شاید ہی ہو گی اور اس کی بہترین غزلوں میں کچھ قافیہ ردیف کی ہم آہنگی سے اور کچھ شاعر کی اپنی شخصیت کے پرتو سے ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت کھپ گئی ہے اور کوئی تال بے سُر معلوم نہیں ہوتی۔

غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں۔ اس لئے غزل گو شعرا اپنے سامنے چند قافیے رکھ لیتے ہیں اور اس کے مطابق اس وقت جو مضمون ذہن میں آئے اسے نظم کر کے غزل مکمل کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے اور نہ غزل میں شاعر کے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کسی اور غزل گو شاعر کے متعلق صحیح ہو لیکن کم از کم مرزا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ انہوں نے خود ایک خط میں بڑے زور سے اس خیال کی تردید کی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

> „کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن سے جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف، قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل، قصیدہ لکھنے لگا۔“

ایک اور خط میں غزل کے لئے عشق و محبت اور معشوق کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے:

> „شعر کیا کہوں گا، غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے۔ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے۔ ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے ؎
>
> اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
> اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل“

قطع نظر اس امر سے کہ مرزا قافیہ پیمائی سے خود متنفر تھے۔ ان کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی غزل گوئی ان کی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار ہے۔ ایک شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے تو کل دوسرا۔

چنانچہ دیوانِ غالب میں بھی یہ تنوع موجود ہے لیکن اس میں مشکل سے کوئی شعر ایسا ملے گا جسے غالب کی اس عظیم اور متنوع شخصیت سے منسوب نہ کیا جاسکے جس سے ہم یادگارِ غالب اور اردوئے معلیٰ کی بدولت خوب واقف ہیں۔ مرزا غالب کا زاویۂ نگاہ عام لوگوں سے کئی باتوں میں مختلف تھا اور ان کے زاویۂ نگاہ میں انھی اشعار کی ترجمانی ہوتی تھی۔ مرزا نے بہشت کا ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا اور یہ ان کے شخصی نقطۂ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرہاد کا ذکر ان کے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے اور سب جگہ طنزاً۔ مذہب کے متعلق ان کے بیسیوں اشعار ہیں اور ہر شعر ان کی وسعتِ نظر اور طبعی تشکک کا اظہار ہے اسی طرح رشک کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا ذکر، طرزِ اظہار کے اختلاف سے قطع نظر وہ مرزا ہی کے اسلوبِ خیال کو نمایاں کرتے ہیں اور بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا کہ مرزا نے کوئی مضمون قافیے سے مجبور ہو کر باندھا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل ایک جامۂ موزوں ہے جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا اور جس نے اس دلفریب شخصیت کو اور نمایاں کر دیا۔

پرانی طرز کے نقّادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کئے ہیں وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں یا بقول سر والٹر رالے "بہی کھاتا والوں کی نقّادی" یعنی سرقہ اور توارد کی بحث۔ مرزا یاسؔ اور مولانا آرگسؔ (مولانا عبدالباری آسی؟) نے محنت و تحقیق سے اساتذۂ قدیم کے کلام سے بعض شعر ایسے ڈھونڈھ نکالے ہیں جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی زمانہ میں ملٹن کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہوا کرتا تھا لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کیونکہ ایک تو بقول گوئٹے "کائنات میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں" اور دوسرے کسی شاعر کے چند اشعار میں توارد یا سرقہ ثابت کرنے سے اس کے باقی اشعار کی خوبیاں ضائع نہیں ہوتیں۔

آبلے

یہ احمد ندیم قاسمی کے چار طویل افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اگر ان افسانوں کو معیار کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو سوائے کرشن چندر کے طویل افسانوں کے ان کا پورے ادب میں کوئی جواب نہیں ہے۔ ان افسانوں میں رومان کی دبی دبی چنگاریوں کے ساتھ فن اور زندگی کے وہ رموز پنہاں ہیں جنہیں ایک بڑے فن کار کا قلم ہی چھو سکتا ہے۔

قیمت ۔/۳

آنچل

یہ احمد ندیم قاسمی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پریم چند کے بعد جس انداز سے دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کو احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے وہ اردو کے کسی اور ادیب کو نصیب نہ ہو سکا۔ ندیم خود دیہات کا رہنے والا ہے۔ اس لئے وہ دیہاتیوں کی زندگی اور ان کے تمام مسائل کو بخوبی جانتا ہے اور ان کے اَن ٹوٹ اور بھولے رومانس سے بھی آشنا ہے۔

قیمت ۔/۳

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

احتشام حسین کی تنقید[1]

کلیم الدین احمد

میں نے کہا ہے کہ نوجوان نقادوں میں خود نمائی اور خود پرستی، دونوں چیزیں ضرورت سے زیادہ ملتی ہیں۔ وہ سب برنارڈ شو کے ہمنوا ہیں: "میں اپنی تعریف کے لئے دوسرا آدمی کیوں لاؤں جب میں خود اپنی تعریف کرسکتا ہوں۔" احتشام حسین صاحب کہتے ہیں: "میں نے کبھی کسی تعارف یا تبصرہ کو اپنے ادبی و تنقیدی مضامین کے مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ اس سے ایک دیانت دار مبصر کو میرے تنقیدی مطمح نظر کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔" لیکن وہ بار بار اپنے مضامین کا تعارف اور ان کی تعریف آپ ہی کرتے جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے مضامین کا دوسرا، تیسرا، چوتھا، یا پانچواں مجموعہ ہے۔ اسی پر بس کرتے تو مضائقہ نہ تھا لیکن وہ کہتے ہیں:۔

۱۔ "زیر نظر مجموعہ کے اکثر مضامین رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ..... ان کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کے لئے ان میں بعض ضروری تبدیلیاں کردی گئی ہیں ——"

(ادبی جائزے)

۲۔ "جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں ان میں سے بہت سے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ..... میں نے ایک مختصر سا مضمون انگریزی میں لکھا تھا ...... اسے لوگوں نے پسند کیا ...... نئے ادب کے طالب علم کے لئے یہ مضمون بہت مفید ہوگا ...... میں نے کوشش کی ہے کہ اس مجموعے میں وہی مضامین شامل کروں جو میرے مطالعے اور غور و فکر کا بہترین ثمر ہیں ...... اس مجموعے کو بھی اس امید سے پیش کرتا ہوں کہ یہ بھی پہلے ہی مجموعے کی طرح مقبول ہوگا ——" (روایت اور بغاوت)

۳۔ "ادھر تین چار سال کے اندر بعض حضرات نے میری تنقید نگاری کی جانب خاص طور سے توجہ کی ہے ..... اس مجموعہ کے اکثر مضامین چھپ چکے ہیں۔"

(ادب اور سماج)

---

[1] یہ "اردو تنقید پر ایک نظر" کا ایک حصہ ہے۔

۴ - مجھے خوشی ہے کہ اس مجموعہ میں میرے بعض اہم مضامین شامل ہیں ...... یہ مجموعہ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کو تنقید کی رفتار کا اندازہ ہوتا رہے اور یہ مضامین بھی ایک جگہ محفوظ ہو جائیں ——" (تنقید اور عملی تنقید)

۵ - "تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں سے بحث ادب کی ایک اہم خدمت ہے .... جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں یہ فرض انجام دیتے ہیں ...... جو مضامین مجموعہ میں شامل ہیں وہ اپنی اہمیت آپ ظاہر کریں گے لیکن قبل اس کے آپ اِن کا مطالعہ کریں چند مضامین کے متعلق دو چار لفظ عرض کر دینا چاہتا ہوں ——" (ذوق ادب اور شعور)

۶ - اُمید ہے کہ میرے ادبی اور تنقیدی مضامین سے دلچسپی لینے والے اب اسے زیادہ مفید پائیں گے ۔" (روایت اور بغاوت)

یہ مُشتے نمونہ از خروارے ہے - اپنے نظریئے کا حوالہ بھی بار بار دیا جاتا ہے :-

۱ - ان مضامین کا مصنّف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ادب مقصد نہیں ——" (تنقیدی جائزے)

۲ - "جو شخص بھی میرے مضامین پڑھے گا اسے خود اندازہ ہوگا کہ میں انسانوں کی فلاح و بہبود اور اقتصادی انصاف کا ذکر کس شدّت اور خلوص سے کرتا ہوں ۔" (روایت اور بغاوت)

۳ - "اس مضمون میں اصولی تنقید اور تنقید کے ارتقا کے متعلق کچھ لکھنا نہیں ہے - اِن کے لئے راقم الحروف ہی کے مضامین 'اصول نقد' اور 'ادبی تنقید' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں ان کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے ——" (تنقید اور عملی تنقید)

۴ - "پہلا مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں" ادبی تخلیق اور تنقید کے متعلق میرے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے (ذوق ادب اور شعور)

یہ بھی مُشتے نمونہ از خروارے ہے ——" یہ بات زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی نقّاد اپنا اصول پہلے بیان کر دے ——"

احتشام صاحب کو بھی یہ احساس کمتری ہے کہ انہوں نے کوئی مفصل اور مبسوط کتاب نہیں لکھی ہے - وہ کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن اپنے مقالوں کو کتابوں پر بھاری نہیں بتاتے ہوئے بھی بھاری بتلاتے ہیں :-

۱ - "ادب اور تنقید پر مبسوط اور مفصّل کتاب لکھنے کے بجائے محض مختصر اور طویل مضامین لکھتے رہنا - چاہے وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں کسی مستقل علمی کارنامے کی حیثیت نہیں رکھتا ——" (تنقید اور عملی تنقید)

۲ - مضامین کا یہ تیسرا مجموعہ مرتب کرنے کے بعد اب بعض موضوعات پر مستقل کتابیں لکھنے کا خیال ہے (ادب اور سماج)

۳ - بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسے مختصر مضامین تنقید پر مبسوط تصانیف کا بدل نہیں قرار دیئے جا سکتے - یہ تو صرف مسائل کو چھیڑتے اور ذوق کی تشنگی کو بڑھاتے ہیں ...... ایک مقالے یا تقریر میں محض اشارے کئے جا سکتے ہیں - (ذوق ادب اور شعور)

لیکن "ان میں سے بعض مضامین مختصر ہونے کے باوجود برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں اگر ان کو توجہ سے پڑھا جائے تو خیال و نظر کے لئے کافی مواد مل سکتا ہے ——"

ایک دوسری کمزوری کا بھی احساس بار بار ملتا ہے ۔ اور وہ تکرار ہے - ایک قسم کی باتیں ایک قسم کے لفظوں میں اتنی بار ملتی ہیں کہ طبیعت منغض ہو جاتی ہے ۔ تکرار ترقی پسند تنقید کی اہم خصوصیت ہے - ہر عمر، زید، بکر، ایک ہی قسم کی باتیں کرتا ہے، الفاظ اور فقروں کی بھی تکرار کرتا ہے لیکن شاید ہی کسی نقّاد میں تکرار کی ایسی عمومیت ہو جیسی احتشام صاحب کے یہاں پائی جاتی ہے - اور انہیں اس کا احساس بھی ہے :-

۱ - بعض باتیں ایک سے زیادہ دفعہ مختلف مضامین میں آگئی ہیں ——" (تنقیدی جائزے)

۲ - مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس میں دوسرے مضامین کے خیالات ہی نہیں بلکہ الفاظ اور فقرے بھی آگئے ہیں - (روایت اور بغاوت)

۳ - کئی مضامین ..... بعض حصّوں میں یکساں نظر آتے ہیں - (تنقید اور عملی تنقید)

اس اعتراف کے بعد اس کی توجیہہ بھی ہے: "وہ (باتیں) اتنی ضروری ہیں کہ ان کی تکرار میں میرے مقصد کی وضاحت بھی مقصود ہے۔ . . . جس اصول نقد کو میں صحیح اسائنٹیفک اور مفید سمجھتا ہوں اس لحاظ سے ایسا ہونا ناگزیر تھا . . . . . مختلف اوقات میں لکھے ہوئے ایسے مضامین میں خیالوں اور جملوں کی تکرار ناگزیر ہے۔" تکرار کوئی بری بات نہیں۔ بعض وقت یہ بہت ضروری بھی ہوتی ہے۔ لیکن ناموزوں تکرار ذوق سلیم پر گراں ہوتی ہے۔ اب اصلی باتوں پہ آئیے۔ زندگی، تہذیب ادب، تنقید، نقاد سبھی اہم اور بنیادی مسائل اور موضوعات دام تنقید میں کھچ آتے ہیں۔ دیکھئے:۔

"دنیا . . . . . تخریب اور تعمیر کے ارتقائی عمل سے ہر لمحہ نئی صورت پذیر ہوتی رہتی ہے . . . . . . زندگی ایک ارتقا پذیر حقیقت ہے جو . . . . . انواع اور جماعت کے ارتقا کی شکل میں اپنے راز کھولتی ہے . . . . . سماج کے اندر طبقات کی کشمکش بڑی حقیقت ہے . . . . . انسان کا شعور ان سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے جن میں ایک شخص حرکت کرتا ہے۔ شعور کی پیدائش ان مادی روابط سے ہوتی ہے جن سے ایک انسان کا اس سماجی زندگی میں گزرنا لازمی ہے . . . . . . ادب کو انفرادی نہیں، اجتماعی خواہشات اور صحت بخش تصورات کا آئینہ ہونا چاہئے . . . . . . حقائق اشیاء کا یقینی علم صرف مادی تجربوں سے ممکن ہے . . . . . . ادیب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں جو سماج میں پائی جاتی ہیں . . . . . . ہر لمحہ بدلتی ہوئی اور متحرک دنیا میں حقائق کی اصل نوعیت کا گرفت میں لانا آسان نہیں . . . . . . وہی فن کار یا ادیب اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو جدلیاتی نقطۂ نظر رکھتا ہے اور حقائق کے سمجھنے میں اس سے کام لیتا ہے . . . . . . تجربہ عمل کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اور یہ عمل انفرادی نہیں سماجی شکل رکھتا ہے . . . . . . ادب بغیر سماجی اظہار کے ادب نہیں ہوتا۔ حکیمانہ حقیقت نگاری جسے سماجی حقیقت نگاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ "تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں"۔ ان چند جملوں سے جو ادھر ادھر سے چن لئے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے احتشام صاحب بھی کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ وہی باتیں جو اختر حسین رائے پوری نے کہی تھیں، وہی باتیں جو مجنوں گورکھپوری نے کہی تھیں، وہی باتیں جو ہر ترقی پسند نقاد کہتا ہے، وہی باتیں احتشام صاحب بھی کہتے ہیں۔ انہی "حقائق" کی روشنی میں وہ تنقید کے مسئلوں اور نقاد کے فرائض پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

تنقید:- "ادبی تنقید کی صلاحیت براہ راست اس عام شعور کا ایک عکس ہوتی ہے جو سماج میں پیدا ہو جاتی ہے . . . . . . اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے کہ تنقید کو تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے اصولوں کو اس طرح مرتب کیا جائے جس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ انسان ادب سے لطف اندوز ہو سکیں، اس کی حقیقت کو بھی سمجھ سکیں اور اسے انسانی مفاد کے کام میں بھی لا سکیں . . . . . . اصول نقد پر غور کرتے ہوئے ان تاریخی قوتوں کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے ادب وجود میں آتا ہے۔ جن سے انسان کی تمنائیں اور خواہشیں پیدا ہوتی ہیں۔ جن سے تنقید کی صلاحیت وجود میں آتی ہے۔ جن سے انسانی تمدن بنتا ہے اور جن سے ان قدروں کا تعین کیا جاتا ہے جو انسانوں کو آزادی مسرت اور ترقی کی اس منزل تک پہنچا سکتی ہیں جس کے لئے انسان ہر دور میں بیقرار رہے . . . . . . تنقید نگاری ان تمام علوم سے وابستہ ہو جاتی ہے جن سے انسانی تہذیب و تمدن کی تخلیق اور تعمیر ہوئی ہے . . . . . .

نقاد:- "اس کا فریضہ ان حالات کا تجزیہ ہے جن میں شاعری پیدا ہوتی ہے۔ ان خیالات کی تنقید ہے جو شاعر کے تجربے میں آ کر فنی شکل میں پیش ہوئے ہیں، ان تصورات کا احتساب ہے جنہیں وہ ایک ذمہ دار انسان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے . . . . . . اس کے سامنے یہ نہیں ہے کہ کتاب کی اچھائی یا برائی بیان کرے بلکہ وہ تو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ کتاب سماج کی کن اچھائیوں اور برائیوں کی آئینہ دار ہے، اس میں زندگی کے کن حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور کتنی گہری نظر سے۔ . . . . . وہ پوری چھان بین اس امر کی کرتا ہے کہ مصنف کی کاوش زندگی کے دھارے میں کیا اہمیت رکھتی ہے۔ نقاد کے لئے فن کار اور اہل ہنر کے خیالات کی درستی پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے . . . . . . وہ ادب اور زندگی کے تعلق کا مطالعہ خاص طور سے کرتا ہے اور اسی تعلق کی روشنی میں ادبی کارناموں کی اہمیت کا اندازہ لگاتا ہے، ادیب کے خلوص کا پتہ چلاتا ہے، ادب کے بہترین اور پائدار قدروں کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے اور انہیں تمدن کا جزو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ رطب و یابس میں تمیز کرنا، غیر مخلصانہ اور سچے ادب میں فرق پیدا کرنا، اُجالے کو اندھیرے سے الگ کرنا نقاد کا کام ہے . . . جس طرح بغیر ایک مخصوص فلسفۂ حیات رکھے ہوئے اچھا ادیب نہیں بن سکتا اسی طرح ایک اچھا حکیمانہ دماغ رکھے بغیر کوئی شخص اچھا نقاد نہیں بن سکتا . . . . . نقاد کے لئے . . . . . یہ ضروری ہے کہ اس کی نگاہ حقیقتوں کے اس پیچیدہ راستے سے ہو کر گزرے اور وہ ان تمام اثرات کا پتہ لگائے جنہوں نے ادیب کے شعور کو مرتب کیا ہے۔"

یہ منتشر باتیں جو احتشام صاحب کے خیالات کی طرف اشارہ کرتی ہیں ایسی نہیں کہ ان پر تنقید کی عمارت کی تعمیر کی جا سکے۔ وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ اصول نقد پر غور کرتے ہوئے کون سی باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ رہا نقاد کا فریضہ تو وہ یہ ہے کہ وہ مارکسی ڈھنگ میں ادب کا تجزیہ کرے۔ خیالات و تصورات کا احتساب کرے۔ "خیال لفظوں سے زیادہ اہم ہے۔"

کہتے ہیں: "ایک اچھا حکیمانہ دماغ رکھے بغیر کوئی شخص اچھا نقاد نہیں بن سکتا۔" "ان مضامین میں ایک حکیمانہ شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہرانہ انداز ہوتے ہیں ..... بہ حیثیت نقاد کے میں ادراک حقیقت کے عام اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے (جو متعدد علوم کی مدد سے ہاتھ آئے ہیں اس کی (فن کار کے سماجی مقصد کی) جستجو کرتا ہوں تاکہ کسی کی تصنیف کی صحیح اہمیت واضح کر سکوں ...... وہ اصول تنقید .... جس کی اشاعت کرنا اور جن کو عام بنانا میرا مقصد ہے۔ ادب مخصوص خارجی حالات کا مظہر ہوتا ہے، یہ بات ساری دنیائے ادب میں مشترک ہے اس لئے اگر خارجی حالات کا مطالعہ عالمانہ شعور کے ساتھ کسی خاص اصولوں کو مدنظر رکھ کر کیا جائے تو پھر نقالی کی بحث ہی نہیں رہ جاتی ...... ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے، ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے اسے تنقید کے چند مقررہ فرسودہ اصولوں اور نظریوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آ سکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو ...... یہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کا نام لے کر اپنے خیالات کا اظہار کروں .... بعض مضامین برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں ...... جہاں تک ہو سکتا ہے میں دیانت دار رہنے کی کوشش کرتا ہوں ــــ"

حکیمانہ دماغ ..... عالمانہ شعور کا نتیجہ بس یہی ہے: مارکسی فلسفہ کی غیر حکیمانہ اور غیر عالمانہ تکرار۔ کیا احتشام صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ مارکس سے الگ ہو کر وہ اپنی غور و فکر کے بل بوتے پر اس فلسفہ تک پہنچے ہیں جس کی "بنیاد "تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہے؟" کیا وہ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ انہوں نے جس "حکیمانہ شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کی ہے"، وہ مارکس کا دین نہیں؟ کیا ان کا کہنا ہے کہ ادراک حقیقت کے عام اصول۔ یہ کون سے اصول ہیں جو متعدد علوم کی مدد سے ہاتھ آئے ہیں۔ اُن کی حکیمانہ بصیرت اور عالمانہ شعور کا نتیجہ ہیں؟ کیا وہ پڑھنے والوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ اصول تنقید جن کی اشاعت کرنا اور عام بنانا ان کی زندگی کا مقصد ہے، وہ بغیر کسی غیر کی شرکت کے ان کے دماغ کے زائیدہ ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو پھر یہ کہنے کا فائدہ کہ "میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہرانہ انداز ہوتے ہیں۔" "ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے۔" احتشام صاحب دیانت دار آدمی ہیں پھر وہ کیسے کہتے ہیں: "اگر خارجی حالات کا مطالعہ عالمانہ شعور کے ساتھ کسی خاص اصول کو مدنظر رکھ کر کیا جائے تو پھر نقالی کی بحث ہی نہیں رہ جاتی۔" 'عالمانہ شعور'، 'خاص اصول'، اپنے نہیں مانگے کے ہیں پھر نقالی ناگزیر ہے۔ نقالی کہنے سے خفا ہوتے ہیں تو اتباع کہئے، تقلید کہئے، پیروی کہئے۔ "یہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کا نام لے کر اپنے خیالات کا اظہار کروں" لیکن اپنے نام سے دوسروں کے خیالات کی تشہیر؟

کہتے ہیں: "اچھی تخلیقی قوت اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے ..... تخلیقی عمل ہی میں تنقیدی عمل کی نمود بھی ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں ..... تخلیق کی ایک شکل تخلیق کے اندر بھی چھپی بیٹھی ہے اور تقریباً ہر ادب کی ابتدا کے ساتھ ہی وجود میں آتی ہے ..... ایک بھدی اور سطحی شکل میں تنقید کا ادب کے ساتھ ہی پایا جانا ضروری ہے۔" یہ ایلیٹ ہے لیکن صورت کچھ مسخ ہو گئی ہے۔ "تقریباً ہر ادب کی ابتدا کے ساتھ ہی وجود میں آتی ہے۔" تقریباً کیوں؟ "بھدی اور سطحی" کیوں، اگر اچھی تخلیقی قوت اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں مارکس کی زبان سے کہتے ہیں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں مارکس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

۱۔ "زندگی کے بھیدوں کو سمجھنے کی طاقت اور انہیں فاش کرنے کا یقین اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان شعوری طور پر سماج کی رفتار ارتقاء اور فلسفۂ تغیر سے واقف ہو۔ مارکس کے فلسفہ اور دوسرے فلسفیوں کے افکار میں ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ اور لوگ فلسفہ کی مدد سے محض دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں اور

مارکس اس کی مدد سے دُنیا کو بدلنا چاہتا ہے۔"

۲۔ "جس فلسفہ نے مکمّل طور پر دونوں کو الگ کر دیا ہے اور تغیر کا ایسا مادّی اور سائنٹیفک نظریہ پیش کیا ہے جس سے ہر جگہ ان کی شکلیں پہچانی جا سکیں وہ مارکسزم ہے۔ اس وقت تک جس مادّی نقطۂ نظر کا ذکر کیا گیا ہے وہ کم و بیش اس پر مبنی ہے۔"

۳۔ "ذرائع پیداوار اور انسانی شعور کے عمل اور ردّ عمل سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔"

۴۔ "لینن نے کہا ہے کہ طبقاتی شعور جبلّی یا پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ حاصل کیا جاتا ہے۔"

۵۔ "حقیقت کو اس کی مختلف شکلوں میں پہچاننے کے لئے ہر افسانے کے مواد کا مطالعہ سماجی اور معاشی رجحانات طبقاتی تضاد اور جہد حیات کی روشنی میں کرنا چاہئے۔"

۶۔ "مادّی انقلاب کے بغیر تمدّن کی قدریں نہیں بدلتیں۔"

یہ مثالیں بلاتخصیص پیش کی گئی ہیں۔

سرور صاحب سے بہت سی باتوں میں احتشام صاحب اختلاف کرتے ہیں۔ سرور صاحب تخلیقی تنقید کا پرچار کرتے ہیں۔ احتشام صاحب تخلیقی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتے۔ وہ تنقید کو تشریح اور تفسیر بھی نہیں بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید کا اصل کام ان کیفیات کی بازآفرینی نہیں جو کسی شاعر یا ادیب پر گزری ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نقّاد کا کام ان کیفیات کو دہرا دینا نہیں ہے جو ادیب پر تخلیق کے وقت گذرتی ہیں بلکہ ادب کے متعلق فیصلہ کن انداز میں رائے دینا ہے۔ نقّاد فیصلہ یا رائے کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اصول تنقید مغرب اور مشرق کے نہیں ہوتے، ان میں عالمانہ اور حکیمانہ ہمہ گیری ہوتی ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ملتی ہیں اور ان باتوں کے پیچھے وہی مارکسی نظریہ کارفرما ہے۔ "نقّاد شاعر کا سینہ اور ادیب کا دل چیر کر اندر جھانکتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس نے کہاں تک حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی ہے۔ وہ فن کار اور اہل ہنر کے خیالات کی درستی پر بھی نظر رکھتا ہے، رطب و یابس کی تمیز کرتا ہے سطحیت کا پول کھول دیتا ہے"۔ یعنی وہ دیکھتا ہے کہ ادیب یا شاعر نے مارکسزم کا مطالعہ کس حد تک کیا ہے اور اس کو کہاں تک اپنایا ہے۔ اس کے خیالات کہاں تک درست یعنی مارکسی ہیں اور اس نے 'اسرار حیات' کو کس حد تک فاش کیا ہے۔ کیوں کہ "مادّی فلسفہ، تاریخی شعور اور سماجی تجزیہ کی کسوٹی پر پورے اُترنے والے خیالات ہی اسرار حیات کے فاش کرنے والے خیالات کہے جا سکتے ہیں۔" اور وہ اصول جن میں حکیمانہ اور عالمانہ ہمہ گیری ہوتی ہے، جو مغرب و مشرق میں یکساں ہیں، مارکسی اصول ہیں۔

دوسرے ادبی مسئلوں کی طرح، مواد اور ہیئت پر بھی بار بار اظہار خیال ہوتا ہے: کیا پیش کیا جائے اور کیسے؟

"اگر خیال کو دوسروں تک پہنچانا ہے تو اس کے لئے ایسے اسلوب بیان کی ضرورت ہے جس سے سماج واقف ہو اور ایسی ہیئت اور شکل کی ضرورت ہے جو اظہار کی سماجی ضرورت کو پورا کرتی ہے ..... دُنیا کو ترقی کی راہ دکھانے میں ادب کا بھی ہاتھ ہے اور یہ رہنمائی ہیئت سے نہیں صحت بخش خیال ہی سے ہو سکتی ہے۔ ہیئت کا کام یہ ہے کہ وہ خیال اور مواد کو بہترین شکل میں پیش کر دے ..... وہ (ادیب) سوچ کر لکھتا ہے، کسی مقصد کے ماتحت لکھتا ہے، وہ کچھ لوگوں کے لئے لکھتا ہے۔ اس طرح اس کا تعلق سماج کے مقصد، وجدان اور تقاضوں سے ہو جاتا ہے اور یہی بات اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ جس وقت وہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی لفظ غلط نہ استعمال کرے، اس وقت اس کے دل میں کیا یہ خیال نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کوئی بات ایسی نہ کہے جو اس کی ذمہ دار حیثیت کی منافی ہو؟ ہر حال میں خیال لفظوں سے زیادہ اہم ہے ..... نقّاد صرف ہیئت اور صورت کے حسین لباس سے آسودہ نہیں ہو سکتا مواد اور مضمون کے صحت بخش عناصر کا تجزیہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہے ...... مواد کی حقیقت کا جائزہ لینے کے بعد تخلیقی ادب کے سماجی اظہار کا دیکھنا بھی ضروری ہے۔ مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے اُس کی آمیزش سے ادب بنتا ہے ..... نقّاد کو اس پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ مواد کے پیش کرنے کے طریقے کو بھی دیکھے ..... ہیئت اور اظہار کی بھی الگ سماجی حیثیت ہے"

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں - یہاں بھی وہی مارکسی خیالات کا ایک رُوپ ہے ۔ وہ کہتے تو ہیں کہ مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے اس کی آمیزش سے ادب ادب بنتا ہے لیکن وہ "مواد اور مضمون کے صحت بخش عناصر" پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ ہیئت کی اہمیت باقی نہیں رہتی ۔ وہ مواد کی حقیقت کا جائزہ لیتے ان کی تنقیدوں پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی —— اور ہیئت کا جائزہ نہیں لیتے ۔ یہ مارکسی نقّاد کی عام کمزوری ہے وہ فنّی خوبیوں کا عام میں ذکر کرتا ہے لیکن ان خوبیوں کا تجزیہ نہیں کرتا ۔ وہ کسی فن پارے میں اپنے ڈھنگ کے خیالات ڈھونڈتا ہے ۔ اگر ایسے خیالات مل گئے تو وہ اس فن پارے کی کرتا اور نہ ملے تو مذمت کرتا ہے وہ یہ نہیں سوچتا کہ اگر اس میں فنی خوبیاں نہیں تو یہ ادب نہیں ۔ پھر اس کے مواد کا تجزیہ بیکار ہے ۔

میں نے کہا ہے کہ احتشام صاحب 'حکیمانہ' اور 'عالمانہ' کا برابر استعمال کرتے ہیں ' لیکن ان کی حکیمانہ اور عالمانہ کاوشوں کا کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکلتا جس سے پڑھنے والے مرعوب ہو سکیں ۔ وہ باتیں بڑی بڑی کرتے ہیں : "تنقید نگاری ان تمام علوم سے وابستہ ہو جاتی ہے جس سے انسانی تہذیب و تمدن کی تخلیق اور تعمیر ہوئی ہے . . . . . تجزیہ کے لئے ان تمام علوم کی ضرورت ہے جو انسانی فطرت اور شعور کی فطری اور ارادی تشکیل سے تعلق رکھتے ہیں . . . . . نقاد کو ماہر نفسیات ، ماہر تعلیمات ، ماہر سیاسیات ، ماہر اخلاقیات وغیرہ کی حیثیت سے ادب کو دیکھنا چاہئے ۔ اگر تنقید کوئی علمی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا ۔ جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے . . . . . ہر علم سے مدد لے کر ادب کو سمجھنا چاہئے . . . . . اگر تاریخ، نفسیات ، معاشیات اور سائنس کی مدد سے اصول نقد معین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش رائیگاں نہ جائے گی . . . . . ایک اچھے نقّاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب فراہم کرے اور ہر مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالے ——" بول بڑے ہیں ۔ کہنا صرف یہ ہے کہ نقّاد کو مارکسی فلسفہ سے واقف ہونا احتشام صاحب اس فلسفہ سے آگے نہیں دیکھتے کیونکہ ان کے خیال میں یہی تمام علم ہے ۔ پھر جدید علوم کی باتیں صرف ایک دھوکہ ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بھی ۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں کوئی ناانصافی کر رہا ہوں ۔ وہ خود کہتے ہیں : "اس فلسفہ (مارکسزم) کے بانیوں اور مبلغوں نے اس کو سماج کے سبھی مظاہر پر منطبق کر کے دیکھا ہے اور خاص کر ادب کی مادّی بنیادوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے جب کبھی ادب کے مادّی تصور پر غور کرنے کی ضرورت ہو تو اس فلسفے کے اصولوں کو سامنے رکھنا ہوگا کیونکہ دوسرے مادّی اور عمرانی فلسفے تغیّر کے تمام پہلوؤں کو ایک ساتھ حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھتے ۔"

اس طرح وہ بعض اہم موضوعات کو اپنے حکیمانہ شعور کا نشانہ بناتے ہیں لیکن برابر کا نشانہ خطا ہو جاتا ہے اور ہر موضوع ان کے پنجہ سے بچ نکلتا ہے دیکھئے : "وہ شعور اور لاشعور کی باتیں چھیڑتے ہیں : "فرائڈ اور اس کے ہم خیال ماہرین علم النفس نے انسانی اعمال اور افعال کی نئی تشریح پیش کی ۔ شعور اور لاشعور کے محرکات کا پتہ لگایا ۔ ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کو جنسی میلانات کے بعض پوشیدہ ، نامعلوم اور راستے سے ہٹے ہوئے اثرات کا نتیجہ بتایا ۔ انفرادی طور پر یا ادیب کی زندگی میں جنسیت کو جو جگہ حاصل ہوتی ہے اس میں جنسی دباؤ ، جنسی تشکن ، تحت شعور اور لاشعور میں جنسی خواہشات کا عمل ، علامات کی شکل میں اس خواہش کا ظاہر ہونے کی کوشش کرنا اور پھر اس خواہش کا ارتفاع ، ان عنوانات کے ماتحت ادیب کے کارنامے کی تشریح اور تحلیل کی جاتی ہے ——" پھر یہ مانتے ہیں کہ "یقیناً ایک حد تک اس سے مدد لینے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی کیونکہ محرکات شعر کی پیدائش میں شاعر کی پوری شخصیت بہت بڑا درجہ رکھتی ہے ۔" وہ اس سے مدد نہیں لیتے ۔ اسے رد کر دیتے ہیں ، صرف اس لئے رد کر دیتے ہیں کہ اس سے مارکسزم کی توہین ہوتی ہے :۔ "جب کوئی نقّاد صرف لاشعور کو حقیقت مان کر ادب و شعر کے سارے سرمائے کو اس پر ڈھالنے لگتا ہے تو انسانی شعور کی قوت تخلیق کی بڑی توہین ہوتی ہے اور مادّی زندگی کے وہ محرکات جو افراد ہی کو نہیں قوموں اور جماعتوں کو جہد حیات کا سبق دیتے ہیں ، غیر اہم معلوم ہوتے ہیں ۔" پھر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ لاشعور پر بھی خارجی حالات کا اثر ہوتا ہے : "اگر خارجی حالات جن کے مظہر تہذیب ، اخلاق اور سماج ہیں ، لاشعور پر اثر انداز نہیں ہوتے تو وہ دبا کیوں پڑا رہتا ہے ، بھیس کیوں بدلتا ہے خارجی حالات سے بالکل بے نیاز کیوں نہیں ہوتا —— ؟"

بس اسی قدر ۔ وہ مارکسزم کو حقیقت مان کر آگے بڑھتے ہیں پھر کسی موضوع پر وہ غیر جانبداری کے ساتھ نہ سوچ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ لاشعور کا تجزیہ بھی خارجی طاقتوں کی روشنی میں ہونا چاہئے لیکن وہ لاشعور کا تجزیہ نہیں کرتے ۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "محرکات شعر کی پیدائش میں شاعر کی پوری

شخصیت بہت درجہ رکھتی ہے۔" لیکن پوری شخصیت کا کبھی تجزیہ نہیں کرتے کیونکہ وہ نفسیات اور تحلیل نفسی سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔۔ وہ شعور، تحت شعور اور لاشعور کا نام لیتے ہیں لیکن فرائڈ کی مدد سے بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ انسان کی زندگی میں، شعری محرکات میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ فرائڈ کے نظریہ کے مطابق لاشعور کا تجزیہ ممکن نہیں۔ لاشعور دماغ کے تہ خانہ میں چھپا رہتا ہے اور چھپ کر اثر انداز ہوتا ہے، کسی خاص جانب دھکیل دیتا ہے۔ اور ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ ہم اس جانب کیوں جا رہے ہیں۔ یہ ایک زبردست میلان ہے اور ہم نہیں جانتے کہ یہ میلان کہاں سے آتا ہے اور کیوں اس کا اثر ایسا ہوتا ہے کہ اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اگر یہ میلان شعور کی سطح پر نہیں ابھرتا تو اس کا تجزیہ بھی خارجی حالات کی روشنی میں ممکن نہیں ——

میں فرائڈ کے نظریہ کی تائید نہیں کرنی چاہتا —— کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی کی باتیں سمجھ لینے کے بعد ہی اس پر اعتراض ممکن ہے۔ احتشام صاحب یہ بھی نہیں بتاتے کہ تحت شعور کی شعری تخلیق میں کیا اہمیت ہے۔ یہ کہنا کہ تحت شعور بھی خارجی حالات سے متاثر ہوگا کوئی بات نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شعری تخلیق کے وقت خیالات، جذبات، نقوش تحت شعور سے ابھرتے ہیں یا نہیں۔ اس موضوع پر بھی کوئی روشنی ڈالی جاتی۔ شعور آزاد ہے یا گرفتار، مالک ہے یا غلام —— احتشام صاحب یہ بھی نہیں بتاتے۔ یعنی اس موضوع کو اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ لاشعور نہیں شعور کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔

وہ ادب اور اخلاق پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن اسے بھی اندھیرے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے طویل مضمون کا لب لباب یہی ہے: "ادب کو انفرادی نہیں اجتماعی خواہشات اور صحت بخش تصورات کا آئینہ ہونا چاہئے ...... اخلاق کا ایک عام اور یکساں معیار بنایا جائے اور جب اس کی خلاف ورزی ہو تو لوگ نکتہ چینی کریں ...... علم الاخلاق کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ جنسی تعلقات کو منضبط کرے اور ہر مرد عورت کی زندگی میں ایسا توازن قائم کرے جس کی تلاش میں انسان ابتدا سے آج تک سرگرداں ہے ..... ادب اور اخلاق دونوں کا مقصد یہی ہے کہ ایک ایسے نظام زندگی کی بنیاد ڈالی جائے جس میں گندگی نہ ہو حسد نہ ہو، نفرت نہ ہو، ایسا نظام نظریہ اور عمل کے اتحاد سے قائم ہو سکتا ہے۔"

حالی کی طرح احتشام صاحب بھی اخلاق کو اس کے محدود اور سطحی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ آقا کے اخلاق اور نوکر کے اخلاق کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اخلاق کچھ اور معنی بھی رکھتا ہے، ایک عالمگیر اصول ہے جو اخلاق کی محدود اور بوقلموں صورتوں کے پیچھے کارفرما ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ انسان اپنی اندرونی زندگی میں توازن حاصل کر سکے اور اس کی انفرادی اور سماجی زندگی ہم آہنگ ہو جائے۔ اخلاق کا ایک عام اور یکساں "معیار" بنانے کی ضرورت نہیں —— اخلاق کے عالمگیر اصول کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اخلاق کا کام صرف جنسی تعلقات کو منضبط کرنا نہیں۔ بات یہ ہے کہ اخلاق کو بھی اس عینک یعنی مارکسزم سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسا نظام زندگی جس میں گندگی نہ ہو، فحاشی نہ ہو، حسد نہ ہو، نفرت نہ ہو، مارکسزم ہی قائم کر سکتا ہے۔ جہاں یہ نظام قائم ہو گیا پھر سب مسئلے، — اخلاق کے بھی مسئلے حل ہو جائیں گے —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کی "انفرادی" خصوصیت یہ ہے کہ وہ باتوں کو چھیڑتے ہیں لیکن اس پر کافی روشنی نہیں ڈالتے مسئلوں کو الجھاتے ہیں سلجھاتے نہیں، بحث کرتے ہیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

"ادب برائے ادب کا اور ادب برائے زندگی کا کیا مفہوم ہے؟" ادب میں مقصد اور افادیت سے کیا مطلب ہے؟ پروپیگنڈا کسے کہتے ہیں اور ادب اور پروپیگنڈا میں کیا رشتہ ہے؟ کیا کائنات کا کوئی مقصد ہے؟ کیا زمان و مکان کی عظیم الشان وسعت میں انسان کی کوئی حقیقت اور اہمیت ہے؟ وہ کسی مقصد اور منزل کی طرف بڑھ رہا ہے یا اس میں بڑھنے کی طاقت ہے؟ ..... ادیب عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے یا کوئی غیر معمولی طاقت اس کے پاس ہوتی ہے۔ وہ ماحول سے بنتا ہے یا ماحول اس کی تحریر سے بنتا ہے، ادیب اور ماحول میں کیا تعلق ہے؟ وہ ماحول سے بیگانہ ہو کر بھی کچھ لکھ سکتا ہے؟ ...... یہ مختصر سا نمونہ ہے۔ نتیجہ جو نکلتا ہے وہ یہ کہ: "تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں ورنہ ہم دیکھتے کہ ....." "ہو سکتا ہے کہ ان سوالوں کے قطعی اور یقینی جواب نہ دیئے جا سکیں ....."

دوسری "انفرادی" خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیدھی طور پر بات نہیں کر سکتے۔ ان کا دماغ سیدھے اور ہموار راستے پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ وہ ٹیڑھا پیچ و خم کھاتا ہوا چلتا ہے۔ "بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی" ہمیشہ بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ ان کے مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں" کو دیکھئے ——

'کیوں' کے ساتھ وہ کس کے لئے کا سوال بھی اُٹھاتے ہیں: "اس سوال سے یہ دوسرا سوال بھی وابستہ ہے: میں کس کے لئے لکھتا ہوں؟" جواب یہ ہے: "میں کو سامنے رکھتا ہوں کہ ہر ادیب اور شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے ..... بہ حیثیت نقاد کے میں ادراک حقیقت کے عام اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ..... کی (فن کار کے سماجی مقصد کی) جستجو کرتا ہوں تاکہ کسی تصنیف کی اہمیت واضح کر سکوں۔ خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھا سکوں ..... ادب کے فنی اور جمالیاتی اور ذوق کے ارتقا اور نشو و نما کی تاریخ بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ پہلو ادب کی اثر پذیری میں اضافہ کر کے مصنف اور قاری کے رشتہ کو مضبوط کرتے انہی مسائل کو جانچنے پرکھنے اور واضح کرنے کے لئے کہتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس سے دوسرے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ——"

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر صرف اس قدر کہنا تھا تو چودہ صفحوں کی کیا ضرورت تھی۔ وہ مغربی کتابوں کا ذکر کیا ضرور تھا؟ پھر اگر یہ صحیح ہے: سچ تو یہ ہے کہ ان کا تھوڑا سا حصہ میری سمجھ میں آیا، تو انہیں یہ نتیجہ نکالنے کا کیا حق تھا کہ "یہ خیالات کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہیں اور عذر گناہ کی کوشش ہیں۔" پھر جسے "دماغ سوزی" کی ہے وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ کیوں اور کس کے لئے صاف جواب نہیں ملتا۔ کس کے لئے؟ دوسروں کے لئے، اپنے لئے نہیں —— یہ دوسرے کون ہیں؟ ہیں؟ مزدور و کسان؟ سرور صاحب؟ پھر وہ کیوں سمجھتے ہیں کہ "اس سے دوسرے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟" اب رہا کیوں کا مسئلہ تو اس کا جواب یہ کہ وہ انہی جانچنے پرکھنے اور واضح کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔ اس لئے کہ دوسرے بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں یعنی وہ دوسروں کے لئے لکھتے ہیں۔ احتشام صاحب کیوں، کیسے اور کیا اور کس لئے میں فرق نہیں کرتے —— سوال ہے کیوں؟ جواب ہے کیا لکھتے ہیں اور کس کے لئے، کہہ کر اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

اس طرح وہ بہت سی باتیں کہتے ہیں اور ان میں تضاد ہوتا ہے اور اس تضاد کو محسوس نہیں کرتے "ایک شخص کی بہت سی شخصیتیں نہیں ہو سکتیں۔ کم سے کم اس کی ذمہ دارانہ شخصیت ایک ہی ہوگی۔" یعنی اس کی بہت سی شخصیتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے اس کی آمیزش (تعلق کی آمیزش کیسی ہوتی ہے؟) سے ادب ادب بنتا ہے۔ وہ مواد اور ہیئت کے ساحرانہ امتزاج کا بھی نام لیتے ہیں پھر مواد کو زیادہ اہم بھی سمجھتے ہیں، لفظوں سے زیادہ اہم ہے" —— یہ نہیں سمجھتے کہ اچھے ادب میں خیال اور لفظوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے اور پیچھے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا —— کہتے ہیں: "تشریح میں کیفیات کی بازآفرینی بھی تو نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی اور پر گزرے ہوئے اثرات کو پوری طرح اپنے اوپر طاری کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ جذبات خاص قسم کے محرکات اور پیچیدہ حالات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔" اور پھر کہتے ہیں: "اپنے ذوق اور وجدان کے سہارے کسی ادیب یا شاعر کی روح میں اتر جانا ہے ..... نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام اثرات کا پتہ لگائے جنہوں نے ادیب کے شعور کو مرتب کیا تھا ——" کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

"نقادوں سے مراد وہی نقاد ہیں جو کسی مخصوص اصول کی بنا پر نقد کرتے ہیں ...." "اصولوں کا تصور بغیر حقیقت اور قطعیت حکیمانہ جانچ کے نہیں کیا جا سکتا۔" لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اصول تنقید ہر زمانے میں بنتے بدلتے اور بگڑتے رہتے ہیں ..... مطلق قدر زندگی کے بدلتے ہوئے نظام میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی ——" جب زندگی تبدیل ہوگی تو قدریں کیوں نہ تبدیل ہوں گی؟ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نقاد ادیبوں کو مختلف "عینکوں" سے دیکھتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اصول کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی پھر وہ بھول جاتے ہیں کہ مارکس نے زندگی کے اسرار کو پا لیا ہے۔ جن اصولوں کی مارکسی فلسفہ پر بنیاد رکھی جائے گی کیا وہ بھی ناپائدار ہوں گے؟ "خیال مادّہ ہی سے پیدا ہوتا ہے چاہے قوت متخیلہ اس میں کتنی ہی رنگ آمیزی کرے" ..... "قوت متخیلہ بہت آزاد قوت ہے لیکن اس کی آزادی بھی فرد کے شعور سے باہر جا کر دم توڑ دیتی ہے ——" خیال مادّہ سے پیدا ہوتا، کیا قوت متخیلہ مادّہ سے نہیں پیدا ہوتی؟ اگر خیال بھی مادّہ ہے اور قوت متخیلہ بھی مادّہ ہے تو قوتِ متخیلہ میں رنگ آمیزی کرنے کی قوت کہاں سے آئی؟ کیا قوت متخیلہ فرد کے شعور سے باہر جا سکتی ہے؟ "جب خیال مادہ کا عکس ہوگا پھر خیال میں کسی نہ کسی شکل میں حقیقت ضرور موجود ہوگی۔ خواہ وہ اچھی صورت میں پیش کی گئی ہو، خواہ بری میں ——" اگر خیال مادہ کا عکس ہے تو وہ حقیقت کو بری شکل میں کیسے پیش کر سکتا ہے؟ پھر خیال مادّہ ہے، مادّہ سے پیدا ہوتا ہے، مادہ کا عکس ہے، مادّہ کو بری شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ تو وہی تصوف کی بازی گری ہوئی جس سے مارکسی نقاد دور رہنا چاہتے ہیں۔

کچھ اور باتیں سنئے: "غزل کے ہر شعر کا پس منظر اور روایت ہوتی ہے اس لئے شعر فہمی کے قاعدے معین نہیں کئے جا سکتے ——" "ایک تہذیب و تمدن

کا دور اپنے گزشتہ تہذیب و تمدن کے دور سے مدد لے کر آگے بڑھتا ہے چاہے وہ اثبات میں ہے یا منفی میں . . . . . ” ”ماضی کی تعریف میں یہ سب سے بڑی بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو حال بھی پیدا نہ ہوتا“ . . . . ”شاعری کا وجود کب ہوا کوئی نہیں بتا سکتا لیکن انسانی تہذیب نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہوں گی اس وقت شاعری پیدا ہوئی ہوگی ——“ ”فنون لطیفہ کی تاریخ میں ایسے فن کار اور ایسے فنی نمونے دکھائی دیتے ہیں جو ہر اصول کو توڑ دیتے ہیں تاہم اصول بنانے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کی کوشش ہونا چاہئے —“ ”پرویزی حیلے انسانی فطرت کا جزو نہیں حالات سے پیدا ہوتے ہیں ——“

شعر فہمی کے قاعدے مقرر نہیں ہو سکتے تو شعر فہمی بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ایک قسم کا نزاع ہے۔ نفی میں مدد کیسے لی جاتی ہے؟ ایک تمدن دوسرے تمدن پر اثر ڈالتا ہے لیکن یہ کون سی نئی بات ہوئی؟ ماضی سے حال پیدا ہوتا ہے، حال سے استقبال پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی کون بات ہوئی جو اس عالمانہ طور پر کہی جائے؟ پھر ماضی کی ”تعریف“ کی ضرورت کیا اور بڑی تعریف اور چھوٹی تعریف کا تفرقہ کیسا؟ شاعری کا وجود کب ہوا — اگر اس بات کا علم نہیں تو پھر اس کا ذکر کیا اور کون سی عالمانہ بات ہوئی کہ ”انسانی تہذیب نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہوں گی اس وقت شاعری پیدا ہوئی ہوگی ——“ اگر فن کار ہر اصول کو توڑ دیتے ہیں تو اس کا منطقی نتیجہ کیا ہوا؟ اصول بنانے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کی کوشش کیوں ہونا چاہئے؟ پرویزی حیلے انسانی فطرت کا جزو نہیں تو وہ آئے کہاں سے؟ حالات سے؟ حالات، مادی حالات سے؟ زندگی کے حقائق سے؟

احتشام صاحب جانتے ہیں کہ روسو کا نظریہ ہے کہ انسان معصوم ہے، ساری برائیاں سماج سے آئی ہیں۔ کیا وہ بھی ”شریف وحشی“ کے خیال کو تسلیم کرتے ہیں؟

ترقی پسند نقاد اپنی ہر تنقید میں ”حضرت آدم سے شروع کرتے ہیں۔“ ”زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے جو تعمیر و تخریب کے ارتقائی عمل سے ترقی پذیر ہے“۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں اس قدر تکرار ہے، وہ نظیر پر لکھیں یا غالب پر، اختر شیرانی یا مجاز پر ایک ہی قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ جدلیاتی زندگی، طبقاتی کشمکش، حقیقت و خیال کی مادیت۔ غرض اس قسم کی باتیں وہ اشارے میں ہوں یا تفصیل کے ساتھ کر لیتے ہیں تب موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ پروفیسر ہل ہم لوگوں کو ”گادر“ پڑھایا کرتے تھے بہت تفصیل کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مسٹر آر صدر شعبۂ انگریزی نے مجھ سے پوچھا ”ہل کیا پڑھا رہے ہیں؟“ میں نے کہا: ”گادر“ کچھ دنوں کے بعد آر صاحب نے پھر دریافت کیا ”ہل اب کیا پڑھا رہے ہیں؟“ میں نے کہا: ”گادر!“ وہ بول اٹھے: ”ہل گادر پر ایک کتاب کیوں نہیں لکھ ڈالتے ہیں؟“ ”میں سمجھتا ہوں کہ اگر سارے ترقی پسند نقاد مل کر ایک کتاب لکھ ڈالیں اور اس میں وہ ساری باتیں کہہ ڈالیں جن کی وہ تکرار کرتے ہیں، وہ سارے اسرار حیات فاش کر دیں جو ان پر منکشف ہوئے ہیں تو پڑھنے والے اس ناموزوں تکرار سے تو نجات پا سکیں گے۔ کم سے کم احتشام صاحب ہی یہ تکلیف گوارا کریں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ایک ہی قسم کی باتوں کی تکرار کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ وہ اشاروں میں باتیں کرتے ہیں اور تفصیل میں نہیں جاتے۔ اگرچہ وہ تفصیل کی شدید ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں۔ بہرکیف، ایک طرف تو زندگی کی جدلیات کی بات اٹھائی جاتی ہے اور دوسری طرف غدر کی۔ وہ کسی شاعر (غدر کے بعد کے شاعر) کا ذکر ہو۔ بغیر غدر کے ذکر کئے بات ہو ہی نہیں سکتی۔ غدر کا سہارا ضروری ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بچے پہلے پہل حروف تہجی سیکھتے ہیں تو وہ الف سے ی تک یاد کر جاتے ہیں اور اگر آپ پوچھئے تو وہ الف سے ی تک فر فر سبق سنا دیتے ہیں۔ لیکن آپ دال پر انگلی رکھ کر پوچھئے کہ یہ کیا ہے تو وہ اکثر نہیں بتا سکتے ہیں۔ وہ شروع سے سبق دہرانے لگتے ہیں: ا، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د —— یہ دال ہے۔ ترقی پسند نقاد بھی کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں!

احتشام صاحب کہتے ہیں کہ نقاد غیر جانب دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ ہر اثر سے بچ کر جوش کی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں —— ہاں تو نقاد جانبدار ہوتا ہے۔ پھر جب ترقی پسندی اور ترقی پسند شاعری کی بات ہوتی ہے تو وہ جانبداری سے کام لیتا ہے۔ ”لیکن ایک جماعت ایسے ادیبوں کی بھی ہے۔ جنہوں نے راستہ پا لیا ہے چاہے وہ تیز رو نہ ہوں، سبک خرام نہ ہوں، لیکن انہیں اپنی منزل کا نشان معلوم ہے وہ ان راہوں سے واقف ہیں جدھر انہیں جانا چاہئے ——“

”ان اشاروں سے بھی کم از کم یہ اندازہ ہوتا ہی ہے کہ مجاز، سردار جعفری، جواد زیدی، مخدوم محی الدین۔ فیض، مطلبی، سب کے سب انقلاب کی رفتار سے واقف ہیں۔ انہیں تاریخی طور پر سماج کے تضاد اور ہیجان کا حال معلوم ہے۔ انہوں نے دنیا میں انقلابات کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ انہیں زندگی کے وہ موڑ معلوم ہیں جہاں انسانیت کروٹ بدلتی ہے . . . . . ان لوگوں نے اپنی منزل دیکھ لی ہے، اپنا راستہ پہچان لیا ہے . . . . . اردو ادب میں اشتمالی حقیقت نگاری کا دور آ گیا ہے اور اس میں زندگی بجلی کی طرح کوند رہی ہے ——“

یہ کھلی جانب داری ہے۔ کہنا صرف اس قدر ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے مارکسیت کو اپنا لیا ہے۔ احتشام صاحب نے کہا ہے کہ جو نقاد ہر ادبی کارنامے پر سر دھنتا ہے اس کا حال بقول اوسکر وائلڈ اس نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر مال کی تعریف کرتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ احتشام صاحب بھی اس نیلام کرنے والے کی طرح ہر ترقی پسند مال کی تعریف کرتے ہیں اور خریداروں پر اپنی دیانت داری ثابت کرنے کے لئے کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں: "چاہے وہ تیز نہ چلتے ہوں؛ چاہے وہ سبک خرام نہ ہوں۔"

پھر ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ مارکسزم کا اتنا زیادہ پرچار کرنے کے بعد روائتی ادیبوں کے ذکر میں وہ دو چار مارکسی قسم کی باتیں کہہ کر پھر روائتی طرز سے باتیں کرنے لگتے ہیں یہ اختر شیرانی ہیں: ......"انہوں نے محبت اور آزادی کے لئے مر مٹنے کا پیغام دیا۔ اگرچہ اسے آج کی سیاسی اور سماجی کشمکش میں پیام کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے اُردو شاعری کو نئے انداز اور نئے فنی شعور کی دولت عطا کی جس کو ہماری جدید شاعری کے ارتقا میں ہمیشہ اہم جگہ دی جائے گی۔ شاید اب اُردو میں ایسے رومانی شاعر پیدا نہ ہوں گے لیکن آنے والی نسلیں اپنی امنگوں اور اپنے نصب العین کے اظہار کے لئے اختر کی شاعری سے بیباکی جرأت والہانہ پن، موسیقی اور کیف مستعار لیتی رہیں گی اور بہت سے نوجوان عمر کی اس منزل میں جب محبوبہ گمشدہ خواب جوانی اور آسمانی حور معلوم ہوتی ہے۔ ان کی نظمیں گاتے اور اشعار پڑھتے رہیں گے کیونکہ جس عشق کے وہ مغنی ہیں وہ ایک پائندہ جذبہ ہے۔" اور یہ خوجی ہیں: "مختصر یہ کہ خوجی ہندوستان میں ہو یا روس، ترکی اور پولینڈ میں وہ اپنی خصوصیتیں اپنے ساتھ لئے پھرتا ہے۔ وہ اپنی تہذیب کا علمبردار ہے۔ اس کا لاابالی پن اُسے بزدل ہونے سے اور اس کا یقین اُسے شکست کھانے سے بچاتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہماری نظر میں زندگی کے بڑے بڑے سوال بے معنی نظر آنے لگتے ہیں اور اس کے بے اصولی ماحول پر قبضہ جما لیتی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی دُنیا میں ہم مزے لے کر سیر کر سکتے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہ ہوگا کہ ہم کس قدر غیر سنجیدہ ہو گئے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ وقتی طور پر ذمہ داری کا احساس معطل ہو گیا ہے۔ نقاد بھی نوجوان عمر کی اس منزل میں ہے جب محبوبہ گم شدہ خواب جوانی اور آسمانی حور معلوم ہوتی ہے۔ وہ "حقائق کی دُنیا" سے گریز کر کے ایک خیالی دُنیا میں پہنچ گیا ہے اور اسے یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر غیر سنجیدہ ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ شعوری طور پر لوگ کسی فلسفہ کو اپنا لیتے ہیں لیکن ان کی قوت حاسّہ میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ احتشام صاحب کی قوت حاسّہ روائتی قسم کی ہے۔ شعوری طور پر وہ مارکسیت کا راگ گاتے ہیں لیکن دل میں چور چھپا ہوا ہے۔

"تنقید سچائی کی گفتگو میں سائنس سے بالکل قریب ہوتی ہے۔ اس کا اسلوب بیان ایسا ہونا چاہئے جس سے سماج واقف ہو اور ایسی ہیئت اور شکل ہو جو اظہار کی سماجی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔" احتشام صاحب بار بار اسلوب کی سماجی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب اور تنقید کی زبان کو عوام کی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ کہیں ان کا اپنا اسلوب عوام کی سطح سے بہت بلند ہے۔ مزدور و کسان اسے مدتوں تک نہیں سمجھ سکیں گے۔ بہرکیف، وہ سیدھے سادھے ڈھنگ سے لکھتے ہیں ان کے اسلوب میں وہ شگفتگی، وہ شاعرانہ لطف و انبساط نہیں جو سرور صاحب کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کبھی کبھی جب وہ جانب دارانہ طور پر ترقی پسندی کی تعریف کرتے ہیں تو کچھ خطابت کا لطف آ جاتا ہے۔ اور کبھی وہ برافروختہ ہو جاتے ہیں تو اسی ڈھنگ سے لکھتے ہیں: "ان کہنے والوں سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے کیا انہوں نے کبھی اپنے شہر میں تاڑی خانے، شراب خانے اور چکلے نہیں دیکھے ہیں، کیا انہوں نے لوگوں کو قمار بازی میں مصروف نہیں دیکھا ہے، کیا انہوں نے سڑک پر لوگوں کو فحش گالیاں بکتے نہیں سُنا ہے، کیا اُنہوں نے میاں بیوی کے خراب تعلقات خود اپنے خاندان میں یا اپنے جاننے والوں میں نہیں سُنے یا دیکھے نہیں۔"

یہ ان کا عام اسلوب نہیں۔ وہ عموماً سادگی کا دامن لیتے ہیں جو بے لطفی کی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھار وہ رومانی کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں اور قصداً رُومانی بولی بولنے لگتے ہیں:

"قوس و قزح کے کمان پر رقص کرتے ہوئے اور شفق کی نیچی اُونچی وادیوں میں اُترتے ہوئے کوئی رنگینیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے، کوئی شفق زاروں کے اس پار کسی اور دُنیا کی جستجو میں جا نکلتا ہے، کوئی فطرت ہی کا ہو کر رہ جانا چاہتا ہے، کوئی انسانی حُسن کے بغیر کائنات کو نامکمل سمجھتا ہے، کوئی محبوبہ کے جسم کو اس بُری طرح چھُونا چاہتا ہے۔

جیسے رنگ و بو کی لہروں کو نسیم سحر کے جھونکے چھوتے ہیں، کوئی اسے آغوش میں اس طرح بھینچ لینا چاہتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے میں حل ہو جائیں ——"

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زبان احتشام صاحب کی نہیں۔ شاید وہ قصداً سرور صاحب کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اس اسلوب کو اپنا نہیں سکتے۔ وہ ذرا گنجلک اور بھاری بھرکم طریقے سے لکھتے ہیں، وہ تیزی، سبکی، روانی نہیں جو سرور صاحب کے اسلوب میں نظر آتی ہے اور جب وہ اس طرز میں لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش فعلیاں کر رہا ہے۔

احتشام صاحب نے بھی کوئی نئے اصول تنقید نہیں بنائے۔ وہ مارکسی ہی سہی۔ ان کی تنقیدوں میں اصول کی دھجیاں اور پرزے ملتے ہیں لیکن ان دھجیوں اور پرزوں کو ملا کر وہ کوئی اچھا سا لباس نہیں بنا سکتے ہیں۔ وہ تفصیلات کی ضرورت سمجھتے ہوئے بھی تفصیلات سے گریز کرتے ہیں:

"جوش اور خیام ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے جا رہے ہیں . . . . . کیا ہزار سال کی شکست اور ارض و سما کی گردش نے مزاجوں کے سانچے نہیں بدلے ہیں؟ میں اس فلسفیانہ بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا اور نہ جوش و خیام کے افکار و خیالات کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہتا ہوں لیکن دونوں میں کوئی اندرونی مماثلت ضرور ہے، کوئی ذہنی رشتہ ہے جو میرے ذہن کو بار بار ادھر لے جاتا ہے اور جوش کے خوبصورت چہرے کو خیام کی ڈاڑھی میں اُلجھا دیتا ہے . . . . ."

'میں اس فلسفیانہ بحث میں الجھنا نہیں چاہتا' —— پھر اس کا ذکر کیا ضروری تھا۔ احتشام صاحب کسی سائیکی ایٹرسٹ سے مشورہ لیں۔ وہ انہیں بتا دے گا۔ کہ وہ کیا غیر شعوری دباؤ ہے جو ان کے ذہن میں جوش کے خوبصورت چہرے کو خیام کی ڈاڑھی میں اُلجھا دیتا ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ کہنا یہ ہے کہ ہر بار وہ کسی بحث، تفصیل، شرح میں اُلجھنا نہیں چاہتے ہیں — 'ایک مقالے یا تقریر میں محض اشارے کئے جا سکتے ہیں' —— 'اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت تشریح چاہتا ہے'۔ 'اب تک تو کچھ نہیں ہوا ہے لیکن آئندہ اُمید ہے کہ اُردو ادب کا کوئی سمجھ دار مؤرخ ان حقیقتوں پر روشنی ڈالے گا'۔ 'اس پر زیادہ لکھنا اس وقت ممکن نہیں'۔ 'ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر تاریخ، نفسیات، معاشیات، اور سائنس کی مدد سے اصول نقد معیّن کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی' ——"

وہ اصول نقد معیّن نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ اُن کی ہر تان 'اشتراکیت' پر ٹوٹتی ہے۔ کہتے ہیں: 'اصول سازی کی دشواریوں کے باوجود معمولی سے معمولی نقّاد بڑی دیدہ دلیری سے دو ٹوک فیصلہ کر دیتا ہے ——' وہ بھی اسی طرح دو ٹوک فیصلہ کر دیتے ہیں اور جیمس جوائس کی رائے نقل کرتے ہیں: "آرٹ اس فنّی بصیرت کا نام ہے جس کی مدد سے آرٹسٹ کسی چیز پر ترجیح یا زور دیئے بغیر سب کچھ ایک ہی لمحہ میں ظاہر کر دیتا ہے۔" اور بغیر غور کئے ہوئے وہ اسے رد کر دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ جیمس جوائس کے فلسفۂ خیال کی تنقید مقصود نہیں وہ تنقید کرتے ہیں: "عدم مقصودیت ایک طرح کا فریب ہے۔" اسی طرح یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ محض نفسیاتی موشگافی ہے وہ کہتے ہیں: 'حسرت کے یہاں سرخ رنگ سے اتنی وابستگی بھی اس زندہ اور انقلابی رجحان کا پتہ دیتی ہے۔ محبوب کا جسم بھی سُرخ ہے اور لباس بھی سرخ۔" یہ نفسیاتی موشگافی نہیں بے تکی سی بات ہے، نفسیات کی توہین ہے۔

کہتے ہیں: "آج ارسطو سے لے کر سارتر تک سب انسانی ذہن کی تخلیقات اور تعبیرات پر رائے دیتے ہوئے انگشت نمائی کرتے ہیں اور ذمہ داری کا احساس تقاضا کرتا ہے کہ اعلیٰ عالمی ادب کے ساتھ ساتھ ارسطو، ڈرائڈن، میتھو آرنلڈ، رچرڈس، ایلیٹ، ایوس، جے بٹ، اسپنگارن، ٹیٹ، ازرا پاؤنڈ، ڈِکسن، برک، سینٹ بیو، ٹین، ملارمے، گاشیئے، لاناگ، سارتر، کروچے، ماریو پراز، ہرڈر، لینگ، شلیگل، ہیگل، مارکس، فرائڈ، ونگ، بلنکی، پلیخونوف، گورکی، روزن تھال کے تنقیدی خیالات اور ادبی تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر تنقید کوئی علمی کام اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جس سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے۔"

کاش احتشام صاحب ان لوگوں کے تنقیدی خیالات اور ادبی تجربات سے فائدہ اُٹھائیں۔ ان متضاد اور متصادم نقطۂ نظر رکھنے والوں سے اپنے کام کے خیالات چن لیں۔ "یہ مشکل اور ذمہ دارانہ کام ہے۔" اور احتشام صاحب اس کے اہل نہیں۔ وہ مارکسیت کے تاریک کمرے میں چکر کاٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی ساری دُنیا ہے۔

مجھے بس یہی کہنا ہے کہ احتشام صاحب اور ان کے ہمنوا ان تین باتوں پر دن رات غور کریں۔ یہ باتیں انہی لوگوں کی کہی ہوئی ہیں:

۱۔ "زندگی کے اقتصادی پہلو پر جو مارکس نے زور دیا تھا وہ ایک خاص عصری چیز ہے ...... اقتصادیات کل زندگی نہیں بلکہ اس کا صرف ایک عنصر ہے جو لاکھ اہم سہی لیکن دوسرے عنصر پر غالب نہیں ہو سکتا۔ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا —" (مجنوں گورکھپوری)

۲۔ "ادب یا تنقید ادب کو معاشیات کا ایک شعبہ نہ بنا دینا چاہئے اور نہ اس تعلق کو جو معاشی عناصر اور تصوراتی ڈھانچے کے درمیان میں قائم ہو جاتا ہے۔ ریاضیاتی تناسب سے بدلتا ہوا سمجھنا چاہئے —" (احتشام صاحب)

۳۔ "شخصیت ایک لاینحل گتھی ہے۔ ابھی ہمارے علم میں اتنی گہرائی نہیں آئی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں —" (اختر حسین رائے پوری)

سرور صاحب کہتے ہیں: "انصاف کا تقاضا ہے کہ اس تحریک کے بعض علم برداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے یہ زندگی کو مارکسی فارمولوں اور اقتصادی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے ...... اور مارکس کو انسانیت کا حرف آخر ......"

سرکنڈوں کے پیچھے

یہ منٹو کی آخری کتاب ہے جو مرحوم کی زندگی میں چھپی تھی۔
منٹو ہی وہ بے باک اور نڈر افسانہ نگار ہے جس نے بڑی سے بڑی حقیقت کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا۔
یہی وجہ تھی کہ اس پر مقدمے چلے اور "زیادہ سنجیدہ" حضرات نے ناک بھوں چڑھائی مگر وہ لکھتا رہا۔ ادب کی بقا کی خاطر لکھتا رہا۔
اس کتاب میں بھی ان کے کئی زندہ رہنے والے افسانے شامل ہیں۔

قیمت ۳/-

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

متفرقات

قاضی عبدالودود

(۱) تقریظ سید احمد خاں: حکیم محمد اکرام الدین خاں دہلوی ابن حکیم ضیاء الدین احمد خاں نے ۱۲۹۲ھ میں ایک رسالہ "ارمغان[1]" (تاریخی نام) لکھ کر مطبع انصاری دہلی میں چھپوایا تھا۔ اس کا موضوع "حکمت عملی" ہے اور اس پر جن اصحاب نے تقریظیں لکھی[2] ہیں، ان میں سید احمد خاں بھی ہیں۔ ان کی تقریظ جو کتاب کے صفحۂ آخر (۱۲۸) میں ہے بجنسہٖ مع عنوان درج ذیل ہے:

"نقل تقریظ آنریبل سید احمد خانصاحب بہادر۔ سی۔ ایس۔ آئی"

"میں نے اس رسالے کو دیکھا جو ایک برہان مصنف کی جودت ذہن و شائستگی خیالات کی ہے۔ عبارت اردو نہایت صاف و شستہ ہے، مشکل مضامین کو صاف و سہل عبارت میں بیان کیا ہے۔ اگلے حکما کے خیالات جو عبارات دقیق میں مندرج تھے، اس (کذا) کو نہایت تہذیب و درستی سے ادا کیا ہے۔ بلاشبہ یہ رسالہ عمدہ و مفید عام ہے۔ راقم سید احمد، علیگڈھ، ۲۵ مارچ ۱۸۷۵ء"۔

ذیل میں ارمغان کے تیسرے مقالے کی فصل اوّل کا ایک ٹکڑا درج ہوتا ہے۔ فصل کا عنوان ہے: "تمدن کی ضرورت کے بیان میں":

"ہر ایک موجود کے واسطے ایک طرح کا کمال ہے بعض موجودات کا کمال ہے۔ بعض موجودات کا کمال پیدائش سے ان کے وجود کے ساتھ لاحق ہوتا ہے، وہ اجرام علوی ہیں، اور بعض موجودات کا کمال ان کے وجود کے بعد عارض ہوتا ہے، وہ اجسام سفلی ہیں۔ جس موجود کا کمال اس کے وجود کے بعد عارض ہوتا ہے، اس کو نقصان سے کمال کی طرف طبعی حرکت ہے۔ اس حرکت میں آپس کی اعانت مطلوب ہوتی ہے۔ اعانت کے تین طریقے ہیں: بالمادّہ، بالآلہ، بالخدمت۔ بالمادہ وہ ہے کہ معاون اعانت کے بعد معین کا جز ہو جائے۔ مثلاً غذا کی امداد اجسام نامیہ میں۔ بالآلہ وہ ہے کہ کوئی شے امداد کا وسیلہ و واسطہ ہووے، مثلاً پانی کی امداد قوت

---

[1] ارمغان کا ایک نسخہ کتبخانۂ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ میں ہے۔

[2] ارمغان پر میرزا محمد سلیمان شاہ بہادر گورگانی اور ذکاء اللہ نے بھی تقریظیں لکھی تھیں جو اس میں شامل ہیں۔

غاذیہ ہیں ۔ بالخدمت وہ ہے کہ ایک کا فعل دوسرے کے کمال کا موجب پایا جائے مثلاً آفتاب کی امداد موالید ثلاثہ ہیں، لیکن بالخدمت دو قسم ہے: ایک وہ کہ جس کے فعل کی غایت خدمت ہو —— مثلاً غلام کی خدمت اپنے صاحب کے لئے یہ خدمت بالذات ہے، دوسرے وہ کہ جس کے فعل کی غایت کوئی اور امر ہو، مثلاً چرواہے کی خدمت اپنے مویشی کے واسطے ۔ یہ خدمت بالعرض ہے"۔ صـ۸۱ـ تا صـ۸۳ـ

(۲) مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر، ثابت جنگ متخلص بقبول کا دیوان[1] مسمّی بہ نتائج الذہن و فیضان الفکر واجد علی شاہ کے حکم سے ۱۲۷۲ھ میں مطبع سلطانی لکھنؤ نے چھاپ کر شائع کیا تھا ۔ اس دیوان میں وفات آتش کا حسب ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے، مصنف ناسخ کا جو آتش کے حریف سمجھے جاتے تھے، شاگرد ہے، اس لئے اس قطعے میں آتش کی جو توصیف کی گئی ہے، شایان توجہ ہے:

خواجہ آتش کاملِ اشعارِ پُر سوز و گداز
اُٹھ گیا دنیا سے اب ویسا کہاں دنیا میں ہے
ایسا شاعر تھا کہ بزمِ شاعری ہے جس جگہ
ہر کوئی بدلے غزل کے نوحہ خواں دنیا میں ہے
شعر کہنے میں زمینِ عشق کا سُلطان تھا
نقدِ موزوں صورتِ سکّہ رواں دنیا میں ہے
جب کلام اس کا نظر آتا ہے گویا ہے وہی
وہ نہاں ہے خاک میں دیواں عیاں دنیا میں ہے
دیکھ کر دیوان یہ تاریخ لکھ دے اے قبول
اب فنا آتش نہیں سوز زباں دنیا میں ہے

(۳) دیوان قبول سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ نے "حکم اختر" کے نام سے شمس الدین فقیر کے رسالۂ عروض و قافیہ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا ۔ طبع کتاب کا مادۂ تاریخ یہ ہے: "ملبوس داده نوشۂ اقدس فقیر را" ۱۲۶۹ھ ۔

(۴) دیوان قبول میں" منشی میر حسن صاحب صابر تخلص"" ذاکرِ حسین" کا قطعۂ تاریخ وفات بھی ہے ۔ مادّہ یہ ہے: "در چہلم حسین حسن رفتہ ہائے وائے" ۱۲۴۶ھ

(۵) فیوچر آف اسلام کے نام سے ولفرڈ اسکاون بلنٹ نے انیسویں صدی کے عشرۂ نہم کے اوائل میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا ترجمہ سید اکبر حسین الٰہ آبادی (متخلص بہ اکبر) نے "اسلام کی حالت[2] آئینہ کے نام سے جب وہ علیگڈھ میں مصنف تھے کیا تھا، اور ۱۸۸۵ء میں کنور لطف علی خاں، وغیرہ کی مدد سے مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ میرٹھ لمیٹڈ میں اسی سال چھپوایا تھا ۔ اکبر نے اپنے تمہید میں لکھا ہے کہ "ہنوز ترجمہ ختم نہ ہوا تھا کہ مسٹر بلنٹ خود ہندوستان میں تشریف لائے اور بمقام کلکتہ مجھ کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی ۔ انہوں نے ایک دوسرا دیباچہ بطور ضمیمہ دیباچۂ اوّل کے تحریر فرما کر مجھ کو دیا، جس کا ترجمہ میں اس کتاب کے ساتھ شامل کرتا ہوں ۔ سلطنت ٹرکی کے قائم رہنے کی نسبت مصنف کو جو مایوسی تھی، یہ دیباچہ اس مایوسی کو ضعیف کرتا ہے ۔ مصنف نے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ سلطنت ٹرکی کی نسبت بعض اطلاعیں ان کو خود علمائے مصر و عرب سے حاصل ہوئی ہیں اور وہ ان کی صحت کے ذمہ دار نہیں ۔" ترجمے کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کا "زیب عنوان" ایک عربی شعر کیا تھا، وہ اور اس کا اردو ترجمہ جو ظاہرا خود اکبر کا ہے درج ذیل ہے: نہ ہو تو مایوس و دل شکستہ بکھر گئے ہیں اگر یہ موتی زیادہ تر حسن و عمدگی سے گندھیں گے باردگر یہ موتی ذیل میں مصنف کے دیباچۂ ثانی کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:

"کتاب فیوچر آف اسلام کو زبان اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی میں اپنی بے انتہا مسرت ظاہر کرتا ہوں کہ میری ناچیز تصنیف کو ایک لائق اور تعلیم یافتہ مسلمان نے دنیا میں سب سے بڑی مسلمانوں کی جماعت کے پڑھنے کے لائق سمجھ کر پسند اور منتخب کیا ۔ اور میرے دل پر اس بات کا بھی بڑا اثر پڑا کہ میری محنتوں کو مسلمانان ہندوستان نے تسلیم کیا اور مجھ کو ایک بیگانۂ محض اور خواہ مخواہ دخل در معقولات کرنے والا نہیں سمجھا، بلکہ دوست سمجھا؛ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید میں نے اپنی کتاب میں ایسے الفاظ اور فقرات مندرج کئے ہیں، جن پر اب تین سال کے بعد کہ اس عرصہ میں مجھ کو اسلام

---

[1] و [2] دیوان قبول اور اسلام کی حالت آئینہ کتبخانۂ ادارہ تحقیقات اردو میں ہیں۔

سے زیادہ تر واقفیت اور محبت پیدا ہو گئی ہے، مجھ کو افسوس کرنا چاہئے، بلاشبہ میں جانتا ہوں کہ اس کتاب میں بعض ایسی عبارتیں موجود ہیں۔ جب میں نے ان مضامین کو کسی قدر عاجلانہ طور پر لکھا تھا اس وقت میرے دلائل کا منطقی سلسلہ مجھ کو ایک تیز رَو اور بے چین گھوڑے کی طرح ایک خطرناک زمین پر کھینچ لے گیا تھا، ایسی خطرناک زمین کہ اس پر زیادہ حزم و احتیاط کا آدمی امن و عافیت سے راہ طے کرنے کی امید نہ کرتا۔ بعض الفاظ بالخصوص خلافت عثمانیہ کی نسبت مجھ کو یاد آتے ہیں، جن کو میں نے کسی قدر ناشائستگی اور سختی کے ساتھ تحریر کیا ہے، اور میں اب تہ دل سے ان کو واپس لیتا ہوں، کیوں کہ اب مجھ کو زیادہ تر امید اس بات کی پیدا ہو گئی ہے کہ سلطان عبدالحمید اس گیارھویں گھنٹے یعنی ساعت آخر میں بھی شاید اس مذہبی اصلاح کے جوش تحریک کی افسری و پیشوائی پر راغب ہو سکتے ہیں کہ وہی ایک ذریعہ ان کی شہنشاہی کو اور ان کی خاص حالت کو اسلام میں محفوظ رکھنے کا ہے۔ جب میں ان حالات کو یاد کرتا ہوں جن میں عجیب عجیب امیدوں اور جوش مسرت کے ساتھ میں نے بمقام قاہرہ اس کتاب کا پہلا دیباچہ لکھا تھا تو نہایت رنج و الم مجھ پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس وقت میرے چاروں طرف جو دنیا تھی وہ زندہ دلی سے بھری ہوئی تھی اور اسلام کی شام غم مبدّل بصبح مسرّت ہوتی نظر آتی تھی۔ میں اس خیال میں دیباچہ لکھ رہا تھا کہ میں مذہبی آزادی کی آب و ہوا میں اس وقت ہوں جس کا پتا صدیوں سے مسلمانوں کے خیالات میں نہ ملتا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ چند برسوں میں بلکہ شاید چند مہینوں میں میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لونگا کہ ازہر کی یونیورسٹی نے اپنی قدیمی شوکت و عظمت پھر حاصل کر لی اور تمام دنیا کے لئے روز افزوں ترقی کرنے والے علوم دینیہ کا مرکز بن گئی، مگر افسوس وہ سب امیدیں خواب و خیال ہو گئیں۔ افسوس، ہم کو پھر صبر کرنا پڑا اور بعوض متمتع ہونے کے انتظار کرنا ضرور رہا۔ تاہم یہ بات بیوقوفی کی ہوگی۔ کہ بوجہ مذکورہ ہم اخیر نتیجے کی نسبت ناامید ہو جائیں اور بلاشبہ جو باتیں بھروسے کے ساتھ میں نے اس وقت کہی ہیں، میں ہرگز ہرگز ان کو نہیں چھوڑتا۔ اب بھی مجھ کو اسلام کی حالت آئندہ پر ویسا ہی اعلیٰ درجے کا یقین اور بھروسا ہے جیسا کہ سنہ ۱۸۸۲ء کی فصل بہار میں تھا اور اگرچہ لوگوں کو نخل اُمید سے پھل پانے میں کچھ تاخیر ہو گئی ہے، لیکن میں بیدل نہیں ہوں۔ گو سر دست ناکامی ہوئی ہے، لیکن ہم کو خدا پر بھروسا اور یقین رکھنا چاہئے۔ الحق یعلو ولا یعلیٰ"

(٦) تاریخ ولادت ناسخ۔ کلیات ناسخ مطبوعہ میں ایک شعر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ ۵ محرم[1] کو پیدا ہوئے تھے۔ سال ولادت بصراحت کسی تذکرے میں نہیں اور نہ کلیات اس پر روشنی ڈالتا ہے، لیکن دیوان رشک[2] مطبوعہ میں ایک قطعۂ تاریخ ہے جس کا مادہ یہ ہے: "مرد اسے ہے بسال شصت و نہم" ناسخ کی وفات جیسا کہ اسی کتاب سے پتہ چلتا ہے پنجشنبہ کے دن، چوبیسویں جمادی الاولیٰ کو سنہ ۱۲۵۴ھ میں واقع ہوئی تھی، اس حساب سے سال ولادت سنہ ۱۱۸۵ھ ٹھہرتا ہے۔ رشک ناسخ کے شاگردان خاص میں تھے، اس سنہ میں شبہے کی مطلقاً گنجائش نہیں۔

(٧) آب حیات میں ناسخ کا سال وفات سنہ ۱۲۵۴ھ درج ہے اور سنہ میں رشک کا یہ مادۂ تاریخ پیش ہوا ہے: "دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے"۔ صد ۳۵۳ ، مگر اس سے ، ۱۲۴۷ نکلتا ہے، رشک نے اپنے عہد کے املا کے مطابق "اوٹھی" لکھا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصرع مرقوم سے ۱۲۵۴ مستخرج ہوگا۔ دیوان رشک میں جو غالباً آزاد کی نظر سے نہیں گزرا، ذیل کا قطعۂ تاریخ بھی ہے جو سنہ وفات کے علاوہ، روز و ماہ و تاریخ پر بھی مشعر ہے:

"داد ریغا کرد رحلت ناسخ معجز بیاں
انتقالش داد عالم را غم جانکاہ وائے
یک ہزار و دو صد و پنجاہ و چارم سال بود
بود از ماہ محرم پنجمیں آں ماہ وائے
رشک روز مرگ و تاریخ و سنین و ماہ گفت
بود پنجم بست و چارم پنجشنبہ آہ وائے"

رشک کے ایک مادۂ تاریخ سے سنہ عیسوی بھی نکلتا ہے: "صدحیف ہائے ناسخ صدحیف ہائے ناسخ" = ۱۸۳۸

---

[1] یہ شعر میں نے ایک خط میں جو العلم کراچی میں چھپا ہے نقل کر دیا ہے۔ رشک کا ایک شعر بھی اس پر مشعر ہے۔

[2] رشک کے دو دیوان ایک ساتھ چھپے تھے اور کتبخانۂ رضائیہ رامپور میں موجود ہیں (رجوع بحواشی تذکرۂ ابن طوفان ص ۲۴۲)

(۸) یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ آتش ۱۲۶۳ھ میں راہی عدم ہوئے تھے۔ لیکن کسی تذکرے یا تاریخ ادب میں میری نظر سے یہ نہیں گزرا کہ وہ کس دن اور کس مہینے کی کس تاریخ میں فوت ہوئے تھے، حالانکہ دیوان رشک سے بصراحت پتہ چلتا ہے کہ وہ بدھ کی صبح کو بتاریخ ۲۵ محرم اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

(۹) دیوان رشک میں نسیم (پنڈت دیا شنکر) کی وفات کا قطعۂ تاریخ بھی ہے:

حسرت دیا کس ہوائے دنیا　　برد نسیم زہیضہ ہے ہے
بزم مشاعرہ بود و شنیدم　　مرد نسیم زہیضہ ہے ہے
فوراً مصرع مادہ گفتم　　"مرد نسیم زہیضہ ہے ہے" = ۱۲۶۱

(۱۰) میر خلیق (پدر میر انیس) کی وفات کا مادۂ تاریخ یہ ہے: "ہائے اسے ہے خلیق بود استاد" = ۱۲۶۰ - (دیوان رشک) اس سنہ کی تصدیق تذکرۂ ناصر سے بھی ہوتی ہے (معاصر ا صہ ۱۶۰)

(۱۱) دیوان رشک سے معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم شاہ الٰہ آبادی ذیقعدہ ۱۲۵۶ھ میں بمرض ہیضہ فوت ہوئے تھے۔ مادۂ تاریخ: "بود ہجری سال پنجاہ و ششم افسوس ہائے"

(۱۲) جلال لکھنوی کے دیوان کرشمہ گاہ سخن سے معلوم ہوتا ہے کہ رشک ۱۲۶۷ھ میں کربلا گئے تھے، مادۂ تاریخ: "کربلا جاتے ہیں دیکھو قبلہ و کعبہ مرے" (رجوع بحواشی تذکرۂ ابن طوفاں صہ ۸۲)

(۱۳) نور لکھنوی برق تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے، ان کا دیوان، ضیائے نور[1] مطبع کارنامہ لکھنؤ نے ۱۲۹۶ھ میں چھاپا تھا۔ اس میں برق کی وفات کا مادۂ تاریخ اس طرح درج ہے: "شاعر بے مثل بود حیف آہ" = ۱۲۷۴

(۱۴) ضیائے نور سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت بتاریخ یکم جمادی الاولیٰ وقت شام ۱۲۷۵ھ میں راہی عدم ہوئے تھے، مادۂ تاریخ: "حیف بود آہ شاعر بے مثال"۔

(۱۵) نور نے غالب کی وفات پر قطعۂ ذیل میں خراج تحسین ادا کیا تھا، مصرع آخر سے ۱۲۸۵ نکلتا ہے:

صد افسوس خورشید اوج کمال　　بہ پیک اجل جان خود را سپرد
پے سال آں شاعر بے عدیل　　فلک زد ندا آہ غالب بمرد

(۱۶) نور[1] نے محمد بخش شہید کی وفات کی تاریخ اس مصرع سے نکالی تھی: "در جہاں بود شاعر یکتا" = ۱۲۷۷ (رجوع بحواشی تذکرۂ ابن طوفاں صہ ۸۶)

(۱۷) ریاض صابر[2] قادر بخش صابر دہلوی شاگرد احسان و صہبائی کا دیوان ہے، جس کا دیباچہ حالی دہلوی نے لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۲۳ھ میں ہوئی تھی اور وفات بمقام بنارس ۱۲۹۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ تذکرۂ گلستان سخن جس پر راقم کا ایک طویل مقالہ دہلی کالج میگزین کے ایک خاص نمبر میں شائع ہو چکا ہے، انہی سے منسوب ہے۔ صابر کا ایک قطعہ دیوان کے صہ ۲۶۱ سے نقل کیا جاتا ہے:

فقط ہے واقعہ گوئی پہ ناز سب بے حرفہ　　کہ زور طبع بھی لازم ہے نکتہ داں کے لئے
جو ہے کمال تو صابر کچھ آگے بڑھ کے سناؤ　　زبان فخر نہیں صاحب زباں کے لئے

(۱۸) صابر کے بیٹے قیصر بخت فروغ نے ان کا سال وفات یوں نکالا ہے (دم سوزاں، فغاں):

ظاہر ہو سن رحلت سلطان بلاغت　　بڑھ جائے ہمارا "دم سوزاں" جو "فغاں" میں

---

[1] و [2] نور و صابر کے دیوان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے کتب خانے میں ہیں۔

(۱۹) ذاکر عالی نسب والا حسب یعنی ضمیر   رفت حسب الحکم خالق چون زعالم آہ وائے
سال فوتش صوری وہم معنوی گفتم قبول   شنبہ و بست و سیم بود از محرم آہ وائے = ۱۲۷۲ھ

بجناں رفت ز آفاق ضمیر   ہستم از وصف کمالش قاصر
سال تاریخ قبول اکنوں گو   آہ افسوس حسینی ذاکر

مشہور مرثیہ گو میر مظفر حسین ضمیرؔ کی وفات کے یہ قطعات تاریخ دیوان قبول میں ہیں۔ ۱۲۷۲ھ کی تصدیق دیوان حاتم علی بیگ، مہرؔ سے بھی ہوتی ہے۔ (معاصر ۲ ص ۲۳)۔

(۲۰) آب حیات ص ۲۱۸ میں ہے: "لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ ..... آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا کہ ایک تو سوداؔ دوسرا یہ خاکسار ہے اور کچھ تامل کرکے کہا آدھے خواجہ میر درد۔" میرؔ نے یہ کہا ہو یا نہ کہا ہو، ایک قصیدے کی تشبیب[1] میں مصحفی نے میر و مرزا کو پورا اور درد کو آدھا شاعر ضرور کہا ہے:

ہو چکا دور میر اور مرزا   اب زمانے میں ہے مرا دورہ
دردؔ کو شاعروں میں سمجھوں ہیں   یہ تو ہونا نہیں ہے وا دردا
کیوں کہ دلّی کے بیچ گزرے ہیں   ڈھائی شاعر سرآمد شعرا
اس کی تفصیل یوں کہ کہتے ہیں   میر و مرزا دو اور دردؔ آدھا
یہ مسلّم کہ ہے فصیح و بلیغ   جو کچھ اس نے غزل کی قسم کہا
لیک اب جو ناتمام ہووے اسے (کذا)   شاعروں میں کیوں پورا (کذا)

(۲۱) آب حیات میں انشاؔ کے ایک قصیدے کے کچھ اشعار نقل ہوئے ہیں، جن میں انگریزی الفاظ بکثرت مستعمل ہوئے ہیں۔ مصحفی کے ایک قصیدے میں بھی جو شاداب علی خاں کی مدح میں ہے بہت سے انگریزی الفاظ آئے ہیں۔ یہ قصیدہ دیوان قصائد مصحفی میں نامکمل شکل میں ہے ذیل میں وہ اشعار جن میں انگریزی الفاظ ہیں نقل کئے جاتے ہیں:

خالی از فیض[2] نہ دیکھی تری خدمت بخشی   ہو وہ سلطان جہاں جس کو تو دیوے پرمٹ
صاحب حکم و جلادت ہے تو ہر شام و سحر   آکے مرّیخ ترے سامنے بولے ہے رپٹ
ملک گیری میں گورنر تجھے سمجھے جو فلک   ہو دیں پھر کیوں نہ کلکٹر ترے لیٹ اور الیٹ
سارے عالم میں ترا حکم ہے دائر سائر   کیوں نہ حاضر رہیں در پہ ہی اپیل اور کورٹ
دیکھے گر قصر معلّے کی ترے رنگینی   اپنی کوٹھی کو کرے اس پہ تصدق ادنٹ

آگے چل کر جو قصیدہ سفینہ نقل ہوگا اس میں بھی ایک انگریزی لفظ آیا ہے مگر تبدیل شدہ شکل میں۔

(۲۲) ذیل کا قصیدہ جو کلب علی خاں، اپسر سعادت علی خاں کی مدح میں ہے، دیوان قصائد مصحفی سے نقل کیا جاتا ہے، اس میں کتابت کی اغلاط بہت ہیں، جن کی تصحیح کی میں نے کوشش نہیں کی:

لیتے خمیازہ جو اس گل کی گئی چولی چس   جا پڑی صاف بدن پر نگہ اہل ہوس

---

[1] یہ قصیدہ دیوان قصائد مصحفی (کتبخانۂ رضائیہ رامپور) میں ہے۔

[2] اس وقت نسخۂ رامپور کی نقل پیش نظر ہے۔

خندۂ گل کے ہوئے ایسے وہ معروف کہ بس　　ہم صفیروں نے نہ کی یاد اسیرانِ قفس
ساتھ ناقے کے جو کی گرم روی مجنوں نے　　تپش ریگ بیاباں سے گئے پاؤں جھلس
کشتیٔ چرخ نہ طوفاں میں آ جائے کہیں　　دن ہیں برسات کے اے ابر مژہ تو نہ برس
تا قیامت کبھی بیدار نہ ہو وہ مسموم　　افعی زلف بتاں جس کے تئیں جاوے ڈس
رسنِ زلف میں اس گل کی ٹھہرتا ہی نہیں　　دل بیتاب مرا مثلِ سگ ہرزہ مرس
برق اور باد سے ڈرتے ہی نہیں اہل ثبات　　کوئی بندوق کے چلنے سے بھی اڑتی ہے مگس
شانہ بن دست درازی کئے کب رہتا ہے　　بال زلفوں کے عبث رکھتے ہیں جوڑی میں گھس
بسکہ میں ضبط غم عشق کیا ہجراں میں　　پھوٹ کی طرح سے سینہ گیا یک لخت تکس
حرز و بردِ مرض عشق نہ مفہوم ہو کچھ　　دیر تک دست مسیحا میں رہے گو ملمس
من و سلویٰ پہ جو قائم نہ ہوئے موسائی　　دشمن جاں ہوئی ان کو ہوس بصل و عدس
رنگ اڑ جائے وہیں چہرے سے اس کا فی الفور　　مصحفی میرا ترانہ جو سنے ٹک رنگرس
سو وہ یہ کلب علی خان بہادر کی مدح　　دیکھ حیران رہے جم جس کے جناب اقدس
پاسبانی پہ زمانے کی جو رائے اس کی آئے　　دزد معنی کے لئے خامہ کرے کار عسس
شخص محتاج پہ ہو اس کی توجہ جو فزوں　　خلق کہتی ہے سدا اس کو کس ہر بیکس
عہد میں اس کے ستمگاری کا جو نام نہیں　　قافلے میں نہ سنی ہیں کبھی فریاد جرس
کیوں نہ ہو مزرع امید غریباں سیراب　　ہے رواں دست جواد اس کا بہ از رود ارس
صاحب حلم و حیا کوہ وقار و تمکیں　　منبع جود و کرم دادرس ہر بیکس
مومن پاک محب علی و آل نبی　　جس کی خدمت میں کمربستہ ہے چرخ اطلس
پھیر دے پنجۂ رستم کو جو وہ زور کے وقت　　ہو کے حیراں وہ کہے واہ ری تیراکن کس
تیغ نے اس کی جہاں پاک رذیلوں سے کیا　　شعلہ چھوڑے نہ زمیں پر کبھی یک ریزۂ خس
یہ فصاحت ہے زباں میں دم توضیح سخن　　جس کی تقریر کے مداح ہیں اہل فارس
دیکھ کر رنگ سیہ پیل کا تیرے ممدوح　　شب دیجور گئی آتش غیرت میں جھلس
آپ ہے وہ شب تاریک تو جو حنہ اس کا　　خوش جلائی میں قرص مہ کامل سے سرس
جھول اس طرح کی زرباف کہ جو موسیٰ کو　　ہر ستارے میں دکھا دے شرر نار قبس
آوے خرطوم سے صورت میں نظر کالی بے　　دانت پر رکھے تو پھر درج کی ہووے مادس
گر یہ چہرہ وہ کہوں اس کو تو بہتاں ہے مجھے　　کیونکہ شکل خم ابرو ہے یہ اس کا انکس
دل میں خورشید درخشاں کے ہے وہ خار ہنوز　　اس نے دیکھا تھا کہیں اس کی عماری کا کلس
آگے گھوڑے کی میں تعریف کروں کیا کہ وہ ہے　　تیز گامی میں ہوا قوت تن میں راکس
تس پہ اسرع ہے وہ اتنا کہ اگر مرد سوار　　پھینکے مغرب سے اسے جانب مشرق ہو کس

دو قدم میں وہ کرے عرصۂ ایام کو طے   بلکہ ہو طول ازل تا بہ ابد نیم نفس
کو نہ بجلی کی کہیے کوئی ہوا میں اس کو   دشت میں ڈھنگ چھلاوے کا دکھاوے وہ فرس
اس کے بیٹھوں پہ صفا یہ ہے کہ جن پر ہر دم   بیٹھتے بیٹھتے جاتا ہے پھسل پائے مگس
بس کہ رہتا ہے کسا اور گھنا لحم اس کا   دخل کیا ہے کہ پڑے جلد میں ٹک اس کی چرس
آبداری جو تری تیغ کی تقریر کرے   وہیں شاعر کے تئیں تیغ زباں دیوے جس
تجربہ اتیجزی کرے اک دم میں   وقت برش کے وہ شمشیر ہے ایسی جز رس
مصحفی اب طرف خاتمہ ہے اپنا خیال   طبع ان قافیوں میں مجھ کو یہ آگے ہے کہ بس
لیک اس پہ بھی میں جاتا ہوں لڑائے گھوڑا   ہے زمیں بس کہ قصیدوں کی مسطح چو رس
کرۂ خاک پہ جب تک گہر افشاں ہے سحاب   جب تلک چاہ سے برز نکلتا ہے چرس
زیر افلاک شب و روز میں جب تک ہے تضاد   جب تلک مور کو اک مار سے ہوتی ہے کھنس
جب تلک کلغی کے سر پہ ہے فرنگی ٹوپی   جب تلک پا میں ہے غنچے کے گلابی برجس
جب تلک پنجۂ زن لحم رہے دست زغن   دوربینی کرے جب تک کہ نگاہ کرگس
عید قربانی مبارک ہو تجھے اے ممدوح   نخل امید ترا ہو وے ہمیشہ نورس
لمس پیشانی کریں اس پہ طلا اہل نیاز   آستانے کا ترے رنگ ہو رشک پارس
جو ترے دوست ہیں وہ شاد رہیں دنیا میں   وہ جو دشمن ہیں انہیں آتش غم جائے جھلس
صد و سی سال رہے مسند اقبال پہ تو   یہ دعا ہے مری بستی تری بسیو سو بس "

(۲۳) پہلوی میں جس پھل کو amrot اور anbrot کہتے ہیں (حاشیۂ برہان قاطع مرتبہ ڈاکٹر محمد معین ص ۱۶۱) اس کی فارسی میں کئی شکلیں ہیں جن میں سے امرود سب سے زیادہ مشہور ہے۔ فارسی نثر میں اس کے استعمال کی قدیم ترین مثال بلعمی کی تاریخ طبری میں ملتی ہے: "سیب و امرود و بہی" ص ۲۴ اور فارسی نظم میں ابوالفرج رونی کے مصرع ذیل سے جو حدائق السحر مرتبۂ آشتیانی سے ماخوذ ہے قبل کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں: "شاخ امرود گوئی و امرود"۔ بعد کی کچھ مثالیں یہ ہیں: نصاب الصبیان ابونصر فراہی طبع نولکشور: "چوں عنب انگور و تین انجیر و کمثری مرود" ص ۹، ہفت پیکر نظامی طبع نولکشور: "گرچہ امرود شب گلوگیر است" ص ۸۷، مطلع السعدی جلد ۲ کتبخانۂ خدابخش: "ز شفتالو سیب و امرود و بہ" ورق ——، دیوان فوقی نسخۂ کتبخانۂ خدابخش: "بہ لذت او ز امرود دل" ورق ——، دیوان جلال رومی نولکشوری: "کے بود در خضر خلد غم امرودے" ص ۹۰۸، فتح اللہ، ذوقی: "شاخ امرود چو آونگ کہ روئیست ببار" (گنج شائیگاں اطبع ایران ص ۱۸۵)، ملک الشعرا بہار: "گلہائے سیب و آلو و آبی و آمرود" (ادبیات معاصر از رشید یاسمی ص ۳۱) وصاف الحضرت و دیوان نعیم اصفہانی میں بھی "امرود" آیا ہے۔ السامی فی الاسامی (نسخۂ خدابخش)، اختیارات بدیعی اور بحر الجواہر میں کمثری کی فارسی امرود درج ہے اور کتبخانۂ خدابخش کی مجہول المصنف، لیکن قدیم کتاب سیرت فیروز شاہی (ورق ——) میں بھی یہی ہے۔ ادات الفضلا (نسخۂ دانشگاہ ڈھاکہ) میں اسے ایک خراسانی پھل لکھا ہے اور عہد ہمایونی کی ریاض الادویہ (نسخۂ خدابخش) اور عہد شاہجہانی کی الفاظ ادویہ (نسخۂ خدابخش) میں امرود کمثری کی فارسی بتایا گیا ہے۔ کمثری وہی پھل ہے جو انگریزی میں Pear کہا جاتا ہے (اسٹائن گیس کی عربی انگریزی لغت)۔ لفظ امرود ایران میں تو اب بھی کمثری کے لئے آتا ہے لیکن، ہندوستان میں فی الحال صرف اس پھل کے لئے مستعمل ہے جسے انگریزی میں Guava کہتے ہیں۔ یہ پھل نہ ہندوستانی ہے، نہ فرنگی، اصلاً امریکہ یا جزائر غرب الہند کا ہے، جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا (طبع جدید) سے معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ پھل اہل مغرب لائے ہونگے۔

لیکن امرود کی اصل سے بہت کم ہندوستانی واقف ہیں، چنانچہ امیر اللغات و نور اللغات وغیرہ کے مطالعے سے بالکل اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ان کے مؤلف اس سے باخبر تھے کہ امرود و کمثری ایک ہیں، وہ اسے گواوا کے لئے موضوع سمجھتے ہیں۔ میر محمد حسین مرشدآبادی نے اواخر مائۃ دوازدہم میں مخزن الادویہ لکھی تھی، جس کا نسخہ مطبوعۂ کلکتہ (کتبخانۂ خدابخش) اس وقت پیش نظر ہے، ان کا قول ہے کہ امرود "مشترک میان ثمریکہ آنرا بعربی کمثری نامند ...... و ثمریکہ در بنگالہ میشود" (ص ۱۶۶)۔ انہوں نے کمثری کی فارسی امرود اور ہندی ناشپاتی لکھی ہے (ص —) اور ثمر بنگالہ کے جو تفاصیل دیئے ہیں ان سے واضح ہے کہ ان کی مراد گواوا سے ہے۔ میرے علم میں یہ قدیم ترین کتاب ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ امرود گواوا کے لئے بھی مستعمل ہے۔ ناشپاتی کا ہندی ہونا میرے نزدیک مشتبہ ہے، اس سے بحث کبھی اور کی جائے گی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اُردو کے دخیل الفاظ کے متعلق جو مقالہ رسالۂ اردو میں لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں کہ امرود اصلاً بہی کے لئے موضوع ہے، مگر یہ بات بے اصل ہے۔ بہی، بہ اور آبی کو عربی میں سفرجل (اختیارات، بحر، الفاظ وغیرہ) اور انگریزی میں Quince (اسٹائن گیس) کہتے ہیں، پلیٹس بھی اپنی لغت میں یہی معنی بیان کرتا ہے لیکن، یہ اضافہ کرتا ہے کہ بہی ہند میں گواوا کے لئے بھی مستعمل ہے۔ بظاہر ڈاکٹر عبدالحق کو اسی سے دھوکا ہوا ہے۔

(۲۴) مولی بخش، قلق کا دیوان[1] مطبع انصاری دہلی نے ۱۸۸۳ء میں چھاپا تھا۔ اس میں گلاب سنگھ، مشتاق شاگرد قلق کا قطعۂ تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات ۱۲۹۷ھ میں بتاریخ ۷ رشعبان واقع ہوئی تھی۔ بیت آخر (مصرع آخر = ۱۲۹۸، مخرجہ سر امید = ۱):

بولا مشتاق بے سر امید — حیف ہے اب سخن یتیم ہوا ص ۲۶۶

(۲۵) آثار الشعرا[2] مصنفۂ سید محمد ممتاز علی سے معلوم ہوتا ہے کہ یار محمد خاں متخلص بہ شوکت فوجدار محمد خاں "خال حقیقی رئیسہ" کے بیٹے، بتاریخ صفر ۱۲۴۹ھ پیدا ہوئے تھے۔ اور غالب کے شاگرد تھے۔ شوکت نے ایک مختصر سا تذکرۂ شعرا فرح بخش کے نام سے لکھا ہے جس میں ایک جگہ غالب کو "خسرو ملک سخن ماہر زبان دری دہلوی" اور دوسری جگہ "فردوسی رزم، خسرو بزم، کلیم کلام، نظامی نظام . . . مشاہیر بلغائے نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے۔" شوکت نے غالب کا صرف ایک شعر تبرکاً نقل کیا ہے: "بوئے گل نالۂ دل الخ" لیکن اس میں محمد عباس، رفعت کا تصنیف کیا ہوا قطعۂ تاریخ وفات درج ہے:

جان ارباب سخن غالب عالی ہمت — ناظم سحر بیاں ناشر والا فطرت
رشک فردوسی و خاقانی و عالی کمال — ثانی خسرو و سعدی و حزیں و شوکت
ابر .... کمالات .... دانش — ماہر علم معانی و بیان و حکمت
از جہاں کرد سفر سوئے ریاض رضواں — گفت عباس کہ شایان سریر جنت

(۲۶) حکیم رضا محمد متخلص بہ صہبا حکیم میر رضا حسین، متخلص بہ سہا کے بیٹے اور لکھنؤ کے مشہور شاعر، صبا شاگرد آتش کے نواسے تھے۔ ان کی ایک کتاب مطبع گلزار محمدی لکھنؤ کی چھپی ہوئی کتب خانۂ ادارہ تحقیقات اردو میں ہے، جس کے سرورق میں مرقوم ہے: "قاعدۂ نغمہ، مجموعہ قانون راگ، نغمہ سرود حصہ اول معروف بہ غنچۂ دلکش ۱۳۰۰ھ ترانۂ دلچسپ و حصہ دوم معروف بہ نغمۂ بہار مع حصہ سوم نغمۂ سرود" حصہ ا کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبا نے موسیقی سے متعلق رسالہ ۱۲۷۶ھ میں لکھا تھا اور قاعدۂ نغمہ تاریخی نام ہے، لیکن اس میں صرف علمی بحث ہی نہیں، گانے کی چیزیں ٹھمری، غزل وغیرہ بھی ہیں، اور یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ چیزیں کب جمع ہوئیں۔ کتبخانۂ ادارۂ تحقیقات اُردو میں جو نسخہ ہے وہ طبع اول نہیں، طبع دوم کا ہے اور زمانہ انطباع سے متعلق کوئی بات اس سے معلوم نہیں ہو سکتی، بہرحال، کہنا یہ ہے کہ ادارہ گرد اشعار کی اس قسط میں جو نقوش (جون ۵۶ء) نے شائع کی ہے، صہبا کی جس غزل سے بحث ہوئی ہے وہ اس کتاب میں بھی

---

[1] دیوان قلق، تذکرۂ فرح بخش ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں ہیں۔

[2] آثار الشعرا، قاعدہ نغمہ اور ادیب ادارۂ تحقیقات اردو کی ملک ہیں۔

"ظفر بادشاہ دہلی" کے نام سے مندرج ہے (ص۱۶)۔ متن میں جا بجا اختلاف ہیں، "بہادر شاہ ظفر" کا شعر: "سبھی جادہ ماتم الخ" اس سے خارج ہے اور شعر ذیل جو اس میں ہے فغان دہلی اور "بہادر شاہ ظفر" میں نہیں ہے:

"نہ دبایا زیرِ چمن انہیں نہ دیا ہے غسل و کفن انہیں　　کیا یارو کس نے ہے دفن انہیں بے ٹھکانے جن کا مزار ہے"

(۲۷) ادیب نامی ایک ماہنامہ ۱۸۹۷ء میں خیال عظیم آبادی کی نگرانی میں پٹنہ سے نکلا تھا، جس کے غالباً صرف ۴ شمارے شائع ہوئے۔ شمارۂ ۳ میں سید علی سجاد، سجاد (مصنف محلخانہ) کا ایک مضمون "زبان اردو" شامل ہے، جو ناتمام رہ گیا۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"قاضی محمد صادق خاں، اختر ہگلی کی خاک سے اٹھے اور وہیں شہرت حاصل کی۔ کہولت عمر میں لکھنؤ گئے تو وہاں کے منصف طبع فصحا نے ان کے کمال کی صرف زبانی ہی تعریف نہ کی بلکہ ان کو اردو کی شاعری میں مسلّم الثبوت مانا اور بہتیروں نے زبان اردو پر ان کے دخل و تصرّف کو جائز جان کر انہیں استاد سمجھا۔ ایک موقع پر وہ خود تحریر فرماتے ہیں: "روز جمعہ حسب الوعد در خدمت نواب مستطاب حسن رضا خاں بہادر حاضر شدم و جناب ایشاں بعد از فراغ صلوٰۃ جمعہ با جماعت کہ از آدینہ ہائے چند در مسجد بنا کردۂ خود قرار دادہ بودند با چند رفقائے چیز فہم سخن شناس کہ یکے از آں میاں میاں فراغ تیز بودند و ایشاں خود را در زمرۂ اساتذۂ شعرائے اردو می شمردند، نشستہ بودند، فقیر را با کمال گرمجوشی پذیرفتند، بعد مزاج پرسیہا و سوائے چند بحسب ارشاد قصیدۂ تازہ تصنیف را کہ بزبان اردو بود بجا آوردم بخواندن بعد استماع قصیدہ تحسین ہائے وافر با خلوص طبع ارشاد کردند و حضار نیز ہم آوائے نواب مستطاب گردیدند۔ از حاضراں میاں فراغ مزید فرمائش خواندن غزلیات اردو خصوص غزلہائے کہ در صحبت عدیدۂ مشاعرۂ آنجا اتفاق خواندن اینہا شدہ بود، کردند۔ چوں اشارت نواب نامدار نیز یافتم قریب دہ دوازدہ غزلیات بعرض رسانیدم و مقبول افتاد۔ میاں فراغ دو جا در محاورۂ اردو حرف گیری نمودند، یکے در لفظ "عقل کا پتلا" (کذا) کہ خود از فقیر تسامح رو دادہ بود و دخل ایشاں بواجب بود، دیگر لفظ "مت"، چنانچہ در فصحائے دہلی و لکھنؤ در اکثر مقام بمعنی "طبیعت" مستعمل است، معترض شدند و ایں بصراحت مکابرۂ محض ایشاں بود، چنانچہ نواب والا جناب و دیگر فصحائے لکھنؤ کہ صحبت جناب ایشاں کمتر از آنہا خالی مے بود، ارشاد فرمودند کہ شخصے را کہ مثل ایشاں (اشارہ بطرف فقیر اختر بود) قدرت بر تصانیف و شعر و زبان اردو خواہ دیگر زبان بہم رسد، بمحض اینکہ اہل پورب یا پنجاب باشد اگر مثلاً لغزشے عمداً یا سہواً رو دہد، نتواں خردہ گرفت و بپایہ منصفانہ استادی وے را پذیرفت کہ عمرے در تلاش و تحقیق الفاظ بسر کردہ و بپایہ اش بکمال رسیدہ، نہ اینکہ عامیانہ جا و بیجا بر کلام و کلامش حرف گرفتن کہ بدترین عیوب و نقص نام خود حرف گیر است، از آں زماں الیٰ حین التحریر کہ دو سال کامل است، میاں فراغ ہموارہ در اثبات لغزشات فقیر کوشاں و کسانیرا کہ در لکھنؤ تلمذ با حقیر دارند، بطنز یاد کناں، لاکن چوں اساتذۂ شعرائے اینجا کہ خالی قابلیت علم و اخلاق نیستند با فقیر ہمزباں اند، حتیٰ در بعضے مسائل کہ متعلق بمحاورۂ اردو بودند، دخل فقیر را منصفانہ پذیرا کردہ اند، میاں فراغ کارے نتوانستند از پیش برد"

فارسی عبارتیں جو اختر کی طرف منسوب ہیں، فراغ کے اعتراض کی دو برس بعد کی بتائی گئی ہیں؛ حسن رضا خاں کی وفات ۱۲۱۶ھ میں ہوئی تھی (تواریخ اودھ ص ۱۵۳) اور یہ مسلّمات سے ہے؛ اختر نے حدیقۃ الارشاد، مصنفۂ ۱۲۲۶ھ (نسخۂ کتبخانہ خدابخش) کے دیباچے میں اپنی عمر ۲۵ سال کی لکھی ہے اور ناصر نے اپنے تذکرے میں تحریر کیا ہے کہ لفظ "اختر" = (۱۲۰۱) سے ان کا سال ولادت معلوم ہوتا ہے (نسخہ خدابخش)۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عبارات فارسی اسی سال حوالۂ قلم ہوئے ہیں، جب حسن رضا خاں کا انتقال ہوا تھا، تو اختر کی عمر اس وقت ۱۴ سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ وہ اس زمانے میں لکھنؤ میں تھے، اگر سجاد کا یہ بیان بھی کہ اختر شہرت حاصل کرنے کے بعد "کہولت عمر" میں ہگلی سے لکھنؤ گئے تھے، صحیح نہیں؛ حدیقۃ الارشاد، جیسا کہ اس کے دیباچے سے ثابت ہے، لکھنؤ میں سپرد قلم ہوئی تھی۔ فارسی عبارات کے لکھنے والے اختر نہیں ہو سکتے؛ یہ کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں، جس نے آب حیات (ترجمۂ ناسخ) میں اختر کا حال دیکھا ہے، اور جو یہ سمجھتا ہے کہ ناسخ کے ابتدائی زمانے میں اختر لکھنؤ کو مسلّم الثبوت شعرا میں محسوب ہوتے تھے۔ واضح رہے کہ فراغ بقول آزاد بحر شاگرد ناسخ کے ہم مشق تھے (آب حیات ص ۱۸۳) وہ تو ۱۲۱۴ھ میں پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے، اور ہو چکے ہوں گے تو ان کا زمانۂ طفولیت ہوگا۔

فارسی عبارات سجاد کے لکھے ہوئے ہوں یا کسی اور کے، مصلحتہً تحریر ہوئے تھے، مقصد اصلی یہ دکھانا تھا کہ ایک بنگالی خاص لکھنؤ میں مستند قرار پایا اور اگر کسی شاعر سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں، تو ان کی وجہ سے وہ غیر معتبر نہیں سمجھا جاتا۔ سجاد شاگرد شاد عظیم آبادی تھے، اور شاد اُس زمانے میں اپنے ہموطنوں کے اعتراضات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

(۲۸) ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرے
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

نقد غالب مرتبۂ ڈاکٹر مختار الدین احمد میں ڈاکٹر سید عبد اللہ کا ایک مقالہ بعنوان "غالب — معتقد میر؟" شامل ہے۔ اس کے ص۲۶ میں شعر بالا غالب کے نام سے درج ہے، لیکن یہ مومن کا ہے اور مومن کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔

(۲۹) دیوان[1] فضل احمدؔ، کیف لکھنوی کا خاتمہ تسلیم نے لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیف کی وفات بعمر ۶۱ سال، شب جمعہ بتاریخ ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ میں ہوئی تھی۔

(۳۰) دیوان قدر بلگرامی میں قربان علی بیگ، سالکؔ دہلوی کی وفات کا مادۂ تاریخ یہ درج ہے: "نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد" = ۱۲۹۷

---

[1] کیف وقدر کے دیوان کتب خانۂ دانش گاہ دہلی میں ہیں۔

عزیزم کے نام

یہ خطوط کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر تاثیرؔ نے اپنے ایک شاگرد کے نام کیمبرج سے لکھے تھے۔ خطوط بذات خود ایک دلچسپ چیز ہیں اور اگر کوئی صاحبِ طرز لکھنے والا ہو تو ان کی افادیت کے ساتھ ان کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہ خطوط کا مجموعہ بے حد دلچسپ، بڑا معلومات افزا، بڑا ہی کار آمد اور حد درجہ نازک اور علمی مسائل پر تبصرہ بھی ہے۔

قیمت -/۳

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

فقہ ہندی

اختر اورینوی

ہیں، پروفیسر حسن عسکری، پروفیسر سید حسن اور پروفیسر ذکی الحق مختلف پرانے خاندانوں کے کتب خانوں کو دیکھنے بہار تشریف گئے تو ہیں اور قیمتی نسخوں کے علاوہ فقہ ہندی کے دو گرانقدر نسخے ملے۔ ان میں سے قدیم تر غالباً سید شاہ محمد اسحٰق حسین چشتی نظامی المتخلص بہ فقیر و المعروف بہ پیر دریا کا نقل کردہ ہے (؟)، آپ شاہ مجتبیٰ حسین صاحب کے پردادا، اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے بہاری صوفی بزرگ تھے۔ فقہ ہندی کا یہ نسخہ ربودہ اور کرم خوردہ، ہلکے زرد رنگ کے پرانے کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی مذہبی رسالوں کے مخطوطات نظم و نثر میں ہیں۔ ان سب کو ملا کر جلد بندی کی گئی تھی۔ اجزا پریشان، شیرازہ بکھرا ہوا، جلد اُکھڑی اور کیڑا لگی ہوئی، اوراق اکثر الگ الگ اور کنارے پارہ پارہ ہیں۔ آخری صفحہ پر لکھا ہے:

”تمام شد نسخہ فقہ ہندی واقعہ بتاریخ ہشتم شہر رجب ۱۲۱۸ھ فصلی“

نسخہ کے ہر صفحہ کے حاشیہ پر اور بین السطور بہ زبانِ فارسی معنی، تشریح و تفسیر درج ہے۔ اس وجہ سے صفحات پر تحریر بہت گنجان ہو گئی ہے۔

فقہ ہندی کا دوسرا نسخہ مخطوطات کی دوسری جلد میں ہے۔ اس جلد میں کچھ عملیات کے نقوش اور چند فارسی زبان میں مذہبی رسالے بھی ہیں۔ آخری رسالہ ”فقہ ہندی“ ہے۔ کاغذ صاف تر ہے۔ تحریر بھی بہت صاف اور خوبصورت ہے مگر سارے نسخہ کی تحریر میں یکسانی نہیں۔ ”فقہ ہندی“ کا یہ نسخہ کرم خوردہ اور ربودہ حال بھی نہیں۔ اس میں کوئی تشریح و تفسیر نہیں۔ اشعار کی سطریں بہت علیحدہ علیحدہ ہیں۔ آخری صفحہ پر مثنوی کے اختتام کے بعد درج ہے:

”تمام شد نسخہ فقہ ہندی واقعہ بتاریخ سیوم شہر رجب المرجب ۱۲۲۵ھ فصلی از خط خام عاصی گمنام
سید نور علی اختتام یافت“

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فقہ ہندی کے یہ دونوں نسخے کسی قدیم تر بہاری نسخہ سے ہی منقول ہیں کیونکہ مثنوی فقہ ہندی کے ان نسخوں کی زبان پر بہاری زبان کا صاف اثر ہے۔ اس کی شہادت بعد میں پیش کروں گا۔ فقہ ہندی عہدِ عالمگیری کی تصنیف ہے۔ میری تشفی اس امر میں اب تک نہیں ہوئی کہ اس کے

مؤلف و مصنف کا پورا نام کیا تھا اور وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ مجھے اب تک فقہ ہندی کے پانچ نسخوں کی اطلاع ملی ہے۔ ایک پنجاب میں، دوسرا گجرات میں، تیسرا اودھ میں، چوتھا و پانچواں بہار میں۔ بنیادی طور پر یہ سب نسخے ایک جیسے ہیں۔ ان کی زبان ایک ہے، ہاں تھوڑا مقامی بولیوں کا اثر موجود ہے لیکن فقہ ہندی کے ہر نسخہ پر پنجابی بولی کا اثر نمایاں ہے۔

سب سے پہلے فقہ ہندی کا نسخہ کتب خانہ اودھ میں اسپرنگر کو ملا۔ لیکن بقول پروفیسر محمود شیرانی "اسپرنگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں اس کو محشر نامہ کے نام سے موسوم کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کتاب کا نام محشر نامہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ فقہ ہندی ...... وہ اس رسالہ کے ناظم کا نام محمد جیون عرف محبوب عالم متوطن جھجر بیان کرتا ہے اور خاتمہ سے دو شعر نقل کرتا ہے:

فقہ ہندی کو موہناں انوہ زباں پر یاد
مسلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد
سن ہزار چو تھے پنج رمضان (کذا)
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اور شعر افتتاحی حسب ذیل نقل کرتا ہے:

اللہ مولا پاک جو جگ سرجن ہار
جن دہایا رصدق سوں سوے اترے پار

میرے زیر نظر فقہ ہندی (مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔ اے)، ہے جو ۱۲۳۳ھ کی نوشتہ ہے۔ اس میں خاتمہ کا پہلا شعر اسپرنگر کے منقولہ بالا شعر کے مطابق ہے اور شعر دوم یوں ہے:

سنہ ہزار چوہتر پنج ماہ رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

مگر شعر افتتاحی یوں ہے:

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان
لائق حمد ثنا یکے اور نہ کوئی جان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپرنگر کے سامنے دو مختلف رسالے ایک ہی جلد میں ساتھ بندھے ہوئے تھے جن میں فقہ ہندی کا نمبر دوم تھا۔ اسپرنگر نے دونوں رسالوں کو ایک سمجھا۔ اس لئے ابتدائی شعر پہلے رسالے کا دیا اور خاتمہ فقہ ہندی سے نقل کر دیا۔ اسی لئے اس نے مصنف کے نام میں غلطی کھائی ہے۔

فقہ ہندی کا مصنف عبدی ہے، نہ کہ محمد جیون، عبدی کا نام اس شعر میں آتا ہے:

فقہ ہندی زبان پر بوجھ کر و یقین
کہیئے مسلہ دین کے عبدی کہے امین

اس کے علاوہ رسالہ کی زبان اس قدر پنجابی آمیز ہے کہ اس کو ہر بانی زبان میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا۔"

(پنجاب میں اردو)

ل "پنجاب میں اردو": شیرانی ص۲۳۶ تا ص۲۳۹ نیز ص۲۲۵ پر پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں: "شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے اردو کی قلمی یادگاریں گیارھویں صدی ہجری سے زیادہ قدیم نہیں ملتیں۔ پنجاب میں بھی اسی صدی سے تالیفات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں مولانا عبدی کی تصنیف رسالۂ فقہ ہندی سب سے قدیم ہے جو ۱۰۷۸ھ میں بعہد اورنگ زیب عالمگیر لکھا جاتا ہے۔" (پنجاب میں اردو ص۲۲۵)

ظاہر ہے فقہ ہندی فضلی کی "وہ مجلس" سے پہلے کی تصنیف ہے۔ وہ مجلس "بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی یہ کتاب فارسی کی روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔"

(رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، حصہ نثر ص۳)

بعد ازاں شیرانی نے فقہ ہندی کے اٹھائیس شعر نقل کئے ہیں۔ آخر میں فیصلہ یوں کیا ہے:

”عبدی پنجابی میں بھی ایک شاعر گذرا ہے جو رسالہ مہندی کا مصنف ہے۔ اب رسالہ مہندی اور فقہ ہندی کی زبان میں قرابت قریبہ موجود ہے جس سے میرا خیال ہے کہ دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے مثلاً:

فقہ ہندی — مسئلہ آوین دین کے مول نہ ہووے فساد
دیگر — کیتے مسئلے دین کے عبدی کہے آمین
رسالہ مہندی — اکھاں وقت سوال دے مول نہ ہووے فساد
دیگر — واجبات نماز دے عبدی کہے آمین

دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک ہے اور جملوں کی ترکیب اور بندش بالکل پنجابی طرز میں ہے۔“ (پنجاب میں اردو ص ۲۳۹، ۲۳۸)

فقہ ہندی کے اور نسخوں کی زبان کے مطالعہ کے بعد میں اس فیصلہ پر پہنچا ہوں کہ غالباً عبدی کے پنجابی رسالہ مہندی کو سامنے رکھ کر کسی نے فقہ ہندی اس عہد کی اردو زبان میں مرتب کر لیا۔ گویا یہ پنجابی سے اردو میں ترجمہ کا کام تھا۔ اس لئے عبدی کا نام رہنے دیا گیا۔ افسوس کہ رسالہ مہندی میری نظر سے نہیں گذرا ورنہ میں زیادہ قطعیت کے ساتھ کسی فیصلہ پر پہنچتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بقول پروفیسر شیرانی دونوں رسالے خود عبدی نے لکھے ہوں مگر قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرکیف فقۂ ہندی کے اوّلین نسخے کی بنیاد پر اس کے اور نسخے بلاواسطہ یا بالواسطہ منقول و مرتب ہوئے ہوں گے۔ پہلے مسائل مذہبی عربی و فارسی میں ملتے تھے۔ ایک ہندوستانی زبان میں فقہ اسلامی کے مسائل پیش کر کے فقہ ہندی کے مصنف نے بڑا انقلابی قدم اٹھایا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ پنجاب، ہریانہ، گجرات، اودھ اور بہار میں اس کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیونکہ صوفیائے کرام عوام کو مسائل اسلامی سے اچھی طرح واقف کرانا چاہتے تھے۔ فقہ پر اور رسالے بھی بعد میں لکھے گئے۔[1]

مطلب مسئلہ بوجھنا فرض عین کے جان — عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

(پنجاب میں اردو)

مطلب مسئلہ بوجھنا جو کچھ ہوئے زبان — عربی ترکی فارسی ہندوی یا افغان

(نسخہ نمبر ۱ بہار شریف و نسخہ نمبر ۲ ایضاً)

مختلف ناقلوں نے مقامی زبان کا لحاظ کرتے ہوئے فقہ ہندی کی نقل کی اور قدرے ردّ و بدل کیا کیونکہ مقصود عوام کو مسائل سمجھانا تھا۔ مصنف کا نام عبدی ہی رہا (تھوڑے تغیر کے ساتھ عبدی، عبید یا عبدو) کیونکہ مسائل مذہبی اسی سے منقول تھے۔ ذمہ داری اور ساکھ اسی کی تھی۔

فقہ ہندی کے مختلف نسخوں میں جس حد تک پنجابی اثر موجود ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ عہدِ عالمگیر میں ہی یا اس کے قریب ترین زمانہ میں فقہ ہندی کے اوّلین نسخے اودھ، بہار اور گجرات میں منقول ہو گئے تھے ورنہ بعد کے زمانہ میں بہار کے نسخوں میں وہ پنجابی اثر ہرگز نہ ہوتا کیونکہ بہاری اردو سے پنجابی اثر اواخر عہدِ مغلیہ میں بالکل ختم ہو گیا تھا۔ یاد رہے کہ فقہ ہندی کا مقصود ہی لوگوں کو فقہ اسلامی کے مسئلے سمجھانا تھا اور اسی لئے مقامی زبان کے مطابق نسخوں میں ردّ و بدل ہوا ہے۔ مثلاً:

علم شریعت بوجھنا فرض عین کے جان — بالغ عورت مرد کوں جو ہووے مسلمان

(پنجاب میں اردو ص ۲۳۷)

---

[1] خدا بخش مشرقی لائبریری، بانکی پور کا ایک نسخہ۔

دیگر ؎
علم شریعت بوجھنا فرض عین کی جان   بالغ جو رو مرد کوں جو ہوئے مسلمان
(نسخہ ع۱ بہار شریف ص۲)

لہٰذا اگر فقہ ہندی کا نسخہ بعد میں بہار پہنچتا تو پنجابی الفاظ ضرور ہٹا دیے جاتے۔ قرینہ یہی کہتا ہے کہ رسالہ فقہ ہندی تصنیف کے فوراً بعد ہی بہار، گجرات اور اودھ میں پہنچ گیا تھا اور وہاں اچھی طرح سمجھا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ عہدِ عالمگیر تک شمالی اور جنوبی ہند میں تھوڑے فرق کے ساتھ لسانی یکسانی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب صوبہ بہار میں دہلی اور نواح دہلی کی زبان اچھی طرح جڑ پکڑ چکی تھی، یعنی سترھویں صدی عیسوی کے اواخر اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ——

فقہ ہندی کا گجراتی نسخہ علامہ سلیمان ندوی کو سفر گجرات کے دوران ملا تھا۔ علامہ "نقوش سلیمانی"[1] میں لکھتے ہیں:

> "بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکلیشور ہے جو سورت کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا، یہاں عہدِ شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے۔ خاندان کے بانی شاہ عبدالعلیم صاحب ہیں جو اکبر کے معاصر تھے، سنہ ۱۰۱۵ھ میں انہوں نے وفات پائی ہے ...... خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعام دار ہے، موصوف کے پاس خاندان کی پرانی آبرو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے۔ اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں۔"

علامہ موصوف نے کئی گجراتی اردو کے رسالوں کا تذکرہ کیا ہے۔ منجملہ ان کے رسالہ فقہ ہندی بھی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں:

"...... یہ فقہی[2] مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے، آغاز کے اشعار یہ ہیں ؎

حمد و ثنا سب رب کوں خالق کل جہان   لائق حمد ثنای کے اور نکو نہ جان
علم شریعت نال دی بھیجا پاک رسول   جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول
یا رب اپنے کرم سوں بیحد بھیج درود   نبی محمد مصطفےٰ تسوں ہوں خوشنود
پیچھوں ان کی آل پر اور اصحاب تمام   تس پیچھوں احباب پر بہت درود سلام
کیتنے مسئلے دین کے عبدو کیے آمین   فقہ ہندی زبان سے بوجھو کر و یقین
مطلب مسئلے پوچھنا جو کچھ ہوئے زبان   عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں، خاتمہ میں تصنیف کا سال سنہ ۱۰۷۵ھ بعہد اورنگ زیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے، خاتمہ میں ہے ؎

فقہ ہندی کوں مومناں کرو زباں پر یاد   مسائل آویں دین کے کبھو نہ ہوئے فساد
سنہ ہزار پچھتر بیچ ماہ رمضان تمام   اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

---

[1] "سفر گجرات کی چند یادگاریں" نقوش سلیمانی ص۲۶۷

[2] نقوش سلیمانی ص۲۸۰۔ حیرت ہے کہ علامہ ندوی نے پنجاب میں اردو (۱۹۲۸ء) کا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ علامہ کا مضمون پہلے پہل معارف ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس سے بہت قبل پروفیسر شیرانی کی کتاب نکل چکی تھی۔

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی و فارسی کے بجائے ہندی وزن کی پیروی میں ہے ......"

بہار شریف کے نسخوں کے ابتدائی اشعار حسبِ ذیل ہیں :-

حمد ثنا سبھ رب کون خالق کل جہان　　لائق حمد و ثناء کی آو رنکوئے جان
علم شریعت نال کی بھیجا پاک رسول　　جو کچھ بھیجا رب نی سبھ ہم کیا قبول
یا رب اپنی کرم سون بیحد بھیج درود　　نبی محمد مصطفیٰ تس ستین ہوئے خشنود
پیچھون اسکی آل پر آور اصحاب تمام　　تس پیچھوں احباب پر بہت درود و سلام
کیتنی مسلہ دین کی عبدو[۱] کہی امین　　فقہ ہندوئے زبان پر بوجھو کر ہو یقین
مطلب مسلہ بوجھنا جو کوچھ ہوئے زبان　　عربی ترکی فارسی ہندوی یا افغان
علم شریعت بوجھنا فرض عین کی جان　　بالغ جورو مرد کون جو ہوئے مسلمان

پنجابی اور بہاری نسخوں کا فرق ملاحظہ ہو :

		بہاری نسخہ	پنجابی نسخہ
شعر۱	م ۱	سبھ	سب
	م ۲	ثناء کی	ثنا کیے
شعر۲	م ۱	کوئی فرق نہیں	......
	م ۲	سبھ	سب
شعر۳	م ۱	کرم	فضل
	م ۲	.... تس ستین ہویے خشنود	..... تجھ سون ہو خوشنود
شعر۴	م ۱	پیچھون اُسکی	بھیجون اوس کی ......
	م ۲	تِس پیچھون	تِس بھیجون ....
شعر۵	م ۱	.... عَبدُو......	.... عبادی ......
	م ۲	.... ہندوئے .... کرہو....	.... ہنادی ..... کرو.....
شعر۶	م ۱	...... جو کوچھ ہوئے زبان	.... فرض عین کے جان
	م ۲	.... ہندوی	.... ہنادی ....
شعر۷	م ۱	کوئی فرق نہیں	....
	م ۲	.... جورو مرد.... ہوئے.....	..... عورت مرد.... ہوئے.....

فقہ ہندی خاصا بڑا رسالہ ہے۔ کل بتیس اوراق نسخہ ۱ میں موجود ہیں اور ہر صفحہ پر کم و بیش ۶ اشعار درج ہیں۔ رسالہ کے مختلف ابواب ہیں

---

[۱] بہار شریف کے نسخہ ۱ کے حاشیہ پر "عبدو" کے پاس لکھا ہے "نام صاحب مصنف"۔ مصنف کہاں کے رہنے والے تھے یہ اطلاع نہیں دی گئی -
اورینوی

مثلاً فصل دربیان اسلام، فصل دربیان.... نماز، فصل دربیان تیمم، وغیرہ وغیرہ۔ اختتامِ رسالہ میں ذیل کے اشعار درج ہیں :

کعبہ آوے نظر میں پڑھ درود و دعاء
اور تکبیر و تہلیل کہہ جو ہی آمر خداء

فقہ ہندوے کون مومنان آنو زبان پر یاد
مسئلہ آوین دین کے مول نہوئے فساد

سنہ ہزار چوہتر بیچ رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

میری رائے یہ ہے کہ بہاری نسخہ گجراتی نسخہ سے قدیم تر ہے یا قدیم تر نسخہ سے منقول ہے۔ بہاری، اودھی اور پنجابی نسخوں میں زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ سنہ تصنیف میں بھی گجراتی نسخہ علیحدہ ہے۔ اس میں "سنہ ہزار پچھتر" لکھا ہوا ہے اور بقیہ نسخوں میں "سنہ ہزار چوہتر" —— گجراتی نسخہ کے خاتمہ کے اشعار دوسرے نسخوں کے انہی اشعار کے مقابلہ میں ملاحظہ ہوں :

فقہ ہندی کون مومنان کرو زبان پر یاد
مسائل آوین دین کے کبھو نہ ہوئے فساد

(گجراتی نسخہ)

فقہ ہندی کو مومنان انو زبان پر یاد
مسئلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد

(اودھی و پنجابی نسخہ)

فقہ[1] ہندی کون مومنان آنو زبان پر یاد
مسئلہ آوین دین کے مول نہ ہوئے فساد

(بہاری نسخہ ۱)

بہاری[2] نسخوں میں بہاری زبان کے اثرات ملتے ہیں۔ مثلاً "سب" کے بجائے "سبھ"۔ "بیچ" کے بجائے "بیچھ"۔ "ہات" کے بجائے "ہاتھ"

---

[1] بہار شریف کے دونوں نسخوں میں بڑی یگانگت ہے۔ اغلب یہی ہے کہ نسخہ ۲ نسخہ ۱ سے نقل کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں خفیف اختلاف پایا جاتا ہے جو نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ نسخہ ۱ "فصل دربیان سنّت" کے پانچ اشعار کے بعد کئی اوراق غائب ہیں۔ نسخہ ۲ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے پھر اس شعر سے سلسلہ جڑتا ہے ؎

مونڈ برابر بیٹھ رکھ رکوع کے ساتھ
طرف قبلہ کر انگلیاں سجدہ بیچ کر ہاتھ

[2] نئی ہند آریائی زبانوں میں سے وسطی زبانیں یعنی مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری زبانیں "ہ" کی آواز (Aspirate) کو بڑی تاکید سے الفاظ کے بیچ یا آخر میں قائم رکھتی ہیں۔ "ہ" کی مرکب آواز بھی قائم رکھی جاتی ہے اور اس کا اعلان ہوتا ہے مثلاً گھ، جھ، دھ، ڈھ، بھ کی آوازیں۔ برخلاف ان کے بنگالی، پنجابی اور سندھی میں "ہ" کی آواز گر جاتی ہے یا بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔ (انڈو ایرین اینڈ ہندی: چٹرجی ص۱۰۵ بحوالہ بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن حصہ سوم ص۳۰۱-۳۱۵) ڈاکٹر گراہم بیلی نے اس سلسلہ میں پنجابی پر کام کیا ہے، آر۔ ال۔ ٹرنر نے سندھی پر اور چٹرجی نے بنگالی پر۔

بہاری		بنگالی
بہن	=	بوٗن
باگھ	=	باگ
لابھ	=	لاب
بیاہی	=	بیائی

بہاری		پنجابی
بھوکھ	=	پکھ
جھاڑو	=	چُھاڑو
گھوڑا	=	کوٗاوڑا
بھابھی	=	پوٗابی

دین' کے بجائے 'دینہہ'، 'جاؤنا' کے بجائے 'جاونہ'، 'پانچ' یا 'پنچ' کے بجائے 'پانچہ'، 'پیچھے' کے بجائے 'پیچھیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ فقہ ہندی کے بہاری نسخہ میں مقامی زبان کا لحاظ رکھتے ہوئے تھوڑی تبدیلی کی گئی ہے۔ 'ہ' کی آواز کا اعلان بہاری بولی میں مبالغہ کے ساتھ دیر تک ہوتا رہا۔ پنجابی نسخہ میں 'ہ' کی آواز گر گئی ہے۔ لیکن 'فقہ ہندی' کے پانچوں نسخوں کی زبان کا عام ڈول اور ڈھانچہ کھڑی بولی ہندستانی کا ہے۔ صرف پنجابی اثر کی وجہ سے نہ تو ہم اسے پنجابی بولی کا رسالہ کہیں گے اور نہ یقینی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'فقہ ہندی' کو ہندوستانی مثنوی کا روپ دینے والا کوئی پنجابی ہی تھا۔ بہرکیف یہ بڑے معرکہ کا رسالہ ثابت ہوا اور ملک کے دور دراز علاقوں میں معروف، مشہور و مرغوب ہوا ہے۔

اوپر کے بیانات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عہد عالمگیری میں کھڑی بولی ہندوستانی بہار میں گھر کر چکی تھی اور عام فہم ہو گئی تھی۔ نیز یہ کہ بہار کی زبان میں "ریختہ پن" بھی پیدا ہو چکا تھا۔ انہی دو عناصر سے معیاری اردو زبان بنی ہے۔ یہ زمانہ بہار میں اردو زبان کے ارتقا کا ایک اہم سنگ میل ہے۔

پیچ و خم

یہ عدمؔ کی ایک سو سے زائد مترنم، دل آویز اور پیاری پیاری سی غزلوں کا ایک سادہ سا مجموعہ ہے جسے اب پچاس نئی غزلوں کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی ہر ہر غزل اور ہر ہر شعر پر جھوم جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے۔

داغؔ کے بعد جتنی روانی اور سلاست ان کے حصے میں آئی وہ اور کسی کو میسر نہیں ہے۔

قیمت -/۳

جانِ عالم

انگریزوں نے اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو جب معزول کر دیا تو انہوں نے اپنے آخری چند سال مٹیا برج میں گذارے تھے۔ وہ دن کس طرح کاٹے اور وہاں وہ کس حالت میں رہے اور ان کا وہاں کیا شغل رہا، ان تمام باتوں کا آنکھوں دیکھا حال اردو کے مشہور مؤرخ عبدالحلیم شررؔ نے اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔

قیمت ۲/۴

اصحابِ کہف

نیازؔ فتحپوری نے مصر کے ایک بڑے مشہور ڈرامہ نگار توفیق الحکیم کے ایک نادر ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ڈرامہ قرآن کے ایک مشہور واقعہ سے متعلق ہے جو قرآن سے قدرے مختلف ہے لیکن جو کچھ اس میں ہے اور اسے جس طرح پیش کیا گیا ہے، وہ بعید از عقل نہیں ہے۔ یہ ڈرامہ مصر میں بے حد مقبول ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اردو میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

قیمت 1/12

ادارۂ فروغِ اردو لاہور

نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ

راجندر ناتھ شیدا

اردو ادب آج ایک انتشار کے عالم میں ہے اور یہ انتشار بھی کچھ عجب طرح کا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے ہندوستان تیزی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں علاقائی ادب کو فروغ دینے کا احساس موجود ہے۔ ادیب پہلے کی نسبت زیادہ آسودہ حال ہے۔ اُس کے لئے روزی کے وسائل ہی نہیں ترقی کی سہولتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی امور میں بصیرت حاصل کرنے کے لئے جو موقعے آج مل رہے ہیں کبھی پہلے ممکن نہ تھے۔ اس کے باوجود ادب کی تخلیق مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ یوں کہنے کو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو ادب سے محبت رکھنے والے ہر شخص کے دل میں ایک طرح کی بے اطمینانی ہے۔ ان حالات میں قدرتی طور پر دل میں کئی طرح کے سوالات اُبھرتے ہیں۔ یہ صورتِ حالات کیوں پیدا ہوئی؟ کیا قومی زندگی کی کچھ تحریکیں اور رجحانات ادب کی ترقی میں مزاحم ہوتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کس حد تک؟ ہم خود کہاں تک اس کے ذمہ دار ہیں؟ اور اس کا تدارک کیا ہے؟

کچھ دوست کہتے ہیں ادب میں جمود نہیں ہے۔ تصنیفات برابر ظہور میں آ رہی ہیں۔ دیکھئے فلاں افسانہ نگار نے وہ ناول لکھا۔ اُس شاعر کا یہ مجموعہ شائع ہوا۔ وہ ناشر برابر کتابیں شائع کر رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے میں نے یہ لکھا وہ لکھا مگر ان میں سے یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اب ادبی پیداوار پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے یا کم اور جو کچھ لکھا بھی گیا ہے اُس کا ادبی معیار کیا ہے۔ تاریخ ادب میں سنگ میل بن سکنے کی بات چھوڑیئے۔ ان کتابوں میں کتنی کچھ عرصے تک بھی زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں؟ اس پر فرماتے ہیں، حالات ناموافق ہیں، ماحول سازگار نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہی جاتی ہے کہ جب زندگی فطرتاً ارتقاء پذیر ہے اور ادب اس کا عکس ہوتا ہے تو وہ زوال پذیر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس طرح یہ ادبی بحث فلسفیانہ بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے اور موٹی موٹی حقیقتیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

زندگی فطرتاً ارتقاء پذیر رہتی ہے اس میں شک نہیں لیکن کسی زبان کا ادب بھی ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہ بے بنیاد دعویٰ ہے۔ زندگی اور ادب کے خطوط ہمیشہ متوازی نہیں چلتے۔ اکثر اوقات یا تو ایسے حالات کی وجہ سے جو ادیبوں کے دسترس سے باہر ہیں یا ادیبوں کی اپنی کج بینی اور کج روی کے سبب ادبی سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ ادیب زندگی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے لایعنی تصورات کی دنیا میں جا بستا ہے اور روحِ ادب کو فراموش کر کے محض

تبحّر یا تصنّع کو معراجِ کمال سمجھنے لگتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی اور ادب کا باہمی تعلق، اُن کا ایک دوسرے پر عمل اور ردِعمل کے طریقے بہت پیچیدہ ہیں جن کو کوئی مشینی تشریح درست نہیں ہو سکتی۔

جو لوگ سنجیدگی سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں وہ حقائق ہی کو نہیں دیکھتے اُن کے اسباب و علل کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، نتائج نکالتے ہیں، اصول وضع کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی اور ادب کے رموز و روابط کو سمجھ کر ادب کے لئے ترقی کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ ادب کے رجحانات اور میلانات اس کی تقدیرِ مبرم نہیں ہوتے۔ انہیں دانش مندی سے بدلا، سنوارا، اُبھارا اور صحیح راستوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔

اردو ادب کی موجودہ حالت تشویشناک ہے اور اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ یوں ملک میں مشاعروں کی کوئی کمی نہیں۔ چھوٹے بڑے ادبی ادارے بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً جلسے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کانفرنسیں بھی ہوتی ہیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتیں کئی طرح سے ادیبوں اور اداروں کی امداد اور ہمت افزائی بھی کرتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگ حکومت سے شکوہ و شکایت بھی کرتے رہتے ہیں اور شاید یہ کام ہوتے رہنے بھی چاہئیں، لیکن ان سب کی حیثیت ثانوی ہے۔ ادب کی ترقی محض ان چیزوں پر منحصر نہیں ہوتی (خواہ ذاتی طور پر ادیبوں کی ترقی ان پر منحصر ہو) ادبی ترقی حقیقت میں منحصر ہوتی ہے اعلیٰ پایہ کے ادب کی تخلیق پر اور یہ تخلیق منحصر ہوتی ہے کچھ حالات پر جو آج کل اطمینان بخش نہیں ہیں۔ آج پہلے سے لکھنے والے معروف شاعروں اور ادیبوں میں تساہل آ گیا ہے۔ اُن میں سے اکثر یا تو لکھنا پڑھنا تقریباً ترک کر چکے ہیں۔ یا اگر کبھی کبھار لکھتے بھی ہیں تو تحریروں میں توانائی اور کوئی جدت نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ اُن کا فکری ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ جو باتیں وہ کہہ رہے ہیں اُن کی صحت پر خود اُن کو شبہ ہے۔ اس لئے اب جب کسی بات پر اظہارِ رائے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اُس میں عجب طرح کا اُلجھاؤ ہوتا ہے اور اکثر اوقات پڑھنے والا بادیٔ نظر ہی میں پریشان خیالی اور متضاد بیانی کا پتہ چلا لیتا ہے۔ فنّی اعتبار سے اظہارِ بیان، اسالیب، ٹکنیک اور اصناف کے جو نئے تجربے پچھلے سالوں میں ہوئے تھے ان میں بھی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ اخذ و ترک اور تراش و خراش کا ذوق، جس کے بغیر فن آگے نہیں بڑھتا۔ اس میں رعنائی اور کشش پیدا نہیں ہوئی، شکست خوردہ سا ہو گیا ہے۔ طبیعتوں میں ایک طرح کی بے دلی اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ ایسے حالات میں سب سے بڑی کوشش ان بزرگوں کی یہ ہوتی ہے۔ کہ اپنے پچھلے ارشادات پر نگاہِ واپسیں ڈالیں، اپنی اور اپنے ہم مسلکوں کی خدمات کی یاد تازہ کراتے رہیں، نئے حالات کی روشنی میں اپنے پیش کردہ نظریات کی تاویلیں کریں، غیر مطمئن قارئین کی دلجوئی کے لئے کچھ نئے خیالات وضع کریں، خواہ وہ کتنے ہی سطحی کیوں نہ ہوں اور جب یہ نہ ہو سکے تو جن باتوں سے لوگ زیادہ برہم نظر آئیں انہیں اپنی "غلطیوں" اور "انتہاپسندی" کے پردوں میں چھپا دیں۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا۔ کہ ان کے فکر و خیال کے فنکاروں نے خود بخود اپنا رخ بدل لیا ہے یا کہیں سے فہم و فراست کی کوئی نئی لہر آ گئی ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر ایسی باتیں کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار اب انہیں نظر نہیں آتا۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ نئے ادیبوں کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔ جن ادیبوں نے حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے اُن میں شاذ و نادر ایسی صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے۔ جن کی بنا پر مستقبل میں بھی اُن سے کوئی خاص توقعات وابستہ کی جا سکیں۔ پھر ادب کی اشاعت کی سہولتیں بھی کم ہو گئی ہیں اچھے ادبی رسائل دم توڑ رہے ہیں یا توڑ چکے ہیں۔ نئے ظہور میں آتے نہیں جو نکل بھی رہے ہیں وہ ایسی چیزیں چھاپنا پسند کرتے ہیں جو مفت حاصل ہو جائیں اور اگر کسی ادیب یا شاعر کو کبھی معاوضہ دیتے بھی ہیں تو زکوٰۃ سمجھ کر۔ یہی حال کتابوں کے ناشرین کا ہے۔ انہیں اپنی کتابوں کی نوعیت یا ادبی اہمیت سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی اپنے منافع سے۔ لہٰذا وہ تیسرے درجے کی تصنیفات شائع کرنا پسند کرتے ہیں جن کے جملہ حقوق برائے نام قیمت پر حاصل ہو سکیں۔ کوئی مصنف بننے کا شوقین اپنی کتاب بالکل مفت نذر کر دے تو وہ اور بھی بہتر ہے۔ کچھ ناشرین کبھی کبھار اگر ایسے مستند ادیبوں کی کتابیں، جن کی فروخت کے متعلق کسی اندیشے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، شائع کرتے بھی ہیں تو اُن کے لئے رائلٹی دینا اور ادیب کے لئے حاصل کرنا ایک مستقل دردِ سر بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے ان سب باتوں سے اچھے ادب کی پیداوار ہی پر بہت بُرا اثر نہیں پڑتا بلکہ قارئین کا ذوقِ مطالعہ بھی بُرے اثرات قبول کرتا ہے۔ لوگوں کو ناقص اور مضر ادب پڑھنے کی عادت پڑتی ہے۔ کبھی کبھی ان حقائق کو یہ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ تو سب کچھ پہلے بھی ہوتا تھا۔ اس میں دورِ حاضر کی کیا خصوصیت ہے؟ اور

ایک حد تک یہ بات صحیح بھی ہے۔ گھٹیا ادب پہلے بھی تخلیق اور شائع ہوتا تھا۔ ناشرین کی یہ ذہنیت بھی کچھ نئی نہیں ہے مجھے اس سے انکار نہیں۔ دراصل میں جس چیز کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلے ادیبوں کی سطحیت پسندی اور ناشرین کی خود غرضی کے دھاروں کے ساتھ ساتھ سنجیدگی، خود سپردگی اور ادبی خدمت کے والہانہ ذوق کے دھارے بھی بہتے تھے اور انہی کے سہارے ادب کا سفینہ آگے بڑھتا تھا۔ اب وہ رجحانات کمزور پڑ گئے ہیں اس لئے ادب سیدھا تیرنے کی بجائے ایک طرح کے گرداب میں آ پھنسا ہے۔

کچھ لوگ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اس کا ذمہ دار ادیبوں یا ماضی قریب میں ادبی رجحانات کو نہیں دوسرے خارجی حالات کو ٹھہراتے ہیں کہتے ہیں پچھلے برسوں میں اردو کے لئے غیر معمولی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں جن کے سبب ایسے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کو جن کا پیشہ کسی نہ کسی صورت سے اردو سے متعلق تھا اقتصادی پریشانیاں رہی ہیں یا کم از کم انہیں ترقی کی راہیں مسدود نظر آنے لگیں۔ ان باتوں کا اثر ادب کی تخلیق اور اشاعت پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ یہ باتیں بھی ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں۔ یہ ادب کی قدرتی اٹھان پر اثر انداز ہوئی ہیں اور انہیں ہونا بھی چاہیئے تھا۔ لیکن ادب کو نقصان پہنچانے والی صرف یہی چیزیں نہیں ہیں۔ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اردو کے لئے مذکورہ دقتیں پچھلے چند برسوں میں پیدا ہوئی ہیں اور اب پھر فضا بدل رہی ہے جبکہ ادب میں غلط رجحانات اس سے کہیں پہلے سے موجود ہیں اور انہی رجحانات میں موجودہ خلفشار کی اکثر جڑیں پوشیدہ ہیں۔

میں پہلے بھی شاید کہیں لکھ چکا ہوں کہ موجودہ صدی کے ربع ثانی کے آغاز میں ہمارے ملک میں زندگی کے ہمعصر مسائل کو سمجھنے کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر حصول آزادی کے لئے جو بے پناہ جذبہ دلوں میں پیدا ہو چکا تھا اُس نے رفتہ رفتہ ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سنجیدگی سے سوچنے لگا آزادی کے حقیقت میں معنی ہیں کیا؟ ہماری سیاسیات کا عالمگیر تحریکات اور حالات سے کیا تعلق ہے؟ یہ کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہیں؟ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں میں بنیادی فرق کیا ہے؟ انسانی راحت اور طمانیت پر کس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ عملی زندگی میں روحانیات کا کیا مقام ہے؟ اقتصادی زندگی کے حقائق جذبات اور نظریات پر کس صورت سے اثر انداز ہوتے ہیں؟ قومی زندگی کی کشمکش میں فرد کا کیا فرض ہے؟

میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ اُس وقت جو کچھ سوچا گیا وہ صحیح ہی تھا۔ سوچنے والوں کی نظریں بدیہی طور پر کچھ حقائق تک پہنچنے سے قاصر رہیں۔ اُس دور کے اکثر مفکرین کے نظریات پر جاگیرداری طریقۂ فکر کی اَمِٹ مہریں موجود ہیں۔ ایک طرح کی "مشرق پرستی" بلند ترین سطحوں پر بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت لوگ سنجیدگی سے غور و فکر کرتے اور پڑھتے تھے۔ بصیرت حاصل کرنے کے لئے واقعات کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئیے کہ فکری دنیا کی یہ حرکت عملی دنیا کی ہلچل ہی کا شاخسانہ تھی۔ لوگ عمل سے کنارہ کشی اختیار کر کے تصورات کے عالم میں کھو جانے کے آرزومند نہیں تھے بلکہ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کن مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہونا مناسب ہے۔ ہمارے اعمال و افعال کا زندگی پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟

قدرتی طور پر زندگی کی یہ کروٹ ادب کے لئے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں قوم کی مختلف زبانوں نے کئی بڑے ادیب پیدا کئے۔ اقبال اور پریم چند کا قیمتی ادب بھی زیادہ تر اسی دور کی پیداوار ہے۔ اِن ادیبوں نے ہم عصر حیات کی جد و جہد اور مسائل پر اپنی ادبی تعمیریں قائم کیں۔ اپنی اپنی نظر سے زندگی کو دیکھا، سمجھا، اپنے مزاج کے مطابق نتائج نکالے اور انہیں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ادبی کام کو مشن سمجھ کر کرنا اُس میں سنجیدگی سے دلچسپی لینا یہ مشترکہ خصوصیت تھی ان ادیبوں کی۔ اسی لئے اُن کا ادب فکری اور فنّی اعتبار سے قدر کے قابل ہو پایا ہے۔

زندگی کی جس چہل پہل نے اردو میں اقبال اور پریم چند وغیرہ کے ادب کو جنم دیا اُسی نے "ترقی پسند مصنفین" کے قیام اور کام کو ممکن بنایا۔ اولوالعزم نوجوانوں نے ادب کو مروّجہ بدعتوں سے پاک کرنے، اسے زندگی سے قریب لانے اور انقلابی جد و جہد میں استعمال کرنے کے جوش میں، اپنے چند رہنماؤں کی حسب خواہش اسے قائم کیا۔ چونکہ اُس وقت ملک میں ماضی کی بہت سی باتوں سے بیزاری، واقعات کو سمجھنے کی خواہش اور آگے بڑھنے کا جوش موجود تھا اور انجمن کے اعلان کردہ مقاصد میں کوئی بات ایسی تھی نہیں جو سماجی یا ادبی ترقی کے خواہش مند حلقوں میں برہمی کا باعث ثابت ہو، اس لئے کچھ مشہور ادیبوں اور مقتدر

قومی رہنماؤں کی نیک خواہشات تحریک کے شریک حال ہوگئیں۔ پریم چند نے پہلی کانفرنس کی صدارت کی۔ اُس کے قیام کو نیک فال سمجھا۔ اُس کے حق میں کلمۂ خیر کہے۔ خلوصِ دل سے کہے۔ انجمن نے ایک قلیل عرصے میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ پیدا کر لی۔ آئندہ برسوں میں کم از کم اردو ادب پر اس تحریک کا گہرا اثر پڑا۔

رفتہ رفتہ انجمن نے اپنا سیاسی رُخ دکھانا شروع کر دیا۔ ادیب کی نظر سیاست کار کی نظر بننے لگی۔ سیاسی مقاصد کی ترجمانی اُس کا مقصد بن گئی۔ اُس کے جلسوں میں خالص سیاسی نوعیت کی قراردادیں منظور کی جانے لگیں۔ اس طرح ادیب نے اپنا مقام کھو کر ایک اشاعتِ کار کا درجہ حاصل کر لیا۔ اُس کا کام دوسروں کی بتائی ہوئی باتوں کو اپنے ادب کے ذریعے قارئین تک پہنچانا رہ گیا۔ ادیب کی فکری صلاحیتیں محبوس ہو گئیں۔ علانیہ کہا جانے لگا کہ ادیب کی انفرادیت اُس کے خیالات سے نہیں اُس کے انداز بیان اُس کے اسلوب سے قائم ہوتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اراکین انجمن میں سے کچھ ان باتوں سے پوری طرح متفق نہیں تھے لیکن اُن کی آواز دب گئی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دوسری باتوں میں میانہ روی کے قائل ہوتے ہوئے بھی سیاسی مقاصد کے لئے ادبی تحریک کے استعمال کو اصولاً غلط نہیں سمجھتے تھے لیکن اس کا اظہار خلاف مصلحت تصور کرتے تھے۔ کچھ نادانستہ طور پر یا ارزاں شہرت حاصل کرنے کے جذبے سے مجبور ہو کر اُن کے ہم نوا ہو گئے۔ اگرچہ بظاہر ان کی سیاسیات میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے فضائے ادب میں ایک عجیب طرح کا غلغلہ اور انتشار پیدا کر دیا۔ جو صلاحیتیں اور جوشِ طبیعت گیسوئے ادب سنوارنے میں صرف ہونا چاہئے تھا لایعنی بحث و تکرار، باہمی رقابت، گروہ بندیوں اور سرگوشیوں میں صرف ہونے لگا۔ ادیبوں کی نظر میں تنگی آ گئی۔ اُن میں بے خوفی سے حق گوئی کی جرأت کم ہو گئی۔ اُن کی زبانیں اور دل متضاد باتیں کہنے لگے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انجمن کی صفوں میں مخلص اور سمجھدار ادیب موجود نہیں تھے یا انہوں نے اپنے ہم مسلکوں کو بے راہ روی پر کبھی ٹوکا نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ حالات کی روز افزوں ابتری کو روک نہیں پائے۔ یا ہو سکتا ہے انہیں بھی انجمن اور ادب کے مفادات لازم و ملزوم نظر آتے ہوں اور اُس کے طریقۂ کار کی اصلاح کے سلسلے میں کوئی بڑا قدم اُٹھانے میں کچھ دوسرے خدشات ذہن نشین ہوں۔ بہرکیف حقیقت کچھ بھی کیوں نہ ہو نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

۱۹۳۰ء کے آس پاس جن نوجوانوں نے لکھنا شروع کیا اُن میں کئی نہایت ذہین تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ اُن میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ماحول کے محرکات انہیں نئی زندگی سے روشناس ہی نہیں کرا رہے تھے بلکہ اُن کے دلوں میں لکھنے پڑھنے کی اُمنگ بھی پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ادب کے سرمائے میں کچھ قیمتی چیزوں کا اضافہ کیا۔ پچھلی نسل کے کچھ حساس ادیب بھی اُن کے ساتھ ہو گئے۔ اقبال اور پریم چند کی وفات کے کچھ عرصے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن جیسے جیسے سیاست مسلکی کا زہر ادب کی شریانوں میں سرایت کرتا گیا اُس کے قوا مفلوج ہوتے گئے۔ متوسط طبقے کے نوجوانوں کی جنسی بھوک نظم و نثر میں عنصر غالب بن کر نمودار ہونے لگی۔ کھوکھلی نعرہ بازی، نظریاتی عصبیت، صحت مند روایات کے خلاف غیر دانش مندانہ بغاوت، دہشت انگیزی، طعن و تضحیک اور ابہام و انتشار سنجیدہ غور و فکر اور فنّی ریاضت کی جگہ لینے لگے۔ خود ترقی پسندوں میں کئی ذہین نقّاد موجود تھے، اُن کا نئے ادیبوں پر اثر بھی تھا۔ لیکن انہوں نے بھی عموماً اگر مگر لگا کر باتیں کیں۔ ادیبوں کو تحریک کے دوستوں اور دشمنوں میں منقسم تصوّر کر لیا۔ لہٰذا وہ معترضین کو تو مختلف خطابوں سے سرفراز فرماتے رہے اور دوستوں کی بدعتوں کے خلاف پوری طاقت سے آواز بلند کرنے سے کتراتے رہے۔ اُن کی گمرہی پر توجیہی پردے ڈالتے رہے۔

ایک دور ایسا بھی آیا جب یہ کہا جانے لگا کہ ادیب کا انقلابی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ انقلابی ہی عمل میں سرگرم عوام کے جذبات کو سمجھ سکتا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ جو ادیب عملی سیاست میں شریک نہیں ہیں اُن کا ادب ناقص ہے۔ وہ متحرّک زندگی کے حقائق پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات تو ایک حد تک سمجھ میں آتی ہے کہ انسان زندگی کے جس پہلو کو زیادہ قریب سے دیکھتا ہے جس کے واردات خود اُس پر طاری ہوتے ہیں اُس کا زیادہ قابل وثوق علم بھی اُسی کو ہونا چاہئے لیکن اُن واقعات کی نوعیت اور اہمیّت کو سمجھنے اور منتقل کرنے پر بھی اُسی کو قادر ہونا چاہئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والے واقعات کا تجزیّہ کرنے اور انہیں وسیع توجیہات کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کے لئے کچھ ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ذہنی دنیا کے واردات کو زیب قرطاس کرنا یہ بھی فنّی قدرت، اور مہارت چاہتا ہے۔ محض سیاسی ہنگامہ آرائی اور خامہ فرسائی سے کام نہیں چلتا

پھر یہ بھی ہے کہ اچھا ادیب کسی قدر فاصلے پر رہ کر بھی اپنی تخیلی اور دوسری قوتوں کے سہارے واقعات کو اپنے ذہن میں زندہ کرنے اور اُن کی صحیح تصویریں کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ادب اور سیاسیات کے باہمی روابط کا مزید ذکر مَیں ایک حالیہ مضمون میں کر چکا ہوں۔ یہاں تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ اتنا البتہ عرض کر دوں کہ اگر سیاسی جماعتوں کو اپنے قومی ادب کو فروغ پاتے اور ترقی کرتے دیکھنے کی تمنا ہے تو وہ اپنے حصولِ مقاصد کے لئے ادبی اداروں کو استعمال کرنا ترک کر دیں۔ ادیبوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی آزادئ فکر و بیان کو خارجی مقاصد پر قربان نہ ہونے دیں۔ اُن کا اصلی فرض زندگی کو تنقید کے ذریعے صحیح راستے پر ڈالنا ہے۔ اس بڑے فرض کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ میدانِ ادب کو نام و نمود کے متوالے مہم بازوں کی جولاں گاہ بننے دینا ادیبوں کے شایانِ شان نہیں۔

ادبی سیاست بازی میں، جیسا کہ ذکر گزر چکا ہے، حالات بدلنے پر ادیب کو اپنے خیالات اور اپنا لب و لہجہ بدلنا پڑتا ہے۔ اگر حالات میں کوئی بڑا انقلاب آ جائے تو نظریاتی قلابازی تک کھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ آج ترقی پسند یہ نہیں بتا سکتے کہ ترقی پسندی آخر ہے کیا۔ وہ کونسی کسوٹی ہے جس پر ادب کو پرکھ کر ترقی پسندی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے؟ شروع شروع میں ترقی پسندی کچھ بدیہی طور پر غلط باتوں کے خلاف، کچھ سماجی بدعتوں اور ناانصافیوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے کا نام تھی۔ بائیں بازو کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں میں اور اُن کے باہر بھی ایسے لوگ تھے جو اِن باتوں پر متفق تھے لیکن رفتہ رفتہ جب تفصیلات سے متعلق بحث ہونے لگی تو اختلافات رُونما ہوئے۔ کچھ لوگ مسائل کے مادّی اور اقتصادی پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دینے لگے کچھ اخلاقی روحانی اور مذہبی کو۔ اس طرح نظریات کے دھارے مختلف سمتوں میں بہتے نظر آنے لگے۔ ترقی پسندی عموماً ادب کی مارکسی تعبیر سمجھی جانے لگی۔ مارکس اور اینگلز کے اقوال سے متعلق بھی دنیا بھر میں اختلافِ رائے موجود ہے جس کی بنیاد زیادہ تر کچھ باتوں پر کم و بیش زور دینا ہے۔ چنانچہ ترقی پسندوں کی صفوں میں بھی ایک حد تک اختلاف رہا۔ مگر پھر بھی ترقی پسندی عموماً ایک مخصوص سیاسی جماعت کے کھینچے ہوئے خطوط پر چلتی رہی۔ اس لئے ترقی پسندوں کے موجودہ تفرقہ بکھراؤ کے اسباب بھی سیاسیات میں تلاش کرنے چاہئیں۔ اس کی زیادہ تر جڑیں وہیں ملیں گی۔

میں یہ مانتا ہوں، میں نے لکھا بھی ہے کہ اپنے چند نظریات کے ذریعے مارکس نے انسانی علم میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر کوئی ادیب مارکس کے ان نظریات کو اپنے تجربوں کی بنا پر صحیح سمجھتا ہے۔ زندگی کے تجربات میں اُسے ان کی صحت کی شہادت ملتی ہے اس لئے ان کا قائل ہے تو اس کی تحریروں میں یقیناً اُن کو اہمیت حاصل ہو گی۔ ایسی صورت میں اس کے قول اور عقیدے میں کوئی تضاد نہیں ہو گا اُسے ایسا سوچنے سمجھنے کا پورا حق حاصل ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادیب کو نظریات کی روشنی میں زندگی کو دیکھنا شروع نہیں کرنا چاہیئے۔ زندگی کی روشنی میں نظریات کو پرکھنا اور ردّ یا قبول کرنا چاہیئے کیونکہ زندگی سے نظریات پیدا ہوتے ہیں اور زندگی ہی سے ان کے صحیح یا غلط ہونے کا علم ہوتا ہے۔ جو ادیب نظریے کی روشنی میں زندگی کو دیکھتا ہے وہ خیال پرست ہو جاتا ہے مشینی طور پر نظریے اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے لگتا ہے۔ اور اس کا ادب بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی ایک متحرک چیز ہے اس میں حیرت انگیز تنوع ہے اور بے حد صلاحیت ہے نشوونما کی۔ وہ آج تک بے شمار نظریوں اور عقیدوں کو باطل ثابت کر چکی ہے۔ مارکس کے نظریات میں اس گہرائی کے باوصف انہیں انسانی علم کا حرفِ آخر تصوّر کرنا ایک مضحکہ خیز غیر مارکسی حرکت ہے۔ جماعت بندی حدِ اعتدال سے گزر کر ذہنی قوتوں کو سخت نقصان پہنچاتی ہے کیونکہ انسان کے خیالات کو قرار دادی قسم کا بننا پڑتا ہے۔ پھر جماعت کو مقبول رکھنے کے لئے قدم قدم پر لوگوں کی ناخوشی اور خوشنودئ مزاج کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں پیش کرتا ہوں۔ ایک زمانے میں کچھ دوست محض نیک نیتی اور خلوص پر انسان دوستی کو منحصر تصوّر نہیں کرتے تھے۔ وہ ان مخلصانہ باتوں کا زندگی پر اثر دیکھتے تھے اور اسی اثر سے اُن باتوں کی افادیت اور مضرت کا اندازہ لگاتے تھے۔ اصولاً اس میں کوئی قباحت بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ روحانیات کے قائل لوگ، جن کا مشرق کے اکثر ملکوں کے سماج پر آج بھی بڑا اثر ہے۔ زندگی میں 'دل' کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اثرات کو احساسات کے تابع تصوّر کرتے ہیں، اُن سے متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو ہمارے ملک میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہیں ان دوستوں کا نظریہ غلط معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس سے اکثر اوقات ان کے عقیدے کے خلاف نتائج نکلتے تھے اور مخلصانہ کوششوں کی اہمیت کم ہوتی تھی۔ چنانچہ اب اِن دوستوں

نے اُس جھنجھٹ کو چھوڑ کر افادیت اور ترقی پسندی کا معیار "انسان دوستی" کو قرار دے دیا۔ جو انسان دوستی پہلے ایک مبہم تصور سمجھی جاتی تھی۔ اب ادب کی افادیت اور اہمیت ناپنے کا پیمانہ بن گئی۔

مشکل کی بات یہ ہے کہ یہ خیال کرنا کہ ہم جس وقت جو چاہیں کہیں لوگ ہماری باتوں کو الہام اور وحی سمجھ کر ایمان لے آئیں گے محض خود فریبی ہے۔ آج انسان بہت بیدار ہو چکا ہے۔ وہ اپنے رہنماؤں کے لبوں کی حرکت ہی کو نہیں دیکھتا اُن کے شعور اور تحت الشعور میں بھی جھانک کر دیکھتا ہے دَور حاضر کے انسان کو مطمئن کرنے کے لئے بیحد دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے تو غالباً سمجھا اب قصّہ پاک ہو گیا۔ پسپائی تو ہوئی مگر اس نے اختلافات مٹا دیا۔ لیکن ادبی رجحانات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والے کو اس انسان دوستی نے نئی الجھنوں میں ڈال دیا۔ اس کے ذہنی افق پر کئی چیزیں مثلاً قول، نیت، اثر، گردش کرنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا آخر انسان دوستی سے ان کی مراد کیا ہے۔ انسان دوستی کا انحصار کسی شخص کے قول پر ہے یا اس کے محسوسات اور اُن کے محرکات پر؟ یا اس بات پر کہ اُس نے جو کچھ کہا ہم عصر سماج پر اس کا کیا اثر پڑا؟ انسان کیا کہتا ہے یہ جاننا تو قدرے آسان ہے مگر یہ سمجھنا کہ وہ ایسا کیوں کہتا ہے، کن جذبات کے زیر اثر وہ اس قسم کی باتیں کر رہا ہے کسی قدر مشکل ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے ہمیں نفسیاتی تجزیے سے کام لینا ہوتا ہے اور یہ نفسیاتی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ بہر کیف اگر کسی نہ کسی صورت سے ادیب کے ذہنی تہ خانوں کے دھندلکوں میں بھی جھانک لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادیب کن حالات کے سبب ایسا سوچنے اور محسوس کرنے پر آمادہ یا مجبور ہوا۔ اس منزل پر سماجی تقاضوں اور ذاتی اغراض کے درمیان حد فاصل کھینچ کر اُس کی بے غرضی اور خود غرضی، مجبوری اور خلوص نیت کا تعین کرنا ہو گا۔ کیونکہ اس کے بغیر اُس کی انسان دوستی یا دشمنی کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے۔ فرض کیجئے ہمیں ادیب کے خلوص نیت پر بھی کوئی شبہ نہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے ادب نے بحیثیتِ مجموعی انسانی زندگی پر اچھا اثر نہیں ڈالا تو ایسے ادیب کو انسان دوست کہنا کہاں تک صحیح اور مناسب ہو گا؟

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان دوستی کہنا آسان ہے اس کا ادب میں پتہ چلانا بہت دشوار ہے زندگی ایک پیچیدہ حقیقت ہے اور انسانی دماغ کا عمل اس سے بھی پیچیدہ تر۔ جب تک انسان دوستی کا کوئی واضح اور سائنٹیفک تصور پیش نظر نہ ہو یہ بے معنی بات ہے اور ادب میں سیاسی نعروں کی طرح اس کو استعمال کرنا روشنی نہیں تاریکی پیدا کرتا ہے۔ جس میں ٹٹولتے پھرنے سے سچائی ہاتھ نہیں آتی۔

اسی ضرورت کے ماتحت اب کلاسیکی ادب کے بارے میں بھی اپنی پچھلی کہی ہوئی باتوں پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے مارکس نے مادّی زندگی اور شعور کے باہمی روابط کو چند موقّر ادیبوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ ادیب کے ذہن پر زندگی اور اس کی کشمکش کا عمل جن پیچیدہ طریقوں سے ہوتا ہے اور انسانی شعور کو متاثّر کرنے میں ادب کو جو اہمیّت حاصل ہے، اسے تسلیم کرتے ہوئے بھی اُس نے جو یہ کہا تھا کہ ادب کا تعلق شعور سے ہے اور شعور بحیثیت مجموعی ہر زمانے میں برسر اقتدار طبقے کا ساتھ دیتا رہا ہے، اس کے پیش نظر ایک زمانے میں کچھ ترقی پسند دوستوں نے (سب نے نہیں) قدیم ادب پر غلط صحیح حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اُسے رجعت پرستانہ اور ناقابل اعتنا قرار دیا گیا۔ جن لوگوں کی نظر میں اپنے قدیم ادبی سرمائے کی بڑی قیمت تھی، جو اُسے صدیوں کے فنّی تجربوں کا نچوڑ سمجھتے تھے اور کلاسیکی شہکاروں کو انسانی فکر کی بلند ترین چوٹیاں تصوّر کرتے تھے انہیں یہ بات خطرناک حد تک مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہی تھی۔ چنانچہ ہوئی۔ جن کے دل قدیم اساتذہ کے احترام سے معمور تھے وہ بھڑک اُٹھے۔ ظاہر ہے کہ جو باتیں کی جا رہی تھیں وہ زیادہ تر محض جذباتی تھیں لہٰذا اُن باتوں میں سے اکثر کی جلد قلعی کھل گئی۔ البتہ ادبی دنیا میں جو بدمزگی پیدا ہو چکی تھی وہ باقی رہی ترقی پسندوں کی تحریک پر اس کا گہرا اثر پڑا ادھر خارجی حالات بدل گئے اس سے ان دوستوں کو اس سلسلے میں بھی اپنا انداز گفتگو بدلنا پڑا۔

سچ یہ ہے کہ کلاسیکی ادب کے بارے میں اُن کا نظریہ نہ پہلے صحیح تھا نہ اب صحیح ہے۔ پہلے وہ جذباتیت کا شکار تھے اب بیجا مصالحت کا شکار ہیں جبکہ ادب کی قدریں نہ جذباتیت سے متعین ہو سکتی ہیں نہ صلح صفائی کی اسپرٹ سے۔ اس کے لئے تو وسعت نظر اور سائنٹیفک تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدیم ادب سے متعلق کئی مسئلے ہیں اور اُن کے مختلف پہلو ہیں جن کی وضاحت وقت اور محنت چاہتی ہے۔ فی الحال شاید اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ قدیم ادب جو ہم تک

وراثتاً پہنچا ہے سینکڑوں ہزاروں برس کے طوفانوں سے گزرتا ہوا آیا ہے۔ اگر آج بھی اس میں تروتازگی محسوس ہوتی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ فکری اور فنی خوبیوں کا حامل ضرور ہے۔ اس کی عظمت اور اہمیت کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کسی قوم کا قدیم ادب اُس کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ جس میں مخصوص زمانوں میں اس قوم کی زندگی، اس کے خیالات و جذبات اور تہذیب و تمدن کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک عجیب و غریب لذت کا بھی سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس سے نظر کو روشنی اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہر دور کا کلاسیکی ادب اپنے ہم عصر سماج کی خوبیوں ہی کی نہیں خامیوں کی تصویریں بھی پیش کرتا ہے۔ اُس میں انسانی روح کی فتح و شکست دونوں منعکس ہوتی ہیں۔ اُس میں جہد حیات بھی ہوتی ہے، کشمکش حیات سے فرار بھی۔ اس میں وہ مقامات بھی آتے ہیں جہاں ادیب کی نظر ماحول کی تاریکی کو چیر کر نئی راہ ڈھونڈ نکالتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، وہ مواقع بھی آتے ہیں جہاں نگاہ زندگی کی ژولیدہ راہوں میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ انسانوں پر کلاسیکی ادب کے اچھے بُرے دونوں طرح کے اثرات پڑے ہیں اور پڑتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ میں نے محض اثر کا ذکر کیا ہے نیت کا نہیں۔ نیت کی نظر سے دیکھا جائے تو شاید ہی ایسی مثالیں مل سکیں جہاں ادیبوں نے شعوری طور پر لوگوں کو گمراہ کرنے یا انہیں راحت و مسرت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہو۔ ہاں ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں جہاں خلوص نیت کے باوصف ادیبوں نے عوام کی صحیح راہ نمائی نہیں کی۔ اُن کے سامنے غلط قدروں کو اہمیت دے کر پیش کیا۔ ممکن ہے اس سلسلے میں دوسری چیزوں کے سمجھنے میں کسی قدر دشواری پیش آئے لیکن قصیدوں کے اُس انبار میں جو سلاطین اور امراء کی بے بنیاد اور غلامانہ مدح طرازی کے لئے معرض وجود میں آیا اس کی ایک بیّن شہادت موجود ہے۔ شعوری طور پر نہ سہی مگر اس قصیدہ گوئی کا مقصد کم از کم غیر شعوری طور پر یہ ضرور تھا کہ ممدوحین کے کردار اور قوت سے لوگوں کو مرعوب کیا جائے۔

کچھ لوگ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ادب میں برابر ایک لہر ملتی ہے جس سے نظام زندگی اور ارباب اقتدار کے خلاف اُن کے اطوار و کردار کے خلاف ایک طرح کے احتجاج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بات بے بنیاد نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کسی نہ کسی صورت سے زندگی کی ہمیشہ ترجمانی کرتا ہے۔ اور خواص کے ساتھ ساتھ عوام کے جذبات بھی اس میں برابر جھلکتے رہے ہیں۔ عوام کی راحت و مسرّت، اُن کے غم و الم، اُن کی امنگیں اور تمنائیں، مایوسی اور بیزاری سب کی پرچھائیاں ادب میں موجود ہیں۔ اونچے طبقے کے تعیش و استبداد پر وقتاً فوقتاً زہریلے تیر بھی سر کئے گئے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی یہ احتجاج عالم گیر عمومی حقائق کی صورت میں نظر آئے گا جس سے عملی طور پر اعلیٰ طبقے کی عیش طلبی خود رائی اور نخوت کی ذہنیت پر بہت کم اثر پڑا ہے البتہ عوام کو صبر و شکر کا درس برابر ملتا رہا۔ تکلیف پریشانی اور مایوسی کے عالم میں زندگی کے حقائق سے فرار میں مدد بھی ایسے ادب سے ملتی تھی۔ آدمی اپنے غم کو عالمگیر غم سمجھ کر ایک طرح کا ذہنی سکون ضرور محسوس کرتا تھا۔

اگر ترقی پسندی کے معنی سماجی ترقی کو ادب کے ذریعے تقویت پہنچانا ہیں تو سماجی ترقی کی وضاحت کے بغیر کلاسیکی ادب میں اس کی تلاش ایک بے معنی بات ہے وجہ یہ ہے کہ آج انسانی ترقی کا تصور بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کلاسیکی ادب جس ماحول کی پیداوار ہے اس میں انسانی ترقی سے مراد روحانی ترقی ہوتی تھی جو عموماً زندگی کی مادّی ترقی کے خلاف پڑتی تھی۔ مادّی طور پر اس کے باوجود زندگی ارتقا پذیر رہی یہ بات الگ ہے۔ مادی زندگی کے تقاضے کہیں کہیں روحانی نظریات سے ٹکراتے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں لیکن عام فضا اُس وقت روحانیات ہی کی تھی۔ روحانی نظریے ہی اُس زمانے کے رائج سکّے تھے۔ لہٰذا اس وقت روحانی مسائل ہی ادب کا غالب رجحان رہے۔

اس ضمن میں شاید فارسی اردو کے تصوّف دوست شاعروں اور ہندی کے سنت کویوں کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ ان تحریکوں کے اہم شاعروں کے کلام میں جو جاذبیت ہے اُس سے انکار کرنا اپنی بدذوقی کو بے نقاب کرنا ہے۔ اُن کے یہاں جا بجا زندگی کے چند دقیق حقائق کی غمازی ملتی ہے اور پھر دل پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری کرنے کی صلاحیت بھی ان میں ہے۔ لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ زندگی کو کس نظر سے دیکھتے تھے تو اُن کی روحانیت پسندی سے

کون انکار کر سکتا ہے؟ تصوّف کی شاعری فنا فی اللہ ہونے اور بھگتی واد کی کو نراکار یا ساکار ایشور سے جا ملنے کی تلقین کرتی ہے۔ اسی عمل کے واردات اور والہانہ ذوق کے سہارے اُن کی شاعری کا جادو چلتا ہے ورنہ یوں زندگی کو وہ غیر حقیقی ناقابل اعتنا اور حباب سمجھتے تھے۔

اس کے باوجود قوموں کا قدیم ادب ان کا ایک نہایت گراں قدر ورثہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے قومیں فخر سے اپنا سر بلند کرتی ہیں۔ وہ اس بات پر ناز کرتی ہیں کہ ہمارے ادب نے ملکی اور قومی حدود پار کر کے دور دراز خطوں میں علم و تہذیب کے چراغ روشن کئے ہیں۔ قوموں کے مزاج بنانے میں مدد دی ہے۔ اگرچہ ادب کی فکری اور فنّی روایات امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں مگر اس کے وہ عناصر جو انسان کی عالمگیر فطرت سے ہم آہنگ ہیں آج بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ قدر کی نظر سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔ قدیم ادب کے جو رجحانات ارتقا پذیر زندگی سے نہیں ٹکراتے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے اس سے ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے

ادب کی تاریخ میں کبھی کبھی ایسے دور آتے ہیں جب ادیب کا نصب العین اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور بھی ایسا ہی ایک دور ہے۔ ہم نے اپنے اعلیٰ مقاصد کیوں فراموش کر دیئے اس کا کچھ ذکر ان سطروں میں کیا گیا ہے لیکن غالباً یہ صورت حالات بھی عارضی ثابت ہوگی۔ اردو ادب اب تک برابر آگے بڑھتا رہا ہے وہ آج بھی تیزی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے موجودہ مسائل حل کرے۔

امراؤ جان آدا

اردو ادب میں سب سے دلچسپ اور سب سے معیاری ناول اگر کوئی ہے تو وہ صرف امراؤ جان ادا ہی ہے۔ یہ ایک بیسوا کی داستانِ حیات ہے جسے مرزا رسوا نے لکھ کر خود بھی دوامی شہرت حاصل کر لی اور ادا کے کردار کو بھی لافانی کرداروں میں شامل کر دیا۔ اس ناول کو اگر زبان کے اعتبار سے ہی پڑھ لیا جائے تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ناول اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ لکھنوی معاشرت کا مرقع بھی ہے۔ خورشید الاسلام کا معرکۃ الآرا دیباچہ بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ قیمت ۴/-

بازارِ حیات

یہ احمد ندیم قاسمی کے خوبصورت افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جتنے معیاری افسانے ندیم نے لکھے ہیں اتنے اور کسی افسانہ نگار نے نہیں لکھے۔ اس مجموعے میں ان کے وہ تمام تازہ افسانے شامل ہیں جن پر ندیم کو اور اردو افسانے کو فخر ہونا چاہیئے۔ افسانوی ادب میں یہ مجموعہ ناقابلِ فراموش ہے۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ

قیمت ۳/۸

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری

ڈاکٹر محمد حسن

آج کی شاعری کے بارے میں ان دنوں تین باتیں عام طور پر کہی جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آزاد نظم کا زوال ہو چکا ہے۔ اس دور کے سرپھروں نے وزن اور بحر کے جو اُلٹے سیدھے تجربے کئے تھے وہ سراسر احمقانہ تھے اور ان کا یہی انجام ہونا تھا۔ چھوٹے بڑے نثر نما مصرعے لکھنا شاعری نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ آج کی شاعری غزل کی طرف واپس لوٹ رہی ہے۔ غزل کا احیا شروع ہو چکا ہے۔ غزل کے حمایتی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہی دراصل مناسب اور موزوں ادبی میلان ہے اور اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے سیدھی سادی غزلیں کہنا اور ان پر قدرت حاصل کرنا ہی بہت کافی ہے۔

تیسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ ترقی پسندوں نے ادب میں سماجی شعور کی جو بات اٹھائی تھی وہ سراسر بکواس تھی۔ شاعر کو سماجی بصیرت، فکر، پیغام وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اسے تو بس یہ کرنا چاہئے کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اسے پورے خلوص کے ساتھ بیان کر دے۔

یہ تینوں بیانات مختلف حلقوں میں مختلف طریقوں سے سننے میں آتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ان سب بیانات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے لیکن یہ سچائی ادھوری اور نا تمام ہے اور ادھوری سچائی اکثر جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ جھوٹ کا فریب آسانی سے ظاہر ہو جاتا ہے، ادھوری سچائی کا فریب مشکل سے دور ہوتا ہے۔

(۱)

اب پہلے بیان کو لیجئے "آزاد نظم کا زوال ہو چکا ہے"۔ اگر زوال سے یہ مراد ہے کہ اب آزاد نظم غالب صنفِ شعر نہیں رہی ہے اور جس طرح ایک زمانے میں اس نے دانش وروں کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی وہ کیفیت ختم ہو چکی ہے تو اس بیان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔ اچھی آزاد نظمیں ہمیشہ کم لکھی گئی ہیں اور اب آزاد اور معری نظمیں خواہ اچھی ہوں یا بری، بہت کم رسالوں میں نظر آتی ہیں لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آزاد اور معری نظم صنف کی حیثیت سے بری ہے اور وہ تجربہ جسے چند نوجوان شعراء نے شروع کیا تھا سراسر احمقانہ تھا؟ آزاد اور معری نظموں کی مقبولیت کم ہو جانے کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ ہم صنفِ شعر کی حیثیت سے انہیں مردود قرار دے کر پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آزاد نظم محض ذریعۂ اظہار ہے اور کوئی ذریعۂ اظہار فی نفسہ اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ زبان سے لوگوں کی توصیف و تعریف بھی کی جاتی ہے

اور ان کو گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔ الفاظ کی مدد سے دوستی اور محبت کے پاک رشتے بھی قائم کئے جاتے ہیں اور لڑائی جھگڑے میں بھی الفاظ کام آتے ہیں۔ اس بنا پر زبان یا الفاظ کے وجود ہی کو ناپاک قرار دینا کہاں کی عقلمندی ہوگی؟ آزاد نظم بھی اسی قسم کا ذریعۂ اظہار ہے۔ شاعری میں ذریعۂ اظہار عام طور پر دو وجہوں سے زندہ رہتے ہیں۔ یا تو انہیں قبولِ عام کی سند مل جائے یا وہ اپنے عہد کے فکری اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ دراصل یہ ایک ہی بات کی دو شکلیں ہیں لیکن کبھی کبھی فوری قبولِ عام کو شعر اور تنقید کا معیار سمجھ لیا جاتا ہے۔ ہر چلتی ہوئی چیز سکّہ نہیں ہوتی اور ہر اقلیم کی طرح شاعری اور فن میں بھی نئے سکّے چلانا بڑی ریاضت کا کام ہے جو عام طور پر عظیم فنکاروں ہی کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔

اگر سرسری طور پر بھی آزاد نظم کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس کی تخلیق خیالات، تلمیحات اور بیانات کے بندھے ٹکے ڈھرے سے بچ نکلنے کی کوشش کی مرہونِ منت تھی۔ آزاد اور معریٰ نظم اسالیبِ اظہار کی سکّہ بندی سے گریز کی کوشش تھی۔ قافیہ کا کھٹکا اپنے ساتھ قدیم اساطیر، استعارے اور مناسبات کی ایک دنیا لے کر چلتا ہے۔ اس سے آزاد نظم نے دامن بچانا چاہا۔ مثال کے طور پر بہار کا بیان کرتے ہوئے اگر شاعر "بہار آئی" کے قافیے کے ساتھ خیالات نظم کر رہا ہے تو بہت ممکن ہے کہ اس کا ذہن قافیے کی تلاش میں "تماشائی" تک پہنچے اور ہماری شاعری کی بندھی ٹکی روایت اسے مہر و ماہ تک لے اڑے اور وہ بہار کا خارجی نقشہ کھینچنا بھول جائے اور ہوا کی مستی، سبزے کی لہلہاہٹ اور پھولوں کی خوشبو کا یا تو سرے سے ذکر ہی نہ کرے اور اگر کرے بھی تو تشبیہ و استعارے سے اس طرح مزیّن کر دے کہ اس کی بیان کی ہوئی بہار سوداؔ اور انشاؔ کا تو کیا ذکر قاآنیؔ اور عرفیؔ کی بہار سے سرِ مو مختلف نہ ہو۔ اس الزام سے ہمارے بڑے سے بڑے شاعر خود غالبؔ کے کلام میں یہ خارجی منظر روایتی اسلوب کی نذر ہو کر رہ گیا ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر   روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

اس کا یہ مطلب نہیں کہ قافیہ اور ردیف کی پابندی میں رہ کر کوئی شاعر اسلوبِ اظہار اور اندازِ فکر کی قدیم سکّہ بندی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ کام اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ قافیہ بجائے معنی کا پابند ہونے کے معنی کا رہنما ہو جاتا ہے۔ آزاد اور معریٰ نظم نے اردو شاعری کو اس سکّہ بندی سے نکالنے کی کوشش کی تھی اور یہ کوشش بیک وقت بڑی مستحسن بھی اور بڑی دشوار بھی۔

مستحسن اس وجہ سے کہ اس طرح ہمارے شاعر ان عام تشبیہوں، پامال تلمیحوں اور فرسودہ مضامین کی دلدل سے کچھ باہر نکلے۔ یہ وہ مضامین تھے جنہیں دہرانے کے لئے کسی انفرادیت، ذاتی فکر و کاوش یا مطالعے اور محنت کی ضرورت نہ تھی آزاد اور معریٰ نظم سے کم سے کم ہمارے شاعروں کو یہ فکر تو ہوئی کہ انہیں اس سکّہ بند خیال کے دائرے سے باہر نکل کر کچھ کہنا ہے اور فرسودہ انداز سے الگ ہو کر قدیم وزن و قافیے کی ترتیب سے ہٹ کر کہنا ہے۔ دشوار اس لئے کہ اسالیبِ بیان کا حسن اور ترنّم، موسیقی اور کیف اردو شاعری میں صدیوں سے قافیے کے ذریعے ظاہر ہوتا آیا ہے اب اس طریقے کی جگہ پر دوسرا انداز استعمال کرنا اور اس طرح استعمال کرنا کہ شاعری شعریت اور موسیقی سے محروم نہ ہو بڑا دشوار کام تھا ابھی تک موسیقی اور قافیہ کو مترادف الفاظ سمجھا گیا تھا شاید اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو قافیہ ہی کو موسیقی سمجھتے ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قافیہ نظم میں موسیقی پیدا کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے خود موسیقی نہیں ہے۔ ہر چند یہ ذریعہ بڑا پرانا اور بے حد مقبول ہے لیکن اس کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی ممکن ہیں اور انہیں اختیار کرنا کفر نہیں بشرطیکہ نظم کی موسیقی میں فرق نہ آئے۔

آزاد اور معریٰ نظم نگاری نے خیال اور تصوّر کی اہمیت واضح کی۔ شاعر کے انفرادی خیال اور تصوّر کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا یہ اور بات ہے کہ ہمارے شعرا اس جھونک میں انفرادیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے لگے آزاد نظم لکھنے والوں کو یہ بھی سوچنا پڑا کہ صرف نظم کی ظاہری ٹیپ ٹاپ، نادر قافیے کا اچھی طرح صرف ہونا یا بندش کی چستی، صحتِ زبان اور تشبیہ و استعارے کی سجاوٹ ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس نظم میں شاعر نے براہِ راست اپنے تجربے کو بیان کیا ہے یا کہیں سے مستعار لیا ہے۔ اس کا بنیادی تصوّر کیا ہے؟ اس کا مرکزی خیال یا احساس کیا ہے؟ یہ بات اردو ادب

میں پہلی بار نہیں کہی گئی تھی۔ "آبِ حیات" "مقدمہ شعر و شاعری" "شعر العجم" اور "کاشف الحقائق" شاہد ہیں کہ پہلے بھی اسے دہرایا جا چکا تھا اور اقبال تک آتے آتے نہ جانے اس پر کتنے عمل کرنے والے شاعر گذر چکے تھے۔ پھر بھی آزاد نظم کی ابتدا کے وقت اس یاد دہانی کی شدید ضرورت تھی۔ یہ یاد دہانی بروقت بھی تھی اور انقلابی انداز کی بھی تھی۔

آزاد اور معریٰ نظم نگاری ایک اور لحاظ سے بھی بابرکت ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ نئے تجربے اردو شاعری کے اسلوب کو تشبیہہ و استعارہ اور مرصع کاری سے نجات دلا کر خارجیت، بیانیہ انداز اور سادگی کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے دیباچے میں فارسی اور بھاشا کی انشا پردازی کا جو موازنہ کیا تھا وہ آج بھی بڑی حد تک ہماری شاعری پر منطبق ہوتا ہے:

> "فارسی اور اردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشا میں جو آسانی ہے اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے، وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت ہمیں ان خد و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزا آتا وہ سننے سے آ جاتا ہے۔
>
> —— برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں صاف اس کی برائی بھلائی نہیں دکھا دیتے بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے اس کے لوازمات کو شے اوّل پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ . . . . غرضکہ اب ہماری انشا پردازی ایک پرانی یادداشت ان تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دستمال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہے۔"

سادہ نگاری مشکل کام ہے سادگی کا حسن، حسن کاری کی آخری معراج ہے گو آزاد نظم کی زبان پوری طرح روزمرہ اور سادہ زبان نہ ہو سکی لیکن پھر بھی مرصع کاری اور "تشبیہہ و استعارہ زدگی" سے شاعری کچھ آگے بڑھی۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جو ابھی تک اردو شاعری کے اکثر ادوار میں پیرِ تسمہ پا کی طرح اس پر سوار رہی ہیں۔ علاوہ بریں ہر چیز کو داخلی انداز میں قدیم مرصع کاری کے ساتھ بیان کرنے کا التزام بھی کچھ کم ہوا اور بیانیہ اور خارجی انداز کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ خارجیت اور غیر مرصع بیان میں شعریت پیدا کرنے کا کام شروع ہوا۔

آزاد نظم کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی ابتدا کرنے والوں کو امام سمجھ لیا گیا اور ان کی رائج کی ہوئی صنف کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوبِ فکر اور اندازِ نگارش بھی لازم و ملزوم سمجھے جانے لگے۔ یہاں اس بحث میں پڑنا بے سود ہے کہ آزاد اور معریٰ نظموں کی ابتدا تصدق حسین خالد نے کی یا ن م راشد نے یا کسی اور نے، لیکن اس میں شک نہیں کہ راشد اور میرا جی کا نام جس طرح اس صنف سے وابستہ ہو گیا ہے اس نے غیر ضروری طور پر اسے نقصان پہنچایا ہے۔ اس سے ان شعراء کی تنقیص مقصود نہیں لیکن یہ سمجھنا یقیناً غلط ہے کہ آزاد نظم میں صرف اسی قسم کے خیالات کا اظہار ممکن ہے جو راشد اور میرا جی نے ظاہر کیے۔ جو لوگ یا تو ان خیالات سے متفق نہیں تھے یا انہیں سمجھنے سے معذور تھے انھوں نے ان خیالات کو ناپسند کرنے کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کو بھی مردود قرار دے دیا۔

اس طرح آزاد نظم کے ساتھ انفرادی مزاج اور مردم بیزاری کی فضا منسلک ہو گئی۔

یہاں دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہماری شاعری میں آزاد اور معریٰ نظم کے چلن کو انگریزی اور فرانسیسی ادب کی FREE SERSE سے وابستہ سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ بات آسانی سے نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی ادبیات میں عہدِ جدید سے قبل بھی بلینک ورس کا رواج تھا اور صفِ اوّل کے شعرا معریٰ نظم کو استعمال کر رہے تھے۔ ہاں فری ورس یا نظمِ آزاد کا رواج عہدِ جدید میں شروع ہوا

اور ۱۹۱۳ء میں تصویریت (IMAGIST) تحریک نے منشور نے آزاد نظم کی ہیئت اور موضوع دونوں حیثیتوں سے حد بندی کر دی۔ اس منشور کے چھ نکات تھے۔

۱۔ "عام بول چال کی زبان استعمال کرنا، ہمیشہ معنوی اعتبار سے مناسب ترین لفظ استعمال کرنا اور آرائشی الفاظ سے پرہیز کرنا۔

۲۔ نئے اوزان و آہنگ پیدا کرنا جن سے نئے 'موڈ' کا اظہار ہو سکے۔ ہم آزاد نظم ہی کو شاعری کا تنہا ذریعۂ اظہار قرار دینے پر اصرار نہیں کرتے ..... بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ شاعر کی انفرادیت جتنے بہتر طریقے پر آزاد نظم میں ظاہر ہوتی ہے اتنی روایتی اصناف میں نہیں ہو سکتی۔

۳۔ موضوع کے انتخاب میں مکمل آزادی کی حمایت۔

۴۔ تصویر پیش کرنے کی کوشش۔ ہم مصور نہیں ہیں لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ شاعری مخصوص تصورات کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہونی چاہئے۔ اسے مبہم اور عام باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

۵۔ ایسی شاعری کو رواج دینا جو صاف اور سنگین ہو اور غیر واضح اور دھندلی نہ ہو۔

۶۔ آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہم میں سے اکثر کا عقیدہ ہے کہ توجہ کا مرکوز ہونا ہی شاعری کی اصل ہے۔"

اس منشور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں آزاد نظم کو صرف دو بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کا ذریعہ سمجھا گیا تھا۔ ایک یہ کہ براہِ راست تجربے کا غیر آرائشی اور براہِ راست اظہار ہو سکے اور روایتی تاثر اور دوسروں کے مانگے ہوئے تجربوں کی بجائے شاعر اپنی انفرادیت اور اپنے تجربات کا براہِ راست اظہار کر سکے اور دوسرے یہ اظہار شاعری کے سجائے بنائے ہوئے پیرایے کے بدلے روزمرہ کی زبان میں کیا جائے۔

بعد کو سمبالزم (اشاریت) امپریشن ازم (تاثریت) اور سوریلزم (ماورائیت) کی تحریکوں نے آزاد نظم کو فرائڈ کے زیر اثر لاشعور کا ذریعۂ اظہار بنانا چاہا اور اس کے رشتے انفرادیت اور نفسیاتی الجھنوں سے جا ملائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد نظم مایوسی، انفرادیت پرستی اور کلبیت کی آماجگاہ بن گئی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی طویل نظم ویسٹ لینڈ (WEST LAND) غالباً اس کا سب سے نمائندہ اظہار ہے اور اس مایوسی اور کلبیت کو ایلیٹ نے "کسی نظامِ حکومت کے خلاف احتجاج کے بجائے انسانی تہذیب کے جواز پر شبہ کرنے" سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری بات یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اردو میں آزاد اور معریٰ دونوں قسم کی نظموں کا چلن اس دور سے قبل نہیں ہوا تھا۔ مولوی اسمٰعیل، شرر، عظمت اللہ خاں وغیرہ کے تجربے محض برائے نام تھے۔ عہدِ جدید میں نظم معریٰ اور آزاد کے جو بھی تجربے ہوئے انہیں بلینک اور فری ورس کے امتیاز کے بغیر فری ورس کی تحریک سے منسلک قرار دے دیا گیا اور ان پر آزاد نظم کے شعرا کی فکری چھاپ تلاش کی جانے لگی۔

اردو میں آزاد اور معریٰ شاعری کی روایت پر نظر ڈالئے تو راشد کا نام سرِفہرست ملتا ہے۔ راشد کی شاعری میں فکری عنصر کا انکار ممکن نہیں۔ ان کے احساسات اور تصورات کی دنیا بلاشبہ قدیم روایتی سکہ بندی سے الگ ہے ان کا احساس پرایا نہیں اور ان کے تصورات خلوص سے عاری نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو ٹکڑے قابلِ توجہ ہیں:

آہ تیری مد بھری آنکھوں کے جال
میز کی سطحِ درخشندہ کو دیکھ
کیسے پیمانوں کا عکسِ سیم گوں
اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا
جیسے میری روح، میری زندگی
تیری تابندہ سیاہ آنکھوں میں ہے

مے کے پیمانے تو ہٹ سکتے ہیں یہ ہٹتی نہیں

یا :

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں

کی ساری فضا نئی نئی سی ہے۔ قدیم خیال میں بھی یہاں انفرادی تجربے کی شمع روشن نظر آتی ہے اور اس خیال کے اظہار کے لئے نئے ذرائع اور نیا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔

علاوہ بریں راشد کو معریٰ اور آزاد نظم میں قافیے کی مدد کے بغیر موسیقی برقرار رکھنے کا وہ ہنر آتا ہے جو ان کے ہمعصروں میں او رشاید ہی کسی کو آتا ہو وہ آزاد اور معریٰ نظم کو پورے ضبط و احتیاط کے ساتھ برت سکتے ہیں لیکن ان کے افکار میں کلبیت، گھٹن اور انفرادیت پرستی کی مایوسی موجود ہے گو [illegible] کی نئی جنبش" اور "پہلی کرن" کے اس اعلان کے باوجود :

"خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے !
یہ انسان کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہیں سن لو !
یہی ہے نئے دور کا پرتوِ اولیں بھی !

راشد اس گھٹن اور مایوسی کا شاعر ہے جو "خودکشی" "دریچے کے قریب" اور "اجنبی عورت" میں اس قدر کامیابی کے ساتھ ظاہر کی گئی ہے۔ راشد نے زندگی کو محض حسیاتی ہیجان سمجھا ہے اس کے نزدیک زندگی آج تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور یہ آج بھی صرف اس موجودہ لمحے کا نام ہے جس سے ہمیں وقتی طور پر لذت نصیب ہو سکے اور یہ لذت گناہ نہیں اصلِ حیات ہے :۔

میرے بوسے روح کا اظہار تھے
روح تو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے
ہے اسی کی یاد سے حاصل مجھے قربِ حیات
روح کا اظہار کیسے بھول جاؤں

یہاں راشد کے نظریۂ حیات پر تفصیلی تنقید کی گنجائش نہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ راشد کو اسی منفی احساسِ شکست کا شکار کہا جا سکتا ہے جس کا اظہار "ویسٹ لینڈ" میں ہوا ہے اور جس نے آزاد نظم کے لہجے کو مردم بیزاری، شکست خوردگی اور مریضانہ کلبیت سے ہم آہنگ کر دیا۔

میراجی نے ان نفسیاتی پیچیدگیوں کو فرانسیسی الخطاطیوں کی نہج پر حل کرنے کی کوشش کی اور تہذیب اور شعور سے فرار اختیار کیا۔ فرائڈ کے زیرِ اثر جنس کو اپنی شاعری کا موضوعِ حقیقی قرار دیا اور شعور کی دنیا سے بھاگ کر لاشعور اور منتشر احساسات کی بوقلمونیوں میں پناہ لی۔ یہ دنیا صاف الفاظ اور اونچی آواز میں بولنے کے بجائے اشاروں اور سرگوشیوں کی دنیا ہے اور یہی سرگوشی اور سمبالزم کی آواز میراجی کی شاعری ہے۔

میراجی کی شاعری پر نفسِ مضمون اور اندازِ اظہار دونوں حیثیتوں سے تنقید کی جا سکتی ہے لیکن اس کا انکار ممکن نہیں کہ میراجی نے شاعری میں ظاہری لیپ پوت اور آرائشی الفاظ کو اہمیت نہیں دی اور اصل احساس اور انفرادی تجربے کو جگہ دی۔ میراجی شاعری اس لئے کرتے تھے کہ شاعری ان کے لئے ایک ضرورت تھی۔ انہیں چند احساسات کو خارجی شکل میں ظاہر کرنا تھا ان کی شاعری مریض کے ہاتھ کی بیساکھی تھی آرائش کی چھڑی نہیں تھی۔

شاعری ان کے لئے محض اظہارِ ذات کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ تنقیہ ذات کا ذریعہ بھی تھی - اگر وہ اس طرح اپنے جذبات کو ظاہر کرتے تو ضبط اور گھٹن ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی -

بہرحال میرآجی نے ابہام اور اشاریت کے باوجود نفسِ احساس پر زور دیا - بیان کی ملمع کاری یا تشبیہہ و استعارے کی روایتی سجاوٹ سے بہت کچھ دامن بچایا - اپنے موضوع کے بارے میں ایک جگہ انہوں نے خود لکھا ہے :

> "مشاہدے کے لحاظ سے اگرچہ بحیثیت مجموعی زندگی کے ہر پہلو کی طرف میرے تجسّس نے مجھے راغب کیا لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشان خیالی کو جنسی رنگ دے دیا۔"
>
> ("میری بہترین نظم" مرتبہ حسن عسکری صفحہ ۱۸۵)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ "موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش" سے زیادہ میرآجی کے ہاں نجی الجھنوں ہی کی داستان ملتی ہے اور اس داستان میں تجربہ کا خلوص بھی ہے اور کسی حد تک اس کا براہِ راست اظہار بھی ملتا ہے۔" اونچا مکان" کا ایک حصہ ملاحظہ ہو :

اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لئے
بھول کر تیرگیٔ روح کو میں آ پہنچا
اس بلندی کے قدم میں نے لئے
جس پہ تو سینکڑوں آنکھوں کو جھپکتے ہوئے استادہ ہے
تیرے بارے میں سُنا رکھی تھیں لوگوں نے مجھے
کچھ حکایاتِ عجیب

"ترغیب" کا ایک بند دیکھئے - اس بند میں بھی بیان کا براہِ راست انداز اور تشبیہہ و استعارے کے بدلے علامتوں اور (SYMBOLS) سے کام لینے کا طریقہ قابلِ توجہ ہے :

قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسیں اور ممنوع جھرمٹ مرے دل کو پھسلا رہے ہیں
یہ ملبوس ریشم کے اور ان کی لرزش
یہ غازہ —— یہ ابٹن
نسائی فسوں کی ہر اک موہنی آج کرتی ہے سازش
مرے دل کو بہکا رہی ہے !
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو !

میرآجی کے تحت الشعوری تجربے کی وقتی کامیابی نے نئی نسل کو بے حد متاثر کیا اور مختار صدیقی، قیوم نظر اور دوسرے شاعر داخلیت کے اس خول میں اسیر ہو گئے جہاں صرف اشاروں اور علامتوں میں باتیں کی جا سکتی تھیں اور شعور کی گرفت بے حد کمزور تھی - مختار صدیقی نے ہیئت اور مصرعوں کی ترتیب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی اور شاعری ریاضی کا سوال ہو کر رہ گئی - سلام مچھلی شہری نے البتہ کافی متنوع تجربے کئے اور

وہ لاشعور کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ کبھی انہوں نے مصرعوں کے آہنگ سے مصوّری کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کی (برسات پینٹنگ)، کبھی رقص اور موسیقی کے بیان کو اسی انداز سے بیان کرنا چاہا (جنگل کا ناچ)، کبھی آزاد اور معریٰ نظم میں مکالموں کی بے ساختگی، بے تکلفی اور ڈرامائی انداز پیدا کیا لیکن سلام کا کوئی واضح نظریۂ حیات نہیں ہے فکر کا فقدان اور فلسفیانہ شعور کی کمی نے انہیں اس تجرباتی منزل سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سردار جعفری کی شاعری منٹو کے بعد اس عہد کا سب سے متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ یہاں اس پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں صرف اس اثر کا ذکر کرنا ہے جو جعفری نے آزاد اور معریٰ نظم کے مضمون اور ہیئت پر چھوڑا ہے۔ سردار جعفری نے اس صنف کو داخلیت کے تنگنائے سے نکال کر عصری مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا اس میں "خودکشی" اور "دریچے کے قریب" کے مسائل ہی پر بات نہیں ہوتی بلکہ دریچے کے باہر کی باتیں بھی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اندر آگئیں۔ سردار جعفری کی آزاد اور معریٰ نظم زندگی کے اور خاص طور پر سیاست کے ہر مسئلے پر اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے اس میں یہ شعور ملتا ہے کہ آزاد اور معریٰ نظم راشد اور میرا جی کے انداز میں اسیر نہیں ہے بلکہ اسے ان سے بالکل مختلف جذبات کا آئینہ دار بھی بنایا جا سکتا ہے۔

سردار جعفری سے قبل بھی معریٰ اور آزاد نظم کی سرحدوں کو وسیع کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ مخدوم، فیض کی چند معریٰ نظمیں اور اختر الایمان کی چند نظمیں اس سلسلے میں خاصی کامیاب ہیں لیکن یہ لوگ اس صنف کو نئی فضا بخشنے میں اس قدر عہد آفریں ثابت نہیں ہوئے۔ سردار جعفری نے ہر سیاسی اور صحافتی موضوع پر شاعری کی اور اس کے لئے معریٰ اور آزاد نظم کو استعمال کیا۔ یہ کوشش یقیناً مستحسن تھی (حالانکہ وہ خود اپنی تنقیدی تحریروں میں موضوعات کو اچھے اور برے، مفید اور غیر مفید کے خانوں میں تقسیم کرتے آئے ہیں) لیکن ہر موضوع کو شاعری میں اپنا لینا اور اس میں شعریت پیدا کرنا فن کے معجزوں میں سے ہے اور سردار جعفری سے یہ معجزہ سرانجام نہ ہو سکا۔

معریٰ اور آزاد نظم میں خارجی اور بیانیہ شاعری کرنے کے جوش میں سردار جعفری کو سادگی ہی سے ہاتھ دھونے پڑے اور اس صنف نے سکّہ بند اندازِ بیان اور تشبیہہ و استعارہ زدگی سے جو گریز اختیار کیا تھا سردار جعفری کے زیرِ اثر اسے پھر قدیم روش کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ سیدھی سادی باتوں کو مرصّع کاری سے حسین بنانے کی کوشش کی گئی اور ایک ہی بات کو ہزار طرح سے سجا بنا کر، زیوروں سے لاد کر، استعارہ در استعارہ کے نقابوں سے آراستہ کر کے دہرایا گیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ایک ہی بیان پھیل کر تین تین چار چار صفحات پر محیط ہو گیا اور نظم سے ضبط و احتیاط ختم ہو گئی۔ مثال کے طور پر "سیلابِ چین" کا ابتدائی حصہ دیکھئے۔ شاعر "برق رفتار لمحوں" سے پوچھتا ہے "انقلاب اب کہاں ہے"؟ :-

"چین میں"
کوہساروں سے آواز آئی
مرغزاروں
گرجتے ہوئے آبشاروں
دہکتے ہوئے لالہ زاروں سے آواز آئی
"چین میں، چین میں"
وادیاں گونج اٹھیں
کوہ کی چوٹیاں گونج اٹھیں
ندیاں چین کا نام لے کر سمندر میں دوڑیں
چین کا نام لے کر سمندر سے کالی گھٹائیں اٹھیں
شرق اور غرب میں

چین کا نام بارش کے قطروں کی صورت میں ٹپکا
پیاسی دھرتی نے اس نام سے اپنے لب تر کئے

اسی نظم کا ایک اور حصہ بھی قابلِ غور ہے:

چین سب سے بڑا گیت، سب سے حسین نظم ہے
چین ایک حوصلہ، اک امنگ اور ایک عزم ہے
چین اک وحی ہے ایک اپدیش ہے ایک پیغام ہے
ایشیا کے لئے ایک انعام ہے
چین کیا چیز ہے بیقراروں سے پوچھو
چین کیا چیز ہے غم کے ماروں سے پوچھو
چین بھوکوں کی روٹی ہے
ننگوں کا کپڑا ہے
بے گھر کا گھر ہے
چین مفلس کے زخموں کا مرہم
امیروں کا زخمِ جگر ہے
چین لاکھوں کروڑوں غلاموں کی آزادی
اور قیدیوں کی رہائی کا اعلان ہے
چین سرمایہ داری کی جلتی ہوئی دھوپ میں
اک گھنے پیڑ کی چھاؤں ہے"

اسی قسم کے بہت سے ٹکڑے "نئی دنیا کو سلام" "فریب" اور "آنسوؤں کے چراغ" میں ملتے ہیں جن کی تکرار نظم کی تعمیر اور اس کی وحدت کو مجروح کرتی ہے۔

اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ سردار جعفری نے شاعری کے تخلیقی عمل کو تعمیم سے تخصیص تک آنے کا عمل قرار دیا اور اس لئے معمولی حادثات کا رشتہ ابدی اور عام انسانی مسائل سے جوڑنے کے بدلے اس عمل کو الٹ دیا۔ اپنی نظموں کو ہنگامی اور وقتی موضوعات تک محدود کر لیا۔ اس طرح ان کی شاعری عام واقعات، عصرِ حاضر کی تاریخ اور سیاست کا آئینہ تو ہو گئی لیکن اس کے رشتے فلسفیانہ فکر سے مضبوط نہ ہوئے انسانی زندگی کا مدعا کیا ہے؟ کائناتی مسائل اور انسانی وجود کا استفہامیہ اور اس قسم کے دوسرے سوال ان کی شاعری کے لئے اجنبی ہیں۔ اگر ان کے کلام میں انسانی زندگی کے متعلق کسی عام نظریے کی تلاش کی جائے تو زیادہ کامیابی نہ ہو گی حالانکہ انہی تصانیف سے پاکستان کی تخلیق، اگست ۴۷ء اور استالن کی موت کے بارے میں شاعر کے ردِ عمل کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

فکر کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد اور معریٰ نظم میں خطابت کا لہجہ آگیا اور الفاظ و بیانات کی تکرار میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے سردار جعفری کو قدیم تشبیہات سے کام لینا پڑا۔ "مطرب کی ہتھیلی سے پھر شعاعیں پھوٹنے لگیں۔" "بربط و طاؤس پھر انگڑائی" لینے لگے اور پرانی (IMGIRY) پھر اسی آن بان سے واپس آگئی۔ کہیں کہیں مزدور، ہڑتال کے الفاظ اور گورکی، میکافسکی وغیرہ کے ناموں کی پیوند کاری کی گئی لیکن یہ انداز بیان میں

پوری طرح گھل مل کر نہیں آئے بلکہ اس سجی سجائی محل سرا میں نو وارد اجنبی معلوم ہونے لگے۔

"استالن کی آواز پر" "چارہ گر" اور "آج کی رات نہ جا" کے باوجود مخدوم محی الدین کو آزاد اور معریٰ نظم نگاری میں کسی منفرد طرز کا نہیں کہا جا سکتا۔ ایک تو ان کی آزاد اور معریٰ نظموں کی تعداد بہت کم ہے، دوسرے ان کی نظموں کا آہنگ ابھی تک واضح شکل اختیار نہیں کر سکا ہے۔

آزاد اور معریٰ نظم نگاری کی اس چھوٹی سی عمر میں اس کے اسالیب کو راشد، میرا جی اور سردار جعفری کے اسالیب میں تقسیم کیا جا سکتا اور اب ان کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ آزاد نظم کا تجربہ کیا واقعی بے ہودگی اور طفلانہ پن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر آزاد اور معریٰ نظم سالہ راشد اور میرا جی کے خیالات کو لازم و ملزوم نہ سمجھا جائے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس صنف میں ابھی کافی لچک اور گنجائش موجود ہے۔ ابھی غزل کی سکّہ بندی یہاں عام نہیں ہوئی ہے اور لازمی نہیں ہے کہ آزاد نظم کا نام سنتے ہی لکھنے والے کا قلم ایک خاص روش پر چل نکلے۔

ابھی تک اس بادل میں نہ جانے کتنی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ آزاد نظم نے صنف کی حیثیت سے جو وسعتیں پیش کی تھیں ابھی تک ان فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ قدیم سکّہ بند خیالات و مضامین سے الگ ہٹ کر نت نئے سائنٹیفک، فلسفیانہ اور عمرانی مسائل پر اظہارِ خیال کا جو موقع تھا اسے ریاضت سے بے پروائی، مطالعے کی کمی اور تن آسانی کی وجہ سے پوری طرح کام میں نہیں لایا گیا۔ تشبیہہ و استعارے کے سہارے اور مرصّع کاری کی بیساکھی سے الگ ہو کر صرف خیال کی ندرت اور رنگینی سے لالہ زار کھلانے کی جو گنجائش پیدا ہوئی تھی اسے ہنوز نہیں برتا گیا اس یہ کہنا کہ آزاد نظم کا تجربہ ہی بنیادی طور پر غلط تھا، عامیانہ بات ہے اسی قدر عامیانہ جیسے آزاد نظم کو صنف کی حیثیت سے تشکیک پسندیا قرار دینا ——

(۲)

غزل کی طرف ابھی پچھلے چند دنوں سے نئی نسل کا میلان بڑھ گیا ہے۔ آزاد نظم نگاری کے دور میں کچھ شعراء نے سوچ سمجھ کر اور کچھ بے سوچے سمجھے غزل کی صنف کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا ان کے خاص اعتراضات دو تھے۔ ایک یہ کہ غزل میں پریشاں خیالی ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ شاعر اپنی تخلیق میں کسی ایک خیال، جذبے یا تصوّر کو پیش کر دے وہ محض قافیوں کی رہنمائی میں مختلف قسم کے مضامین کو بندش کی چستی کے ساتھ باندھ دینے ہی کو کمالِ فن سمجھتا ہے اس طرح اکثر غزل گو دوسروں کے خیالات اور جذبات سے کام چلاتے ہیں انفرادی فکر اور ذاتی کاوش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اس سے ایک قسم کی ذہنی غیر ذمہ داری، لاابالی پن اور لفاظّی کے ساتھ ساتھ فکری انتشار اور تن آسانی پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ صدیوں کی روایات اور مخصوص تلمیحات کی بنا پر غزل کا اپنا ایک خاص مزاج بن گیا ہے اور ہر لکھنے والے کو روایتی (IMAGERY) کا سہارا لینا پڑتا ہے جو زمانۂ قدیم سے استعمال ہوتی رہنے کی وجہ سے انفرادیت کے اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ نئے مضمون یا انفرادی تجربے کو ظاہر کرنے کے لئے غزل گو شاعر کو گھسے پٹے تشبیہہ و استعارے، تلمیح اور اندازِ بیان سے کام لینا پڑتا ہے اور اس بنا پر بیان کی وضاحت اور تجربے کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے، سننے والے کا ذہن معنی کے بجائے اندازِ بیان کی سجاوٹ میں کھو کر رہ جاتا غزل کے احیاء کا ذکر کرنے سے پہلے ان سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے۔ کیا نئی غزل ان اعتراضات کی گرفت سے باہر نکل آئی ہے؟ کیا اس میں فکری عنصر کی آمیزش زیادہ ہوئی ہے؟ کیا اس میں خیال اور انفرادی تجربے کے اظہار کو مناسب جگہ مل گئی ہے؟ کیا اندازِ بیان کے پرانے روایتی اسلوب کی جگہ پر کوئی ایسا اسلوب پیدا ہونے لگا ہے جو تجربے یا تاثر کی انفرادیت کو مجروح نہ کرے؟

جدید غزل کا تذکرہ عام طور پر حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی اور فانیؔ سے شروع ہوتا ہے اور یگانہؔ اور جگرؔ سے ہوتا ہوا فراقؔ پر لا کر ختم

حسرت کو 'غزل کا مجدد' کہا گیا ہے لیکن اگر انہیں مجدد کہا جا سکتا ہے تو صرف ان معنوں میں کہ انہوں نے غزل کو پھر سے تغزل سے آشنا کیا، سوز و گداز اور بقول صاحب "کاشف الحقائق" "واردات قلبیہ" کے بیان سے پھر معمور کر دیا۔ حسرت کی غزل میں نکھری ہوئی داخلیت اور شیرینی اور کیف ہے لیکن اگر ان کی غزلوں میں کسی جدید ذہن کا پتہ لگانا ہو تو اس میں ناکامی ہوگی۔ حسرت کا ذہن وہی قدیم نیم صوفیانہ، نیم شاعرانہ ذہن قدیم صوفی اگر اس عہد میں ہوتے تو شاید ان کی انسان دوستی اور جمہور سے جذباتی وابستگی انہیں کچھ اسی قسم کے متضاد رویے کی طرف لے جاتی جو کی غزل اور ان کی سیاسیات میں ملتا ہے۔ "چکی کی مشقت" اور گاندھی جی اور تلک سے عقیدت کے اظہار کے باوجود حسرت کی غزل عہدِ نو ثل سے دور ہے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حسرت، اصغر اور فانی تینوں کے کلام میں ایک قدر مشترک ملتی ہے۔ ان کا اپنا ایک فکری کردار ہے جو حسرت تر اور باقی دونوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔ حسرت کا کوئی واضح فلسفۂ حیات معلوم نہیں ہوتا لیکن ان کے سارے کلام پر صوفیانہ رنگ کی چھاپ ہے جس نے ان کے زاویۂ نگاہ کو بڑی حد تک متعین کر دیا ہے۔ اصغر نے تصوف کو واضح طور پر استعمال کیا اور فانی نے اپنے کو اس قدر انفرادی بنا دیا کہ ان کی آواز پورے دور کی آوازوں میں الگ سنائی دیتی ہے۔ اصغر اور فانی کے فلسفۂ حیات سے کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن ان دونوں کی غزلوں پر انتشارِ ذہنی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی غزلیں مخصوص فلسفیانہ مزاج رکھتی ہیں اور یہی جدید غزل کا سے بڑا کارنامہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصغر اور فانی نے بھی غزل کی پرانی (IMAGERY) اور زبان کا سہارا لیا ہے پرانی تلمیحات کو کبھی نئی وسعت بخش کر نکالا ہے کبھی قدیم علامتوں کو نئی گہرائی دی ہے لیکن پھر بھی انہوں نے متاخرین کی غزل سے پریشاں خیالی کا عنصر دور کر کے اسے مربوط نظریۂ حیات کی تشکیل کا ذریعہ بنایا۔ فانی یا اصغر کے لئے غزل محض خوش وقتی نہیں تھی ان کی شخصیت کے اظہار کا لازمی جزو تھی۔ یگانہ اور جگر مراد آبادی کی شاعری فکری کردار تو باقی نہ رہا لیکن یگانہ نے لہجے اور فضا سے غزل میں نیا جادو جگایا اور جگر نے مئے کہنہ کو نئے شیشوں اور نئے پیمانوں میں پھر پیش کیا۔ کے تیور، بانکپن، قلندرانہ آن بان اور غم کے طوفانوں کے مقابلے میں کج کلہی کی شان ـــ گو مربوط نظریۂ حیات کا بدل نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی اس شاعری ایسے مشروب کی کیفیت تھی جو نشہ نہیں لاتا مگر جسم میں تازگی اور چستی پیدا کرتا ہے۔ یہ چستی زیادہ دیرپا نہیں ہوتی اس سے ہمت ضرور بڑھتی بلکہ بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔

غزل میں نئے احساس کو جگہ دینے والوں میں سرِ فہرست فراق، جذبی، مجروح اور فیض کا نام ہے۔ فراق کی غزلوں میں حسن و عشق کے معاملات پردے میں اس جذباتی کرب، ارضیت اور درد خود آگہی کا احساس ملتا ہے جو نئی نسل کو ورثے میں ملا ہے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں اور نئی نسل کے بانی مسائل کا ذکر اس مقالے میں جگہ جگہ آیا ہے بہتر ہے اگر ان مسائل کو جذباتی کرب، ارضیت اور درد خود آگہی کے الفاظ میں کسی قدر واضح کیا جائے۔

ہمارے ادب میں نئی شاعری کی ابتدا یا یوں کہئے کہ شاعروں کی نئی پود کا طلوع ایک ایسے دور میں ہوا جسے مناسب اصطلاح کی غیر موجودگی بین بین دور کہا جا سکتا ہے یہ نسل اپنے دور کے یورپ سے بہت کچھ ملتی جلتی نسل تھی۔ عام طور پر نئی نسل طبیعیات، نفسیات اور عمرانیات کے نئے انکشافات کی بنا پر کچھ تلخ حقیقتوں اور ان سے پیدا شدہ تشکیک کا شکار ہو رہی تھی۔ ڈارون انسان کو اشرف المخلوقات کے مرتبے سے کر مادے کے عام ارتقائی عمل کی کڑی قرار دے چکا تھا۔ فرائڈ نے انسان کو قادرِ مطلق کے بجائے لاشعور اور جبلت کے دستور میں اسیر قرار دے یا تھا اور مارکس نے تمام قدروں کو اضافی بتا کر نیکی اور بدی کے معیار پر نئے سرے سے غور کرنے کی دعوت دی تھی۔ یورپ میں ان تعلیمات کے ساتھ صنعتی تہذیب کا تشنج اپنے شباب پر تھا۔ شہر کارخانے بن چکے تھے اور شہری زندگی کی برق رفتاری، افراتفری اور بے یقینی نے انسان سے

جذباتی سکون اور برادری کا احساس چھین لیا تھا جس سے گھبرا کر نئی نسل کرب، تشکیک اور بیزاری کا شکار ہو رہی تھی۔

ہندوستان میں صنعتی اور شہری تہذیب کا وہ تشنج اور افراتفری نہ تھی لیکن غلامی کی زنجیریں گراں بار تھیں اور انگریزی تعلیم نے جو آدرش نوجوانوں کو بخشے تھے وہ ان کی خانگی زندگی کے سانچے سے ٹکراتے تھے، وہ آزادی، جمہوریت اور صنعتی ترقی کے خواب دیکھتے تھے اور ان کے ارد گرد کی صدیوں پرانی چہار دیواری میں غربت، پردۂ نسواں اور قدیم دقیانوسی اور ایشیائی نظامِ حیات کی انحطاط پذیر قدریں اب بھی سانس لے رہی تھیں۔ ان کے جذبات کچھ چاہتے تھے اور ان کے گرد و پیش کی زندگی کا تقاضا کچھ اور تھا۔ جو کوششیں اس دور میں آزادی اور انصاف کے لیئے ہو رہی تھیں ان میں سے اکثر میں انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے جدید اور دقیانوسی تہذیبوں کا یہی تضاد ملتا ہے اور ان کی ناکامی سے تشکیک اور بیزاری پیدا ہوتی تھی اور ذہنی نراج پرورش پاتا تھا۔

اس بیان کا یہ مطلب نہیں کہ اس دور کے یورپ یا ہندوستان میں ایسی تحریکیں یا افراد سرے سے موجود ہی نہیں تھے جو تخریب اور نراج سے آگے بڑھ کر کوئی مثبت حل تلاش کر سکتے لیکن اس دور کے نوجوانوں کا غالب رجحان یہی تھا اور اسی نے میرا جی اور راشد، منٹو اور احمد علی، عصمت اور حسن عسکری "انگارے" اور "لحاف" کو جنم دیا تھا۔ اگر اس دور کی سیاست کا غور سے مطالعہ کیا جائے جس میں نوجوانوں کا بڑا حصّہ رہا ہے تو اس میں بھی طفلانہ پن اور ذہنی نراج کے نمایاں نشانات ملیں گے۔ بعد کی نسل نسبتاً زیادہ تعمیری اور مثبت انقلابی شعور کی طرف مائل ہوئی اور ذہنی نراج سے تھک کر عقیدہ کی تلاش میں اشتراکیت کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن یہ بعد کی داستان ہے۔

نئی غزل کے سامنے اس دور کے جذباتی ردِ عمل کو بے نقاب کرنے کا فریضہ تھا۔ فراق نے اس کام کو انجام دیا۔ اس کا ثبوت فراق کے تصورِ حسن و عشق سے ملے گا جس میں بڑی ارضیت اور حقیقت پسندی ہے۔ نئی نسل کے پاس ماورائی تصوّرات اور مسلّمہ قدریں نہیں تھیں اور ان کی محبت افلاطونی ہونے کے بجائے ارضی تھی تصوّراتی یا دائمی ہونے کے بدلے حقیقت پسندی کی سطح پر اتر آئی تھی اور اسی لیئے فراق کے کلام میں جو درد مندی ہے اس میں صرف غمِ جاناں ہی موجود نہیں ہے بلکہ کبھی غمِ دوراں کی آمیزش ہو جاتی ہے کبھی ایک ایسے موہوم درد کی جو محبوب کے دل پہ ہاتھ رکھ دینے سے بھی نہیں تھمتا۔ یہی موہوم خواہش، یہی بے نام درد اس نئی نسل کا نشان ہے۔

جدید غزل میں فراق کے اس کارنامے کے باوجود فراق کے پاس کوئی مربوط فلسفۂ حیات نہیں ہے ان کی غزل اس صنف کو پریشان خیالی سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اصغر کو تصوّف کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ فانی کو یاسیات کا امام کہا جاتا رہا ہے۔ یہ دونوں شاعر زندگی کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں اور زندگی کی اسی تصویر کو اپنے سننے والوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اصغر اور فانی کے پاس بُرا بھلا نظریۂ حیات ہے ضرور لیکن فراق کی شاعری میں اگر کسی مربوط نظریۂ حیات کی تلاش کی جائے تو کامیابی دشوار ہے۔ فراق کی غزل میں فکری وحدت کا فقدان ہے اور وہ پریشان خیالی کے اس الزام سے بری نہیں ہے جس کے دور کیئے بغیر نئے دور کے تقاضوں کو غزل میں سمونا ناممکن ہے۔

فراق کے اندازِ بیان کے بارے میں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ ان کے اکثر اچھے اشعار سادہ ہیں۔ تشبیہہ و استعارہ اور مرصّع کاری پر ان کا دار و مدار نہیں لیکن یہ سادگی اکثر مقصد بن جاتی ہے ذریعہ نہیں رہتی۔ ایلیٹ نے ایک جگہ شاعری کو ایک ایسا شیشہ قرار دیا ہے جس میں سے دوسری چیزیں نظر آتی ہیں اور خود وہ شیشہ مقصودِ نظر نہیں ہوتا۔ اگر مخاطب کی نظریں شیشے کی مرصّع کاری میں الجھ کر رہ جائیں اور اس میں سے ہو کر اصل تصویر تک نہ پہنچ سکیں تو شاعرانہ بیان خیال کے اظہار میں معاون ثابت ہونے کے بجائے رکاوٹ بن جاتا ہے۔

فراق کے سادہ اندازِ بیان میں بھی یہی کیفیت رہتی ہے ایک تو ان کی غزلوں کی ساری IMAGERY قدیم غزلوں کی ہے پھر اس میں انہوں نے "زبان" کے شعر کہنے کی کوشش میں اصل خیال کی لطافت کو نکھارنے کے بدلے طرزِ بیان کی سادگی پر ساری توجہ مرکوز کر دی ہے۔ پوربی اور ہندی الفاظ کی جو تلمیحیں اور محاورات انہوں نے استعمال کیئے ہیں وہ رباعیوں میں تو مزا دے گئے ہیں لیکن غزل میں پوری طرح نہیں جڑے جا سکے۔ فراق کی غزل

احساسات کا آئینہ ہے، اوراک کا مربوط آئینہ خانہ نہیں۔ ان کے فلسفۂ حیات کا کوئی نشان اس میں نہیں ملتا۔ زندگی کے بارے میں عام رویّہ یا فکر ان کے دائرے سے باہر ہے ان کی آواز نئی ضرور ہے لیکن ان کی شاعری میں فلسفیانہ آہنگ اور فکری انفرادیت موجود نہیں ہے۔

فراقؔ کے بعد ایک ہی ساتھ جذبیؔ، مجروحؔ اور فیضؔ کا ذکر آتا ہے۔ جذبیؔ خارجی تجربے کو جوں کا توں نہیں رکھتے بلکہ عام خارجی حقیقت کو تفصیل اور جزئیات سے الگ کر کے اسے مجرّد تاثر میں ڈھال لیتے ہیں اور اس تاثر کو غزل کے عام اندازِ بیان کی شکل دے دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ان کی غزل میں نئے انداز کے غم کا احساس تو مل جاتا ہے لیکن نئے خیال سے محروم رہ جاتا ہے۔ جذبیؔ کی شاعری اس غم آشنا طبیعت کی غمّاز ہے جو نئی نسل کو حالات و افکار نے بخشی ہے۔

لیکن اس دُکھ میں فکری عنصر سرے سے مفقود ہے۔ جذبیؔ کی شاعری ترسیل کم ہے انکشافِ محض زیادہ ہے۔ ان کی غزلوں میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جسے وہ بے اختیار ہو کر دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہوں یہ محض اظہارِ ذات کا ذریعہ ہیں اظہارِ حقیقت کا نہیں۔ جذبیؔ کائنات اور حیاتِ انسانی کے عظیم مسائل تک دسترس نہیں رکھتے۔ ان کی چھوٹی سی دنیا ان کی اپنی ذات ہے اور اسی کے جذبے ان کی شاعری کی حقیقتیں ہیں حسرتؔ کی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حسرتؔ کی شاعری حقیقتوں سے معمور ہے لیکن ان کی حقیقتیں چھوٹی اور سطحی ہیں ان میں گہرائی، بسط اور کائناتی آہنگ نہیں ہے۔ جذبیؔ کی غزلوں کے بارے میں یہ بات اور بھی زیادہ صحیح ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جذبیؔ کی غزلوں میں رچاؤ، ضبط و نظم اور انفرادی تجربے کا سوز و گداز اپنے تمام ہمعصروں سے زیادہ ہے لیکن فکر کی کمی، قدیم غزل کے پیٹرنوں سے بندھے رہنے اور خارجی بیانات کو سادگی اور شعریت کے ساتھ نظم کر دینے کی قدرت نہ ہونے کی وجہ سے جذبیؔ کی غزل بھی اس صنف کو نئے تقاضوں سے قریب لانے میں ناکام رہی ہے۔

مجروحؔ سلطانپوری نے نئے تقاضوں کو محض سیاسی تقاضے سمجھا اور جس طرح پچھلے دنوں ہنگامی واقعات اور سیاسی حادثات پر نظمیں لکھی جاتی تھیں اسی طرح مجروحؔ نے غزل سے کام لینا چاہا۔ مجروحؔ کی غزل کا سارا ٹھاٹ باٹ ٹھیٹھ کلاسیکی اور قدیم ہے۔ وہ مرصّع کاری کے بھی قائل ہیں اور تشبیہ و استعارے کی طلسم سازی کے بھی۔ اندازِ بیان کے رچاؤ اور ندرتِ ادا کی دولت سے یقیناً وہ قدیم غزل میں نئی زندگی پیدا کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دوسرا راستہ چُنا اور اس تجربے میں انہیں ناکامی ہوئی۔

غزل میں عصری اور صحافتی مسائل کو پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یہ بڑا دلچسپ سوال ہے اور اس کے مختلف جوابات دیئے جاتے رہے ہیں۔ مجروحؔ اس کے جواب میں میرؔ کا یہ شعر پڑھیں گے ؎

سکھ مرہٹے، چور اچکّے، شاہ و گدا سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے، فقر بھی اک دولت ہے یاں

اور کہیں گے کہ اس میں ہنگامی واقعہ کا بیان شاعری بن گیا ہے لیکن یہ شعر نہ میرؔ کے اچھے شعروں میں شمار ہوتا ہے اور نہ اردو غزل کے اچھے شعروں میں، اور اس میں بھی واقعہ سے زیادہ اس سے نکالے ہوئے نتیجے پر زور دیا گیا ہے۔ — غزل کو کچھ لوگوں نے رمز و کنایہ کی زبان قرار دیا ہے اور کچھ نے استعارے کی۔ لیکن سچ پوچھئے تو نہ غزل کے لئے استعارہ ضروری ہے اور نہ رمز، اصل شئے تعمیم ہے جس کا اظہار رمز اور استعارے کے ذریعے ہوتا ہے۔ غزل روزمرّہ کی زندگی کے کسی واقعے یا چند واقعات کو من و عن بیان نہیں کرتی بلکہ ان سے بنیادی تاثر یا عمومی خیال اخذ کر لیتی ہے اور اسے مختصر سے مختصر پس منظر کے ساتھ پیش کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر میرؔ کے شعر کو شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں سلائی پھیرے جانے والے واقعے سے متعلق سمجھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ غزل کس طرح اصل واقعے کے بیان اور اس کی جزئیات و تفصیل سے قطع نظر کر کے صرف مجموعی تاثر پیش کرتی ہے۔ شعر یہ ہے ؎

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی   انہی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

مختصر یہ کہ غزل کا آرٹ تعمیم کا آرٹ رہا ہے وہ محرکات کو پیش نہیں کرتی، ان محرکات سے پیدا شدہ تصوّر کو پیش کرتی ہے اور تصوّر کے لفظ سے یہاں وہ فوری اور اعصابی ردِّ عمل مراد نہیں ہے جو انسان پر کسی بیرونی شے سے پڑتا ہے بلکہ اس اعصابی ردِّ عمل (SENSATION) کے بعد احساس (FEELING) اور ادراک کے امتزاج کے بعد جو مرکّب تیار ہوتا ہے اس سے مراد ہے اس کا ترجمہ "جذبہ" بھی ہو سکتا ہے۔

مجروح کی غزل نے تعمیم کی اس منزل کو نظر انداز کر دیا اور اصل واقعہ کا بیان یا اس کے اعصابی ردِّ عمل (SENSATION) پر اکتفا کر لیا وہ اس تصوّر تک نہیں پہنچتی جو احساس اور ادراک کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

یہاں دو باتیں جملہ ہائے معترضہ کے طور پر کہنا ضروری ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ بعض لوگ تعمیم کو داخلیت کا مترادف سمجھ لیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک غزل گو شاعر کو اوّل تو صرف ایسے واقعات کا بیان کرنا چاہئے جو اس کی ذات پر گذرے ہوں اور داخلی طور پر اس پر بیتے ہوں اور بہتر ہوگا اگر وہ محض ہلکے پھلکے عشقیہ مضامین باندھتا رہا۔ دوسرے اگر وہ بیرونی دنیا کے واقعات کا تذکرہ بھی کرے تو انہیں ذاتی محرومیوں کا رنگ دے کر پیش کرے۔ ظاہر ہے کہ یہاں جذبے کو خالص داخلی اور غیر فکری عنصر قرار دے دیا گیا ہے اور اسے احساس کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے تعمیم سے نہ تو داخلیت مراد ہے اور نہ احساس محض۔

روزمرہ کی زندگی میں انسان کو طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ غیر تربیت یافتہ ذہن کے لئے یہ واقعات بظاہر غیر متعلق اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں ان میں وہ کسی قسم کا تسلسل نہیں دیکھ پاتا۔ وہ ان سے نتیجہ نکالنے یا کسی ایک بنیادی تصوّر تک پہنچنے پر قادر نہیں ہوتا۔ تربیت یافتہ ذہن شے سے مجرّد خیال تک پہنچتا ہے اور شاعر اس مجرّد خیال کو اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ وہ ایک عہد یا ایک فرد کی کہانی ہونے کے بجائے عام انسانوں کی کہانی بن جاتا ہے اور اس میں ایسے مسائل جھلکنے لگتے ہیں جو انسان کو رنگ، نسل یا مذہب کے اعتبار سے نہیں بلکہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے پیش آتے رہے ہیں۔

یہ مسائل کون سے ہیں؟ یہ سوال عمرانیات اور نفسیات میں بھی پیش نظر رہا ہے اور تاریخ اور فلسفے میں بھی زیر بحث رہا ہے۔ اگر محض حیاتیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو کم از کم ساری دنیا کے انسان تمام تفرقوں کے باوجود اس بات میں ضرور مشترک ہیں کہ وہ پیدا ہوتے ہیں ان کو بھوک پیاس اور جنسی رفاقت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی قسم کی اجتماعی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ انہیں موسم کی سختیوں سے بچاؤ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب ایک نہ ایک دن موت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اگر انہی چند باتوں پر غور کیجئے تو عظیم ادب کے اکثر عنوانات اس حد بندی میں آ جاتے ہیں۔ انسان کے دنیا میں آنے کا سبب، زندگی کی ماہیت، بھوک، جنس، رومان اور محبت، فرد اور سماج کا رشتہ اور موت کے بارے میں انسانیت کا رویّہ ——— یہ ایسے مسائل ہیں جن کا تانا بانا ہر دور کے ادب میں نمایاں ہے۔ چونکہ ہر عہد کے بدلے ہوئے حالات میں یہ مسئلے نئے سرے سے حل ہوتے ہیں اس لئے ایک طرف ادب کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے اور دوسری طرف قدیم ادب کی تازگی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو ادب کو تازہ رکھتی ہے اور صحافت اور سیاسی واقعات کو باسی اور بے مزا کر دیتی ہے۔ ان جبلّی مسائل سے رشتہ استوار رکھنے اور انسانیت کے تفرقے کے بجائے اس اشتراک پر نظر رکھنے کو ادبی اندازِ نظر کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

دوسرا جملۂ معترضہ یہ ہے کہ ہنگامی مسائل پر لکھنا فی نفسہٖ نہ معیوب ہے نہ مستحسن۔ واقعہ تو در حقیقت شاعر کے لئے اظہار کا ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے، وہ حسن و عشق کی باتوں کے ذریعے اپنا مقصد واضح کرے یا کارخانے کی ہڑتال پر نظم لکھ کر اگر وہ اس موضوع میں جمالیاتی کیف، اور ادبی اندازِ نظر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا فن سچا ہے۔ عنوان اس کے لئے فوری محرّک کے علاوہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

مجروح کی غزل کی صرف اس لئے تنقید یا تعریف کرنا کہ وہ چند ایسے عنوانات سے وابستہ ہے جو فوری، صحافتی اور ہنگامی ہیں صحیح نہیں ہے۔ فیصلہ اس بات پر ہونا چاہئے کہ وہ ان وقتی محرکات کو ادبی اندازِ نظر اور جمالیاتی کیفیت بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں۔ اقبال نے "مسجدِ قرطبہ" اور

……کی گود میں بلّی دیکھ کر" اور "والدہ مرحومہ کی یاد" کو موضوع بنایا ہے اور انہیں شعری تجربے میں ڈھال لیا ہے۔

مجروحؔ کے یہاں دونوں قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یا ؎

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا تو چراغ راہ میں جل گئے

اور یہ بھی انہی کا شعر ہے ؎

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

لیکن مجروحؔ کا میلان دوسری قسم کی شاعری کی طرف زیادہ رہا ہے جسے وہ نئی غزل کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ مجروحؔ کی اچھی غزلیں بڑی رسیلی، تابناک اور سجیلی ہیں۔ ان کے اسلوب میں بڑا رچاؤ اور شیرینی ہے لیکن اس تجربے میں مجروحؔ کی غزلوں نے لطافت اور مٹھاس دونوں کھو دی ہیں۔

دراصل مجروحؔ کا یہ تجربہ کافی اہم تھا۔ غزل میں آج کی بات کو پوری خارجیت، تسلسل اور ربط کے ساتھ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جس طرح نظم میں سائنس، عمرانیات اور علوم انسانی کے کسی خیال کو بھی پورے ارتقائی تسلسل اور بسط کے ساتھ سموتے ہیں اسی طرح مجروحؔ غزل میں سمونا چاہتے تھے۔ یہ تجربہ ناکام رہا۔ غزل کے مخصوص مزاج نے ان کے "اجتہاد" کو تسلیم نہیں کیا اور ان صحافتی اشاروں کو غزل کے مغلیہ ٹھاٹ باٹ کا لباس پہنا کر نہ تو وہ اپنی بات کو پورے شرح و بسط کے ساتھ سمجھا سکے اور نہ غزل کی فضا کو مجروح ہونے سے بچا سکے۔

فیضؔ نے اس تجربے کو زیادہ ضبط و احتیاط کے ساتھ کیا۔ "دستِ صبا" کی غزلوں میں اشاریت اور رموز کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ یہ غزلیں ایسے حالات میں لکھی گئی تھیں جب شاعر کو اپنی بات کو وضاحت سے کہنے کے مواقع حاصل نہ تھے۔ یہ باتیں نہ تفصیل سے سمجھائی جا سکتی تھیں نہ صاف صاف کہی جا سکتی تھیں۔ زنداں کی دیوار کے نیچے نہ فراغت تھی نہ آزادیٔ اظہار۔ ایسے حالات میں اختصار اور کنایہ دونوں ضروری تھے اور اس کے لئے غزل موزوں تھی ——

فیضؔ کی غزلوں کی تعریف میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس پر اضافہ کرنا دشوار ہے۔ فیضؔ کے بیان میں ناہمواری نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں مناسب تعمیم ملتی ہے اور وہ ہنگامی واقعات یا سیاسی بیان کو بھی تعمیم کے ساتھ داخلی تجربہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی آواز غزل کے مزاج کے خلاف معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ان کا تخیّل تشبیہہ اور استعارے کی تلاش میں نئی فضا تلاش کر لیتا ہے۔ فیضؔ کی کامیابی کا راز کچھ تو اس میں مضمر ہے کہ ان کی داخلیت وسیع اور خود آگاہ ہے اور وہ ہر خارجی مسئلے، مشاہدے یا واقعے کے بنیادی تاثر کو داخلی اور شعری تجربہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور کچھ اس بات میں کہ فیضؔ نے غزل میں تشبیہہ و استعارے کے استعمال میں جدّت سے کام لیا ہے اور (TRANSFERED EPITHET) کی مغربی تکنیک کو اپنا لیا ہے۔ تصوّرات اور خیالوں کو زندہ تصوّر کیا ہے اور ایک شے کی صفت سے دوسری اشیاء اور ان کے تصوّر کو موصوف کر دیا ہے۔ فیضؔ نے اس طرح غزل کو نئے انداز کی IMAGERY بخشی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ فیضؔ کی غزلوں میں جذباتی وفور ہے۔ وہ نئی نسل کے اس مبہم درد کو جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں "کسی نہ کسی حد تک پابندِ نَے" کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا بڑا المیاتی احساس اور SENSNOUS شعور ملتا ہے۔ وہ زندگی کی حسین چیزوں سے قریبی ربط رکھتے ہیں

اور ایلیٹ کے الفاظ میں "سماعی تخیل" سے اس کی لذت کو اسیر کرتے ہیں۔ یہی نہیں فیض نے اس تجربے میں بھی تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے جو مجروح نے کیا تھا۔ یہ فرق ضرور ہے کہ مجروح بلا واسطہ واقعے کے بیان کو نظم کر دیتے ہیں اور فیض کے یہاں ہنگامی واقعات کی صورت بھی بدل جاتی ہے یہ واقعات شعری تجربے کا مرکزی نقطہ نہیں رہتے بلکہ پس منظر میں موجود رہتے ہیں اور ان سے حاصل شدہ تاثر ہی بنیادی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو مضمون کے اعتبار سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ان سے فیض اور مجروح کا موازنہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اسلوب کے امتیازی فرق کو نمایاں کرنا مقصود ہے ؎

ہوں جو سارے دست و پا ہیں خوں میں نہلائے ہوئے
ہم بھی ہیں اے دلِ بہاراں کی قسم کھائے ہوئے

مجروح نے بھی دیکھا اس کو اے کہنہ نظامِ سرمایہ
تیری ہو یہی بنیاد مگر اب کیا ہے بنائے زنداں میں
ہمہ تیغ اثر زنجیرِ قدم پھر بھی ہیں نقیبِ منزل ہم
زخموں سے چراغِ راہگذر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں

زنداں کی اس بے اثری اور عزمِ کامراں کو فیض نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری   فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے   تو فیض دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی!
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ فیض کی غزلوں کو اس صنف کے احیاء کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا ان غزلوں نے نئے دور کے تقاضوں کو پورا کر کے سارے اعتراضات کا مسکت جواب دے دیا ہے؟ پہلے اعتراض پر غور کیجئے کیا واقعی فیض کی غزلوں میں پریشاں خیالی نہیں ہے اور ان میں کسی مربوط تصورِ حیات کا پتہ ملتا ہے؟ فیض کا نقطۂ نظر یا فلسفۂ حیات کیا ہے؟ فیض کی شاعری کے فکری کردار کا پتہ ان کی غزلوں سے نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ فیض اپنی غزلوں میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کائنات، زندگی، انسانی وجود اور اس قسم کے بنیادی مسائل پر فیض خاموش ہیں۔ جس طرح ہم اصغر یا فانی کے ایک فکری کردار کا تصور کر سکتے ہیں ان معنوں میں فیض کو کسی مخصوص تصورِ حیات کا علمبردار نہیں کہہ سکتے۔

فیض کی غزلوں میں سجاوٹ ہے توانائی نہیں ہے احساس کا حسن ہے فکر کی گہرائی موجود نہیں ہے ان کی دنیا رنگ و نور کی دنیا ہے اس اخلاق کی دنیا نہیں ہے جو اس رنگ و نور کو سخن کا ذریعہ بناتا ہے فیض کی غزل میں اندازِ بیان ایسا شیشہ نہیں ہے جو کسی شے پر توجہ مرکوز کرنے کے لئے استعمال ہوا ہو یہ شیشہ خود مقصودِ نظر ہوتا ہے اور اسی لئے فیض کی غزل اس سجے ہوئے منقش فانوس کی طرح ہے جس میں فکر کی تابناکی کے بجائے وفورِ احساس کی ہلکی سی شمع روشن ہے۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ فیض ہر بات کہنے کے لئے حسن و عشق کے معاملات کا سہارا لیتے ہیں اور انہی استعاروں میں سب کچھ ادا کرنا چاہتے ہیں آج کے شاعر کی کامیابی یہ ہے کہ وہ خیال کی تابناکی اور سادہ روئی میں شعریت پیدا کر سکے اسے سطحی اور بیرونی سہاروں کی ضرورت نہ ہو۔ فیض نے خیال

ی شمعیں روشن کرنے کی بجائے نئی رنگینیوں سے کام لینا چاہتے ہیں۔

جہاں فیض نے کلاسیکی رچاؤ اور تخیل کی آن بان کو پھر سے تغزل کا جوہر بنایا وہاں ان کی غزلوں نے سادگیِ ادا کی طرف سے توجہ ہٹا لی اور استعارے ور تشبیہ کی طرف عام شعراء کے ذہن کو منعطف کر لیا۔ فیض نے غزل کو نیا ذہن نہیں دیا البتہ نئے احساس کی رنگینی اور زیادہ وسیع اور نسبتاً بالغ نظر تخیل زور ان کا عطیہ ہے۔ فیض کی غزلیں نہ تو غزل پر سے اس اعتراض کو دور کر سکتی ہیں کہ اس میں فکری کردار اور نظریاتی آہنگ نہیں ہوتا اور نہ قدیم مرصع کاری ور روایتی انداز کے بجائے سادگیٔ ادا کو اپناتی ہیں۔ فیض نے غزل کی مسیحائی نہیں کی البتہ احساس کی آگ اور تخیل کی ترنگ سے اس پرانی دنیا کو نئی رنگینی ے ضرور آشنا کر دیا فکر کی تابناکی ان کی محفلوں سے دور ہے۔

یہاں ناصر کاظمی، ابنِ انشا اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو غزل گو شعرا کی نئی پود میں اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ابنِ انشا غزل گو کی حیثیت سے زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ البتہ ناصر کی غزلوں میں لطافتِ تخیل اور نزاکتِ ادا ملتی ہے۔ ناصر نے غزل کو سچ مچ کارگہِ شیشہ گراں ہی سمجھا ہے اور ان کی غزلوں کے موضوع عام طور پر داخلی اور عشقیہ مضامین سے متعلق ہوتے ہیں۔ موہوم اداسی کا احساس، ناکامی کو زہرخند کے ساتھ قبول کر لینے کا انداز، برسات اور چاندنی راتوں میں کسک سے مضطرب رہنے کا سلیقہ، سبھی کچھ ان غزلوں میں ہے لیکن یہ شاعری ہنوز سنِ بلوغ تک نہیں پہنچی۔ ہنوز نو عمر اور ناپختہ کار (Adolescent) جذبات کا مجموعہ ہے جس میں ہلکا پھلکا درد تو ہے البتہ تجربے کا وزن اور آفاقیت کی گونج نہیں ہے اور صرف فضا یا اندازِ بیان کے بل پر غزل کو نیا لہجہ دینا ناممکن ہے۔ گو ناصر کی اس خدمت کو سراہنا ضروری ہے کہ ان کی سادگیٔ ادا نے غزل کو سادگی کی لطافت سے قریب کیا ہے لیکن سادگیٔ خیال کا بدل نہیں ہو سکتی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں میں رچاؤ اور گداز ہے اور میٹھا میٹھا درد اور لطیف کیف بھی موجود ہے اور اس کیفیت کو اعظمی نے مرصع کاری یا سجاوٹ سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ احساس کی شدت اور تیکھے پن سے قائم رکھا ہے۔ ان غزلوں میں عشق کی محرومی سے زیادہ ایک ایسے نوجوان کی محرومی کی آوازِ بازگشت ہے جو ہماری اس مصروف دنیا میں تنہا رہ گیا ہے اور جذباتی آسودگی کی ناکام تلاش کر رہا ہے لیکن اس تلاش کا دائرہ بھی محدود ہے۔ خلیل اعظمی کی رسائی خیال تک نہیں ہے، وہ محض تاثر پر قناعت کرتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان تینوں شعراء نے میر کی تقلید کی لَے اس قدر بڑھائی ہے کہ ان کی شاعری میں داخلیت اور مایوسی کا غلبہ ہونے لگا ہے۔ اسی جوش میں کہیں کہیں وہ بالکل روایتی انداز میں قافیہ پیمائی کرنے لگتے ہیں اور پرانی زمینوں میں فکر کرتے کرتے ان کا ذہن گویا ماضی میں فرار اور گریز کا آسرا تلاش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ انداز غزل کو نئے عہد کے تقاضوں کے لئے استعمال کرنے کے قابل نہیں بناتا بلکہ نئے مسائل سے دامن کشی کی طرف راغب کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ غزل کے بارے میں احیاء کا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنا سوائے خوش فہمی کے اور کچھ نہیں ہے لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہو گا کہ غزل بے کار صنف ہے اور جدید غزل کے الفاظ استعمال کرنا دراصل دو متضاد لفظ استعمال کرنے کے مترادف ہے؟ غزل جدید عہد کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے فی نفسہٖ غیر موزوں ہے؟ ان سوالوں کا جواب بہت سے "غزل دشمن" احباب نے نفی میں دیا ہے لیکن یہ کہنا غزل کی "بے تکلف گردن مار دینے" کا مشورہ ہے۔

غزل عہدِ جدید کے سب تقاضوں کو نہ سہی پھر بھی بہت سے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ غزل کو اس کے پرانے سہاروں سے نجات دلائی جائے یعنی اسے فکری وحدت بخشی جائے اور مرصع کاری کے بجائے سادگیٔ ادا، تاثر کے بجائے خیال، اعصابی احساسِ محض کے بجائے جذبہ کے نور سے اسے آراستہ کیا جائے۔ فکری وحدت کے بارے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس سے غزلِ مسلسل مراد نہیں ہے جس میں ایک ہی خیال کو ارتقائی سلسلہ کے ساتھ پیش کرنا ضروری سمجھا جائے یا پوری غزل میں ایک ہی تاثر کو نظم کیا جائے۔ یہاں مراد صرف یہ ہے

کہ شاعر کا اپنا کوئی نہ کوئی زاویۂ نظر حیاتِ انسانی کے بارے میں موجود ہو اور شاعری اس کے نزدیک محض خوش وقتی، پریشاں خیالی یا اپنے تاثرات کے بے نقاب کرنے کا ذریعہ ہونے کے بجائے ایک مربوط نظریۂ حیات کی ترسیل کا ذریعہ ہو۔ بڑی شاعری محض احساسات کی فراوانی سے تخلیق نہیں ہوتی اور نئی غزل میں جب تک یہ مربوط فکری آہنگ نہ ہوگا اور پڑھنے والوں کو جب تک یہ احساس نہ ہوگا کہ ان کا مخاطب زندگی کے اعلیٰ ترین مسائل پر چند باتیں کہنا چاہتا ہے، غزل ان کے لئے محض خوش وقتی کا ذریعہ ہی بنی رہے گی۔

فکری وحدت سے یہ مراد ہے کہ ہر غزل کے اشعار میں مختلف مضامین ہی کیوں نہ باندھے گئے ہوں لیکن جب ان غزلوں کو یکجا کر کے پڑھا جائے تو ان سے ایک ایسے نقطۂ نظر کا نشان ملے جس سے انسانی زندگی کے بارے میں شاعر کا مربوط نظریہ سامنے آسکے۔ اس کی مثالیں میرؔ دردؔ سے لے کر اصغرؔ و فانیؔ تک ملتی ہیں۔

مرصع کاری کو کچھ لوگوں نے غزل کا بنیادی پتھر سمجھ لیا ہے اور اندازِ بیان کی سجاوٹ ——— اور سجاوٹ بھی غزل کے قدیم تشبیہہ و استعارے اور IMAGERY سے ——— ان کے نزدیک غزل کے لئے ضروری ہے، یہ گویا خیال کی ندرت کی کاوش سے بچنے کا سہل طریقہ ہے۔ نیا غزل گو شاعر وہی ہوگا جو غزل میں فکری وحدت قائم کر سکے اور صرف خیال کی ندرت اور لطافت سے شعریت اور تغزل کا جادو جگائے اور اسی وقت غزل کے احیاء کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔ اس وقت کی غزل گوئی خیال اور زندگی کے بارے میں مطالعہ، مشاہدے اور وسیع النظری سے نتیجوں پر پہنچنے سے گریز کا نتیجہ ہے اور ترقی پسند شاعری نے نفسِ مضمون پر جو زور دیا تھا اس کے ردِ عمل کے طور پر محض اسلوبِ بیان اور روایت پر زور دینے کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے۔

(۳)

یہ بات سماجی شعور اور ترقی پسند شاعری کے متعلق ہے۔ ادب میں سماجی شعور تلاش کرنا صحیح ہے یا غلط؟ اس کے بارے میں غور کرنے سے پہلے دو مسئلوں کا تصفیہ ضروری ہے۔ شاعری اور سماج کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ اور اس رشتے کی روشنی میں ترقی پسند تحریک نے ہماری شاعری کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچایا ہے؟

ادب کے سماجی رشتے کے بارے میں دو قسم کی رائیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ ایک طرف وہ گروہ ہے جو ادب اور سماج کا کوئی واضح رشتہ تسلیم نہیں کرتا اگر سماج کا رابطہ ادب سے ہے تو قطعی غیر شعوری قسم کا ہے اور شاعر کو شعوری طور پر کسی بات کو کہنے یا سماج کو کسی ایک سمت میں لے جانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ان کے نزدیک شاعر صرف آئینہ بردار ہے وہ صرف اپنے عکس پیش کرتا ہے جس کو دیکھنا ہو انہیں دیکھے اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ گویا شاعری کو شعوری عمل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے یا تو اسے تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں گم کر دیتے ہیں اور یا متصوفانہ اصطلاحوں اور کیفیات میں۔ ان کیفیات کے اظہار کے لئے اب وجدان، مذاقِ سلیم اور کیف کی مبہم اصطلاحیں استعمال کی جانے لگی ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ادب کو شعور کی تربیت کا ایک ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آرٹ صرف ایک کسوٹی پر کسا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک سماج کے لئے کارآمد ثابت ہوتا ہے اور اس سے ہمارے ذہن اور جذبات کی تربیت میں کوئی مبارک کام سرانجام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ گروہ عام طور پر تبلیغی ادب پر اصرار کرتا ہے اور تفریحی ادب کو ادبیات کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ادب کی سماجی اہمیت کو واضح کیا اور تخلیقی عمل میں شعور کو اس کا صحیح مرتبہ بخشا۔

ایک تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ادب میں سماجی شعور کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی اسے محض تبلیغی ادب تک محدود نہ کیا جائے اور مقصدیت سے پہلے اس کے جمالیاتی نکھار اور فنی حسن کو پیشِ نظر رکھا جائے اور تفریحی ادب کو بھی جائز اہمیت دی جائے۔ ایسے لوگ ہیں جو

ادب کو شعور کی تربیت کا ذریعہ قرار دینے کے بعد بھی ہر ایسے ادب کو جس میں فنی حسن موجود ہو اس امتیاز کے بغیر کہ اس میں تبلیغی عنصر موجود ہے یا نہیں ادب کے دائرے میں جگہ دینے پر آمادہ ہوں گے ۔

ترقی پسند تحریک کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدائی حالت میں ترقی پسند تحریک نے دو بنیادی غلطیاں کیں ۔ سارے قدیم سرمایے کو حرفِ باطل اور جاگیرداری دور کی یادگار قرار دیا حتیٰ کہ اس کے بہت عرصے بعد تک کچھ لوگ غزل کو "سامنتی دور کی یادگار" کہتے رہے دوسرے ترقی پسندی نے ابتدا میں عریانی، مذہب دشمنی اور روایت دشمنی کی اندھی ترویج کی اور صرف چونکا دینے کو ادب کا معیار سمجھا جانے لگا ۔ چنانچہ ترقی پسندوں نے ابتدا میں میراجی، "آزاد نظم" اور "لحاف" کی جو حمایت کی وہ اسی اعصابی تحیر پسندی کی بنا پر تھی ۔ کچھ عرصے بعد ان دونوں رویوں میں کچھ اعتدال پیدا ہوا ۔ فحش نگاروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے چھانٹا جانے لگا اور قدیم سرمایے میں بھی حسن و قبح کی تلاش کی جانے لگی حالی اور اقبال، غالب اور نظیر اکبرآبادی میں ترقی پسند میلانات تلاش کئے جانے لگے ۔

اس کے کچھ عرصے بعد ہی ترقی پسند تحریک کا رجحان ہنگامی سیاست کی طرف ہو گیا اور ادب اور شعر کا معیار سیاسی مسلک کی صحت کو قرار دیا جانے لگا ۔ شاعری سیاست کی نذر ہو گئی اور ادب کو سیاسی پروپیگنڈے کا آلۂ کار سمجھا جانے لگا ۔ نظمیں صرف اپنے نفسِ مضمون کی سیاسی اہمیت کی بنا پر جانچی اور تولی جانے لگیں ۔ اندازِ بیان اور جمالیاتی حسن تو درکنار شاعری کے ابتدائی ضابطوں کو بھی نظر انداز کیا جانے لگا اور اسی سیاسی بلکہ صحافتی افادیت کو سماجی شعور کا نام دے دیا گیا ۔ اس سے شاعری میں بے رنگی، یکسانیت اور سطحیت پیدا ہو گئی اور یہ تحریک ادبی کے بجائے سیاسی تحریک ہو کر رہ گئی ۔

یہاں اس بات کو دہرانا ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کا انکار ممکن نہیں ۔ اس نے ہمارے افسانوں کو صنوبر کے سایوں سے نکال کر ہماری اپنی دنیا میں لا کر آباد کیا ۔ ادبی تنقید کو ذاتی پسند یا ناپسند کے معیار سے اوپر اٹھا کر زیادہ سائنٹیفک بنایا ۔ ناول اور ڈرامے کو عصری زندگی کے مسائل کا کس بل عطا کیا، شاعری میں افسانہ و افسوں کے بجائے حقیقت پسندی، ارضیت اور سماجی معنویت کی شمعیں روشن کیں اور ایسے ان گنت ادیب اور شاعر پیدا کئے جنھوں نے پوری سماجی ذمہ داری کے ساتھ قلم اٹھایا ۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ادبی اہمیت رکھنے والی تحریک کا تاریخی مقام کیا ہے اور اس کی غلطیوں اور کمزوریوں کا تعین کس طرح کیا جائے؟ کیا ترقی پسند تحریک کی غلطی یہ تھی کہ شاعری کے سماجی مقصد پر اس نے اصرار کیا ؟ کیا تخلیق میں شعور کے حصہ کو بنیادی قرار دینا غلط تھا ؟ اس کا جواب نفی میں ہے ۔

شاعری اور سماج کا رابطہ باہمی رابطہ ہے اور بہت قریبی ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کو بنانے اور بگاڑنے میں بڑا کام کرتے ہیں لیکن سماج کی تشکیل میں ادب کا عمل اس طرح کارفرما نہیں ہوتا جس طرح صحافت، اخلاق اور سیاسیات کا ہوتا ہے ۔ عام طور پر شاعری اور سماج کے رابطے پر بحث کرتے ہوئے صرف شاعری اور سیاست کے رشتے کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے لہٰذا اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ سماج پر سیاست کے اثر انداز ہونے کا عمل ادب کی اثر اندازی سے کئی معنوں میں مختلف ہے ۔ سیاست سماج کے خارجی ڈھانچے کو تبدیل کرتی ہے اور اس خارجی ڈھانچے کا اثر داخلی شعور پر پڑتا ہے ۔ شاعری اور فن انسان کے داخلی وجود پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جذبات اور شعور کو تبدیل کر کے بالواسطہ سماجی حالات کو بدلتے ہیں ۔

شاعری دوسرے شعبہ ہائے علم کی طرح محض ہماری معلومات میں اضافہ نہیں کرتی، یہ کام اس علم کا ہے جسے ڈی کوئنسی نے معلوماتی ادب (LETERATURE OF KNOWLEDQE) کہا ہے ۔ فن کا کام یہ نہیں ہے کہ زندگی کی خارجی حقیقتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسے اصول مرتب کرے جو حیاتِ انسانی کا دستور العمل بن سکیں ۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ "مجھے لوگوں کے لئے گیت بنانے دو ۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ ان کے لئے قانون کون بناتا ہے ۔" گیت بنانے والوں کو قانون بنانے والوں سے بھی سروکار رہتا ہے لیکن گیت قانونِ محض نہیں ہو سکتے اور نہ کوئی اس پر اصرار کر سکتا ہے کہ

گیت میں صرف وہی باتیں نظم کی جائیں جو قانون کی دفعات میں موجود ہیں۔

شاعری کا کام قانون بنانے سے کہیں زیادہ گہرا، اہم اور دور رس ہے۔ قانون بیرونی گرفت کے شکنجے تیار کرتے ہیں فن اندرونی ڈسپلن کا ضبط و نظم قائم کرتا ہے جس کے لئے جبر کی ضرورت نہیں ہے۔ قانون —— اور سیاست —— انسانی سماج کو بیرونی دباؤ اور خارجی عوامل سے متاثر کرتے ہیں فن کی اپیل اس جمالیاتی احساس سے ہوتی ہے جو مختلف جذبات، احساسات اور فکر کی مناسب اور موزوں ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ احساسِ جمال کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ حُسنِ تناسب کا احساس ہے اور یہ تناسب کا احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک انسان کے جذبات میں خود ایک خوش آہنگ ترتیب پیدا نہ ہو جائے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک اچھے سماج میں جمالیاتی طور پر تربیت یافتہ انسان عمرانی اور اخلاقی طور پر بھی بہتر انسان ہوگا اور اس تناسب، آہنگ اور توازن کا احساس پیدا کرنے میں چونکہ آرٹ سب سے بڑا محرّک ثابت ہوتا ہے اس لئے آرٹ کو بالواسطہ سماج کا معمار، اخلاق کا معلّم اور سیاست کا بانی کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر آرٹ میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا کام جمالیاتی احساس کی تسکین ہے اور اس کے ذریعے وہ انسانوں میں آہنگ، توازن اور حُسن کا احساس پیدا کرتا ہے جو سماجی انصاف کی آواز بنتا ہے اور بہتر انسانوں کی تشکیل کرتا ہے لیکن اس جمالیاتی تسکین کے بھی منازل اور مدارج ہو سکتے ہیں جو لوگ حُسن کا راز خوش آہنگی اور تناسب کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسین شے میں ایسے مختلف اور متضاد اجزا کا یکجا ہونا ضروری ہے جن کو تراش خراش کر کے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے اور جس قدر یہ اجزا ایک دوسرے سے دور اور مختلف ہوں گے اور تخیّل کو انہیں ملانے میں تھوڑی بہت خوشگوار کاوش کرنا پڑے گی اسی قدر احساسِ حسن زیادہ آسودگی بخش اور پُر کیف ہوگا۔ اسی کو کچھ لوگ استعارے کی بنیاد بتاتے ہیں اور کچھ ابہام کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالبؔ کا یہ شعر لیجئے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

یہاں پہلے مصرعے میں تین مختلف اشیاء کے ساتھ بزم کے لفظ نے ایک وحدت پیدا کر دی ہے۔ کسی حد تک ذہنِ انسانی مختلف اشیاء میں رشتۂ مشترک تلاش کرنے کی کاوش میں خوشگوار مسرت محسوس کرتا ہے اسی بنا پر جدید مصوّری نے واضح اشکال کی تصویر کشی کے بجائے ایسے مختلف نقاط و اجزا کو پیش کرنا شروع کیا ہے جنہیں ملا کر دیکھنے پر ذہن تھوڑی کاوش اور جستجو کے بعد ایک مکمل تصویر کا روپ دے سکے۔

بہر حال اگر شعر میں آہنگ مکمل ہے تو اس میں مختلف اجزاء کا ملاپ ضروری ہے ان میں دو واضح اور بنیادی عناصر خیال اور جمالیاتی اظہار کے ہیں معنی کا اس طرح ظاہر کرنا کہ وہ جمالیاتی دروبست کو مجروح نہ کرے اور بیرونی قانون کے بجائے داخلی جذبہ معلوم ہو —— یہی شاعری کا سب سے بڑا سوال ہے۔ سستی جمالیاتی تسکین وہ ہے جو نچلی سطح پر حاصل ہوتی ہے اور سامنے کی اشیاء اور اجزاء کی ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں نشہ ہوتا ہے بصیرت نہیں ہوتی۔ اعلیٰ تر اور دشوار جمالیاتی آسودگی وہ ہے جو اعلیٰ خیال اور سادہ اظہار کے دشوار امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔

اس منزل میں، ظاہر ہے کہ لاشعور کے بجائے شعور زیادہ تسلّی بخش طور پر رہنمائی کر سکتا ہے اور اچھا اور بڑا شاعر وہی ہے جو خیال کے اس چیلنج کو قبول کرتا ہے۔ سماجی شعور فی نفسہٖ فن کا دشمن نہیں ہے وہ نہ تو جمالیاتی تسکین کے لئے زہر ہے اور نہ لازمی طور پر شاعری کو پروپیگنڈہ، صحافت یا تقریر بناتا ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ شاعری میں بہتر اور اعلیٰ تر جمالیاتی آسودگی کا امکان پیدا کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا برتنا دشوار اور بہت دشوار ہے۔

یہاں سماجی شعور کا لفظ محض سیاسی شعور کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اگر سماجی شعور کو محض سیاسی شعور سمجھا گیا تو وہ شاعری میں عظمت کی جگہ سطحیت اور حد بندی قائم کر دے گا۔ سماجی شعور سے یہاں انسانی زندگی کے بارے میں ایک بسیط نقطۂ نظر مراد ہے۔ لکھنے والا خواہ وقت اور حیات کے

مقصد کے بارے میں لکھ رہا ہو، خواہ حسن و عشق کے سلسلے میں، چاہے اس کا موضوع داخلی ہو یا خارجی، چاہے اس کی نظم کا عنوان مزدوروں کی ہڑتال ہو یا حریمِ ناز کے پردے —— ہر حالت میں ان عنوانات میں زندگی کا وسیع و بسیط نقطۂ نظر جھلکنا چاہیئے۔ اس کے پاس ایک ایسا بنیادی تصوّر ہونا چاہیئے جو اس کی تمام تر شاعری کی شعوری طور پر سمت مقرر کرتا ہو۔

ہر قسم کا فن لازمی طور پر تشکیلِ نو ہے۔ وہ ہر دور میں شاعر کی زبان سے صرف یہ بات دہراتا ہے: ”سنو! میں نے زندگی کو اس طرح دیکھا، برتا اور سمجھا ہے“ اور ہر نیا تجربہ ایک عظیم تہذیبی تجربہ ہے جو انسانوں کو ایک بار پھر اپنی تقدیر کا مختار بناتا ہے اور انہیں خلّاق کے درجے پر فائز کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ اس نے ”سماجی شعور“ کو بڑے محدود معنوں میں استعمال کیا۔ ترقی پسند شاعری میں صحافتی آئینہ برداری تو ہے لیکن فکری اور فلسفیانہ کردار نہیں ہے۔ ایسے شعرا نے بھی جو مارکسیت کو عقیدے کے طور پر تسلیم کرتے ہیں اس کے فکری اور فلسفیانہ پہلو کو پسِ پشت ڈال کر محض مارکسیت کے وقتی اور سیاسی پہلو کو پیشِ نظر رکھا۔ مارکسیت محض کسی پارٹی کی سیاسی حکمتِ عملی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسے ہمہ گیر نقطۂ نظر کا نام ہے جس نے حیات و کائنات کے بارے میں واضح خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اکثر اس کی ہمہ گیری کو نظرانداز کر کے اسے یا تو عقیدۂ محض کی شکل دی یا پھر فوری سیاسی پالیسی کے مترادف سمجھ لیا۔ مارکسی ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ شاعر ایٹم بم، مزدوروں کی ہڑتال یا کوریا پر نظم لکھنا ضروری سمجھے بلکہ یہ ہیں کہ فن کار انسانی زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور ہر عنوان میں اسی میلان کی جھلکیاں دیکھتا ہے۔ مارکسیت کو اسی طرح غلط یا صحیح کہا جا سکتا ہے جس طرح تصوف کو، لیکن دونوں کے مربوط اور ہمہ گیر نقطۂ نظر ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ شاعری کے لئے جامد اور حتمی اصول بنانا دشوار ہے۔ جس طرح اخلاقی تعلیم شاعری نہیں کہلاتی، جس طرح مذہب سماجی زندگی میں بہت کچھ اہم ہوتے ہوئے بھی ادب نہیں بن جاتا مگر اخلاقی نظمیں اور مذہبی نگارشات کے بہت سے نمونے عمدہ اور عظیم ادب کے دائرے میں شامل ہیں اسی طرح سیاست شاعری کی اصل نہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی شاعری کے بہت سے نمونے ادبیات کے دائرے میں شامل ہیں۔

یہی نہیں ایسی سیاسی شاعری کا رواج بھی ہمارے ادب میں رہا ہے جسے عظیم تو نہیں کہہ سکتے لیکن ادبیات کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتے۔ میری مراد شبلی اور ظفر علی خاں کی ہنگامی نظموں سے ہے۔ گو ان نظموں کا درجۂ اوّل کی تخلیقات میں شمار نہیں ہو سکتا لیکن جس طرح شاعری کی اقسام میں اخلاقی شاعری اور مذہبی شاعری شامل ہیں اسی طرح سیاسی شاعری بھی شامل ہے۔ ایک لمحہ زندہ رہنے والے ادب کی بھی ہمارے ادب میں گنجائش ہے لیکن یہ بات اس ایک لمحے میں بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ان تمام اقسام و مدارج کے باوجود شاعری اور ادب کی صرف دو ہی قسمیں ممکن ہیں اچھا ادب اور بُرا ادب، اور جو تخلیق اچھے ادب کے دائرے میں نہیں آتی جمالیاتی آسودگی نہیں بخشتی، تعمیم اور انسانیت کی بنیادی قدروں سے رشتہ استوار نہیں رکھتی وہ چاہے کتنی ہی صحت مند اخلاقی، مذہبی یا سیاسی تعلیم کیوں نہ دیتی ہو ادب کے دائرے میں جگہ نہیں پا سکتی۔

اس بات کا ثبوت ہمارے دور کی سیاسی شاعری سے مل جائے گا۔ اس قسم کی شاعری کو خواہ صحافتی اور ہنگامی کہا جائے یا سیاسی اور انقلابی اس میں شک نہیں کہ اس کی روایات ہماری ادبیات میں پہلے سے موجود تھیں۔ شبلی اور ظفر علی خاں کے نام فوراً ہی سامنے آ جاتے ہیں ہمارے اپنے دور میں جوشؔ ملیح آبادی اس کے رہنما ہیں۔ اقبالؔ کا نام اس سلسلے میں اس لئے لینا موزوں نہ ہوگا کہ وہ وقتی حادثے میں بھی عظیم قدروں کی آویزش دیکھ لیتے ہیں اور اقبالؔ نے ہنگامی شاعری کو بھی فلسفیانہ شاعری کا روپ دے دیا۔ جوشؔ البتہ وقت کی بات کہتے ہیں۔

جوشؔ کو انقلابی شاعری کے سلسلے میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تصوّرات جنہیں انہوں نے اپنا موضوع بنایا سارے ہندوستان کے لئے مشترک اور عام تھے مثلاً نسلی منافرت، سیاسی غلامی، قومی نفاق کی مخالفت، یہی ان کے عنوانات تھے۔ اس کے علاوہ ان کی قادر الکلامی نے روایتی اندازِ بیان سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور اس طرح ان کی ہنگامی شاعری کو بھی ادبی روپ رنگ مل گیا۔ پھر انہوں نے

اپنی شاعری کو کسی سیاسی پارٹی کے پروگرام سے وابستہ کر دینے کے بجائے عام قومی آہنگ سے متعلق رکھا جوش کی قادر الکلامی کانگریس، لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کی باہمی سیاست گری کو بھی شاعری کا روپ دے سکتی تھی۔ "وقت کی آواز" اس کا ثبوت ہے۔

لیکن جوش کی انقلابی شاعری محض جذباتیت اور جوشِ بیان سے عبارت ہے اور یہ جذباتیت بھی ایسے نبرد آزما شریکِ کار کی نہیں ہے جو میدانِ جنگ میں رجز خواں ہو بلکہ اس تماشائی کی ہے جو دور سے کھڑا ہوا لڑنے والوں کے حوصلے بڑھا رہا ہو مگر خود میدان سے دور حفاظت کے پیشِ نظر فاصلہ قائم رکھے۔

اسی لئے جوش کے دور ہی سے ہماری شاعری میں انقلابی اور رومانوی شاعری کے درمیان ایک امتیازی لکیر کھنچ گئی۔ گویا انقلاب اور عشق و عاشقی شاعری دو الگ الگ شخصیتوں سے متعلق ہوں۔ ایک پر "آتشکدہ" کا عنوان چسپاں کر دیا گیا اور اسے صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال کرنے کے لئے محفوظ کر لیا گیا، اور دوسری عام شخصیت کا عنوان خیام کے کسی شعر کو بنایا گیا جس میں سیاسی یا سماجی شعور سرے سے مفقود ہے۔

مجاز کے کلام میں بھی یہ تقسیم موجود ہے لیکن اس کے باوجود مجاز انقلابی نظموں میں بھی اپنے رومانوی بانکپن اور مٹھاس کو راہ دیتے ہیں۔ مجاز کی بہت کم نظمیں سیاسی اور انقلابی کہی جا سکتی ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان میں سے اکثر کو ان کی بہترین نظمیں نہیں کہا جا سکتا۔ "آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں" "آہنگِ نو" "مہمان" "سرمایہ داری" "جاگ اری او دھرتی جاگ" اور "پاکستان کا قومی ترانہ" ان کے مزاج کی بہترین نمائندہ نہیں ہیں۔ ان کا مقابلہ "آج بھی" "رات اور ریل" "کیا ہوا" اور "طلوعِ اشتراکیت" سے نہیں کیا جا سکتا۔

سیاسی شاعری کی روایت کو پروان چڑھانے والوں میں مخدوم اور سردار جعفری کے نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہاں بہت سے اساتذہ کا تذکرہ نظر انداز کرنا پڑے گا جن میں اقبال سہیل، سیماب اکبرآبادی اور احسان دانش سے جمیل مظہری تک کئی اچھے اور خوش گو شاعر شامل ہیں لیکن میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے اکثر یہ قربانی دینا ہوتی ہے۔

مخدوم کے کلام میں ایک ستھری اور سنبھلی ہوئی جذباتیت ہے وہ جوش کی گھن گرج کے قائل نہیں بلکہ سیاسی شاعری میں رومانوی شاعری کی لطافت اور پیار کو اختیار کرتے ہیں اس سے اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ انقلاب کے لئے "رُخِ محبوب" کے استعارے اور قدیم "محفلِ خوباں" کی فضا استعمال کی جاتی ہے جس سے لطفِ بیان میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن نفسِ مضمون سے توجہ ہٹ جاتی ہے اس اعتبار سے ان کی مشہور نظم "انقلاب" جہاں شعری لطافت، آہنگ اور لطفِ بیان کے اعتبار سے بڑی کامیاب ہے وہاں اس میں نفسِ مضمون سے انصاف نہیں کیا جا سکا ہے۔ انقلاب کا تصور اردو شاعری کے محبوب کی طرح تشبیہہ و استعارے میں چھپ گیا ہے۔

جن معنوں میں جوش اور مخدوم نے سیاسی نظمیں لکھی ہیں فیض نے نہیں لکھیں گو سیاسی محرکات پر ان کی کئی نظمیں موجود ہیں لیکن وہ ان محرکات اور تاثرات کو تعمیم کی اس سطح پر لے آئے ہیں جہاں ان کا مقصد وقتی اور سیاسی مفاد حاصل کرنا نہیں ہے جذبہ اور احساس میں زیادہ دیرپا اور اہم تغیر کرنا ہے اس طرح سیاسی بیانات نے ادبی صداقت کا روپ اختیار کر لیا ہے۔

سردار جعفری کی شاعری البتہ سیاسی شاعری ہے۔ ان کی اکثر نظمیں عام طور پر وقتی سیاسی اقدامات کی ترویج و ترغیب کے لئے لکھی گئی ہیں ان کے کلام میں سیاسی کا لفظ محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

سیاست علمِ انسانی کا ایک وسیع شعبہ ہے۔ انسانیت کو کس طرح بہتر سماج کی طرف لیجائیں؛ اس مقصد کو حاصل کرنے کی عملی کوشش اور سماج کی تنظیم اور اس کی مشینری پر مناسب اقتدار حاصل کرنے اور اسے سب کی بہتری کیلئے چلانے کا کام ہی سیاست کہلاتا ہے لیکن یہ سیاست کا وسیع اور بسیط مفہوم ہوا اس کو اور محدود کیجئے تو ہر سیاسی پارٹی ایک مخصوص منزل اور طریقۂ کار کو انسانیت کیلئے بہتر سمجھتی ہے مثلاً کمیونسٹ پارٹی کے نزدیک ملک کی بہتری اسی میں ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہو اور پیداوار اور عمرانی اداروں پر انفرادی قبضے کے بجائے ریاستی یا اجتماعی قبضہ ہو۔ اگر پہلے شعبے کو ہم سیاستِ مدن (POLILCAL SCIENCE) کہتے ہیں تو اس پارٹی کے نظام کو آسانی کے لئے (POLICY) کا نام دے سکتے ہیں اور یہ پالیسی چونکہ مقصدِ بعید ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرنے ہوں گے اس لئے اس مقصدِ بعید کو (STATEGY) کہا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مقصدِ بعید کو حاصل کرنے کے لئے ہر پارٹی کو چند ذرائع اختیار کرنے ہوتے ہیں اور عملی زندگی کے ہر واقعے کے بارے میں ایک رویّہ قائم

کرکے اس سے اپنے مقصد کے لئے فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے مثلاً ہندوستان میں خاتمۂ زمینداری یا مصر میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کا جارحانہ اقدام ایسے ہنگامی واقعات ہیں جن کے بارے میں ایک رویّہ قائم کر کے اس کی ترویج سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور ہر پارٹی اس سے اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کر سکتی ہے۔ اسی قاش کا ایک اور ذریعہ الیکشن ہے جسے ہر پارٹی وقتی طور پر استعمال کر کے مقصدِ بعید یعنی طاقت کے حصول کے لئے راستہ ہموار کرتی ہے۔ یہ گویا سیاست کی تیسری اور سب سے محدود شکل ہے جسے عملی سیاست یا وقتی حکمتِ عملی (TACTICS) کہہ سکتے ہیں۔ عام طور پر ترقی پسند شاعری میں اس تیسرے درجے کی سیاست یا TACTICS کو سیاست کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس فرق کو اگر دو نظموں کی مثال سے واضح کرنا چاہیں تو سیاست کے وسیع تصوّر کے سلسلے میں سیاسی آزادی پر لکھی ہوئی نظموں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے تصوّر کے سلسلے میں جوشؔ کی "شکستِ زنداں کا خواب" یا مجازؔ کی "سرمایہ داری" کو پیش کیا جا سکتا ہے اور تیسرے تصوّر کی نمائندگی سردار جعفری کی ان نظموں سے ہو سکتی ہے جو وقتی TACTICS پر لکھی گئیں مثلاً تلنگانہ، ملاحوں کی بغاوت وغیرہ۔ اسی طرح مجازؔ کی "طلوعِ اشتراکیت" کا موضوع عام سیاسی تصوّر ہے اور "آہنگِ نو" میں مخصوص ہنگامی محرکات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

سردار جعفری اپنی نظموں میں خطابت اور پرچار کو بہت داخل کر لیتے ہیں لیکن درحقیقت خطابت اور تبلیغ خواہ وہ سیاسی ہی کیوں نہ ہوں فی نفسہٖ شعریت کی نقیض نہیں ہیں بشرطیکہ ان میں ادبی نقطۂ نظر، تعمیم اور جمالیاتی اندازِ بیان موجود ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برکؔ کی تقاریر، حضرت عیسیٰ کا وعظِ کوہ اور نطشےؔ کی بقول زردشت کو ادب میں جگہ نہ ملتی لیکن سردار جعفری کی نظمیں وقتی موضوعات کو اعلیٰ تر فکری سطح تک لے جانے میں ناکام رہی ہیں بلکہ انہوں نے فکری بلندیوں کو وقتی موضوعات میں گم کر دیا ہے۔ نظموں سے فوری سیاسی فائدہ حاصل کرنا بنیادی مقصد ہو کر رہ گیا ہے اور جذباتی تطہیر اور تربیت کے اس کام کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے جو آرٹ کا حقیقی مقصد ہے۔

اس بحث کا مقصد یہ ہے کہ سماجی شعور یا مقصدیت فی نفسہٖ شعریت کی مخالف نہیں ہے۔ اگر عصری ترقی پسند شاعری سماجی شعور اور مقصد کو پوری فنی نزاکتوں کے ساتھ سمونے میں ناکام رہی ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہماری نئی نسل یا تو ترقی پسند شاعری کی خدمات سے صریحاً انکار کر دے یا سماجی شعور کو کفر اور خلافِ شاعری قرار دے کر چھوٹی اور سطحی حقیقتوں پر قانع ہو جائے۔ نئے دور کی شاعری کو سماجی شعور سے تائب ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ زیادہ بہتر سماجی شعور کی ضرورت ہے جو چند تیسرے درجے کے سیاسی تقاضوں میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ ہر جزو میں کل کا جلوہ دیکھ سکے کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں ایک مربوط نقطۂ نظر رکھتا ہو اور اس نقطۂ نظر کو پورے فنکارانہ حسن اور نکھار کے ساتھ شاعری میں سمو سکے —— وہ شاعری خواہ آزاد نظم کی صنف میں کی جائے یا غزل کی صنف میں۔

(۴)

صنف خواہ کوئی بھی کیوں نہ استعمال کی جائے یہ ضروری ہے کہ نیا نفسِ مضمون اپنے ساتھ نئے اندازِ بیان کا مطالبہ کرے گا اور "طریقۂ راسخۂ قدما" کے برخلاف ہمارے شاعروں کو ایسے اندازِ بیان کی ضرورت ہو گی جس میں تشبیہ و استعارے کی رنگینیوں اور مرصع کاری کے طلسم پر تکیہ کرنے کے بجائے سادگیٔ ادا اور ندرتِ خیال موجود ہوں اور شاعری خیال کا آئینہ بن جائے خیال کا نقاب نہ بنے۔

یہ اسی وقت ممکن ہے جب تخیل آرائی کی جگہ خیال اور تاثر کی جگہ پر جذبۂ شاعری کا بنیادی عنصر قرار پائے اور ہمارے شاعر روایتی ہیئتوں اور پرانے آزمائے ہوئے ہتھکنڈوں سے کامیابی حاصل کرنے کی جگہ حیاتِ انسانی کے مشاہدے اور مطالعے کی کوشش کریں "سلامتی بکنار" پرانے تصورات قانع رہنے کے بجائے حیات و کائنات کے مسائل پر نئے سرے سے غور کریں اور ذرّات کو حریفوں کے لئے چھوڑ کر خورشید پر بڑھ کے ہاتھ ڈالیں۔

تذکرۂ شعرائے اُردو

وحید قریشی

میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کا زمانۂ تالیف طبع اوّل کے دیباچے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "یہ تذکرہ میر حسن نے اس زمانے میں لکھا جب کہ دلّی کو خیرباد کہہ کر فیض آباد میں سکونت پذیر تھے چنانچہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں: "شروع جوانی از گردش روزگار..... بطرف لکھنؤ و فیض آباد رسیدم" تذکرۂ ہٰذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں "مثنوی رموز العارفین" ہے "گلزار ارم" نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سالِ تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔"

مقدمۂ تذکرۂ شعرائے اردو طبع اوّل

طبع اوّل کی نوبت ۱۹۲۱ء میں آئی تھی۔ طبع ثانی ۱۹۴۰ء میں ہوئی اور متن کا مقابلہ بعض دوسرے قلمی نسخوں سے بھی کیا گیا جن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ قابلِ ذکر ہے۔ طبعِ جدید میں بھی وہی قدیم دیباچہ من و عن شامل ہے۔ البتہ کتاب کے آخر میں ایک ترقیمہ اضافہ کیا گیا ہے جس میں تذکرے کی تالیف کا کچھ اور حال کھلتا ہے:

> "الحمد للہ والمنّۃ کہ این تذکرہ من تالیفِ فقیرِ حقیر، پروردۂ رنج و محن، میر حسن در تاریخ یک ہزار و یکصد و نود و یک ہجری بہ اتمام رسید۔"

خاتمۂ طبع ثانی ص ۲۰۸

ان اقتباسات پر بحث کرتے ہوئے محمود فاروقی صاحب "میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء" میں لکھتے ہیں:

> "یہ تخمینہ (تصنیف مابین ۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ) اپنی جگہ پر درست ہے لیکن اب یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ میر حسن نے اپنا تذکرہ ۱۱۹۱ھ میں ختم کیا تھا۔" (میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء ص ۲۲۸)

رام بابو سکسینہ اپنی کتاب میں تذکرے کے بارے میں رقمطراز ہیں :

THE DATE OF THE COMPOSITION IS NOT MENTIONED BUT AN ENAMATION OF VARIOUS DATES MENTIONED IN THE BODY OF THE "TAZKIRA" POINTS OUT 1194 A.H. (1780 A.D.) AS THE APPROXIMATE DATE OF COMPOSITION, WHEN SANDA WAS SEVENTY YEARS OF AGE.

(A HISTORY OF URDU LITERATURE P. 70.),

مرزا محمد حسن عسکری اس اقتباس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں :

”اس کا سالِ تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر ان تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور یہ وہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سوداؔ کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔“

(تاریخ ادبِ اردو۔ طبع لاہور ص۱۲۵)

مولانا عبدالباری آسی ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۱ھ کے حق میں معلوم ہوتے ہیں:

”اگرچہ سنہ تصنیف کا کہیں تذکرہ میں ذکر نہیں تاہم محققین کا خیال ہے کہ یہ ۱۱۹۱ھ یا ۱۱۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں ۱۱۹۴ھ اور مقدمۂ تذکرہ میں ۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ لکھا ہے۔“

(دیباچۂ مثنویاتِ میر حسن صٹ)

رام بابو سکسینہ کا استدلال سوداؔ کے ترجمے پر مبنی ہے۔ سوداؔ نے ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر بقولِ صاحبِ گلشنِ ہند و صاحبِ آبِ حیات ستر برس تھی۔ تاریخِ ولادت ۱۱۲۵ھ ہوگی تو یہ حال ۱۱۹۴ھ میں لکھا گیا ہوگا کیونکہ تالیفِ تذکرہ کے وقت بقولِ میر حسن ”سن شریفش بہ ہفتاد رسیدہ باشد“ لیکن سکسینہ کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ میر حسن خود اسی اقتباس میں کہتے ہیں: ”الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بہ وسیلۂ شاعری سرفراز است۔“ شجاع الدولہ بہ اتفاقِ مورخین ۱۱۸۸ھ میں فوت ہوئے اس لئے سکسینہ کا قیاس درست نہیں ہے کہ میر حسن نے سوداؔ کا حال ۱۱۹۴ھ میں لکھا۔

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشیؔ نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں تذکرۂ حسن کی تالیف کا زمانہ متعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خود میر حسن نے تکمیلِ تذکرہ کا سنہ ۱۱۹۱ھ قائم کیا ہے :

”اس سے یہ قیاس کرنا بجا ہے کہ کتاب کی تالیف و ترتیب کا کام ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں ختم ہو گیا تھا۔ البتہ بعد میں بھی مصنف نے اضافے کئے ہیں جن میں سے ایک شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں واقع ہوئی تھی۔“

اب اس کے سالِ آغاز کا مسئلہ باقی رہتا ہے۔ کتاب کے مختلف مقامات سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے ”رموز العارفین“ مصنفہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کا ذکر ہے۔ جیسا کہ صدر یار جنگ بہادر نے ارشاد فرمایا ہے۔ اس کے ماسوا احسنؔ اور سوداؔ کے حال میں لکھا ہے کہ یہ دونوں نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں ملازم ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ حالات شجاع الدولہ کی زندگی میں لکھے گئے۔ شجاع الدولہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (آخر جنوری ۱۷۷۵ء) کو فوت ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ حالات اس تاریخ سے پہلے لکھے گئے ہوں گے۔ اسی طرح نواب محمد یار خان بہادر (متوفی ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ) کو ”خدا قائم دارد“ لکھا ہے۔ گویا ان کا حال بھی اس ماہ و سال سے پہلے لکھا ہے۔

اب یہ طے کرنا چاہئے کہ نواب شجاع الدولہ اور نواب محمد یار خان بہادر کے انتقال سے کتنا پہلے کام شروع کیا۔ میرزا مظہر کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں :

"الحال بطرفِ سنبھل مراد آباد استقامت دارد و ہماں جا وعظ می فرماید۔"

میرزا مظہر علیہ الرحمۃ کے ایک خط میں ان کے سفر روہیل کھنڈ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس خط کو شاہ نعیم بہرائچی نے معمولات مظہریہ میں نقل کیا ہے۔ میرزا صاحب اپنے مرید میر علی کو لکھتے ہیں :

"آنچہ از عالم تدبیرِ معاش نوشتہ اند بجا است، اما فقیر را طاقتِ حرکت و دماغ سیر و سیاحت ہرگز نماندہ برائے پرداختِ یارانِ طریقہ کہ از اطراف ہجوم کردہ اند، آمدہ ام۔ بعد دو ماہ بدہلی می روم کہ متعلقان آنجا ہستند، و از ہر طرف فتنہ قصدِ دہلی می کند۔ بایں ہمہ دنیا دارانِ ایں حدود با فقیر معرفتی ندارند، عقیدت معلوم۔ یاد دارند کہ روزِ ملاقات ایں قصہ را با شما گفتہ ام کہ خانساماں و بخشی، یعنی فتح خاں و سردار خان را در تمام عمر خود گاہی ندیدہ ام و دوندے خاں را کہ ارادۂ ملاقاتِ فقیر داشت منع کردم کہ نیاید و حافظ رحمت خان کہ پیشِ فقیر حاضر شدہ بود صحبتِ او با فقیر نادر است افتاد، و پسرانِ علی محمد خاں را ہرگز نمی شناسم۔ ربط کجا و سفارش معلوم۔"

اس خط سے مقامِ کتابت پوری طرح متعین نہیں ہوتا لیکن ایک اور خط بنام میر محمد معین صاحب میں فرمایا ہے :

"امروز کہ دہم شوال ست، بتقریبِ تعزیتِ حضرت خان صاحب یعنی والدِ بزرگوارِ شما کہ جامع ہزاراں مناقب بودند و از انتقال ازیں عالم داغے یادگار گذاشتند کہ بس، در آنولہ حاضرم و بعد توقف سہ شبانہ روز فردا مراجعت بہ سنبھل خواہم نمود۔"

ان دونوں خطوں کے پڑھنے سے ہم اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ (الف) میرزا مظہر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سفر نواب دوندے خاں کی حیات میں واقع ہوا تھا۔ (ب) اس زمانے میں چاروں طرف سے فتنہ و فساد دہلی کا رُخ کر چکا تھا اس لئے میرزا صاحب دو ماہ کے بعد اپنے متعلقین کی خبرگیری اور حفاظت کے خیال سے دہلی واپس جانا چاہتے تھے۔ (ج) اور یہ کہ ۱۰ رشوال تک آنولے میں قیام کر کے گیارھویں تاریخ کو سنبھل کی طرف سفر کرنے کا قصد تھا ——— اخبار الصنادید میں نواب دوندے خان بہادر کی تاریخ وفات ۳ محرم ۱۱۸۵ھ (۱۸ اپریل ۱۷۷۱ء) بتائی گئی ہے۔ لہٰذا میرزا صاحب کا سفر روہیل کھنڈ اس سنہ کے شروع ہونے سے قبل کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ جس فتنے کا میرزا صاحب نے اپنے مکتوب میں حوالہ دیا ہے اس سے مرہٹوں کی دہلی پر چڑھائی مراد ہے۔ انہوں نے ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں بہت بڑے لشکر کی صورت میں دریائے چنبل عبور کر کے دہلی کا رُخ کیا تھا۔ مگر نواب نجیب الدولہ بہادر نے فرخ آباد کی تسخیر کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ آغاز ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں یہ مہم مرہٹوں نے شروع کر کے قلعہ شکوہ آباد روہیلوں سے لینے کے بعد صلح کر لی۔ اسی سال غالباً رجب میں نواب نجیب الدولہ بہادر کا انتقال ہو گیا اور مرہٹے دہلی کی طرف بڑھے۔ چنانچہ سنہ ۱۱۸۵ھ میں ضابطہ خاں دہلی چھوڑ کر چلے گئے اور اس پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ دہلی پر قبضہ کر کے مرہٹوں نے شاہ عالم کو الہ آباد سے بلا کر تخت نشین کیا اور اب ضابطہ خاں پر یورش کر کے سکرتال میں انہیں شکست دی۔ اس سے یہ قیاس کرنا بے جا نہیں کہ ۱۱۸۴ھ میں میرزا صاحب آنولے یا سنبھل میں تھے۔ چونکہ انہوں نے ۱۰ رشوال تک آنولے میں قیام ظاہر کیا ہے اور تقریباً اسی زمانے میں مرہٹوں نے فرخ آباد کی مہم سر کی ہے۔ اس لئے یہ سفر شوال ۱۱۸۴ھ (جنوری ۱۷۷۱ء) میں واقع ہونا چاہئے اور اس زمانے میں ان کا یہ لکھنا درست ہے کہ فتنہ دہلی کا قصد کر رہا ہے۔ لہٰذا میں دو مہینے کے سفر کے بعد دہلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ اب اگر میر حسن نے ان کے حالیہ سفر کا ذکر کیا ہے تو اس حصے کی تالیف شوال ۱۱۸۴ھ یا اس کے قریب قریب ہونی چاہئے۔ اس کی تائید نعیم کے ذکر سے ہوتی ہے۔ میر حسن نے اس کا حال اس انداز سے لکھا ہے کہ ہمیں اس کی زندگی کا یقین ہوتا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی گویاں میں لکھا ہے

سکرتال کی لڑائی کے بعد نعیم کا انتقال ہوا۔ مولوی قدرت اللہ شوق نے "تکملۃ الشعراء" میں بتایا ہے کہ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں رحلت کی ہے چونکہ سکرتال جنگ بھی اسی سال کا واقعہ ہے، اس بنا پر ان دونوں بیانوں میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر حسن نے اس کا حال ۱۱۸۵ھ سے قبل ھا ہے جو بعید نہیں کہ ۱۱۸۴ھ ہی کا واقعہ ہو جب کہ اس نے میرزا مظہر کا حال لکھا تھا۔

مزید تائید میں میر حسن کے اس جملے کو پیش کیا جا سکتا ہے جو مصحفی کے بارے میں لکھا ہے کہ "الحال در شاہجہان آباد بہ پیشۂ تجارت بسری برد" میری رائے ہے کہ میر حسن نے جس زمانے میں یہ فقرہ لکھا ہے، مصحفی دلی سے نکل کر ٹانڈے اور وہاں سے لکھنؤ نہیں گئے تھے۔ اگر لکھنؤ کا سفر اختیار کر چکے تھے تو ممکن تھا کہ مصنف اس کا ذکر نہ کرتا۔ مصحفی نے لکھنؤ کا یہ سفر ۱۱۸۵ھ میں سکرتال کی جنگ کے بعد اختیار کیا تھا۔ اس بنا پر یقین ہے کہ ان کا حال بھی ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں میر شمس الدین فقیر کے متعلق یہ فقرہ قابلِ توجہ ہے:

"درینولا بطرفِ کربلائے معلّی تشریف بردہ بود، ہماں جا بجوارِ رحمتِ ایزدی پیوست۔"

فقیر کا انتقال اس سفر سے واپسی پر ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں ہوا ہے۔ "درینولا" ایسے واقعے سے متعلق استعمال کیا جا سکتا ہے جو حال ہی میں ظہور پذیر ہوا ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ان کا حال بھی ۱۱۸۴ھ کے قریب لکھا ہوگا۔

ان دلائل کے پیشِ نظر میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ میر حسن نے ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں ختم کر دیا تھا۔ بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخِ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔"

(دیباچہ دستور الفصاحت ص۶۴ تا ص۶۹)

عرشی صاحب نے میرزا مظہر جانِ جاناں کے سفرِ روہیل کھنڈ کا سنہ ۱۱۸۴ھ مقرر کیا ہے اور اس کی بنیاد پر میر حسن کے مندرجہ ذیل اقتباس کی تحریر کا زمانہ ۱۱۸۴ھ قرار دیا ہے:

"الحال بطرفِ سنبھل مراد آباد استقامت دارد و ہماں جا وعظ می فرماید"

لیکن کلماتِ طیبات (رقعہ ۲۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مظہر جانِ جاناں کو سنبھل جانے کا کئی سال سے اتفاق ہوتا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اقتباسِ بالا میں میر حسن نے ۱۱۸۶ھ کے سفر کا ذکر کیا ہو۔ اس زمانہ میں مظہر سنبھل میں تھے اور وہاں سے دلی آئے تھے۔ چنانچہ کلماتِ طیبات کے مکتوب بست و ششم (ص۴۲) میں نواب ارشاد خان کی شاہ عالم کے ساتھ واپسی (بعد از شکستِ ضابطہ خاں) کا ذکر موجود ہے نیز اسی میں ارشاد خاں کے ۱۲ ربیع الاول (۱۱۸۶ھ) میں داخلۂ دہلی اور فوری انتقال کا حال بھی لکھا ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں میرزا مظہر کا حال ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ لکھا گیا۔

اسی طرح مصحفی کے حال میں ان کا یہ قیاس کہ ان کا ترجمہ ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ لکھا گیا، بغیر کسی شہادت کے قابلِ قبول نہیں۔ ہم یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ مصحفی کا حال اس کی دہلی میں واپسی کے بعد لکھا گیا ہو۔ نعیم اور شمس الدین فقیر کے بارے میں عرشی صاحب کے بیانات درست ہیں اور اس کا قوی امکان ہے کہ ان دونوں کا ذکر ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ کیا گیا ہو۔ ان شعراء کے ساتھ جرأت کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ جرأت کے حال میں میر حسن لکھتے ہیں:

"مراد علی، جرأت تخلص متوطن مراد آباد طبع رسا دارد، سلامت باشد"

(تذکرۂ شعرائے اردو طبع ثانی ص۴۹)

مصحفی تذکرۂ ہندی میں کہتے ہیں:

"فقیر او را در آوانِ آبادیٔ کٹھیر روزے در آنولہ دیدہ بود۔ ... در ہماں ایام شنیدم بطرفِ کوہ برائے کارے حسبِ ایمائے رئیسے رفتہ بود کہ آفتابِ زندگیش در ہماں کوہ رو بغروب نہاد۔"

(تذکرۂ ہندی ص۷۹)

مصحفی ۱۱۸۵ھ میں آنولہ میں تھے اور وہ خود لکھ رہے ہیں کہ حیرت اسی زمانے میں فوت ہوئے۔ میر حسن نے حیرت کا ذکر بطور زندہ کیا ہے ظاہر ہے کہ ۱۱۸۵ھ سے قبل یہ حال لکھا گیا ہوگا۔

تذکرہ شعرائے اردو کے باقی شعراء میں سے جن کے سنینِ تراجم متعین کئے جا سکتے ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) احسن کے حال میں میر حسن بیان کرتے ہیں:

> "اوائل استفادہ از میر ضیاءؔ حاصل کردہ الحاصل شعر خود را پیشِ میرزا رفیع می گذراند...... بہ وسیلۂ شاعری در سرکارِ نواب شجاع الدولہ سرفراز است۔"
>
> (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۶)

میر ضیاء، اغلب یہ ہے کہ ۱۱۸۱ھ تک (آمدِ میر حسن تک) فیض آباد پہنچ چکے تھے اور ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ عظیم آباد چلے گئے تھے۔ اسپرنگر بحوالہ عاشقی عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ ضیاء نے چالیس سال ہوئے پٹنے میں سکونت اختیار کی۔ (یادگار الشعراء اردو ترجمہ اسپرنگر ص ۱۲۹) عاشقی کا تذکرہ بقول عرشی (دیباچۂ دستور الفصاحت) ۱۲۲۴ھ اور ۱۲۳۳ھ کے درمیان لکھا گیا۔ اگر ضیاءؔ کا حال ۱۲۲۴ھ ہی میں لکھا گیا ہو تو عظیم آباد کی سکونت ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ اختیار کی ہوگی۔ ۱۱۸۵ھ سے قبل ضیاء کے ترکِ سکونت کو اس قیاس سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ مصحفیؔ فیض آباد جا کر سوداؔ سے تو ملتے ہیں (تذکرۂ ہندی ص ۱۲۶) لیکن ضیاء سے کسی ذاتی واقفیت کا کوئی ثبوت نہیں دیتے۔ اگر ضیاءؔ وہاں ہوتے تو ضرور تھا کہ فیض آبادی شعراء کے استاد سے بھی ان کا ملنا ہوتا۔ مصحفیؔ تو اس کے بارے میں اسی قدر لکھتے ہیں: "بندہ او را ندیدہ" (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۲) مذکورہ بالا اقتباس میں شجاع الدولہ کا ذکر بطور زندہ کیا گیا ہے۔ شجاع الدولہ نے ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ احسن کا حال ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۸۶ھ کے مابین لکھا گیا۔

(۲) اجملؔ کے بارے میں حسن رقمطراز ہیں:

> "الحال مسند نشینِ حضرت شاہ خوب اللہ۔"
>
> (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۲)

اجمل اپنے بھائی کی وفات پر جو ۱۱۸۶ھ میں ہوئی مسند نشین ہوئے۔ چنانچہ تذکرۂ مسرّت افزا میں ہے:

> "او در صحبت سراسر برکتِ برادرِ خود قطب العارفین قطب الدین الہ آبادی...... تربیت یافتہ...... بعد تشریف برونِ برادرِ گرامی خود بہ بیت اللہ و انتقالِ وے دراں ارضِ مقدس بر مسندِ مشیخت نشست و زینت بخشِ سجادۂ نیاگانِ خود شد۔"
>
> (مسرت افزا ص ۱۲)

> "(قطب الدین مصیب) در عشرۂ اولیٰ ماہِ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و شش...... متوکلاً علی اللہ از خانہ برآمدہ...... بیت اللہ رسد...... سلخ ذیقعدہ: سنہ یک ہزار و ہشتاد و ہفت ہجری برحمتِ حق پیوست...... شاہ اجمل...... قطعۂ تاریخ وفاتِ وے...... بسلکِ نظم آوردہ......"
>
> (مسرت افزا ص ۱۸۵، ص ۱۸۶)

اس حساب سے یہ حال ۱۱۸۷ھ کے بعد لکھا گیا۔

(۳) میر حسن، افسوسؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "الحال در سرکارِ نواب سالار جنگ بہادر سرفراز است۔"
>
> (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۱)

افسوس سالار جنگ کی سرکار میں ۱۱۸۸ھ یا ۱۱۸۹ھ میں داخل ہوئے۔ خود دیباچہ سحرالبیان میں لکھتے ہیں:

> "سواقم کو اس (میر حسن) سے دوستی ولی تھی۔ کبھی رنجش خفگی باہم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی سرکار میں میں بھی نوکر اور اسی صاحبزادے کا ہم نشین تھا۔ دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے۔۔۔۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سو ننانوے میں صاحبِ عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔"
>
> (دیباچہ سحرالبیان ص ۱۸)

ان کا حال کم و بیش ۱۱۸۸ھ میں داخلِ تذکرہ کیا گیا۔ آخری حد ۱۱۸۹ھ ہے۔ ہم نے اوپر تذکرۂ شعرائے اردو کی تالیف کی آخر تک ۱۱۹۱ھ پیش کی تھی بکہ حسن نے اس کا ترقیمہ لکھا۔ ایک آدھ اضافہ بعد کا ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود صاحب کے پاس تذکرۂ شعرائے اردو کا ایک ایسا قلمی نسخہ موجود ہے جس کے خاتمے میں ۱۱۸۹ھ تاریخ تصنیف لکھی ہے۔ بعض نسخوں میں اس کے بعد کی بھی کچھ باتیں مندرج ہیں۔" (حواشی تذکرۂ شعرائے ابنِ طوفان ص ۲) استفسار معلوم ہوا کہ ان کے نسخے میں افسوس کا حال موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ افسوس کا حال ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۸۹ھ کے مابین لکھا گیا۔

(۴) تذکرۂ شعرائے اردو میں محمد اشرف کے حال میں ہے:

> "بہ داروغگیٔ اخبارِ فرنگیٔ جان برسٹو صاحب سرفراز است"
>
> (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۳)

جان برسٹو مہدی گھاٹ پر آصف الدولہ سے بطور ریذیڈنٹ آکر ملے تھے۔ اسی زمانے میں ریذیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ کو ایک عہدنامے پر دستخط بھی کیے (تاریخ اودھ نجم الغنی جلد سوم ص ۴۹) چونکہ اشرف کا حال قاضی عبدالودود صاحب کے نسخے میں بھی موجود ہے لازماً ۱۱۸۹ھ ہی میں داخلِ تذکرہ کیا گیا۔

(۵) سودا کے بارے میں لکھا ہے:

> "الحال در سرکارِ نواب شجاع الدولہ بہادر بوسیلۂ فن شاعری سرفراز است۔"
>
> (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۸۳)

شجاع الدولہ نے ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ ظاہر ہے یہ حال اس سنہ سے قبل لکھا گیا ہوگا۔

(۶) فغاں کے بارے میں میر حسن کا بیان ہے:

> "فغاں خوش اختلاط بود"
>
> (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۱۵)

فغاں کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ ۱۱۸۶ھ میں فوت ہوئے۔ اس لئے ثابت ہے کہ یہ حال ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا گیا۔

تذکرۂ گلزارِ ابراہیم میں فرحت کی وفات کا سنہ ۱۱۹۱ھ دیا گیا ہے۔

گویا فرحت کا حال ۱۱۹۱ھ سے قبل تحریر ہوا۔

(۷) تذکرۂ شعرائے اردو کے ص ۱۲۰ پر فرحت کو سلمہ اللہ لکھا ہے۔

(۸) شاہ فصیح کا حال قاضی صاحب کے نسخے میں نہیں ہے گویا ۱۱۸۹ھ کے بعد تحریر ہوا۔ شاہ فصیح کے حال کے بعض فقرے جن میں ان کا ذکر

بطور زندہ شخص کے ہوا ہے اور مطبوعہ نسخے کی طبع ثانی میں شامل ہیں ۱۱۸۹ھ اور ۱۱۹۱ھ کے مابین لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن مندرجہ ذیل فقرہ :

"در سالِ یک ہزار و یک صد و نود و دو بہ رحمتِ حق پیوست۔"

۱۱۹۲ھ میں یا اس کے بعد لکھا گیا۔

(۹) میر حسن قائم کے بارے میں کہتے ہیں :

"الحال در سنبھل مراد آباد است۔"

قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ قائم کا قیام سنبھل ۱۱۸۸ھ کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔ یہ حال اسی زمانے میں لکھا گیا ہو تو عجب نہیں۔

(۱۰) گدا آز کے حال میں ہے :

"در لکھنؤ بہ نظر می آید" (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۲)

میر حسن غالباً ۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ گئے۔ یہ حال اسی تاریخ کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

(۱۱) مصیبؔ :

"بعد از مراجعتِ منزلِ مقصود جاں بہ جاں آفریں سپرد۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۵۷)

تذکرۂ مسرت افزا میں تاریخ وفاتِ مصیبؔ ۱۱۸۷ھ "قطبِ زماں وفات یافت"۔ حسن نے یہ حال ۱۱۸۷ھ کے بعد لکھا ہوگا۔

(۱۲) معینؔ :

"مدتے در الہ آباد بہ سر بردہ الحال شنیدہ ام کہ بطرفِ خیر آباد است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۹۵)

معینؔ الہ آباد میں شاہ عالم ثانی کے ملازمین میں تھا۔ شاہ عالم نے ۱۱۸۵ھ میں الہ آباد سے دلی کی طرف کوچ کیا اور یہ محفل برہم ہوئی۔ اس لئے میر حسن نے معینؔ کا حال ۱۱۸۵ھ کے بعد لکھا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مسرت افزا ص ۲۰۳)

(۱۳) مدعا کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں :

"از راہِ قدر شناسی و نکتہ دانی . . . . عنایت خاں غفر اللہ لہٗ سہ صد روپیہ (بہ او)
می داد . . . . . . الحال معلوم نیست کہ کجا است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۶۲)

یہاں عنایت خاں پسر حافظ رحمت خاں کا ذکر بطور مردہ کیا ہے۔ لازماً یہ حال ۱۱۸۷ھ کے بعد لکھا گیا۔

(۱۴) نواب محبت خاں کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں :

"محبت بہ اصلاح خواجہ حسنؔ یا میاں حسرتؔ جرأت نمودہ۔"

(تذکرہ ص ۱۷۴)

نواب محبت خاں ۱۱۸۸ھ میں مہندی گھاٹ پر آصف الدولہ کے پاس آئے — ان کا حال ۱۱۸۸ھ میں یا اس کے بعد داخلِ تذکرہ کیا گیا ورنہ خواجہ حسن اور میاں حسرتؔ کے ذکر کا کیا موقع تھا۔

(۱۵) ولایت کے بارے میں میر حسنؔ لکھتے ہیں :

"قریبِ دوازدہ سال شدہ باشد کہ بہ رحمتِ الٰہی پیوست"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۷۸)

ولایت کی وفات کے بارے میں ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ بعمر ۸۷ برس سنہ ۱۱۷۸ھ میں وفات پائی۔ اس لئے ان کا حال حسن نے بارہ برس بعد یعنی سنہ ۱۱۹۰ھ میں لکھا۔

(۱۶) مصحفی کے بارے میں میر حسن کا کہنا ہے کہ:

"الحال در شاہجہان آباد بہ پیشۂ تجارت بسر می برد"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۶۸)

یہ حال اغلب یہ ہے کہ سنہ ۱۱۸۶ھ کے بعد رقم ہوا جب کہ مصحفی سفر سے واپس دلی جا چکے تھے۔

(۱۷) میر حسن نے اپنا حال سنہ ۱۱۸۸ھ کے بعد لکھا جب کہ رموز العارفین تصنیف کر چکے تھے۔ قاضی صاحب کے نسخے میں یہ حال موجود ہے اس لئے سنہ ۱۱۸ھ اور سنہ ۱۱۸۹ھ کے مابین تحریر ہوا ہوگا۔

ان تراجم سے جن کے سنین ایک حد تک متعین ہو سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے تذکرۂ شعرائے اردو کی تالیف کا کام اغلب یہ ہے کہ سنہ ۱۱۸۷ھ کے قریب شروع کیا۔ زیادہ شعراء کے حالات سنہ ۱۱۸۸ھ کے آس پاس تحریر ہوئے۔ پہلا مسودہ سنہ ۱۱۸۹ھ میں تکمیل پا گیا۔ پھر خاتمہ سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھا گیا بعد ازا ن شاہ فصیح کی تاریخ وفات داخلِ تذکرہ ہوئی۔ اس بات کا قرینہ نہیں کہ اس کے بعد اور اضافے بھی ہوئے ہوں۔

صاحب

یہ کتاب ان اسکیچوں کا مجموعہ ہے جو محمد طفیل مدیرِ نقوش نے وقتاً فوقتاً لکھے۔ ان اسکیچوں میں پورے خلوص اور پوری دیانت کے ساتھ مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تمام اچھی اور بری باتوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، عابد علی عابد اور احسان دانش کے اسکیچ شامل ہیں۔

قیمت -/۳

شعلۂ طور

یہ جگر مراد آبادی کا وہ مقبولِ عام مجموعۂ کلام ہے جسے اردو شاعری میں سب سے زیادہ قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ ہمارے اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسے از سرِ نو مرتب کیا اور کئی کمزور اشعار کو حذف کر کے کئی ایک غیر فانی اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

قیمت ۸/۷

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

قدیم مشاعرے کی ادبی اہمیت

آفتاب احمد

میں نے عنوان میں عمداً مشاعرے کے ساتھ قدیم کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک آج کل کے مشاعروں کی ادبی اہمیت محلِ نظر ہے بلکہ میں سمجھتا ں کہ ہماری موجودہ معاشرتی اور کلچرل فضا میں مشاعرہ ممکن ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ اب مشاعرہ ممکن ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ اب مشاعرہ ایک سستی قسم کے ہنگامۂ ہو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جس میں شعر محض برائے بیت بن کر رہ گیا ہے۔ یہ زوال دراصل اس انقلاب کا نتیجہ ہے جو گزشتہ پون صدی کے دوران میں ہماری ں روایت اور ادبی شعور میں رونما ہو چکا ہے، بیسویں صدی کی دنیا میں شاعر اور اس کے سامعین یا قارئین کے درمیان ذہنی ربط و یگانگت اور افہام و تفہیم کا وہ بے مثل یلہ جو ہمارے ہاں مشاعرہ کی صورت میں رواج پا گیا تھا ناممکن ہو گیا ہے، ایسا کیوں ہوا ہے یہی اس مضمون کا موضوع ہے۔

قدیم مشاعرے کا ایک بزمیہ اور تفریحی پہلو ضرور تھا مجھے اس سے انکار نہیں، یوں دیکھا جائے تو خود ادب و شعر کا تفریحی پہلو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور مشاعرہ تو شعر کی مجلس ہوا۔ اور مجلس کے لوازمات لازماً تفریحی ہیں مگر جس طرح شعر کو محض تفریح کا سامان سمجھ لینا کم نظری ہے۔ اسی طرح مشاعرہ کو محض ایک ہنگامۂ ہو سے تعبیر کرنا بھی اپنی شاعری کی روایت سے بے خبری کی علامت ہے، مجھے مشاعرہ کی تاریخ سے یعنی اس امر سے کہ وہ کسی عہد میں اور کیونکر پیدا ہوا کچھ واقفیت ں ہے اور نہ مجھے اس کے آداب و رسوم کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا حال معلوم ہے اس لئے میں اس مختصر سے مضمون میں ان باتوں کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قاصر ں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ نرالی اختراع خالص ہندی نژاد ہے۔ اور ہندی مزاج نے جہاں اپنی عام زندگی کی رسموں اور تہواروں کو رنگین اور دل کش بنانے میں کوئی کسر ا نہیں رکھی وہاں مشاعرہ کو بھی ایک ادبی جشن کی صورت دے دی تھی، یہ ادبی جشن مقررہ تاریخوں پر جس اہتمام سے منایا جاتا تھا، اس کے آداب و رسوم میں جو رکھ رکھاؤ اور سلیقہ ا جاتا تھا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قدیم معاشرت میں کلچر کو کیا مقام حاصل تھا اور ادب و شعر سے ہمارے تہذیب یافتہ طبقوں کی دل بستگی کا کیا عالم تھا۔ مشاعرہ رسم کا صدیوں تک نباہا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کو اپنے مخصوص کلچر اور اپنی شعری روایت کا کس درجہ احترام تھا اور انہیں ان کے تحفظ اور فروغ سے کس قدر غف تھا، اردو شاعری کے کسی تذکرے میں اگر اردو مشاعروں کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویریں نہیں ملتیں تو وہ اور چاہے جو کچھ بھی ہو صحیح معنوں میں ہماری شاعری تذکرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ قدیم اردو شاعری (اور یہاں میری مراد قدیم غزل گوئی سے ہے کہ ہماری شاعری کا مقبول ترین اور شاید بلند ترین حصہ اس

صنف سخن میں ملتا ہے) کی ماہیت۔ اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم مشاعرہ کو ایک ادبی ادارہ کی حیثیت سے اس زمانے کی مخصوص کلچرل فضا کی پیداوار سمجھتے ہوئے پیش نظر رکھیں۔ آزاد کی 'آب حیات' بطور تاریخ ناقص سہی اس کی تنقید ہمارے نقطۂ نظر سے سطحی اور خام سہی مگر آج نصف صدی کے گزر جانے کے بعد بھی اور نصف درجن سے زائد تذکرے لکھے جانے کے بعد بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آزاد نے جو سحر آب حیات میں کر دکھایا ہے تاریخ ادب میں اس کا جواب ذرا مشکل سے ملے گا 'آب حیات' خالص علمی نقطۂ نظر سے تاریخ تو نہ سہی اس کی اصل خوبی اس میں ہے کہ وہ اردو شاعری کا نگار خانہ ہے 'آزاد محقق نہیں، نقاد نہیں، اردو نثر کا سب سے بڑا نقّاش ہے' اور آب حیات میں اس کے موقلم نے وہ جادو جگایا ہے کہ باید و شاید'

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا قدیم مشاعرہ کی ادبی اہمیّت کا، اور میں یہ کہنے والا تھا کہ اس پر ایک کلچرل ادارے کی حیثیت سے غور ہونا چاہئے، اور ساتھ ہی ساتھ اس مخصوص کلچرل فضا پر بھی جس نے مشاعرہ کو نہ صرف ممکن بنایا بلکہ اسے ایک پوری شعری روایت کے امانت دار ہونے کا رتبہ بخش دیا، مشاعرہ ہماری ایک اہم ادبی ضرورت کو پورا کرتا رہا ہے جو ہمارے ہاں اس افسانے کی کلچرل فضا سے مخصوص تھی، جب وہ رت بدلی تو مشاعرہ بے رنگ ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس کی ادبی اہمیت کم سے کم تر ہوتی گئی۔ ——

بات یہ ہے کہ مشاعرے کی بدولت ہمارے شاعروں اور ان کے سامعین کو ایک ایسی چیز میسّر آ گئی تھی جس کی مثال دنیا بھر کے ادب میں بہت کم ملتی ہے۔ اور وہ یہ تھی کہ ان کے درمیان ایک زندہ رشتۂ افہام و تفہیم قائم تھا، شاعر اور اس کے سننے والوں کے درمیان کوئی پردے حائل نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے اسی قدر قریب تھے کہ شاعر کو بلاواسطہ ان سے اپنی بات کہنے کا موقعہ ملتا تھا۔ شاعر کو خوب معلوم تھا کہ اس کے سننے والے اس سے کیا چاہتے ہیں اور سننے والے یہ جانتے تھے کہ شاعر سے کن باتوں کی توقّع رکھی جا سکتی ہے۔ شاعر اور اس کے سامعین کا رابطہ باہمی بڑی قابل قدر چیز ہے۔ جدید شعر و ادب کے بہت سے پیچیدہ مسائل صرف اس لئے پیدا ہو گئے ہیں کہ شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان ایسی بے پایاں خلیج حائل ہو گئی ہے جس کا پاٹنا دونوں میں سے کسی کے بس کی بات نہیں، شاعر شعر تو یقیناً اپنے داخلی تجربے کی شدّت اور دباؤ سے مجبور ہو کر کہتا ہے مگر اسے کوئی نہ کوئی اور کسی نہ کسی صورت میں ایسی جماعت تو ضرور چاہئے جو اس کی واردات قلبی کا حال سُن سکے، مختصر یہ کہ شاعر سامعین کا طلبگار ہے اور جب اسے سامعین اس قسم کے ملیں جن سے وہ بلاواسطہ مخاطب ہو سکتا ہو اور جن سے زیادہ سے زیادہ ذہنی قربت حاصل کرنے کا امکان موجود ہو تو شاعر کے لئے ایک بڑی تشفی بخش صورت حال پیدا ہو جاتی ہے، اس کے ہاتھ میں ایک ایسا واضح اور معیّن معیار آ جاتا ہے جس سے وہ بہ آسانی اپنے آپ کا اندازہ کر سکتا ہے، شاعر جتنا اپنے سامعین سے دور ہو گا اسی قدر خود شناسی کے اس معیار سے محروم رہے گا شاعر اور اس کے سامعین کے باہمی رابطہ اور ذہنی قربت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ادبی اقدار بڑی واضح شکل میں پیش نظر رہتی ہیں اور ان میں ایک خوشگوار توازن اور ہم آہنگی خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہے —— اگر آپ کو اس بنیادی اصول سے اختلاف ہو تو پھر آپ کے لئے مشاعرہ کی ادبی اہمیت کا قائل ہونا ناممکن ہے، لیکن اگر اس بنیادی اصول کو مان لیا جائے تو پھر اس میں کوئی شک کی بات نہیں رہتی کہ مشاعرہ نے شاعر اور اس کے سامعین کو قریب لا کر ایک عظیم الشان ادبی خدمت انجام دی ہے'۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر حال میں شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان ذہنی ربط و یگانگت کی یہ صورت قائم رہنا ممکن بھی ہے' بات یہ ہے۔ کہ یہ صورت ممکن اسی وقت ہے جب کوئی معاشرت ایک پختہ واضح اور معیّن کلچر کے نظام اقدار کو اپنا چکی ہو، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ جب معیار باقاعدہ طور پر قائم ہو چکے ہوں اور ایک پوری جماعت کو ان پر اعتماد اور یقین ہو، جب افراد جماعت کے نظام اقدار کو تسلیم کرتے ہوں۔ ان کا احترام کرتے ہوں اور اُن سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتے ہوں، جس کلچر میں فرد اور جماعت کے مابین یہ یگانگت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہو صرف وہیں ممکن ہے کہ شاعر اور اس کے سامعین میں حائل پردے اُٹھ جائیں، اور ان میں اُس ذہنی قربت کا رشتہ قائم رہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اور جسے ہمارے ہاں مشاعرہ نے فروغ دیا تھا'

ہماری قدیم شاعری اس قسم کے کلچر کے درمیان پھولی پھلی تھی، ادبی اقدار اور شعر و سخن کو پرکھنے کے معیار واضح اور معیّن تھے سخن گو اور سخن فہم دونوں ان پر ایمان رکھتے تھے، شاعری کے موضوعات بھی کم و بیش مقرر تھے، تجربات و محسوسات جو شعر کی محفل میں بار پاتے تھے شاعر اور سامعین کے درمیان تقریباً طے شدہ

تھے، دونوں ان کی شعری صلاحیت کو تسلیم کرتے تھے ——— غزل کے مضامین مقرر تھے، ان سے گزر کر اسلوب کی مختلف صفتیں، تشبیہیں اور استعارے، تلمیحیں اور ترکیبیں سب اپنی ڈھلی ڈھلائی سکہ بند صورت میں موجود تھیں، مختصر یہ کہ ادبی روایت نے اپنے آپ کو بڑی معین اور منظم صورت میں قائم کر لیا تھا۔ شاعر اور سامعین دونوں اس روایت کے پابند تھے۔ شاعر کے لئے اس سے انحراف کا مطلب یہ تھا کہ اسے شاعر ہی تسلیم نہ کیا جاتا تھا، نظیر اکبرآبادی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اس روایت کی تعمیر و تشکیل میں ایک نہایت اہم حصہ ہمارے قدیم طرز تعلیم کا بھی تھا، ہمارا کلچر اپنی مخصوص سماجی اور معاشرتی ماحول کے زیر اثر ایک محدود نوعیت رکھتا تھا ان معنوں میں کہ وہ صرف سماج کے اونچے طبقے کی زندگی سے متعلق تھا، اس اونچے طبقے یعنی شرفا کی تعلیم صدیوں کے طے شدہ اور مقررہ نصاب اور انداز سے ہوتی تھی۔ اس تعلیم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں Humanities یعنی اُن علوم و فنون کا کہ جو بلاواسطہ انسان کی ذات سے متعلق ہیں عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ اس مقررہ نصاب تعلیم کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں شرفا کے طبقہ کی ذہنی پرورش اور تربیت ایک مخصوص ڈھب پر ہوتی تھی۔ ادب و شعر کے معاملے میں چند تصورات اور اصول جنہیں قدما کی نگارشات سے اخذ کیا گیا تھا، معیاری اور مسلّمہ حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ چنانچہ ادب و شعر کے نمونوں کو انہی کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جاتا تھا، شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان ادبی مسلّمات کے ضمن میں کوئی بنیادی اختلاف ممکن ہی نہیں تھا اختلاف گر ہو سکتا تھا تو محض جزئیات میں، شاعر اور سامعین دونوں کے لئے قدما کا کلام سند تھا اور دونوں بوقت ضرورت اسی سے رجوع کرتے تھے، مختصر یہ کہ شاعر یک ایسی کلچر یافتہ جماعت کے سامنے اپنا کلام پیش کرتا تھا جو ذہنی تربیت اور ذوق کے اعتبار سے اس کے لئے اجنبی نہیں تھی، شاعر کے لئے اس شکایت ی گنجائش نہیں تھی کہ اس کے سامعین اس کے کلام کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر ہیں بلکہ اسے اُن کی سخن فہمی کی صلاحیتوں پر کامل یقین اور اعتماد تھا، وہ ن کی رائے کی قدر کرتا تھا۔ چنانچہ مشاعرہ محض شعر سننے سنانے اور واہ وا کرنے کی مجلس نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ذوق کی تربیت اور شعر گوئی اور شعر فہمی کے فن کی حصیل کے لئے ایک درس گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اسی میں مشاعرہ کی سب سے بڑی ادبی اہمیت مضمر ہے، بر سر مشاعرہ جو داد دی جاتی تھی ہمیشہ بے معنی اور ے ہنگم چیز نہیں ہوتی تھی، اس کی تہہ میں نسلاً بعد نسلاً کا پلا ہوا ادبی شعور بول رہا ہوتا تھا، جو شاعر اور اس کے سامعین دونوں میں مشترک تھا۔ یہ شعور ہمارے ہاں کے ہذب اور کلچر یافتہ طبقے کے ذہن میں اس طرح رس بس گیا تھا اور اتنی رچی ہوئی صورت میں ملتا تھا کہ اس کے متعلق باقاعدہ طور پر سوچنے کی ضرورت ہی محسوس ہیں کی گئی ——— اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ مشاعرہ نے ہمارے ہاں ایک تو شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان زیادہ سے زیادہ ذہنی قربت ے رشتے کو برقرار رکھا اور دوسرے وہ ہمارے ادبی ذوق اور شعور کی تربیت کی درس گاہ بھی بنا رہا۔

جب تک ہماری معاشرت، خصوصیت سے ہمارے کلچر اور ادب کے نظام اقدار میں وہ توازن اور ضبط موجود رہا جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، ہمارے ں مشاعرے کو ایک ادبی اہمیت حاصل رہی اور وہ شعری روایت کا حقیقی امانت دار بنا رہا، غالب کے زمانے سے یہ صورت حال ذرا بدلنی شروع ہوئی۔ غالب ر شاعری کی روایت میں پہلا شاعر ہے جس نے تجربات و محسوسات کے اعتبار سے عام روش سے ہٹ کر شاعری کی اور اپنی دلچسپ شخصیت کے گوناگوں لوؤں کے بے پایاں احساس کی بدولت اُردو غزل کو ایک بالکل نئی راہ پر لا ڈالا غالب اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے خلاف ایک نہایت واضح روحانی اوت کا پہلا علمبردار ہے اور اپنی اسی خصوصیت کی بدولت وہ اپنے وقت کے مشاعروں میں کچھ بہت زیادہ مقبول نہ ہو پایا یعنی ان معنوں میں جن میں ذوق اور من مقبول تھے ——— غالب کے بعد سے مشاعرہ کا رنگ بتدریج بگڑتا گیا۔ اس لئے کہ غالب کے بعد سے ہمارے کلچر کے نظام میں وہ ضبط و آہنگ قرار نہ رہا۔ ادبی اقدار کے توازن کی بنیادیں ہل گئیں۔ پوری معاشرتی زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ کی جو کیفیت صدیوں سے چلی آتی تھی خواب و خیال ہو گئی۔ نئی تعلیم ے ذریعے ایک نئے کلچر اور ایک نئے ادب سے شناسائی ہوئی تو نئے خیالات ذہنوں میں اضطراب پیدا کرنے لگے اور پرانے مسلّمات پر سے یقین اُٹھنے گا، ذہنی تربیت اور ذوق کے اعتبار سے جماعت اور افراد میں جو اشتراک اور ربط باہمی فروغ پا گیا تھا وہ رفتہ رفتہ مٹنے لگا۔ انفرادیت کا زور بڑھا۔ افراد ے اجتماعی سانچوں کی ساکھ ٹوٹ گئی، بے یقینی، تشکک، انتشار۔ نئی ذہنی زندگی، پرانی ڈگر سے ہٹ کے نئی راہوں میں سرگرداں نظر آنے لگی، کلچر خصوصیت سے بی اقدار کی دنیا میں رفتہ رفتہ اس تلاش و جستجو نے ہر چیز کی معیاری حیثیت پر کاری ضرب لگائی، کوئی کسوٹی، کوئی سند، کوئی مفروضہ ایسا نہ رہا جس کی مسلّمہ حیثیت

برقرار رہی ہو۔ نئی تعلیم اور معاشرتی انقلاب کا ایک اثر یہ ہوا کہ کلچر سماج کے اونچے طبقے سے نکل کر متوسط طبقہ کی تحویل میں آگیا۔ پُرانی مہذب اور کلچر یافتہ جماعت کی ”ذہنیت“ جاتی رہی، یہ انتشاری کیفیت ہمارے گزشتہ پون صدی کے ادبی شعور کی سب سے نمایاں خصوصیت رہی ہے، یہ کسی منزل کسی مقام پر نہیں رُکی، اس کا تسلسل آج بھی جاری ہے بلکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ اپنی انتہائی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے، یہ کیفیت صرف ہمارے ادبی شعور سے مخصوص نہیں، دنیا بھر میں اسی کا دور دورہ ہے، ایک لحاظ سے تو یہ بہت بڑی بات ہے کہ ہمارے ادبی شعور میں دنیا بھر کے ادبی شعور کے عناصر خصوصی کا پرتو نظر آتا ہے وہ اپنے وقت اور اپنے زمانے میں ہم آہنگ ہے، یہ بھی ہے کہ اس انتشار میں زندگی اور ایک نہ ختم ہونے والی تب و تاب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آپ اسے جو چاہیں سمجھیں مجھے فقط یہ یاد دلانا ہے کہ اس صورتِ حال کے پیش نظر پرانے ادبی اداروں کی ادبی اہمیت باقی رہنا ممکن ہی نہیں، شاعر اور اس کے سامعین ذہنی تربیت اور ذوق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر دور جا چکے ہیں کہ ان میں اس قسم کی ذہنی قربت کا رشتہ قائم رکھنا محال ہے۔ جو مشاعرے کا امتیازی وصف تھا، اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے تقریباً اجنبی ہیں، سامعین کا ذوق عموماً غیر تربیت یافتہ ہے۔ یا اگر اس کی تربیت ہوئی بھی ہے تو وہ شاعر کے ذوق سے ہم آہنگ نہیں، شاعر اپنے سامعین کی رنگا رنگ ذہنی دلچسپیوں سے آگاہ نہیں اور سامعین شاعر کی انتہائی شخصی واردات میں دلچسپی لینے سے قاصر ہیں، نئی شاعری مشاعرے کی چیز نہیں۔ کیوں کہ اس میں شاعر سے ذہنی قربت حاصل کرنے کے لئے کوشش اور کاوش کرنی پڑتی ہے، یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری نئی قسم کی ادبی انجمنوں کی چیز بن کر رہ گئی جہاں نظم کی کاپیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ ہر شخص ان پر اپنی اپنی جگہ غور کرتا ہے پھر اس کے بعد بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ نظم کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر شاعر کو سامعین کے ردّ عمل کی رسید ملتی ہے۔ بدلے ہوئے ادبی ماحول کے مطابق اس قسم کی نئی انجمنیں قدیم مشاعرے کے بدل کے طور پر پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن عام پسند چیز اب بھی غزل ہی ہے۔ جس میں بہت سے روایتی عناصر موجود ہیں اور سامعین میں شعری ذوق کے انحطاط کے باوجود اس کے چاہنے والے اور اس کو سمجھنے والے اب بھی مل جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ نظم آزاد کے شاعر بھی مشاعروں میں پڑھنے کے لئے غزل کے میدان ہی میں قسمت آزماتے ہیں۔

اُردو غزل گوئی

اردو تنقید میں غزل پر اپنی کام کی کتاب اور نہ ملے گی۔ اس لئے کہ اس کا مصنف فراق گورکھپوری غزل کا بہت بڑا شاعر ہے۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ مغربی تنقید اور مشرقی تنقید کا جتنا رچا ہوا مذاق فراق کا ہے اتنا اردو کے نہ کسی شاعر کو نصیب ہوا اور نہ کسی نقاد کو۔

قیمت ۲/-

اندازے

مصنفہ فراق گورکھپوری۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ اندازے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے پچھلے بیس برسوں میں اردو کے تنقیدی سرمائے میں اس سے بہتر کتاب پیش نہیں کی جا سکی۔ اب اس مجموعہ کو بڑی اہم تبدیلیوں اور کئی نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت ۵/-

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

حیات ڈپٹی نذیر احمد

یٰسین علی خاں

مولوی نذیر احمد صاحب پر خود ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے فوراً بعد اور اس وقت سے آج تک مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا جا کا ہے، لکھا جا رہا ہے اور جب تک اردو ادیب زندہ رہیں گے نہ صرف اردو زبان میں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان سے متعلق بہت کچھ لکھا جاتا ہے گا اور ان کی تصنیفات میں سے اکثر و بیشتر شیکسپیئر کے ڈراموں کی طرح ہمیشہ پڑھی اور پڑھائی جاتی رہیں گی۔ قرآن مجید کا اردو ترجمہ تو ایک ایسی گار ہے جو دنیا کے قیام تک مٹ نہیں سکتی۔ مولانا عربی اور اردو کے بے مثل ادیب تھے اور بقول حالی مرحوم "خصوصاً قرآن مجید کی خدمت کے ظ سے جو امتیاز انہوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اس وقت کر سکیں گے جب ان کی وفات پر ندبہ زمانہ گزر جائے گا اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حب و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔" چنانچہ جیسا جیسا زمانہ گزرتا جاتا ہے اور جتنے جتنے جم قرآن مجید کے ہوتے جاتے ہیں، حالی کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچتا جاتا ہے۔ مولانا نذیر احمد کی چند یا سب تصنیفات پر بہ نظر تنقید یا توصیف کچھ لکھنا جیسے بے بضاعت اور کم علم انسان کے بس کی بات نہیں ہے جس کو عربی اور فارسی کی شد بد کے علاوہ اردو بھی اچھی طرح نہ آتی ہو۔ اس لئے یہاں صرف یہ کوشش کروں گا کہ مولانا کی مبارک زندگی کے نمایاں خد و خال مختصراً کچھ اپنی کچھ ان کے معاصرین اور زیادہ تر خود مولانا کی زبانی بیان کر دیئے یں تاکہ اس مختصر مضمون کے پڑھنے والوں کو مولانا کی زندگی کے گرد و پیش کے اہم واقعات و حالات کا ایک گونہ اندازہ ہو سکے جس کے بغیر کسی بڑے ی کی بڑائی کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

ادت :

مصنف "حیات النذیر" کی تخمینہ کے مطابق مولانا ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے لیکن ڈپٹی کلکٹری کے لئے جو تاریخ ولادت مولانا نے سرکاری یں درج کرائی وہ ۲۱ ستمبر ۱۸۳۳ء تھی۔ مولانا ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور جیسے غیر معروف قریے میں پیدا ہوئے لیکن وہ یہاں بہت کم ے کیونکہ ان کے والد مولوی سعادت علی صاحب، خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے اپنی جائداد سے (جو چند بیگھہ اراضی پر مشتمل تھی) دست بردار ہو کر بجنور چلے ے اور اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے تھے۔ اس وقت مولانا کی عمر کوئی چار برس کی ہوگی۔ مولانا فرماتے ہیں "بجنور میرا ہوم (وطن) نہیں، وطن اقامت نہیں بلکہ

وطن اصلی ہے۔“

اس کے بعد تقریباً ۱۲ برس کی عمر سے مولانا دہلی میں رہنے لگے اس لئے دہلی کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: ”میں جس بات کو دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ دلّی کو دوسرے بلادِ ہند پر ایک فضیلت ہے۔ یہ امام ہے دوسرے شہر مقتدی۔ یہ مجتہد ہے اور دوسرے شہر مقلد، یہ اصل ہے اور دوسرے شہر نقل۔ . . . . میں اس بات کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں پنجاب کا رہنا والا نہیں ہوں۔ اگرچہ دہلی (ہائے دہلی)، جو سینکڑوں برس تمام ہند کا دارالسلطنت اور حاجاتِ خلائق کا مرجع، لیاقت اور کمالات کا مرکز، حکومت و دولت کا منبع رہی اب مضافات لاہور میں سے ہے۔ مگر دہلی والے تو اپنے تئیں کیوں پنجابی سمجھنے لگے۔ پنجابی بھی ان کو پنجابی نہیں سمجھتے، اور وہ پنجابی ہیں بھی نہیں۔ جغرافیے کی رُو سے دہلی اور پنجاب کے مواقع مختلف، دونوں کے باشندوں کی زبان مختلف، وضع مختلف۔ خیر تو غرض یہ ہے کہ میں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں اور اس بات کو اس غرض سے ظاہر نہیں کرتا کہ خدانخواستہ میں پنجاب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ نہیں بلکہ ہر شخص کو اپنا وطن عزیز ہے، مجھ کو بھی وطن کے ساتھ انس ہے اور ہونا چاہئے حب الوطن من الایمان۔“

گویا مولانا دہلی کو اپنا وطن تصوّر کرتے ہیں اور ہونا بھی چاہئے کہ ۱۲ برس کی عمر سے وہیں کے ہو رہے

خاندان:

مولانا اپنے خاندان کے متعلق لکھتے ہیں: ”مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اباً عن جدٍ موروثی مسلمان ہوں۔ اپنے نسب نامہ میں انقراض سلطنت دہلی تک بلافصل مشائخ، مفتی اور علماء کے نام پاتا ہوں۔“ مولانا شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے نامور خلیفہ شاہ عبدالغفور اعظم پوری کے خاندان سے تھے جن کے متعلق شاہ عبدالحق صاحبؒ محدث دہلوی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: ”بسا صاحب کرامات و مقامات بودہ اند۔ روزے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم را در خواب دیدہ و آں جنابؐ ایشاں را درودے تعلیم فرمود۔“

بچپن اور تعلیم:

مولانا بچپن میں نہایت چلبلے تھے۔ کبھی ایک نشست میں حجامت نہیں بنوائی، آدھی بنوائی اور بھاگے۔ دوبارہ سہ بارہ گرفتار ہو کر آتے تو وہ آدھی پوری ہوتی۔ ابتداء میں ان کے والد بزرگوار نے مولانا کو بھی قرآن بغیر معنوں کے پڑھایا۔ پھر پرانی وضع کے مکتب میں داخل کر دئیے گئے۔ مکتب میں انہوں نے کیا پڑھا ہوگا خود ان کے الفاظ میں سُن لیجئے: ”مسلمانوں نے یا تو کچھ نہ پڑھا ہوگا یا پڑھا ہوگا تو وہی مذہبی مکتب میں، اور مقدور ہو تو گھر پر پڑھانے کھوسٹ میاں جی سے محمود نامہ، کریما، مامقیماں یا دستور الصبیان، اور وہ بھی اس خاص لَے سے جس کی نقل اسی کانفرنس کے تھیٹر میں آنریبل محمود نے کی تھی۔ ابتدائی تعلیم تو میری بھی اسی طرز پر ہوئی تھی مگر تعجب ہے کہ وہ لَے سید محمود کو ایسی یاد ہے کہ نقل کو سُن کر اصل کا سماں آنکھوں میں پھر گیا تھا اور مجھ کو ایسی بھول گئی کہ نقل کا قصد کرتا ہوں تو ان سُروں میں ادا نہیں ہوتی۔“ مکتب میں زیادہ دن نہیں گذرنے پائے تھے کہ وہاں سے اٹھا لئے گئے اور پدر بزرگوار نے فارسی کی متداول کتابیں مثلاً مینا بازار، پنج رقعہ، سہ نثر ظہوری وغیرہ خود پڑھائیں اور عربی بھی شروع کرا دی گئی۔ اس طرح ۹ برس تک اپنے والد سے تعلیم پاتے رہے اور تربیت کے سبق سیکھے۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ خان صاحب ڈپٹی کلکٹر نے جو ان کے والد کے خاندانی دوست تھے۔ نذیر احمد صاحب اور ان کے بھائی علی احمد صاحب کو اپنے حلقۂ درس میں لے لیا اور اپنے پاس ہی رکھ بھی لیا۔ ان دونوں بھائیوں کی طبعی شوخی اور ذہانت کی وجہ سے ڈپٹی صاحب بہت خوش ہو کر گھر پر پڑھاتے اور سرکاری دورہ میں بھی ساتھ لے جانے لگے۔ اس طرح مولانا نے پانچ برس کے عرصہ میں نحو عربی شرح ملّا تک اور منطق میں تہذیب قطبی اور فلسفہ کی چند درسی کتابیں بھی پڑھیں۔ بعد ازاں نصر اللہ خاں صاحب کے کہنے سے یہ دونوں لڑکے دہلی بھیج دئیے گئے۔ مولانا کے والد نے اب ان دونوں کو دلّی کے مولوی عبدالخالق صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ مولوی عبدالخالق صاحب ایک پنجابی بزرگ تھے جو آخر عمر میں حلقۂ درس و تدریس کو خدا حافظ کہہ کر مسجد نشین ہو گئے تھے۔ مولوی عبدالخالق صاحب نے مولانا کو پنجابی کٹرے کی مسجد میں مقیم کر دیا۔ دلّی کے

اس محلہ میں زیادہ تر پنجابی سوداگر آباد تھے۔ اس مسجد کا نام اورنگ آبادی مسجد بھی مشہور تھا جس میں بہت سے طالب علم اطراف سے آکر جمع ہوتے تھے۔ ان ہی میں سے بعض ائمۃ المسجد بن جاتے اور بعض میاں جی گری اختیار کر لیتے۔ یہ پیشے دفع الوقتی اور متعطلانہ زندگی کی حد تک محدود ہوتے پنجابی کٹڑے کی مسجد میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس محلے کے ہر ایک گھر سے روٹی کے ٹکڑے مانگ لاتا اور پیٹ بھرا کرتا۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں: "اکثر طالب علم باری باری دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے اور آپس میں بانٹ کھاتے، اور ان ہی میں ایک میں بھی تھا۔" ایک اور جگہ فخراً بیان کرتے ہیں: "یہ لوگ مسجدوں میں رہتے اور صدقات پر گزران کرتے، کسی کو عار کا موجب ہو تو ہو مگر میں اس کو فخراً بیان کرتا ہوں کہ میری طالب علمی کا ابتدائی حصہ اسی طرح بسر ہوا ہے۔"

مولانا نے طالب علمی کے زمانہ میں ایسی ایسی صعوبتیں برداشت کی ہیں کہ طلبِ صادق ہی اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ مولویوں کو طالب علموں کی تعلیم سے زیادہ سروکار نہ تھا۔ چنانچہ اس وقت کی تضیع اوقات کی شکایت مولانا یوں فرماتے ہیں: "مجھ کو تو کسی مولوی نے آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ وہ اس طرح کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانوں میں جاتے تھے اور ان سے خدمت گاری کا کام لیا جاتا تھا۔ معاوضہ اس کا مسجد میں رہتے تھے۔ پس مسجد ان کے لئے بھٹیارے کی سرائے تھی اور اس کا کرایہ مولویوں اور مولانوں کی خدمت۔ جس جس پہلو سے میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں پنجابی کٹڑے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میری ساری عمر میں بدترین وقت تھا اور اگر اس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہوتا تو میں دنیا اور دین دونوں طرف سے تباہ ہو لیا تھا۔"

دہلی کالج میں داخلہ:

ایک عجیب اتفاق سے مولانا دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ پنجابی کٹڑے کے طالب علموں کو جمعے کے جمعے نمازیوں کے لئے استنجے کے ڈھیلے بنانے کے بعد چھٹی ملتی۔ ایسی ہی ایک چھٹی کے دن مولانا شہر میں گشت لگانے کے لئے نکلے تو دیکھا کہ لڑکوں کی ٹولیاں عمامے باندھے چلی جا رہی ہیں۔ بطور تماشائی کے ایک ٹولی میں جا ملے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ امیروں کی سواریاں کھڑی ہیں۔ کالج کے بڑے ہال میں اساتذہ اور طالب علم جمع ہیں، انگریز اور شہر کے امراء ہیں، آدمیوں کا ٹھٹ لگا ہوا ہے۔ گھستے گھستے ہال کے دروازہ پر پہنچے۔ چپراسیوں نے تماشائیوں کو دھکے دیئے لوگوں کے ریلے میں مولانا کا پاؤں پھسلا، چاروں شانے چت گر پڑے۔ چوٹ زیادہ آئی تو مولانا رونے لگے۔ کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر کارگل نے سمجھا کالج کا لڑکا ہے، شفقت سے اٹھا لیا اور کہا: "تم اپنی جماعت کے لڑکوں میں جا بیٹھو!"

مولانا نے کہا: "میں اس مدرسہ کا طالب علم نہیں ہوں۔"

"پھر کیوں آئے اور تم کون ہو؟"

"پنجابی کٹڑے کی مسجد کا طالب علم ہوں۔"

"کیا پڑھتے ہو؟"

"شرح ملا اور ابوالفضل!"

پرنسپل کو باور نہیں آیا اور مولانا کو لے جا کر مفتی صدرالدین خاں کے سامنے کھڑا کر دیا کہ وہ امتحان لیں آیا یہ لڑکا سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ مفتی صاحب بڑے بدمزاج تھے۔ "تو" سے خطاب کر کے مولانا سے پوچھا: "تو کیا پڑھتا ہے؟"

مولانا نے جواب دیا: "میں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے؟"

جو لوگ مفتی صاحب کے قریب بیٹھے تھے ہنس پڑے۔ مفتی صاحب نے ایک الماری سے "شرح ملا" نکالی اور مفعول لہٗ کی بحث اتفاقی طور پر ان سے سنی۔ روکا ٹوکا کہیں نہیں اور نہ معنی پوچھے۔ مولانا فراٹے سے چند سطریں پڑھ گئے۔ پھر ابوالفضل کے دفتر سوم کی جلد نکالی اور کہا: "اس کو پڑھو!"

لانے وہ بھی پڑھی۔ مفتی صاحب تو امتحان لے کر کچھ نہ بولے لیکن پرنسپل نے جانچ لیا کہ لڑکا ذہین ہے۔ تو مولانا سے کہا ایک مہینہ بعد آنا نام لکھ لیا ئے گا اور چار روپے وظیفہ ملے گا۔ مولانا نے پوچھا "آپ مجھ سے کیا کام لیں گے؟" پرنسپل نے کہا "پڑھنا!" مولانا الٹے پاؤں مسجد پہنچے اور اپنے جائی علی احمد سے کہا "میں چار روپے ماہانہ کا نوکر ہو گیا ہوں، تم بھی چلو انگریز سے ملا دوں" الغرض بھائی کو بھی پرنسپل کے پاس گھسیٹ کر لے گئے ودا یہ مجھ سے زیادہ پڑھے ہوئے ہیں۔ ان کو بھی وہی جواب ملا کہ ایک مہینہ بعد آنا۔ یہ خبر جب پنجابی کٹڑے کے مولویوں کو ہوئی تو انہوں نے مولانا مسجد سے نکال باہر کیا۔ مولانا نے اسی محلہ میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرایہ پر لے لی اور اسی میں رہنے لگے۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں کالج میں داخل ہوئے مہینہ ختم ہوتے ہی چار روپے وظیفہ ملا اور بڑھتے بڑھتے جماعت اوّل و دوم تک چار سے چوبیس تک پہنچ گیا۔ اس طرح مسجد کی گدایانہ زندگی سے بات ملی اور تھوڑے دنوں بعد مولانا کرایہ کی کوٹھڑی سے مولوی غلام حسین صاحب کے ہاں اٹھ آئے جو مولانا کے والد کے دوست اور مولوی عبدالقادر صاحب کے دور کے رشتہ دار تھے۔ کھانے پینے کے تین روپے ماہوار دے دیا کرتے تھے۔ مولانا اپنی عمر کے چودھویں سال میں پہنچے ں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ جو دکھ درد باپ کے بعد اٹھانا پڑا اسے یوں بیان فرماتے ہیں:

> "کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ دو ڈھائی برس کی چھٹائی بڑائی سے دو متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ پڑنا حقیقت میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑنا تھا مگر (اے مصیبت زدہ ہرگز ناامید نہ ہو کیونکہ خدائے رحمٰن کے پاس مخفی عنایتیں ہیں) والد کا قبل از وقت انتقال تحصیلِ علم کے لئے کاری تازیانہ کا کام کر گیا۔ والد کو رو پیٹ کر واپس آیا تو یہ خیال کہ مجھ اکیلے کے نہیں بلکہ سارے خاندان کے TO BE AND NOT TO BE کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ تحصیلِ علم کے میدان میں یا تو قدم قدم چل رہا تھا یا اب لگا سرپٹ دوڑنے۔"

وّل تو نصابِ مدرسہ ہی کیا کم تھا کہ مولانا نے خارج از اوقاتِ مدرسہ مہربان اساتذہ کی مدد سے دو سبق اور شروع کر دیئے۔ اس طرح کی دونی محنت سے استعداد ترقی کرنے لگی۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے طلباء کو مخاطب کر کے مولانا فرماتے ہیں:

> "دن کا تو کیا حساب دوں مجھے یاد نہیں کہ زمانہ طالب علمی میں کسی رات نیند بھر کر سویا ہوں۔ میں اسکالرشپ ہوتے ہی ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجھ کو رات کے دو بجے کتاب بینی کے لئے جگا دے۔ میں گرمیوں میں مکان کے اندر گھٹ کر اور جاڑے میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تھا، تاکہ سو نہ جاؤں اور اب یہ خیال کرتا ہوں کہ (ALL WORK AND NO PLAY) کا یہ نتیجہ ہوا تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی نہ آئی۔ ساری عمر سائنس سے گریز رہا اس کے دو سبب ہوئے۔ میں نے عربی ادب لیا تھا اور سائنس کو بے ڈھنگا جانتا تھا، دوسرا سبب سائنس کی طرف سے بے رغبتی کا یہ بھی ہوا کہ سائنس نے جو میرے مذہبی خیالات پر حملہ کرنا شروع کیا، سائنس میں توغّل کرنے کو طبیعت نے گوارا نہ کیا۔"

مولانا نے ہمیشہ عربی کی حمایت کی۔ کوئی تحریر عربی کے جملوں سے خالی نہیں۔ ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

> "کسی مسلمان کا دل چلے اور وہ تم سے عربی کے پڑھنے کو کہے تو تم اس کا منہ کھسوٹنے کو موجود ہو جاؤ۔ اگر عربی کی طرف سے یہی غفلت رہی تو المجد، والحمد، پر لڑا کریں گے اور کوئی اتنا کہنے والا نہ ہوگا کہ صحیح لفظ اَلْحَمْدُ ہے۔ تم بوڑھے طوطے کیا پڑھ سکتے ہو لیکن آئندہ نسلوں کو کیوں برباد کر رہے ہو۔ اچھا بھائیو جو تمہاری سمجھ میں آئے سو کرو۔ اپنا کام تو کہہ دینا ہے۔ وہ بھی اس سبب سے کہ بلا بلا کر کہلواتے ہو۔"

عقد نکاح:

قبل اس سے کہ مولانا دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوں ان کے عقد کا سامان ہو گیا۔ مولوی غلام حسین صاحب کی کوشش سے مفتی الدین خاں نے مولوی عبدالقادر صاحب کی بڑی لڑکی (یعنی اسی لڑکی سے جس کو مولانا بچپن میں بحیثیت خادم لادے لادے پھرتے تھے) سے عقد پڑھا دیا۔

اب تین چار روپے ماہوار کھانے پینے کا خرچ دے کر مولانا سسرال میں رہنے لگے اور نہایت عسرت کے ساتھ خود بسری کرتے۔ ان دنوں میں مولانا کی جو کچھ بھی آمدنی سمجھئے کالج کا تین چوبیس روپے وظیفہ تھا یا چند روپے ماہوار اوپر کی آمدنی جو لڑکے کے پڑھانے سے حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ شادی کے بعد بھی مولانا اسی طرح تعلیم حاصل کرتے رہے۔ عربی ادب پر بہت زور دیا اور اس کے ساتھ دوسرا انصاب بھی طے کیا۔ چنانچہ کالج کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں :

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگزر)، گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی، اجتہاد، علمی بصیرت، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرطِ زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ تنگ خیال، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط

ترکِ دنیا بمردم آموزند خویشتن سیم و غلّہ اندوزند

مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا، بہرا۔"

ملازمت :

الغرض ۱۸۴۵ء میں کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۵۴ء میں یعنی ۹ برس ختم کر کے ملازمت اختیار کی۔ مولانا فرماتے ہیں:

"مجھ کو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پانا یاد ہے۔ جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور ہمارے سارے خاندان نے اس کو سلسلۂ ملازمت سمجھا۔"

دہلی کالج کی تعلیم قریب الختم تھی۔ خود متعلم معلموں کی استعداد حاصل کر چکے تھے کہ سر رچرڈ ٹمپل نے اپنے ضلع میں بھی سررشتۂ تعلیم جاری کرنا چاہا۔ پنجاب گورنمنٹ نے ضلع گجرات میں چھ اسکول کھولے۔ اس وقت دہلی کالج بھی ہنری اسٹیورٹ ریڈز (General Visitor Of Education) کے ماتحت تھا۔ ٹمپل نے ریڈ سے چھ مولوی مانگے۔ ریڈ صاحب نے پرنسپل کو لکھا۔ مولانا نے بھی عرضی پیش کی۔ پرنسپل کو معلوم تھا کہ مولانا نوکری کے حاجتمند ہیں لیکن نامساعدتِ وقت کہئے کہ اور لوگ نامزد ہوئے اور مولانا منہ تکتے رہ گئے۔ اس صدمہ کا اظہار یوں فرماتے ہیں :

"اس زندگی میں مجھ کو بھی اتفاق ناملائم پیش آئے مگر جس قدر رنج اس ناکامیابی کا مجھ کو ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت کبھی کبھی مجھ کو خودکشی کا بھی خیال آیا ہے۔"

اتفاقاً چھ مدرسین میں سے شیخ ضیاء الدین کو ہیضہ ہوا اور وہ دہلی واپس آ گئے۔ ان کی بجائے مولانا نامزد کئے گئے۔ مولانا دل شکستہ ہو چکے تھے لیکن پرنسپل کی دلجوئی اور اصرار پر کنجاہ جانے کے لئے راضی ہو گئے۔ اس پہلی ملازمت کا حال مولانا یوں بیان فرماتے ہیں:

"مگر میں پنجاب کے سفر کو نہیں بھولا اور بھولنے کی چیز بھی نہ تھی۔ بھری برسات تھی، ندی نالے اور نالے دریا ہو رہے تھے۔ ٹرنک روڈ جاری تھی مگر پل نہ بننے پائے تھے اور اس پر اپنی ناتجربہ کاری، ناداری اور بے سامانی، الغرض کنجاہ میں از سرِ نو مدرسہ جاری کرنا تھا۔ پنجابیوں اور سکھوں اور کشمیریوں کے لڑکے گھر گھر پھر کر جمع کئے۔ اپنے ہاتھ سے ان کو الف بے کی تختیاں لکھ کر دیں اور درس شروع ہوا۔ الٰہی اتنا پڑھ لکھ کر بھی حرف شناس منڈے ریڈ کے (میری تقدیر کے) تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایک خط کی آمد و شد میں بارہ آنے خرچ ہوتے تھے اور کم سے کم پندرہ دن۔ لیکن جب چالیس پچاس تنخواہ آتی تھی تو تمام رنجوں کی تلافی کر دیتی تھی۔"

وہاں ایک کرنل دھیراج کشمیری تھے ان کی رانی کی سرکارِ انگریزی میں بڑی عزت تھی۔ رانی صاحبہ نے اپنے بچوں کو مولانا سے پڑھوانا چاہا۔ مولانا چاہتے تھے کہ بچے مدرسہ بھیجے جائیں۔ رانی صاحبہ نے اسے اپنی عزت کے خلاف سمجھا اور ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہہ کر مدرسہ اپنے ہاں اٹھوا منگایا۔ اس

نہ کا ذکر مولانا یوں کرتے ہیں :

"اب مدرسی میں ذرا خوشحال ہو چلا تھا۔ بہتر سے بہتر مکان رہنے کو ملا، کرنل صاحب کے خدمت گار ٹہل کو، گھوڑے ٹٹو سواری کو، دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانا رانی صاحبہ کے سر۔"

س طرح کی فراغت پائی تو سالم تنخواہ گھر بھیجنے کا انتظام کر دیا۔ مگر مولانا کنجاہ میں خوش دل نہ تھے۔ کوشش کی تو اجمیر کے کالج سے سَو روپے ماہوار کی ابی مدرسی پیش کی گئی اور کان پور سے اسّی روپے کی ڈپٹی انسپکٹری مدارس۔

انپور کی ملازمت :

بہ امیدِ ترقی کانپور کی ملازمت کو پسند کیا اور وہاں مامور ہو کر فلر صاحب سے جو انسپکٹر مدارس تھے خوشگوار تعلقات یدا کر لیے۔ ایک مرتبہ جلسۂ امتحان میں مولانا پان کی گلوری منہ میں دبائے ہوئے پہنچے۔ فلر صاحب بہت ناراض ہوئے اور تنہائی میں درشت الفاظ یں ملامت کی جس کی مولانا کو برداشت نہ ہوئی اور استعفےٰ دے دیا۔ اسی اثناء میں ۱۸۵۷ء کا غدر واقع ہوا جس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں :

"جہاں جائے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ کنجاہ کی مدرسی کا سا تو حال نہ تھا کہ منڈوں کو بیٹھے بیٹھے کراؤ مگر یہاں بھی قریب قریب ہماں آش در کاسہ۔ بچّے نہ کراؤ پہاڑے سنتے پھرو۔ اتنے میں تو یاراں فراموش کردند کا وقت آ گیا یعنی ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر۔ کس کی نوکری اور کیسا پڑھانا، جینے کے لالے پڑ گئے۔"

ابھی استعفےٰ منظور نہ ہوا تھا کہ مولانا کان پور سے بھاگے تو دلی جا کر دم لیا۔ سسرال والوں میں بعض متوسلانِ شاہی تھے جنہوں نے خود بادشاہ بیگم نواب تاج محل کو پڑھایا بھی تھا۔ غدر ہوا تو نواب تاج محل نے اپنی چھوٹی بہن کو جو بیرونِ قلعہ چیلوں کے کوچہ میں رہتی تھیں قلعہ لوا لانے کا کام مولوی عبدالقادر صاحب کے سپرد کیا۔ اس کام کے لئے شاہی گاڑی خانے کے چھکڑے تعینات ہوئے۔ مسجد فتح پوری کے طالب علم اور مولانا کے سسرال کے ڑکے اس کام کے سر انجام پر مامور ہوئے۔ ایک دن اسباب کی آخری کھیپ قلعہ میں پہنچا کر مسجد کے طالب علم (جن میں مولانا بھی تھے) واپس آ رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ کالج کے سامنے والے میدان میں باغی تلنگوں نے انگریز قیدیوں کو جمع کر کے باڑ مار دی ہے۔ لاشیں جن میں میمیں بھی تھیں بے حرمتی کی حالت میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت (مسز لیسن) پر مولانا کی نظر پڑی جو نیم بیہوشی کے عالم میں (WATER WATER) کہہ رہی تھی۔ مولانا کے دو ساتھی لڑکوں میں سے شعیب نے چاہا کہ اس کا کام تمام کر دے لیکن مولانا اور دوسرے ساتھی نے غالباً مذہبی ہمدردی کے جذبہ کے تحت ایسا نہ کرنے دیا۔ قریب کے کسی مقام سے پانی لا کر اس کے منہ میں لا ڈالا۔ رمضان کے دن تھے، اندھیرا ہو چکا تھا۔ لوگ مارے ڈر کے گھروں میں بند ہو چکے تھے۔ ایسے میں میم کو اٹھا کر تینوں طالب علم پنجابی کٹرے کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر ایک خالی گھر میں اس میم کو چارپائی پر لٹا دیا۔ دروازے میں تختے اڑا دیئے اور دوڑے دوڑے مولوی عبدالقادر صاحب کو خبر دی۔ مولویوں نے لڑکوں کو رازداری کا حکم دیا۔ میم کے زخموں کا علاج شروع کر دیا اور کھانے پینے کا بندوبست بھی۔ رفتہ رفتہ میم کو زنانہ کپڑے پہنا دیئے۔ مہندی لگوا دی، چوڑیاں پہنا دیں اور چوٹی بھی گوندھ دی گئی۔ میم کی عمر ۲۴، ۲۵ برس کی بتلائی جاتی ہے۔ مولانا یا ان کے ہم سن لڑکوں کو میم کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی البتہ مولانا کو اپنی بیوی سے اس کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ یہ میم مسٹر لیسن نام انگریز کی ایک افسر کی بیوی تھی جو اپنے باپ سے ملنے دہلی آئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے باپ اور دوسرے انگریزوں کو گولیوں سے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ اسی طرح اس کا شوہر بھی [illegible] آگرہ میں مارا گیا ہو گا۔ لیکن اس وقت تک انگریزوں نے ایسی بغاوت پنجاب میں نہیں ہونے دی مشتبہ رسالوں سے ہتھیار رکھوا لیے اور خیر خواہوں کو ساتھ لے کر دہلی کے محاصرہ کے لئے پہنچ چکے تھے۔ باغیوں نے دہلی کے باہر نکل کر علی پور تک مورچہ بندی کر دی۔ طرفین سے گولہ باری شروع ہوئی۔ انگریزوں کے گولے باغیوں پر گرنے لگے۔ میم بہت گھبرانے لگی اور بڑی حکمتِ عملی سے میم کی چٹھی انگریزوں کے

کیمپ تک پہنچا دی گئی۔ جواب آیا کہ تم جہاں ہو چپ چاپ بیٹھی رہو۔ تم جس مکان میں ہو اس کا اور جہاں تم نے پناہ لی ہے ان کے تفصیلی حالات تمہارے مخبر سے دریافت کر لئے گئے ہیں۔ تم ان لوگوں پر سرکار اور تمام سرکاری عہدہ داران ملکی و فوجی کی احسان مندی کماحقہٗ ظاہر کر دینا۔ تین چار چٹھیاں اس طرح کی آئیں گئیں۔ انگریزوں کو مخبر کا اعتبار ہو گیا تو انگریزوں نے مولویوں کو کہلا بھیجا کہ میم کو ہمارے کیمپ پہنچا دو شاہی حاصل کر کے اس میں میم کو بٹھایا اور مولویوں کی دوسری بیبیاں بھی اس میں بیٹھ گئیں۔ لاہوری دروازے پہنچے تو باغیوں نے تلاشی لینی چاہی مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ مولویوں کی بہو بیٹیاں قدم شریف منت اتارنے جاتی ہیں تو عذر نہ کیا۔ اس طرح میم کیمپ پہنچ گئی اور کوئی دو ہفتے بعد انگریز کشمیری دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ نکلسن کمانڈنگ افسر مارا گیا۔ مولانا کا محلہ بھی نرغے میں آ گیا۔ مولوی لوگ گھر میں بند ہو کر دروازوں میں پتھر اڑا کے بیٹھے تھے کہ رات کے ڈیڑھ پہر گئے گھوڑے کے ٹاپ کی آواز سنائی دی اور ایک سوار کو چلاتے سنا "مولویوں کا مکان کون سا ہے؟" کواڑ کے پاس جا کر ڈرتے ڈرتے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا۔ جنرل صاحب نے حکم دیا ہے کہ مولوی لوگ کابلی دروازے کی سڑک سے پرے نکل جائیں۔ صبح سے پہلے پہلے اس محلہ پر دھاوا ہوگا۔ بڑی بدحواسی میں مولویوں کا خاند یہاں سے بھاگ کر پہلے سوئی والوں کے محلے اور وہاں سے ترکمان دروازے پہنچا اور جب انگریزوں کے جامع مسجد پر آ جانے کی اطلاع ملی تو یہ لوگ ہمایوں کے مقبرے سے قریب عرب سرائے پہنچے جہاں بادشاہ بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دو دن امن سے گزرے پھر بادشاہ اور ان کے ملازمین کی دار و گیر شروع ہوئی تو مولویوں کا خاندان سلطان نظام الدین بھاگا۔ وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے تو وزیر آباد کا ارادہ کیا۔ رستہ میں گوروں کا گارد ملا۔ سب مرد گرفتار ہوئے عورتوں کو چھوڑ دیا گیا۔ اس گرفتاری میں مولانا بھی تھے جو سب کے ساتھ شہر کی کوتوالی میں حوالات کر دئے گئے۔ یہاں بہت سے لوگ پکڑے ہوئے تھے جن کو قطار در قطار بٹھا کر معمولی پوچھ گچھ کے بعد پھانسی دے دی جاتی۔ انگریزوں کے ساتھ ایک بخشی صاحب بھی تھے جو نشان دہی کرتے جاتے تھے کہ یہ فلاں اور وہ فلاں۔ جب مولویوں کی باری آئی تو خدا نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا اور انہوں نے کہا یہ بیچارے تو بساطی لوگ ہیں۔ زندگی باقی تھی سب مولوی مزید تحقیقات کے لئے زندہ بچ گئے۔ مسز لیسن کی دی ہوئی انگریزی چٹھی مولانا کی پگڑی میں تھی۔ دکھا دیتے تو شاید چھوٹ جاتے۔ انگریزی تو ان میں سے کوئی پڑھا نہ تھا۔ خدا جانے اس میں شکایت تو نہ لکھ دی ہوگی۔ اس ڈر سے چٹھی پیش نہیں کی گئی۔ جس دوکان میں یہ لوگ قید تھے اس کے کوٹھے پر مسٹر لوئس فوجی افسر ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کو ہوا خوری کے لئے نیچے اترے تو مولانا کو پہچان لیا۔ لوئس صاحب نے مولانا سے کبھی کچھ اردو پڑھی تھی۔ حالات معلوم کر کے کمانڈنگ افسر صاحب کو لکھ کر راہداری کا پروانہ دلوا دیا۔ بالآخر تلاش بسیار کے بعد خاندان کی عورتیں جو بروالے چلی گئی تھیں مل گئیں۔ مولانا کو معلوم تھا کہ ان کے ایک ملاقاتی کالج کے ریاضی کے استاد مسٹر رام چندر نو عیسائی انگریزی فوج میں ہیں۔ ان سے ملنے وزیر آباد آئے مگر وہ اس وقت تک شہر دہلی میں آباد ہو چکے تھے۔ پروانۂ راہداری تو تھا ہی مولانا شہر میں آئے اور ماسٹر صاحب کی سفارش سے عورتوں کو بھی شہر میں لے آئے۔ لوٹ کا بازار گرم تھا۔ سکھ مسلمانوں کو اور ولایتی ہندوؤں کو لوٹتے تھے۔

ڈپٹی انسپکٹر مدارس الٰہ آباد:

دہلی میں ایک بزرگ میر منشی کریم بخش صاحب سے مولانا کی ملاقات ماسٹر رام چندر کے کوٹھے پر ہوئی اور انہوں نے مولانا کو ہنری اسٹیورٹ ریڈ ڈائرکٹر تعلیمات تک پہنچا دیا جو ان دنوں قلعہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ریڈ صاحب نے مولانا کو الٰہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری مدارس پر مامور کیا اور کچھ دنوں بعد ریڈ صاحب کے ساتھ ہی فرخ آباد، مین پوری، کانپور ہوتے ہوئے مولانا الٰہ آباد پہنچ کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ دہلی میں مولانا کے خاندان والوں پر نئی آفت آئی۔ وہابیوں کی سازش کے مقدمے کے سلسلے میں جھوٹی مخبری کی بناء پر مولوی عبدالقادر صاحب بھی پکڑ لئے گئے۔ غرض یہ سن کر مولانا دہلی آئے۔ اس وقت لیسن کی میم نے بڑا کام لیا۔ اپنے شوہر کو ساتھ لے کر دہلی آئی اور وکالت کر کے سب مولویوں کو

ب قضیۂ غدر ختم ہوا تو مولانا دوبارہ الٰہ آباد پہنچے اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اس ملازمت کا حال مولانا یوں بیان کرتے ہیں:

غدر کے دو تین برس بعد سررشتۂ تعلیم تو پنپ گیا مگر جس چیز کو میری آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں کہیں اس کا مذکور نہ تھا۔ وہی باپ نول رام سرن کی تین چار ورق کی کتاب جس میں بیگھہ بسوہ کا حساب تھا، وہی بھرگول' (بابو شیو پرشاد کا ناگری کا جغرافیہ) یعنی وہی سررشتۂ تعلیم ا انسپکٹر بن کر دورے میں کہیں لڑکوں کے پہاڑے سنتا پھرتا ہوں اور کہیں دریا اور پہاڑ پوچھتا پھرتا ہوں۔"

ی زبان کا اتفاقیہ طور پر سیکھنا:

یہیں مولانا نے اتفاقیہ طور پر انگریزی زبان سیکھی۔ چنانچہ خود مولانا کی تحریرات کے اقتباسات ہر ہو جائے گا کہ مولانا نے کالج میں کیوں انگریزی نہ پڑھی اور الٰہ آباد پہنچ کر کیونکر پڑھی۔ مولانا ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے اور اپنے وقت کے بڑے دین دار، کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں...... بارے مساعدت توفیق سے اب میری اپنی تعلیم نے ایک دوسری شان اختیار کی جس نے میری پچھلی تعلیم کی خاطر خواہ داد دی اور مجھ کو ایسے شغل سے لگا دیا کہ وہ مجھے ساری عمر کے لئے بس کرتا ہے...... تصریح اس اجمال کی یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں تو سوسائٹی کے تعصبات نے انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ دی اور خود میں بھی انگریزی کی طرف سے بدگمان ہی سا رہا۔ الٰہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم امین عدالت نے مجھے مکان میں ٹھہرایا۔ بیٹھک میری ان کی مشترک تھی۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے مشن اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ میں تو کسی قدر ٹھٹکا مگر دیکھا تو ان کو پکا مسلمان پایا۔ غلو کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند، باوجودیکہ انگریزی میں اچھی لیاقت ہے مگر وضع ظاہر، طرز ماند و بود اور گفتگو سے کوئی جان نہیں سکتا کہ ان کو انگریزی چھو بھی گئی ہے۔ میں عبداللہ خاں کو دیکھتا کہ راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر مسلمانوں کی اپیلیں مفت لکھتے۔ سب سے پہلے شخص جنہوں نے انگریزی کی طرف سے میرے سوءِ مظنہ کو دور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔ اب انہوں نے کہا میں چٹکی بجاتے میں انگریزی سکھا دوں گا۔ غرض انگریزی پڑھنی شروع کی۔ دس دس پندرہ پندرہ صفحے Arabian Nights کے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دوروں میں رٹا کرتا۔ جب ہزار ڈیڑھ ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو میں ڈکشنری کی مدد سے آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا اور یہ صرف چھ مہینے میں۔ چونکہ عربی ٹھوک بجا کر پڑھی تھی اس نے انگریزی کو میرے لئے ایسا سہل کر دیا کہ جو لوگ برسوں میں کرتے ہیں میں نے مہینوں میں کر لیا۔ اعظم گڑھ میں ایکلٹن صاحب سے انگریزی زبان میں انجیل بھی پڑھی تھی۔"

ح مولانا کو جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملا انگریزی کا شوق فرماتے رہے اور اچھی استعداد حاصل کر لی تھی۔ بقول ان کے: "میں نے اپنی و (بطور تواضع و کسر نفسی) لعنت بر پیچ کہا ورنہ اسی لعنت بر پیچ پر میں بی۔ اے والوں کے ساتھ پالا لینے کو موجود ہوں۔"

ے:

یہ مسلّم ہے کہ مولانا نے انگریزی یا عربی زبان سے جتنے بھی ترجمے اردو میں کئے وہ قطعی طور پر ترجمے نہیں معلوم ہوتے بلکہ اردو زبان کی تقل تصنیف معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صلاحیت ان کی خاص ہے اور اس سے ان کی زبان دانی کا اعلیٰ معیار ظاہر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ استنباط ہیں جیسی طبیعت مولانا کی لڑتی ہے ویسے بڑے بڑے انگریزی دانوں کی نہیں لڑتی۔

ہ انکم ٹیکس:

اوّل بار انکم ٹیکس جاری ہوا تو میر ناصر علی خاں ڈپٹی کلکٹر کی سفارش سے میور صاحب نے یہ کام اولاً مولانا کے سپرد کیا اور

جب آدھے سے زیادہ ترجمہ ہوگیا تو بابو شیو پرشاد بھی اس میں شریک ہوگئے۔

ترجمہ پینل کوڈ تعزیراتِ ہند:

سر جارج ایڈمنسٹن لفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ نے پینل کوڈ کے ترجمے کو امر مہتم بالشان سمجھ کر اپنے اہتمام خاص میں رکھا اور اس وجہ سے بھی کہ سر جارج مدتوں طہران میں سفیر رہ چکے تھے۔ فارسی کی اچھی استعداد تھی۔ بلا تکان فارسی بولتے بھی تھے اور اس وقت کوئی دوسرا یورپین ان سے بہتر فارسی دان نہ تھا۔ سر جارج نے ہنری اسٹیورٹ ریڈ ڈائرکٹر تعلیم کو اس کام میں اپنے ساتھ لیا اور مسٹر ریڈ نے منشی عظمت اللہ انگریزی مدرس بریلی کالج کو اپنے ساتھ کر لیا۔ منشی صاحب ترجمہ کرتے اور ریڈ صاحب کے میر منشی کریم بخش صاحب (جن کی عربی فارسی اچھی تھی) اس کو بہ نظرِ اصلاح دیکھتے۔ ریڈ صاحب ترجمہ سُن کر اس میں تصرف کرتے اور بالآخر یہ ترجمہ لاٹ صاحب کو سنایا جاتا۔ یہ کام اس طرح چل رہا تھا کہ منشی کریم بخش صاحب کی تحریک سے ریڈ صاحب کی چٹھی مولانا کے نام آئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "لاٹ صاحب صرف دو دن الٰہ آباد ٹھہر کر بنارس چلے جائیں گے۔ عظمت اللہ اور کریم بخش ان کے ساتھ آگے بڑھ جائیں گے اور میں چند روز تمھارے ہاں کمشنر کے ہاں ٹھہروں گا تم کچہری کے وقت منشی عظمت اللہ کا ترجمہ مجھے سنا دیا کرو۔" اب دیکھئے مولانا کس ترکیب سے ترجمے میں شامل ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> "میں تین چار دن تو ریڈ صاحب کا رنگ دیکھتا رہا کہ کیا چاہتے ہیں اور کہاں اٹکتے ہیں۔ جب اس کی اٹکل مل گئی تو میں نے بیچ میں سے چار پانچ دن کے سُنانے کی قدر چھوڑ، اٹھارویں چیپٹر سے متوکلاً علی اللہ آپ ترجمہ شروع کر دیا۔ برخاست کرتے وقت ریڈ صاحب سکشنوں کو گن لیا کرتے تھے۔ فی یوم اکثر سات سکشنوں کا اوسط پڑتا تھا۔ اٹھارویں باب پر پہنچ کر تو میں نے ہمت کر کے اپنا ترجمہ پڑھا۔ خدا کا کرنا پہلے ہی دن ۱۴ سکشن پاس ہوئے۔ ریڈ صاحب کو بڑا تعجب ہوا۔ دبی زبان سے میں نے کہا ترجمہ میں نے کر لیا تھا۔ ریڈ صاحب کو اور بھی تعجب ہوا۔ ترجمہ تو لے لیا اور لاٹ صاحب کے نام ایک چٹھی میرے حوالے کی اور زبانی ہدایت کی کہ آج ہی کی ڈاک میں بنارس پہنچ کر یہ چٹھی لاٹ صاحب کو دو، وہ ترجمے میں تم کو بھی شریک کر لیں گے اور میں بھی چوتھے دن ان کے کیمپ میں ہوں گا۔"

مولانا نے وہ چٹھی لاٹ صاحب کی خدمت میں پیش کی اور عظمت اللہ صاحب اور کریم بخش صاحب کے ساتھ تیسرے مترجم بنا دیئے گئے، مگر یہاں بھی مولانا شریک غالب رہے۔ اٹھارویں چیپٹر سے پیشتر تک جو ترجمہ ہو چکا تھا اس کو بھی Criticise کر کے صاف کیا۔ بھدی اصطلاحوں کی جگہ بہتر اصطلاحیں وضع کر کے ترجمہ میں داخل کیں اور یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو میں قانونی اصطلاحات کو روشناس کرایا۔ چند اصطلاحیں دلچسپی کی خاطر ملاحظہ ہوں۔ مثلاً آتش گیر اشیا، اثبات جرم سابق، بے نام مکاتبہ، حبسِ دوام و عبور دریائے شور، قتل انسان مستلزم سزا وغیرہ Combustibli Matter کے ترجمہ کے لئے دیگر مترجمین دور دور کی سوچ رہے تھے لیکن عاجز تھے۔ مولانا نے ذرا تامل کر کے فرمایا۔ بھک سے اڑ جانے والا مادہ۔ سب دنگ رہ گئے اور یہی ترجمہ تعزیراتِ ہند میں رکھا گیا۔ اب ترجمہ کی طباعت کا کام بھی مولانا ہی کے سپرد ہوا جس کے اختتام پر انعام ملا اور ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہوئے۔ اس سے پہلے مولانا تحصیلدار بن چکے تھے ۱۸۶۶ء تک تحصیلداری کی اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہو کر گورکھپور پر متعین ہوئے اور بندوبست کا کام سپرد ہوا۔

لونمز ہونز سمٰوات:

گورکھپور سے اعظم گڑھ بدلی ہوئے۔ یہاں ان کی دوستی ایچ۔ لی پوروں صاحب سے ہوگئی جو اسی علاقہ میں بندوبست کے مہتمم تھے اور بعد کو کشمیر کے ریزیڈنٹ بھی ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک اشتہار نکالا کہ جو کوئی علمِ ہیئت کی اس کتاب (یعنی لونمز ہونز) کا اچھا ترجمہ کرے گا ایک ہزار انعام پائے گا۔ مولانا کو بھی ترجمہ کے لئے لکھا۔ مولانا نے عذر کیا تو سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر سے دباؤ ڈلوایا۔ مجبوراً ترجمہ کرنا پڑا۔

ذکر مولانا یوں کرتے ہیں:

> "سب مل کر گیارہ ترجمے ہوئے۔ ان میں محاکمہ کرنے کو لی پوروں صاحب نے نقادانِ فن کی کمیٹی بٹھائی۔ کمیٹی نے میرے ترجمہ کو سب سے بہتر تو مانا مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ Up To Mark نہیں ہے۔ ہزار میں سے چار سو کے قابل ہے۔ میرا جی جل کر خاک ہی تو ہو گیا۔ ممبرانِ کمیٹی کے نام پوچھتا ہوں تو نام نہیں بتاتے، اسقام دریافت کرتا ہوں تو اسقام ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے فرمائشی شاعری سے کان اینٹھا۔"

چھپیاں نہ بتلانے کا سبب تو معلوم نہ ہو سکا لیکن اتنا پتہ چلا کہ سر سید اور مولوی ذکاء اللہ صاحب بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ بہر حال اسی ترجمے نے آگے چل کر مولانا کو میٹھے پھل دیئے۔ وہ اس طرح کہ حیدر آباد کے امیر کبیر شمس الامرا نواب رفیع الدین خان بہادر علمِ ہیئت کے بڑے عالم تھے۔ لی پوروں صاحب نے مسٹر سانڈرس Sandhers رزیڈنٹ حیدر آباد کو لکھا کہ اشتہار دے کر جو ترجمہ کرایا گیا ہے اس کو Up To Mark کرانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ امیر کبیر کو اس کی درستی کی طرف متوجہ کر سکیں تو میں دونوں کا ممنون ہوں گا۔ اس طرح مولانا کا زبہ رزیڈنٹ بہادر کے توسط سے امیر کبیر کی خدمت میں پہنچا۔ امیر کبیر نے سر سالار جنگ بہادر و مولوی سید حسین بلگرامی عماد الملک بہادر کو دیا کہ وہ اس کو دیکھیں۔ ایک عرصہ کے بعد سید حسین بلگرامی نے مولانا کو خط لکھا:

> "آپ کا ترجمہ میرے سپرد ہوا ہے۔ مجھ کو اس کمیٹی کی رائے سے اتفاق نہیں جس نے ترجمہ کو اچھا نہیں بتایا۔ ترجمہ بہتر سے بہتر ہوا ہے اور اس میں کچھ کسر ہے تو اس قدر کہ آپ ہی اس کی نظرِ ثانی کریں اور جہاں ضرورت دیکھیں اصلاح کریں اور میں بھی رائے لکھ کر وِن صاحب کے ہاں بھیج رہا ہوں۔"

ایک ہفتہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ وِن صاحب مر گئے۔ ان کی بیوہ ولایت چلی گئیں۔ کوئی چھ مہینے بعد انہوں نے مولانا کو اطلاع دی کہ وہ ترجمہ اور چھ سو روپے ترجمے کی نیت کے امانت ہیں جو تم کہو سو کروں۔ مولانا نے روپیہ نہیں چاہا البتہ ترجمہ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ جب ترجمہ آ گیا تو مولانا نے اس مراسلت کو مع ترجمہ گورنمنٹ میں پیش کر دیا۔ یہ ترجمہ مولانا نے سموات کے نام سے کیا تھا۔ گورنمنٹ نے ایک ہزار بطور انعام مرحمت کیے۔

حیدر آباد کی ملازمت: سموات دیکھ کر ہی خود سالار جنگ کے دل میں فاضل مترجم کے طلب کرنے کا تقاضا پیدا ہوا بہرحال اولاً سید حسین بلگرامی نے مولانا کو اطلاع دی کہ سالار جنگ بلانا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سر سید کو حکومت حیدر آباد کا اس مضمون کا خط پہنچا کہ بالفعل ساڑھے آٹھ سو اور بعد کو ایک ہزار بیس ماہوار گورنمنٹ برطانیہ کے سکہ سے ملے گا۔ اس وقت مولانا اعظم گڑھ میں چار صدی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سر سید نے اس کی اطلاع مولانا کو دی۔ سر سید اور مولانا کی مراسلت تو دستیاب نہیں ہوئی۔ البتہ مولانا نے اس بارے میں جو تحریر اپنے فرزند کو بھیجی تھی وہ یہ ہے:

> "اتنی تنخواہ مجھے سرکارِ انگریزی میں تمام عمر پانے کی توقع نہیں۔ دربارِ حیدر آباد ان دنوں بہت ممدوح ہے۔ اختیارات وسیع، عہدہ معزز۔ پس تم لوگ مجتمع ہو کر مشورہ کرو۔ اگر اجازت دو تو بالفعل ایک سال کے لئے رخصت لے کر جاؤں۔ انگریزوں کی ہمت پر نظر کرو کس قدر دور کے سفرِ دریا اختیار کر کے یہاں آتے ہیں۔ حیدر آباد تو اپنا دیس ہے۔ سنو بھائی میرا تو جی للچاتا ہے لیکن اب ولولہ دل میں باقی نہیں کہ تم سب کو ناخوش کر کے چلا جاؤں۔ اب صرف اتنی گدگدی دل میں ہے کہ میں نے انکار نہیں کیا۔ اگر ابتداً بارہ سو دیں گے اور ارذلِ عمر کے لئے سامان کر دینے کا وعدہ فرمائیں گے تو انشاء اللہ جاؤں گا۔ لیکن مجھ کو ایسا احمق مت سمجھو کہ بہت دنیا جمع کرنے کو زندگی کا ماحصل سمجھوں۔ بشیر دنیا کو خوب دیکھا۔ غریب محتاج تھا خدا نے مالدار غنی کیا۔

اولاد ہوئی، حکومت کے مزے اڑائے، ناموری اور شہرت سے بھی بے نصیب نہیں رہا۔ لیکن انجام ان سب بکھیڑوں کا کیا ہے۔ آخر فنا۔ آخر فنا۔ اب خداوند تعالیٰ ایسی توفیق عطا کرے کہ کچھ وہاں کے لئے بھی کروں ۔

کیا وہ دنیا جس میں ہو کوشش نہ دیں کے واسطے
واسطے واں کے بھی کچھ یا اب یہیں کے واسطے"

الغرض یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو مولانا اعظم گڑھ سے فرلو لے کر دہلی روانہ ہوئے۔ دیگر مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۲۷ اپریل کو حیدر آباد فرخندہ بنیاد پہنچ کر نواب محسن الملک کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ مولانا کے بڑے داماد حاجی احمد حسن اور بہنوئی رفیع الدین بھی ساتھ تھے۔ مولانا کی تنخواہ ہزار اور بھتہ دوامی ۲۴۰ مقرر ہوا۔ دونوں ساتھی بھی ڈیڑھ ڈیڑھ سو ماہوار پر مولانا کی ماتحتی میں رکھ لئے گئے۔ مولانا جب حیدر آباد پہنچے تو یہ ان کے لئے بالکل دوسری دنیا تھی۔ وہاں کے ساز و سامان، تزک و احتشام دیکھ کر حیرت کرتے۔ دہلی اور لکھنؤ کی جو خراب حالت اس وقت ہو چکی تھی اس کا مقابلہ کرتے تو ان دونوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں پاتے تھے۔ شہر میں جا کر جب دیکھتے تھے کہ مارے ہجوم کے تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی اور ہجوم بھی کیسا قلی مزدوروں کا اور بلوائیوں کا ہجوم نہیں بلکہ نوابوں، راجاؤں اور سرکاروں کا جن کی اردلی میں پلٹنیں، رسالے اور ہاتھی دوڑتے ہیں، تو مولانا حیرت کے عالم میں رہ جاتے تھے، سرکاری محلوں میں جاتے تو ہکا بکا ہو کر رہ جاتے۔ لیکن جب مولانا کی نظر بدنظمی سلطنت پر پڑتی تو بہت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے:

"عملداری میں اچھا انتظام نہیں۔ اگر خدا نوکروں کو توفیق دے، خیر خواہی دے تو یہ ملک بجائے خود اودھ کا چوگنا ہے، نوکروں کی شوخ چشمی کی وجہ یہ ہے کہ موقوفی کا دستور نہیں، جرمانہ کا قاعدہ نہیں۔"

حیدر آباد کی ملازمت اختیار کرنے کے چند دن بعد مولانا نے جو خط ریڈ صاحب کو اردو میں لکھا تھا اس کا اقتباس یہ ہے:

"مجھ کو یہاں صدر تعلقہ داری کی خدمت سپرد ہے اور یہ انگریزی کمشنری سے بہت ملتی ہوتی ہے۔ تنخواہ وہاں بہت، اور اختیارات یہاں۔ مجھ کو تنخواہ کے بارہ سو ملتے ہیں اور بہ تعلق بندوبست مدامی ایک سو چالیس۔ یہاں کا روپیہ تین آنہ کے قریب انگریزی روپے سے چھوٹا ہے اور چیزوں کا نرخ بھی اکثر گراں۔ اس ملک میں کبھی پارسی مقتدر رہے، کبھی مدراسی اور ان دنوں ہندیوں کا دور دورہ ہے۔ نواب مختار الملک بہادر اور نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر ریجنٹ ہیں۔ ان دونوں میں جو باہمی اختلاف ہے وہ آپ اخباروں میں پڑھتے ہوں گے۔ انتظامِ سلطنت مختار الملک کرتے ہیں باستثنا امورِ عظیمہ جس میں مشاورتِ امیر کبیر ضرور ہے۔"

مولانا اپنے علاقے کی تفصیلی رپورٹ سرکار میں بھیجا کرتے اور اصلاح طلب امور کی نسبت دل کھول کر لکھتے۔ یہ رپورٹیں سر سالار جنگ تک بھی پہنچتیں۔ وہ ان کو غور سے پڑھتے اور اکثر و بیشتر مولانا کی رائے سے اتفاق فرماتے۔ ساتھ ساتھ ان رپورٹوں کی ادبی عظمت اور شگفتگی سے لطف اندوز ہوتے۔ مولانا کی تحریکات معقول ہوتیں جس کا اثر سالار جنگ کے دل پر بہت اچھا پڑا۔ چنانچہ مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہ صرف خدا کی مہربانی تھی کہ ایک تازہ وارد جو رسم و راہ ملک سے بے خبر، زبان سے ناآشنا، دستور و رواج سے ناواقف ہو آتے کے ساتھ معقول رائے دینے لگے۔ اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ یہاں فارسی دفتر ہے اور میں نے ساری عمر کبھی فارسی نہیں لکھی۔ مجھ کو فارسی کی تحریر ایک اجنبی بات معلوم ہوئی۔ لیکن چار و ناچار لکھنی پڑی۔ وہ خدا کے فضل سے کچھ ایسی بن پڑی کہ تمام حیدر آباد میں غل مچ گیا اور لوگ لوہا مان گئے۔"

فارسی رپورٹوں کے چند دلچسپ ادبی نمونے:

مولانا نے جو رپورٹیں لکھی ہیں وہ زیادہ تر نظم و نسق کی مشکلات اور

TECHNICAL MATTER سے متعلق ہیں اور ان کے حل پیش کئے گئے ہیں لیکن ان رپورٹوں میں ادب کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے چنانچہ ایسے ہی دو چار نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں :

۱- "دوم تعلقہ دار دورہ کہ مے کنند بطور سیاحت - روزنامچہ کہ مے نویسند بطور حکایت - دستخطے کہ مے کنند چو زلف محبوباں - افتاں وخیزاں۔"

۲- تجاویزِ ایں صدر تعلقہ دار (یعنی خود) مترجمان کم سواد یا منشیان بے استعداد مبیضہ مے کنند و بوجہ نالیاقتی تحریف اصل تجویز مے شود۔ آئندہ اگر چنیں مرئی و معائن شود از سزا درگذر نخواہم کرد۔"

۳- "دو روز در محبوب نگر در تنقیح دفاتر مصروف بودم، انبارے دیدم - پریشان تر از حواس دیوانگاں باستثنائے خزانہ کہ ہنوز بوجہ ضیق فرصت تنقیح آں بہ انجام نرسانیدہ ام۔ دریں ممالک مے بینم کہ چوں حاکمے بر کرسی اجلاس مے فرماید۔ اکثر عملہ گرد او حلقہ مے کنند و مطابق تقسیمے کہ فی ما بین شاں معہود است نوبت بہ نوبت کاغذات پیش نمایند۔ چوں از تعدد پرسشے رفت، چندیں نویس بر من شمرند۔ کہ خالد جواب نویس است، ولید احکام نویس است و حامد صاف نویس و محمود زود نویس و فلانے تلنگی نویس و آں دیگر مرہٹی نویس۔ ما حصل انتظام شاں اینست کہ اجلاس آباد و سر رشتہ خراب و دفتر تباہ۔"

۴- "مستعجل بودم بروانگی اندور مگر مخاصمت دوم تعلقدار با تحصیلداران میدک و ٹیکمال نگذاشت کہ شتاب روم۔ دوم تعلقہ دار ما مزاج دارند کہ ہر کہ در آمیخت در آویخت۔ کم اختلاطی شیوہ ایست محمود لیکن نہ ایں قدر کہ پنج سال کامل شخصے حاکم بقعہ باشد و ہیچ کس را از اعالی و ادانی با او سابقہ نے۔ بلکہ ہر آں بزرگوار تر در نظر دوم تعلقہ دار خوار تر۔"

بہر حال مولانا بہ حیثیت صدر تعلقہ دار و ناظم بند و بست بڑی محنت، دیانت اور دلچسپی سے سرکاری کام کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے سالار جنگ کے دل میں ان کی وقعت دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ سرکاری کام کی اتنی کثرت تھی کہ تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملتا تھا تاہم مولانا نے سالار جنگ کے فرمانے سے حضور نظام میر محبوب علی خان بہادر کی واقفیت کے لیے (جن کو اختیاراتِ شاہی سپرد کرنے کا زمانہ قریب آ گیا تھا) انتظاماتِ سلطنت سے متعلق سات یا گیارہ رسالے لکھے جن کی زبان شستہ اور صاف اور بیان شگفتہ تھا۔ یہ رسالے ایسے عنوانات پر مشتمل تھے: مال گزاری، عدالت، تعلیمات، پولس، مالیہ وغیرہ۔

نواب سالار جنگ سے متعلق اپنے فرزند کو لکھتے ہیں:

> "نواب صاحب کے دل میں جگہ ہونی شرط ہے پھر تو وہ اس طرح کا سخی دل آدمی ہے کہ جو مانگو سو لو۔ مثل ہندوستانی رئیسوں کے ہمارے نواب صاحب احمق اور لایعقل نہیں ہیں۔ اپنے وقت کا یہ شخص ارسطو اور افلاطون ہے۔ لیکن کریم النفس اور مروت اس درجہ کی ہے کہ لا اور نہیں اور No منہ سے نہیں نکلتا۔ بشیرا یہ بڑا عمدہ اصول ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ تم نواب صاحب کے احسانوں پر نظر کرو۔ نواب صاحب کے حق میں صمیمِ قلب سے دعا کرنی چاہیئے۔"

انگریزی خدمت سے استعفا :

مولانا انگریزی حکومت سے دو برس کی فرلو لے کر حیدر آباد گئے تھے۔ یہ مدت ختم ہونے کو آئی تو محسن الملک کے ذریعہ سے سالار جنگ تک یہ بات پہنچائی کہ میں رخصت کے ختم پر واپس جاؤں گا۔ سالار جنگ کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے کسی موقع پر سبب دریافت فرمایا۔ مولانا نے عرض کیا۔ وہاں کے حکام سے بڑی شناسائی ہے ان کے ذریعہ سے میں اپنے اعقاب کی فکر کرنی چاہتا ہوں۔ نواب صاحب کریم النفس نے اعقاب کی فہرست مانگی۔ مولانا نے بشیر الدین (فرزند)، احمد حسن (داماد) اور مولوی شرف الحق (داماد) کی رسم نویسیاں پیش کر دیں۔ یہ فہرست سالار جنگ نے یہ کہہ کر محسن الملک کو دی کہ مولانا سے پوچھ کر وہ ان لوگوں کو خدمات مناسب پر نامزد

کردیں۔ چنانچہ مولوی بشیر الدین کے نام ۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ کارآموزی جاری ہوا اور دونوں داماد چار سو اور ڈھائی سو ماہوار پر مامور ہو گئے۔ ملازمت حیدر آباد کے زمانہ میں جبکہ صوبۂ شمالی کے صدر تعلقہ دار تھے مولانا نے باوجود کثرتِ کار چھ مہینے کی مدت میں پورا قرآن مجید اپنی بیوی کو سنا سنا کر حفظ کرلیا۔ تراویح بھی سنائی تھی مگر غلطیاں کرتے تھے۔

حیدر آباد کی ملازمت میں انقلاب اور استعفیٰ:

ریاست کی ملازمت کے متعلق ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

> "جو یہاں ہے وہ وہاں (ممالک متحدہ میں) نہیں یعنی عزت و آبرو، بیش قرار تنخواہ۔ اور جو وہاں ہے وہ یہاں نہیں یعنی قاعدہ قانون اور کامل اطمینان۔ باقی جو وہاں سو یہاں، جو یہاں سو وہاں۔ دلی میں برائے نام ایک بادشاہ تھے جن کو لاکھ روپے مہینہ پنشن کے طور پر ملتا تھا۔ میں نے یہاں ایک سلطنت دیکھی کہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ لاکھ سالانہ کے جاگیردار ہیں۔ غرض مسلمانوں کی سلطنت کی ایک یادگار ہے۔"

جب سالار جنگ کا انتقال ہوا اس وقت مولانا مجلس مالگزاری کے ممبر مقرر ہو چکے تھے۔ ۱۷سو تنخواہ ملتی تھی۔ یہ دور سالار جنگ کے فرزند نواب لائق علی خاں بہادر سالار جنگ ثانی کی صدر المہامی کا دور تھا۔ ممبروں کی سازش اور آپس کے اختلاف کی وجہ سے مولانا نے مجلس میں استعفیٰ پیش کر دیا۔ نواب لائق علی خاں بہادر نے جو مولانا کے شاگرد بھی تھے مولانا کے لئے مشیر مال کا ایک نیا عہدہ تراشا جو برائے نام تھا۔ تنخواہ پوری، کام دراصل کچھ بھی نہیں۔ مولانا کو یہ بے عزتی گوارا نہ ہوئی۔ بہت سمجھائے جانے کے بعد بھی مولانا اس عہدہ پر راضی نہ ہوئے تو استعفیٰ قبول کر لیا گیا اور مولانا کبیدہ خاطر ہو کر حیدر آباد سے نکل کھڑے ہوئے کسی کو خبر نہ ہوئی کہ کب گئے۔ گھر کا سامان، گھوڑا گاڑی سب بھرا پڑا چھوڑ گئے جو بعد کو کوڑیوں کے مول نیلام ہوا۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

> "سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد سبھی آوردوں کے پائے ثبات لڑکھڑا اٹھے اور جو سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا وہ میں تھا۔"

گورنمنٹ آف انڈیا اور حکومت حیدر آباد دونوں کی مدتِ ملازمت تیس سال سے کم پڑتی تھی اس لئے مولانا کو ان رسائل کا لحاظ کرتے ہوئے جو حضور نظام کے لئے لکھے گئے تھے، چھ سو روپے ماہوار پنشن مقرر ہو گئی جو تا حیات ملتی رہی۔ پنشن کے بعد سے تا زیست مولانا دہلی ہی میں رہے۔

منٹو

یہ سعادت حسن منٹو کی افسانوی رنگ میں سوانح ہے جسے منٹو کے بچپن کے دوست ابو سعید قریشی نے لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوانح میں بڑا توازن اور بڑی کام کی باتیں ہیں۔ اس میں منٹو کی نہ تو بے جا تعریف ہے اور نہ ہی خدا واسطے کی دشمنی، منٹو جو کچھ اور جیسا کچھ تھا اسے ہو بہو قریشی نے پیش کر دیا ہے۔

قیمت ۴/۴

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

ضمیمہ

شخصیّات نمبر

یہ وہ مضامین ہیں، جو شخصیات نمبر ۲
میں بروقت نہ ملنے کی وجہ سے
شائع نہیں ہو سکے تھے۔

(ادارہ)

علّامہ سیّد علی حیدر نظم طباطبائی

ابوالخیر مودودی

طباطبائی صاحب کا تخلص ان کی شخصیت تھا اور شخصیت ان کا تخلص۔ وہ سراپا نظم ہی نظم تھے۔ نپے تُلے قدم، بچے تلے بول، سانچے میں ڈھلی وضع قطع، لہجے میں نرمی، آواز میں دھیماپن، ناملائم بولی ٹھولی سے ناآشنا، خوش صفات و پاک نہاد، تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ اوصاف سے آراستہ، نشست و برخاست کا جو طریقہ اپنے دیوان خانے میں وہی سرکار دربار میں، کیا مجال جو سرمو کہیں فرق آجائے۔ شعر و سخن کی صحبتوں میں داد اسی شعر پر دیتے اور یکساں لب و لہجے میں جو ان کے معیار کا ہوتا، شعر کسی کا ہو اس سے ان کو واسطہ نہ تھا! جوش ہوں یا مہاراجہ سرکشن پرشاد، اپنے معیار کو وہ کسی کے لئے قربان نہیں کرتے تھے، داد میں بھی نظم تھا: "اچھا کہا ہے" مشفقانہ لہجے میں، "خوب بات نکالی ہے" "یا ایسا ہی کوئی حسب موقع لفظ شفقت اور اپنی منزلت کے ملے جلے انداز میں، اور دھیمی آواز میں بے ساختہ "واہ" سب سے بڑی داد تھی۔ فن میں ان کا یہ گراں مایہ خلوص ان کی شخصیت کا ایک عکس ہے۔

اُردو شاعری میں تخلص کی جو کچھ بھی نوعیت ہو، طباطبائی صاحب کا تخلص واضح اور متعین نوعیت کا حامل ہے۔ وہ ایک واضح ہے جو ہمیں ان کی شخصی اور فنی افتاد مزاج سے آگاہ کردیتا ہے۔ نظم، دل کی اُمنگ نہیں دماغ کا حکم۔ شعر دل سے نہیں ابلتا دماغ سے تراوش کرتا ہے۔ اُردو شاعری کے پورے دفتر میں شاید ہی کسی شاعر کا تخلص اس کی شخصیت اور اس کے فن سے اس قدر یک جان اور اس کا ترجمان ہو جس قدر کہ طباطبائی صاحب کا تخلص۔ شخصاً وہ "اخلاق ناصری" تھے۔ مشیت نے "اخلاق ناصری" کو انسانی پیکر عطا کرنا چاہا، علی حیدر نظم کو جنم دے دیا۔ کہاں گنجائش تھی کہ علی حیدر صاحب مغازلت کرتے، اور کوئی حسین خیال کوئی کوندا لپکتا، لہلہاتا جذبہ قالب اظہار اختیار کرتا۔ اگر وہ غزل کے ماحول میں پیدا نہ ہوتے تو نہ غزل ان کے قریب پھٹکتی نہ وہ غزل کے قریب پھٹکتے۔

طباطبائی صاحب مشرقی علوم کے نہایت بلند دست گاہ عالم، قادر الکلام ادیب اور انگریزی ادبیات کے صاحب کمال رمز شناس تھے۔ عروض و قافیہ کا علم قدیم درسیات کی تکمیل کا لازمی حصہ تھا، طباطبائی صاحب نے درسی حد پر اکتفا نہ کی، ماحول کے تقاضوں سے اس علم میں، بلکہ ادبی صناعتوں کے تمام علوم میں استادانہ کمال حاصل کیا۔ شعر گوئی ان کے کمالات کا محض ایک گوشہ ہے، وہ شاعر ہونے سے زیادہ عالمِ شعر و ادب ہونا بہتر سمجھتے تھے۔

حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے مغربی تعلیم کا واحد اور اولین مرکز (جامعہ مدراس سے ملحق) نظام کالج تھا۔ طباطبائی صاحب پہلے شخص تھے جو اس کالج میں عربی فارسی اور اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور مدتوں ان تینوں زبانوں میں جامعہ مدراس کے ممتحن رہے۔ شرح غالب اسی پروفیسری کی یادگار ہے اور اسی لئے

نی ہے اور یہ کیفیت اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اُردو کے ادبی ذخیرے میں نقدِ شعر پر یہی ایک فنی کتاب ہے جو ہمیں شاعری کے مطالعے کا علمی طریقہ سکھاتی ہے ایک شاعر کے حسین خیالات اور چبھتی ومکتی ترکیبوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اس کی صنّاعی کی خوبیوں کو نہیں جانتے۔ ہم ایک شاعر کو سراہتے ہیں مگر اُنگلی رکھ کر یہ نہیں بتا نہ کر اس کے شعر میں کیا خوبی ہے، اور اس وجہ سے کہ فنونِ شعر میں درک نہیں ہوتا، ایک شاعر کو دوسرے شاعر میں پرو دیتے ہیں۔ پھر بسا اوقات شاعر اتنا اونچا جاتا ہے کہ فن ے متداول قاعدے گردِ راہ بن جاتے ہیں، اس کا جذبۂ تمام فن کے سانچے کو توڑ دیتا ہے اور اس کی شگرف کاری نئے سانچے ڈھالتی اور فن کو نیا شعور عطا کرتی ہے۔ ہم اسی ست وریخت کے حسن اور شاعر کے اصلی کمال کو تبھی سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں شعر کے آداب میں گہرا فنی شعور حاصل ہو۔ شرح طباطبائی، اگر ہم شعرِ غالب سے قطع نظر کر لیں اور اس ے فنی اور اصولی مباحث سے استفادہ کریں، ہمیں فنونِ شعر کے بہت سے، لکھے بے لکھے، نکتے سمجھاتی سُجھاتی ہے اور اس شعور کی یافت میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اگرچہ و طباطبائی صاحب اسیرِ حلقۂ دامِ نظم و قواعد ہیں۔

نظام کالج میں مدتوں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے تو کچھ علمی ادبی کام سپرد کر دیئے گئے۔ پھر جب عثمانیہ یونیورسٹی کا شعبۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا ز اعلیٰ حضرت اقدس و اشرف نے ان کو ترجموں کی ادبی اصلاح کے لئے بطورِ خاص ناظرِ ادب مقرر فرما دیا، اور یہیں مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ بوڑھے شیر نے جس کے سامنے ہوش سنبھالا ہو اور ہوش ہی نہیں جس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہو اس کی عمر سن چوبیس میں پچھتر اسّی سے کیا کم ہوگی۔ بھویں تک سفید، چہرہ صبیحہ سجادیہ، ریحانِ شباب کی طراوت سے روکش، قد کشیدہ، نہ ہاتھوں میں رعشہ نہ قدموں میں، پابندی سے دفتر آتے۔ اپنے کارِ منصبی کے علاوہ عربی انگریزی سے ترجمے کا بھی کام کرتے اور وضعِ اصطلاحات کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے۔ پھر سنہ ۲۶ء میں خود ہی اس خدمت سے دست کش ہو گئے مگر علمی مشغلہ آخر دم تک قائم رہا۔ مئی سنہ ۳۳ء میں وفات پائی۔

حیدرآباد میں یہ عام چلن تھا کہ خطاب ہی میں نام گم ہو جاتے تھے۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ خطاب یافتہ صاحب اپنا کوئی اصلی نام بھی رکھتے ہیں یا بطنِ مادر سے خطاب ہی لپٹے تولد ہوئے تھے۔ جہاں دیکھئے، جسے دیکھئے آدمی گم خطاب حاضر۔ طباطبائی صاحب بھی خطاب یافتہ تھے، مگر انہوں نے اپنے نام کو خطاب سے بالا رکھا۔ خطاب دفتر میں، علی حیدر گھر میں۔ ایک دفعہ میں نے ایک نجی خط میں غلطی سے اور اپنی عادت کے خلاف ”نواب حیدر یار جنگ بہادر“ لکھ دیا، فرمایا: اے حضرت، یہ کیا قیامت ہے آپ بھی ناشناسوں کی چال چلنے لگے! ان کے پرانے پرانے ملنے والے اور وہ لوگ بھی جنہوں نے ان کو حیدرآباد کی ابتدائی زندگی کے زمانے میں دیکھا تھا کہتے تھے کہ شروع میں طبیعت کا جو انداز تھا وہی آج بھی ہے نہ پہلے کوئی عجز و انکسار تھا نہ آج کوئی نیا پندار ہے۔ چلن میں بہک پہلے بھی نہ تھی اب بھی کوئی نئی عفت نہیں۔ سیرت کی یہ استواری ایک مستقل احترام تھی۔

طباطبائی گھرانا اتنا قدیم ہے جتنی کہ خود اسلامی تاریخ۔ امام حسن علیہ السلام سے چوتھی پشت میں طالبیوں اور علویوں کے ایک بزرگ خاندان ابراہیم بن اسماعیل تھے، ایک دن انہوں نے خادم سے لباس طلب کیا، کہنا چاہتے تھے: ”قبادو“ زبان سے نکلا: ”طبا طبا“۔ اس دن سے وہ ’طبا طبا‘ ہو گئے اور ان کی اولاد طباطبائی کہلائی۔ عباسیوں اور فاطمیوں کی خلافت میں اس گھرانے کے اکابر طالبیوں کے نقیب بھی رہے اور شریفِ مکہ بھی۔ اور بقول ابن خلدون یمن کے زیدی ائمہ بھی اسی گھرانے سے ہیں۔ علم اور تہذیب شرف میں یہ لوگ عرب و عجم میں یکساں ارجمند رہے، اودھ میں یہ گھرانا نواب وزیر کے بلاوے پر شیراز سے آیا تھا، بزرگ داشت ہوتی ہی تھی۔

طباطبائی صاحب کی زندگی کا موسمِ بہار جانِ عالم واجد علی شاہ کے دربار میں گزرا۔ وہ مٹیا برج کی بزمِ سخن کے جوہر دار رکن اور شہزادوں کے معلم و اتالیق تھے۔ واجد علی شاہ کے داماد اور بھتیجے مرزا جہاں قدر نیّر نے امرؤ القیس اور طرفہ کے قصیدوں کو اُردو شعر میں ڈھال دیا۔ طرفہ ایک نصیحت گر دوست کو خطاب کر کے کہتا ہے:

لعمرک ما امری علیّ بغمۃٍ　　نہاری ولا لیلی علیّ بسرمدٍ

نیّر نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

ڈرا طولِ شبِ غم سے نہ میں روزِ مصیبت سے　　ترے سر کی قسم، مشکل کو مشکل میں نہیں سمجھا

کم و بیش بیس سال طباطبائی صاحب مٹیا برج کی فضا میں رہے۔ دربار کی خزاں اور ان کی بہار ایک ساتھ آخر ہوئی۔ وہ ان لوگوں میں آخری شخص تھے جو بادشاہ کی وفات کے بعد بھی مٹیا برج کے مکینوں سے وابستہ رہے، اور حیدرآباد آنے کے بعد بھی واجد علی شاہ کے پوتے پرنس مرزا محمد مقیم سے، ان کی زندگی تک اسی نہج پر تعلق قائم

رکھا[1]

جانِ عالم پیا کا دربار اور یہ اخلاق ناصری ”مئی جون کی تتار دھوپ! —— مگر تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ساون بھادوں کی جھڑی کا لطف اس کی رُت میں ہے۔ اور دھوپ میدانوں میں پھیلتی ہے تہ خانوں میں نہیں گھستی —— پھر ناشیر خوار علم کا شیوہ ہے، علم جب وسیع ہوتا ہے، انسانی فطرت سے فہمیدہ معاملت کرتا ہے، اور فطرت جب شائستگی سے نکھار پاتی ہے، خوش فعلی کو رائیگاں نہیں کرتی خوش وقتی کے امتزاج سے اس کو زیادہ تاب کار بناتی ہے۔ مے خانۂ سخن میں دستاریں اس لئے نہیں اچھلتیں کہ یہ کوئی محبوب مشغلہ ہے، اس لئے اچھلتی ہیں کہ فطرت ناآسودہ ہوتی ہے، کچھ اور نہیں دستار ہی سہی۔ کم نگاہی اور کج نگاہی زندگی کے محدود دائروں کو پوری شخصیت سمجھ لیتی ہے، اگر مشغلے اور زندگی کی راہیں فطرت اور ظرف کے اصلی پیمانے نہیں ہوتے۔ فطرت کے امکانات بہت وسیع ہیں، اس کو احسن تقویم سے اسفل سافلین تک پھیلی ہوئی پوری جولاں گاہ میں دیکھنا چاہئے۔

دارالترجمے میں بھی طباطبائی صاحب کے لئے ایک بہت بڑا مٹیا برج موجود تھا، مرزا رسوا! مدرسۃ الواعظین سے امراؤ جان آدا تک ایک پوری دنیا! اور حسنِ اتفاق سے دونوں کے کمرے باہم ردیف و قافیہ۔ مگر نہ ان کا مذاق اور مشغلے ان کا پورا ظرف تھے، نہ ان کی زندگی کا محدود دائرہ ان کی پوری شخصیت۔ کلچر کے فیض سے غزل اور نظم بے تکلف

---

[1] کلکتہ کے ایک انگریز بیرسٹر کا مضمون لندن ٹائمز (۲۰ جولائی ۱۹۳۱ء) میں پرنس مرزا محمد مقیم کی موت پر شائع ہوا تھا۔ اس کے تاثرات میں انسانیت کا جوہر ہے۔

”اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے ایک پوتے پرنس مرزا محمد مقیم بہادر نے ، ارجون کی دوپہر کو داعی اجل کو لبیک کہا —— ہندوستان میں ایسے کتنے آدمی موجود ہیں جن کا دل یہ غمناک خبر پڑھ کر بھر آیا ہو؟ بہت کم! لیکن مجھے مرحوم شہزادے کے زمرۂ احباب میں داخل ہونے کا فخر حاصل تھا، اس لئے دل کہتا ہے کہ جب اس کا جنازہ سامنے سے گزرے تو تعظیم سے اس کے آگے جھک جاؤں۔

۱۹۰۷ء میں ہمارا تعارف ہوا۔ مرحوم ایک مصیبت کے وقت مجھ سے ملنے آئے تھے۔ کئی سال سے خاندان اودھ عسرت و افلاس کے پنجے میں پھنس گیا تھا اور روز بروز یہ پنجہ سخت ہوتا جاتا تھا۔ شاہی خاندان کی ایک بیگم اپنی جائداد پر کچھ قرض لینا چاہتی تھیں۔ اسی ضمن میں میرا مشورہ طلب کیا گیا تھا۔

گارڈن ریچ کے قریب ساحل دریا پر جو عظیم الشان عمارت اپنی عظمت رفتہ پر ماتم کر رہی ہے، میں کئی مرتبہ اس میں جا چکا ہوں۔ لیکن جب کبھی اسے دیکھتا ہوں، دل سے ایک ہوک اٹھتی ہے اور زبان سے آپ ہی آپ ان لوگوں کے حق میں نعرۂ تحسین نکل جاتا ہے، جنہوں نے بڑی بڑی مصیبتوں میں بھی جبین پر شکن نہ آنے دی اور ہمیشہ سر بلند ہی رہے۔

بچہ بچہ جانتا ہے کہ انگلستان نے ہندوستان کی عنان حکومت جب اپنے ہاتھ میں لی تھی اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ سے ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق انہوں نے اودھ کو خیرباد کہا اور کلکتہ میں سکونت اختیار کی، جہاں انہیں وسیع اور شاداب زمینیں دی گئیں۔

میرا یہ مرحوم دوست شہزادہ اسی جائداد کی بچی کھچی آمدنی پر گزر اوقات کرتا تھا۔

اپنی آبادی کے زمانے میں یہ ایوان کتنے شاندار ہوں گے! اب جن باغوں کو بوٹانیکل گارڈن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان کے سامنے ندی کے کنارے پرتکلف عمارتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ایک زمانے میں یہ باغ شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھے۔ محلوں کے اندر گلاب اور جوہی کے پھولوں کے تختہ زار تھے ……

لب ساحل محلوں کے باہر کا میدان بھی خاندان اودھ کی ملک تھا۔ اس سب کی قیمت معقول لگائی گئی تھی۔ کنگ جارج ڈوک کی طرف جو سڑک جاتی ہے، آج بھی اس کے دونوں طرف تنگ و تاریک کوٹھیوں کے کھنڈر خاموش کھڑے ہیں۔ اب ان مکانوں کو کوئی کوڑی کے مول بھی نہیں پوچھتا۔

ہم محل کی طرف روانہ ہوئے۔ اس کا عظیم الشان صدر دروازہ کسی بھی برسرِ اقتدار تاجدار کے لئے باعث ناز ہو سکتا تھا۔ گنبد کے پہلو میں نوبت خانہ تھا۔ دربان صرف ایک تھا، جس نے بڑی تمکنت سے پھاٹک کھول دیا۔ اس کا لباس تار تار ہو گیا تھا مگر یہ طلائی تار تھے! کپڑا لاجوردی رنگ کا تھا۔ دل سے ایک آہ اٹھی اور زبان پر آ کر رک گئی۔ اس شکستہ در نے تباہی و بربادی کے کیسے کیسے جاں گداز نظارے دیکھے ہوں گے!“

نہ سیکھی تھی۔ دونوں باکمال بوڑھے جب مل بیٹھتے اس قدر شگفتہ باتیں کرتے کہ یوں معلوم ہوتا کہ جوئے آب ہے جو گلزاروں سے بہتی چلی آ رہی ہے۔ بڑھاپا پیچھے مڑ کے دیکھتا ہے، مگر یہ دونوں خرد مند بوڑھے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتے تھے جوانی اور بڑھاپے کے سنگم پر چلے جاتے اور وہاں سے ایک آنکھ سے ماضی کو دیکھتے اور ایک آنکھ سے حال کو، اور لگے وقتوں کی تہذیب و معاشرت کے دیدہ و شنیدہ ان پہلوؤں پر گفتگو کرتے جن کے عیب و صواب کو نئی تہذیب و تعلیم کے تصادم نے محسوس کرایا۔

پھر کلچر کی یہ خوبی اپنی جگہ خود ایک نظر افروز نمونہ تھی کہ طباطبائی صاحب جو سن و سال میں مرزا رسوا سے دس پانچ برس بڑے تھے، مرزا رسوا اس بڑائی کا خلوص میں پاس و لحاظ کرتے۔ ہمسری کا ادعا نہیں، اپنی اور ان کی منزلت شناسی کے ساتھ بزرگ داشت۔ گفتگو میں امراؤ جان کے ضلع کا اشارہ بھی نہ آنے پاتا۔

ایسی پاکیزہ شخصیتیں اب ڈھونڈے نہیں مل سکتیں۔ یہ اس دور کی یادگار تھیں جب سنسار کی راج سنگھاسن پر صنعتی انقلاب کا دیو براجمان نہ ہو پایا تھا۔ تہذیب ایک تسلسل کے ساتھ مزاجوں کو معاشرے میں سموتی اور ان سے بیچ کرتی چلی آ رہی تھی۔ اس بیچ نے معاشرے کے مختلف گروہوں میں وہ لوچ اور رس پیدا کر دیا تھا جو تہذیب کے تسلسل ہی سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ یہ کلچر جیسا کچھ بھی تھا، اسی میں گھنیر پن تھا، وحشت نہ تھی۔ قدریں متعین تھیں اور مستقل تھیں۔ معاشرتی عضویئے اپنا ایک مستقل اور ہم آہنگ کردار رکھتے تھے اور اپنے رنگا رنگ کرداروں سے معاشرے کو خوش رنگ بناتے تھے — نخلستان کے بغیر بدوی بھی ریگستان میں زندہ نہیں رہ سکتا — انشاء اللہ خاں نے "دریائے لطافت" میں اپنے زمانے کے شہدوں اور رنڈیوں کا جو کلچر اور کیرکٹر لکھا ہے، کلچر کا تو ذکر ہی کیا، وہ زوردار کیرکٹر آج نئے اور پرانے بلند مقاموں اور پُر شکوہ نقار خانوں میں ڈھونڈے نہیں مل سکتا۔ صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس ایک خطِ فاصل ہے جو دیوار چین اور کوہستان ہمالیہ کی طرح تہذیبی تسلسل کے اس دور کو اپنے لابھ اور لوبھ کے سماج سے بالکل جدا کر دیتا ہے۔ انقلاب کی فطرت توڑ پھوڑ ہے، بناؤ اور تدریجی ارتقا نہیں۔ جو کچھ پہلے مقدس و محترم تھا۔ بقول مارکس صنعتی انقلاب کے سرمایہ دار تمدن نے اس کو مول تول کے چہ بچہ میں غرق کر دیا۔ اب کوئی چیز مقدس نہیں، کوئی چیز اپنی مستقل قدر نہیں رکھتی؛ ہر چیز ٹریڈ مارک ہے، علم اور مذہب دونوں انقلابی ہیں اور دونوں سیاست کے باربردار جانور! کلچر اور اس کی نمود اب گئے گزرے وقتوں کی کہانی ہے۔

میں نے طباطبائی صاحب سے کہا: کیا اچھا ہوتا کہ آپ اس بدنام بادشاہ پر ایک کتاب لکھ دیتے کچھ خوبیاں بھی اس تیرہ بخت میں ضرور ہوں گی، طباطبائی صاحب کے چہرے پر حزن سا طاری ہوا، کہنے لگے: ایسی آوازیں کم سننے میں آتی ہیں۔ آئین دنیا ہمیشہ سے یہی ہے کہ ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند۔ میں نے بہت مواد جمع کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رکارڈوں سے، اور بہت سے سرکاری غیر سرکاری روزنامچوں سے، اور لندن کے اخباروں کے جو نامہ نگار بادشاہ سے مٹیا برج کے قیام کے زمانے میں ملے اور انہوں نے اپنے اخباروں کو مضمون بھیجے، یہ سب مسالا میں نے جمع کیا تھا۔ کلکتہ میں ایک انگریز وکالت پیشہ تھا، یہ آخر زمانے کی بات ہے، وہ بادشاہ کا بہت گرویدہ ہو گیا تھا، اس نے بھی مواد کی فراہمی میں بہت مدد دی۔ مگر صاحب، وہ سارا مواد اور لکھی لکھائی کتاب اس طغیانی کی نذر ہو گئی جو ۱۹۱۱ء میں رود موسیٰ میں آئی تھی ——

پھر گفتگو واجد علی شاہ کے ذاتی اوصاف پر چل نکلی، طباطبائی صاحب کے لہجے میں تفہیم کا دھیما پن اور دردمندی کا گداز تھا، انہوں نے کہا۔ بادشاہ میں خوبیاں بھی تھیں عیب بھی تھے۔ ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے سلطنت کی عمر پوری ہو چکی تھی۔ اسی انیسویں صدی کی ابتدا کی تو بات ہے کہ ویمر کے بادشاہ سلامت اگسٹ کارل اور گوئٹے اور بادشاہ کے ندیمانِ خاص کسانوں کی لڑکیوں کے ساتھ ناچتے تھے اور سرِ دربار کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اودھ میں تو ایسا منظر کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ بایں ہمہ نئے جرمنی نے جنم لیا اور اودھ کی سلطنت مٹ گئی۔ بننے بگڑنے کے بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔ ایک چنا بھاڑ نہیں پھوڑا کرتا۔ سلطنت کی تباہی کا ذمہ دار پورا معاشرہ تھا۔ شیرازہ تو مسلمانوں کی ملک داری کا اس ملک میں برسہا برس سے بکھرنا شروع ہو چکا تھا حضرت عالمگیر بادشاہ کی ذات میں شکست و ریخت جمع تھی۔ ان کی آنکھ بند ہوئی شکست رہ گئی ریخت نابود ہو گئی۔ دلی اور اودھ اور دکن میں یہ جو کچھ بھی آنکھوں نے دیکھا اس کو سنبھالا سمجھئے۔ کتنی قوی ہار ہو گی جو سنبھالے نے اتنا دم لے لیا۔ واجد علی شاہ نوجوانی میں تخت پر بیٹھے تھے۔ دانشمندی مستعدی سے حکمرانی شروع کی۔ دادگستری اور اصلاح لشکر پر خاص توجہ تھی، طلوعِ صبح سے تین بجے دن تک ایک دم کو بھی استراحت نہ کرتے، بہت کچھ کیا، ان کی کارپردازی کے ثبوت ہیں، مگر یہ سب چند روز کی بہار تھی۔ سرطان کو

راج پھوڑا کہتے ہیں، ہمارے راج میں یہ پھوڑا مدتوں سے اپنی جڑیں پھیلائے جا رہا تھا۔ بادشاہ اٹھے تھے لشکر کی اصلاح کرنے، اب جو دیکھتے ہیں عورتوں کی فوج مرتب ہو رہی ہے۔ فقط ایک بادشاہ کی ذات تھی جس میں ملک داری کی استعداد تھی باقی آوے کا آوا بگڑا ہوا۔ شکار گاہوں میں شیر کو جب شکار کرتے ہیں اس کا ہانکا کیا جاتا ہے، اودھ کی سلطنت شکاریوں کی شکار گاہ بنی ہوئی تھی، بادشاہ کا ہانکا کیا جا رہا تھا —— انسانی فطرت خوبیوں کو دیر میں قبول کرتی ہے۔ بلندی پر چڑھنا کٹھن ہوتا ہے۔ نفس کی ادنیٰ خواہشوں کی طرف جلدی لپکتی ہے۔ نشیب کی طرف اترنا سہل ہوتا ہے۔ بادشاہ بہت سی لغویتوں اور عشرتوں میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن انتہائی عیش پسندیوں کے باوجود کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی بازاری طوائف کو باریابی کا موقع ملا ہو۔ وہ اپنی شریعت کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کرتے تھے۔ مٹیا برج میں ایک امام باڑہ "بیت البکاء" بنوایا تھا، جب وہ تیار ہو گیا، اس میں سادات ملازمین کی ضیافت کی اور حسن عقیدت سے آفتابہ خود ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوئے۔ خود سب کے ہاتھ دھلائے۔ وہ اپنی ذات سے بہت نیک دل اور داد گستر تھے۔ کسی موافق یا مخالف، یگانہ و بیگانہ کے ساتھ عدل میں رعایت نہ کی، کسی کے ساتھ بے رحمی نہ کی، کسی مخالف کو ستایا نہ کسی کی جان لی۔ ان میں غرور نخوت نام کو بھی نہ تھا جس سے ہزاروں میں کوئی امیر رئیس خالی نہیں ہوتا، ہر فرد بشر کے سلام کا جواب دیتے، خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور نرمی سے گفتگو کرتے۔ یہ بات سننے کے قابل ہے، باڑہ کے رہنے والے ایک صاحب امیر علی خاں ہائی کورٹ کے وکیل تھے، مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے، بتدریج ایسا تقرب حاصل کیا کہ وزیر السلطان خطاب ہوا، تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے۔ ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں۔ ان حضرت نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں میجر کوبنیا قلعہ دار فورٹ ولیم کو ایک جھوٹی خبر پہنچائی تھی کہ راجہ مان سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے اس مضمون کا ایک فرمان مزین بمہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھ غدر کر کے انگریزی تسلط اٹھا دیں۔ میجر کوبنیا نے فوراً یہ واقعہ نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا، وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہوا۔ بادشاہ فورٹ ولیم میں قید کر دیئے گئے۔ لیکن خبر جھوٹی تھی، معلوم ہو گیا کہ اس روز تو راجہ مان سنگھ لکھنؤ میں موجود تھے۔ میجر کوبنیا نے اپنے "گوینده" امیر علی کی مخبری اور خبر کی بے اصلی کا سارا واقعہ اپنے روزنامچے میں لکھ لیا تھا، حریفوں نے اس کا روزنامچہ منگایا اور شاہزادہ مرزا جہاں قدر کی وساطت سے بادشاہ تک پہنچا دیا۔ مگر بادشاہ عجب نفس رکھتے تھے، فرمایا کہ اس زمانے میں امیر علی میرے ملازم نہ تھے —— مثنوی "دریائے تعشق" بادشاہ کے کلام میں ایک ممتاز چیز ہے، اس مثنوی میں جو قصہ ہے اسی کا رہس ہوا کرتا تھا۔ اسی پر اہل شہر طعنہ زنی کرتے تھے کہ ہائے غضب! بادشاہ ناچتے ہیں۔ اصل اور بے اصل کی بات تو خدا ہی جانے، وہاں ندیمانِ خاص کو بھی بار نہ تھا۔ بادشاہ کے محل میں ایک گروہ رہس والیوں کا تھا۔ وہی اس قصے کا رہس کیا کرتی تھیں۔ ان کے محل میں عورتوں کے گروہ تھے، اپنے اپنے درجے اور مرتبے کے مطابق ان کی جدا جدا منزلیں تھیں: جھومر والیاں، گھونگٹ والیاں، نتھ والیاں، لکن والیاں، سار دھا منزل والیاں، رادھا منزل والیاں، رہس والیاں یہ سب ممتوعہ تھیں۔

ممتوعہ! —— جاریہ! —— لیلیٰ! —— نام جو چاہے رکھ دیجئے، ظرف ایک ہے —— ذائقہ تنوع چاہتا ہے!

طباطبائی صاحب بہر حال نظم تھے۔ جس قدر علی حیدر اسی قدر نظم! حضرت نظم نے فرمایا: "مگر شعر ذرا سوچ سمجھ کر کہنا نہ جانتے تھے۔ فکر شعر کے وقت دو دو تین تین خوش نویس لکھتے جاتے تھے۔ ایک شعر اس نے لکھنا شروع کیا تھا کہ دوسرا اور تیسرا شعر بھی تصنیف ہو گیا۔" اور شخصیت نے اپنا خاکہ مکمل کر دیا۔

عرفی اور فیضی کے جوہر کمال کو خان خاناں کی بزم تادیب نے چمکایا، طباطبائی صاحب کا ادبی تشخص مٹیا برج کی بزم سخن سے ارجمند ہوا۔ علم سے بہرہ ور نوجوان میں اپنے اظہار کی امنگ ہوتی ہے اور علمی بنیادیں جس قدر زیادہ استوار و محکم ہوں۔ انفرادیت کا حوصلہ اسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ ماحول کے ساتھ اسی حوصلہ مندانہ انفرادیت کے عمل و ردّ عمل نے طباطبائی صاحب کے ادبی تشخص کو جنم دیا اور ادبی تشخص نے ان کی شخصیت کو، پھر اس سے ترکیب پا کر ایک نئی انفرادیت ابھری۔ کچھ الگ انداز فکر، اپنا ایک جداگانہ رنگ، اپنا ایک ممتاز نقطہ نظر۔ ان کا ایک مضمون ہے: "مٹیا برج کے سبع سیارے"۔ یہ سبع سیارے واجد علی شاہ کے منتخب شاعر تھے، مضمون میں انہی سیاروں کی ایک جھلک دکھائی ہے، اس جھلک میں جگہ جگہ خود طباطبائی صاحب موجود ہیں اور ہمیں اپنے حوصلۂ اظہار ذات کی قوت اور امنگوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

—— "فتح الدولہ برقؔ، ناسخؔ کے شاگرد، بادشاہ کے استاد تھے ...... خاص رنگ ان کا بنوٹ ہے اور شعر میں نئے طرز کی بنوٹیں کرنا یہ ناسخ والوں کا ایک ممتاز طریقہ ہے ...... مرنے وقت بادشاہ کے پاس یہ شعر لکھ کر بھیجا ؎

برقؔ جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اُٹھے
جان دی، آپ کے دروازے پہ مر کے اٹھے

حالتِ احتضار نے اس شعر میں ذرا تعقید پیدا کر دی ہے، یعنی جو منہ سے کہا تھا برقؔ وہی کر کے اُٹھے۔

—— منشی مظفر علی اسیرؔ نے مجلس میں سلام اور مرثیہ پڑھا، سلام میں یہ مصرع تھا:

سزاوارِ خلافت اور امامت ایسے ہوتے ہیں

جب وہ پڑھ کے اُترے اور مجلس برخاست ہو گئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ سزاوار خلافت فارسی ترکیب ہے۔ خلافت پر امامت کا عطف "اور" کے ساتھ کیا درست ہوگا؟ فوراً سمجھ گئے، کہا کہ اس شعر کو سلام میں سے نکال ڈالوں گا۔

—— میری ایک غزل میں یہ مصرع تھا:

بسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے

منشی مظفر علی اسیرؔ نے مجھ سے کہا: معاف کیجئے گا بسانِ نکہتِ گل کی جگہ برنگِ نکہتِ گل آپ کہتے تو ایہام تناسب کا حسن پیدا ہو جاتا۔ میں نے کہا: برنگِ گل اس قدر لوگوں نے کہا کہ میں نے تو عمداً اس لفظ کو ترک کر دیا ہے۔ جس بات کو ہزار دفعہ لوگ کہہ چکے اس کے باندھنے میں اب کیا لطف رہا۔ اگر اس میں کچھ حسن تھا بھی تو وہ مبتذل ہو گیا۔ اس کے علاوہ آپنے یہ نہ خیال فرمایا کہ بسانے کے لفظ میں بھی بوئے گل کے ساتھ ایہام تناسب موجود ہے، جو کسی نے نہیں کہا۔ اسیرؔ اس جواب کو سن کر پھڑک گئے، جیسے ایک پردہ پڑا ہوا تھا وہ اٹھ گیا۔

—— مرزا مسیتا عیشؔ ناسخ والوں میں ہیں۔ نازک خیالی کے مدعی اور بنوٹ کے استاد ہیں .... سلام کے اس مطلع میں جو بنوٹ کی ہے ملاحظہ ہو ؎

سلامی حال عابد جس جگہ میں نے لکھا دیکھا
مرے پائے نگاہ نے بن کے چشم آبلہ دیکھا

میں نے کہا: یہاں چشم آبلہ کو قافیہ کرنا غلط ہے۔ انہوں نے میرا یہ مصرع پڑھا:

روانہ جادۂ شمشیر پر یہ قافلہ دیکھا

یعنی میں نے آبلہ کی ہ کو الف بنا لیا تو آپ نے بھی تو قافلہ کی ہ کو الف بنا لیا۔ میں نے جواب دیا کہ چشم آبلہ فارسی ترکیب ہے، فارسی لہجے میں آبلہ کو آبلے کہیں گے نہ کہ آبلا۔ اسی سبب سے شعرائے فارسی کے کلام میں کہیں ہ کو الف کر کے قافیہ بنایا ہو۔ آپ نہ دیکھیں گے۔ ہاں تنوین کو نون کر کے حافظ نے قافیہ کیا ہے۔

مگر وقت عطا پروردن آمد
کہ فالم لاتذرنی فرداً آمد

اس سبب سے کہ ان کا لہجہ اس کے موافق ہے۔

—— منشی اسیرؔ کے ایک شاگرد تھے آغا حسن مذہبؔ، انہوں نے اپنا مطلع میرے سامنے پڑھا ؎

غزل پڑھوں میں دعائے ہلال کی صورت
عیاں ہے ابروئے جاناں ہلال کی صورت

میں نے کہا: قافیہ مکرر ہو گیا۔ اس مطلع میں ایطا ہے۔ انہوں نے مرزا مسیتا عیشؔ کو یہ مطلع سنایا۔ انہوں نے بھی کہا: ایطا ہے۔ منشی اسیرؔ نے کہا: تکرار قافیہ ہرگز نہیں۔ ایک مصرع میں دعائے ہلال قافیہ ہے، دوسرے میں ہلال ہے۔ فارسی کا شعر ہے ؎

اے دل اول بگو تو بسم اللہ
کن ادا شکر نعمت اللہ

بطور شاہد کے پیش کیا۔ یہ جھگڑا دور تک پہنچا۔ لکھنؤ کے شعراء علماء کے پاس استفتے بھیجے گئے کہ اس کی کیا وجہ کہ بسم اللہ اور اللہ کے قافیہ میں ایطا نہ ہو دعائے

ہلال اور ہلال کے قافیہ میں ایطا ہو جائے۔

میں نے اس شبہ کو اس طرح رفع کیا کہ بسم اللہ نام ہے ساری آیت کا، اور تسمیۃ الکل اسم الجزء سے عَلَمِیّت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی بسم اللہ عَلَم ہے اور عَلَم کے اجزا میں ہر جزو لاینفک ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے اللہ اور بسم اللہ میں ایطا نہ ہوگا۔ اور دعائے ہلال عَلَم نہیں ہے، عبارت ہے اس سبب سے ہلال اور دعائے ہلال میں ایطا ہوگا۔

——— بادشاہ کا ایک شعر ہے ؎

الٰہی عشق ترا میرے دل سے دور نہ ہوگا
گناہ گار ہوں پر اب کبھی قصور نہ ہوگا

میں نے اردو کے بہت سے دیوان قدما و متاخرین کے دیکھے ہیں۔ مجھے خیال نہیں پڑتا کہ کسی نے اس وزن میں غزل کہی ہو۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اہل اردو کے مذاق میں یہ وزن ناموزوں سا معلوم ہوتا ہے۔ اردو والوں نے اس وزن میں سے دو حرف کم کر کے وزنِ مانوس پیدا کر لیا ہے اور ہزاروں غزلیں اس وزنِ مانوس میں کہی ہیں۔ میں دو حرف آخر سے کم کر کے شعر پڑھتا ہوں ؎

الٰہی عشق ترا میرے دل سے دُور نہ ہو
گناہ گار ہوں پر اب کبھی قصور نہ ہو

بادشاہ کو ان دو حرفوں کا بڑھانا گوارا ہو گیا۔ اس وجہ سے کہ عروضی تھے۔ جانتے تھے کہ گو اُردو میں گوارا نہ ہو مگر اصولِ فن کے اعتبار سے وزن صحیح ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کے دیوان بھی بادشاہ کے پیشِ نظر تھے۔ فارسی کے شعرا کو بھی ان دو حرفوں کا ہونا مستعذب معلوم ہوتا تھا۔ ان کے دیوانوں میں کثرت سے اس وزن میں غزلیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب نے بھی اُردو میں اسی وزن میں غزل کہی ہے ؎

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے"

طباطبائی صاحب نے اصولِ فن کے اعتبار سے وزن درست کیا اور آگے بڑھ گئے۔ یہ بات ان کی نگاہ میں پیش پا افتادہ ہے کہ ہمیں خیال سے وزن کا حسن کا رابطہ بتائیں۔ وزن نے خیال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وزن درست ہوا، شعر میں لہجہ نکل آیا، خاک پر گر پڑا شعر تا بنِ گوش اُونچا ہو گیا۔

جدت اور ایچ ان کی نگاہ میں ایک طرح کا تصنع ہے۔ مضمون سچّا اور پاکیزہ ہو، تخیّل بدیہی ہو، تشبیہہ و استعارہ پامال نہ ہو، مراعات النظیر اور تجنیس لفظی و خطی سے بازی گری نہ کی جائے، کچھ بات کہی جائے کچھ ذہن کے لئے چھوڑ دی جائے۔ بات کہنے میں نظر کا زاویہ اور بیان کا اسلوب ایسا ہو کہ "ایک مصرع پڑھا جسے سُن کر لوگ حیران ہو گئے دوسرا مصرع جب پڑھا تو حیرت جاتی رہی لطف حاصل ہوا"۔ وہ محض شکوہ لفظی کو پسند نہیں کرتے، شعر سادہ ہو اور اس میں آداب فن کی خوبی ہو۔ ایک سادہ سا شعر ہے:

اے شاعرِ نو سخن خدا را
اندازِ سخن نے تیرے مارا

ظاہرا اس میں کوئی خاص فنی خوبی نظر نہیں آتی۔ اک ذرا سوچیں تو مفہوم میں ہلکا سا ابہام جھلکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تعریف ہو، مگر "خدا را" کچھ اشارہ کر رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ تعریض ہو۔ الفاظ کے در و بست میں مفہوم کی دونوں پرچھائیاں ذہن میں آتی ہیں لیکن فن کا اس میں کیا نکتہ ہے، ذہن کی گرفت میں نہیں آتا۔ طباطبائی صاحب سمجھاتے ہیں کہ اس میں بیان و بلاغت کے دو نکتے ہیں:

"خیال کیجئے تو اس شعر سے انتہا کی مدح نکلتی ہے اگر یہ کہتے کہ تمہاری غزل دیکھ کر میں پھڑک گیا، دل بے چین ہو گیا، تو یہ دونوں فقرے جملۂ خبریہ ہوتے شاعر نے خبر کو انشاء کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ ایک مثال ہے فنِ بلاغت کے اس نکتے کی کہ خبر کو انشا بنا لینے میں کلام کا اثر کس قدر بڑھ جاتا ہے۔ شاعر و کاتب کا کمال یہ ہے کہ خبر کو انشا بنائے، علمائے خبر کے اقسام، انشاء کی صورتیں بہت تفصیل و توضیح سے بیان کی ہیں لیکن یہ تصریح کسی نے نہیں کی تھی کہ خبر کو انشاء بنا لینے میں کلام کی بلاغت بہت بڑھ جاتی ہے اس نکتے پر بس ایک ہی نظر پڑی اور اسی نے اس مسئلے کو "ادب الکاتب والانشاء" میں داخل کیا۔

اس شعر میں فنِ بلاغت کا ایک نکتہ اور بھی ہے جسے علامہ جرجانی نے "اسرار البلاغہ" میں ذکر فرمایا ہے اور غالباً ان کے سوا کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ حذف سے کلام کی بلاغت بڑھ جاتی ہے۔ شاعر نے اس شعر میں خدا را کہہ کر کلام کو ختم کر دیا اور مقصود یہ ہے کہ اے شاعرِ نو سخن! خدا را ایسی شوخیاں نہ کر۔ مقصود میں سے آخر کا فقرہ حذف کر دیا، اور اس حذف کر دینے سے کلام کی بلاغت حدِ اعجاز تک پہنچ گئی۔ اس قسم کی مثالیں دے کر صاحب اسرار البلاغہ فرماتے ہیں کہ الفاظ تو کچھ نہیں اور معنی

اس کے سننے والوں کے دلوں میں اتار دیئے، یہ سحر نہیں تو کیا ہے۔"

خود ان کا رنگِ تغزّل آدابِ فن سے آراستہ ہے انہوں نے مٹیا برج کی مقبول غزلیت سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی اور کلاسیکی تغزل کی روایت کو ایک نیا نکھار اور نیا ڈھنگ دیا: متین اور سنجیدہ، سادہ اور یک رنگ، خیال وزن سے جس قدر ہم آہنگ ہوتا ہے اسی قدر اس میں نغمگی ہوتی ہے۔ طباطبائی صاحب کے کلام میں خیال اور وزن یک جان ہیں ان کے شعر میں بھرپور نغمہ ہے، خود ان کی طرح سنبھلا ٹھہرا، تحت اللفظ۔ یوں معلوم ہوتا ہے خود طباطبائی صاحب شعر کے قالب میں خراماں خراماں چل رہے ہیں:

نظر آتا ہے ابر آسا گزرنا کوہ ساروں کا
کہ عالم، عالمِ اجسام میں ہے بے قراروں کا
نہ شوخی اے صبا کر وضع میں اب فرق آتا ہے
غبار اونچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاک ساروں کا
بہت جلدی کی تو نے کوسِ رحلت کے بجانے میں
کہ میں نے اے اجل! ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا

ضعیفی میں نہیں ہم کو شکایت قد کے جھکنے کی
زمیں سے کچھ دنوں فریادِ جورِ آسماں کر لیں
خبر کس کی نہیں تھی دام زیرِ کاہ پنہاں ہے
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں
ہمارے ضبط کی گر یہ وہ عاری دیکھنا چاہے
تو آ، اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کر لیں
خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اے نظمؔ بہتر ہے
تماشائے گل و ریحان و باغ و بوستاں کر لیں

اُردو ادب کو طباطبائی صاحب نے ایک گراں قدر عطیہ دیا ہے۔ یہ عطیہ 'گرے' کی شاہکار 'ایلجی' کا عکس "گورِ غریباں" ہے —— شاعر کا واحد شاہکار جس نے اسے انگریزی زبان کا ممتاز شاعر بنا دیا۔ گرے عبوری دَور کا شاعر تھا اس کی شاعری میں انگریزی کلاسیکی شاعری کی روایت اور انگریزی رومانی شاعری کی بغاوت کے آثار کا بڑا لطیف اور حسین امتزاج ہے۔ اور یہ امتزاج اس کے اس مرثیے کی نمایاں خصوصیت ہے! شکوہِ لفظی، مرصع کاری، بندش کی چستی اور عروض و قافیہ کی پابندی کے پہلو بہ پہلو اُبھرتی رومانیت کی سی جذبات نگاری، سادگی و پرکاری اور انسانی دوستانہ مقارنت۔ طباطبائی صاحب بھی ایک طرح پر عبوری دور کے شاعر تھے پروان چڑھی شاعری کا دور ختم ہو چکا تھا، اس شاعری کو جو حصّہ شعری ادب کو دینا تھا دے چکی تھی، اور خود مٹیا برج میں جہاں ناسخ کا رنگ بادشاہ پسند تھا۔ اسی شاعری کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اور تصنع میں ڈوبی شاعری کے خلاف ردِّ عمل خود برقؔ و بحرؔ کے شاگردوں میں ابھر رہا تھا[1]۔ طباطبائی صاحب ان لوگوں

---

[1] آتشؔ کے نامور شاگرد آغا حجو شرفؔ، جو سبع سیارہ میں ایک سیارے ہیں، کہتے ہیں:

جھٹ پٹا وقت ہے بیتاب ہوا دیا ٹھیرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھیرا

اور

منزلِ عشق کا حال آپ میں آلوں تو کہوں
دم ذرا لینے دو، میں دل کو سنبھالوں تو کہوں
کون ہے جس سے فسانہ کہوں اے دل تیرا
سننے والا کوئی پہلو میں بٹھا لوں تو کہوں

برقؔ کے شاگرد مرزا امداد علی بحرؔ:

دوڑ ساقی کہ مجھے لغزشِ مستانہ ہے
پاؤں قابو میں نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے
آج تک بانگ انا الحق کے گڑے ہیں جھنڈے
سر اٹھائے ہوئے منصور کا افسانہ ہے

رہ گئی بات کٹ گئی شبِ ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

(باقی اگلے صفحہ پر)

میر بیش پیش تھے اس لئے انہوں نے "گرے" کی شاعری کی ان تمام خصوصیتوں کا پوری طرح ادراک کیا، اور عکّاسی میں اس قدر مثالی کامیابی حاصل کی۔ چند متفرق بندوں کے تقابلی مطالعے سے عکس کی ان خوبیوں کا اندازہ ہوگا :

*The curfew tolls the knell of parting day,
The lowing herd wind slowly o'er the lea,
The plowman homeward plods his weary way,
And leaves the world to darkness and to me.

وداعِ روزِ روشن ہے گجرِ شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اُٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے، میں ہوں، اور طائر آشیانوں کے

Now fades the glimmering landscape on the sight,
And all the air a solemn stillness holds,
Save where the beetle wheels his droning fight,
And drowsy tinklings lull the distant folds;

اندھیرا چھا گیا، دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اُٹھا کر آنکھ اُدھر اک ہُو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دُور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

Save that from yonder ivy-mantled tow'r
The moping owl does to the moon complain
Of such, as wand'ring near her secret bow'r,
Molest her ancient solitary reign.

کبھی اک گنبدِ کہنہ پہ بومِ خانماں ویراں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)
مالک الدولہ صولت :

آنکھوں آنکھوں میں یوں وہ لے گئے دل　　کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

میرا دل تو نہ تھا کسی لائق　　نظرِ لطف آپ ہی کی ہے
اور کچھ تم سے واسطہ نہ سہی　　جان پہچان تو کبھی کی ہے
دیں ہمیں دل ہمیں ہوں پھر محروم　　دلکو کیا خوب منصفی کی ہے

فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دُنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

But Knowledge to their eyes her ample page
Rich with the spoils of time did ne'er unroll ;
Chill Penury repressed their noble rage,
And froze the genial current of the soul.

زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں اُلٹا
کہ بارِ فکر سے مہلت یہ پاتے سر اُٹھانے کی
مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا
کہ بار آنے نہ پائی جوہرِ ذاتی دکھانے کی

Full many a gem of purest ray serene
The dark unfathomed caves of ocean bear :
Full many a flower is born to blush unseen,
And waste its sweetness on the desert air,

بہت سے گوہرِ شہوار باقی رہ گئے ہونگے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہونگے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشکِ اذفر کی

The struggling pangs of conscious truth to hide,
To quench the blushes of ingenuous shame,
Or heap the shrine of luxury and Pride
With incense kindled at the Muse's flame.

نہ صحبت میں امیروں کی کبھی خونِ جگر کھایا
نہ اونٹایا لہو اپنا کبھی جھوٹی خوشامد سے
نہ مل کر روغنِ قازِ آتشِ نخوت کو بھڑکایا
کہ جس سے خود پسندوں کا تبختر بڑھ چلے جیسے

Far from the madding crowd's ignoble strife,
Their sober wishes never learned to stray ;
Along the cool sequestered vale of life
They kept the noiseless tenor of their way.

الگ ہر نیک و بد سے، دور دنیا کے مکائد سے
گئے بیگانہ وار، اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسد سے
قدم راہِ توکّل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

For who to dumb Forgetfulness a prey,
This pleasing anxious being e'er resign'd,
Left the warm precincts of the cheerful nay,
Nor cast one longing ling'ring look behind ?

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اُسے اک دن
یہ ہونا ہے کوئی چاہے گا دل سے یا نہ چاہے گا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن
دلوں سے یاد بھی مٹ جائے یہ حاشا نہ چاہے گا

اور یہ عکاسی بھی فرمائشی تھی، خود اپنی طبیعت کے اقتضا سے نہیں۔ طبیعت کے اقتضا سے تو انہوں نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔ پرنسپل "اسٹرج" نے حضرت نظمؔ سے "گرے" کے شاہکار کو اردو نظم کا پیکر دینے کی فرمائش کی، اب یہ خدا ہی جانے کہ حضرتِ نظمؔ پر شاعر کا سا وجدان طاری ہو گیا، یا انہوں نے اپنے ذہن میں "ایلیجی" کو خوب گھولا۔ بہر حال عکس تیار ہوا اور پرنسپل "اسٹرج" نے اس کے طرز و آہنگ میں وہی تاثر محسوس کیا، اس کی ایک نقل انگلستان بھیج دی اور انگلستان کے ادب دوستوں نے "گورِ غریباں" کو "ایلیجی" کے پہلو بہ پہلو "گرے" کا سنگِ تربت بنا دیا۔ اس اعزاز پر پرنسپل اسٹرج نے کالج میں جلسہ کیا۔ انگلستان کے اردو ادب دوستوں کی جانب سے حضرت نظمؔ کو تہنیت پیش کی اور اعلیٰ حضرت آصف سابع نے حیدر یار جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا۔ یہ پورا واقعہ مجھ سے میرے دوست جانکی پرشاد صاحب نے بیان کیا تھا۔ وہ اسی زمانے میں نظام کالج میں پڑھتے تھے۔

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما!

قاضی عبدالودود

مختارالدین احمد

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے جب قاضی عبدالودود صاحب کا نام میں نے پہلی مرتبہ سنا۔ اس زمانے میں انہوں نے پٹنہ سے ایک بلند پایہ تحقیقی رسالہ 'معیار' نکالنا شروع کیا تھا اور ادبی حلقوں میں اس کا بڑا چرچا تھا۔

'معیار' کی ترتیب اور صوبائی انجمن ترقی اردو کے کاموں کی معاونت کیلئے انہیں ایک مخلص اور ذی علم دوست شرف عالم آرزو جلیلی (مرحوم) مل گئے تھے۔ یہ تھے تو سائنس کے استاد لیکن شعر بھی کہتے تھے ڈرامے اور افسانے بھی لکھتے تھے اور انہیں مغربی زبانوں سے ترجمے میں بھی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ چینی شاعری پر مضامین لکھتے تھے ستار بجاتے تھے شعبۂ طبیعات جاکر Sound پر ریسرچ کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ادبی اور تحقیقی کام بھی کیا کرتے تھے میں اس زمانے میں مصحفی کی مثنویوں پر کام کر رہا تھا۔ کتب خانۂ خدابخش میں ان سے کسی طرح ملاقات ہوگئی۔ قاضی صاحب کا ذکر آیا اور ان کی باتیں سن کر ملنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا لیکن ان سے ملاقات کی نوبت پروفیسر حسن عسکری صاحب استاد شعبۂ تاریخ جامعہ پٹنہ کی وساطت سے کچھ مہینوں کے بعد ہی آسکی۔

میں ان کی کوٹھی میں ملاقات کے لئے پہنچا تو معلوم ہوا علیل ہیں۔ میں واپس ہونے والا ہی تھا کہ انہوں نے پردہ کراکے اوپر ہی کی منزل پر اپنے کمرے میں بلالیا اور اس بات کی معذرت کرکے مجھے شرمندہ کیا کہ علالت کے باعث وہ نیچے ملنے کے کمرے میں نہ آسکے اور مجھے اوپر آنے کی زحمت اٹھانی پڑی۔ جاڑوں کا زمانہ تھا وہ ایک مسہری پر نیلے رنگ کی سلیپنگ گون لپیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں الماریاں کتابوں کے بوجھ سے جھکی پڑی تھیں۔ میز پر، دریچے پر، فرش پر، قالین پر، کرسیوں پر تمام کتابیں ہی کتابیں دکھائی دیتی تھیں۔ اخبارات اور رسائل سخت بے ترتیبی سے منتشر حالت میں بکھرے پڑے تھے۔ جس مسہری پر وہ بیٹھے تھے اس پر اس دن کا 'اسٹیٹسمین' کچھ اردو رسالے اور کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کئی بڑے بڑے صندوق رکھے تھے کوئی کھلا ہوا اور کسی کے پٹ آدھے کھلے آدھے بند تھے۔ کتابیں اور کاغذات وہاں سے بھی جھانک رہے تھے۔ قریب کی ایک تپائی پر گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی کی دوسری جلد، Swan کی ایک پرانی دوات جس میں کسی زمانے میں اصلی روشنائی ہوگی اور ایک بہت پرانا فونٹین پن رکھا ہوا تھا۔ فاؤنٹین پن تو یہ پہلے رہا ہوگا اب تو اسے معمولی ہولڈر کی جگہ استعمال کیا جارہا تھا۔ نب پر مختلف قسم کی سیاہیوں کی اتنی دبیز تہ جم گئی تھی کہ اس سے سیدھے طور پر لکھنا ناممکن تھا اس لئے انہیں نب کو الٹ کر لکھنا پڑتا تھا۔

چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ان کے ذہن اور دماغ کو کمرے کی کتابوں اور کاغذات کے انتشار سے دور کا بھی تعلق نہیں گفتگو آگے چلی تو اندازہ ہوا کہ انہوں نے اپنے حافظے کی مختلف تہوں اور خانوں میں اپنی دل چسپی کی ساری معلومات نہایت اچھی ترتیب سے جھاڑ پونچھ کر اور اس طرح سج کر رکھی ہیں کہ جب، اور جہاں سے چاہتے ہیں اپنے کام کی چیز نکال کر حاضرین کے سامنے پیش کر کے حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔

اس ملاقات میں سب طرح سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ان کی صاف گوئی تھی مصنفین اور ان کے کارناموں پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے بغیر کسی جھجک اور مصنوعی تکلف کی وہ رائیں دیں جنہیں وہ صحیح سمجھتے تھے بغیر اس بات کی پروا کئے کہ میں یا وہ مصنفین ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق گفتگو ہوئی وہ انہیں صاحب طرز ادیب اور مسلم الثبوت انشاء پرداز مانتے تھے، انجمن کے تحقیقی کاموں کے معیار سے وہ مطمئن نظر نہ آئے لیکن انجمن نے قدیم تذکرے اور شعراء کی دواوین کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ شیخ چاند مرحوم جیسے کچھ اور رفقاء مولوی صاحب کو مل جاتے تو کتابوں کا معیار اور بھی اونچا ہو سکتا تھا۔

وہ حالی کو شبلی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ 'یادگار غالب' کو ایک ناکام کتاب بتاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس زمانے میں غالب پر اس سے کہیں اچھی اور مستند کتاب لکھی جا سکتی تھی اس لئے بھی کہ اس وقت جو ذرائع اطلاعات کہ حالی کے پاس تھے اب وہ مفقود ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اردو تحریر انہیں پسند ہے کہتے تھے انشا پردازی میں شبلی کی انہوں نے اتباع کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان سے آگے بڑھ گئے ہیں ان کی تصانیف میں 'خیام' کو اُن کی بہترین تصنیف مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مقلد اور مذہبی آدمی کبھی اعلیٰ درجے کے محقق اور تنقید نگار نہیں ہو سکتے۔ اعلیٰ درجے کے تحقیقی مضامین لکھنے والے ان کے خیال میں خال خال ہیں، ان میں وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور حافظ محمود شیرانی کے بڑے معترف ہیں۔

اس ملاقات کو کوئی بیس سال ہونے کو آئے۔ اس کی ساری باتیں اس طرح یاد ہیں جیسے ابھی کل کی ہوں لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔

قاضی صاحب کی ولادت عظیم بہار (پٹنہ) میں آج سے کوئی ۵۸ سال پہلے ایک سخت مذہبی خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد قاضی عبدالوحید مرحوم شہر کے رئیسوں میں تھے اور مشہور مذہبی عالم۔ انہوں نے ایک مدرسہ مدرسۂ حنفیہ کے نام سے قائم کیا تھا اور وہ ایک مذہبی رسالہ 'تحفۂ حنفیہ' بھی نکالا کرتے تھے۔ وہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے سخت مخالفین میں تھے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ صوبۂ بہار میں ندوہ کا زور توڑنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم اسی ماحول میں ہوئی اور وہ عربی و فارسی کی تحصیل کرتے رہے قرآن شریف بھی ان سے حفظ کرایا گیا ہو تو عجب نہیں مجھے اس بات کی تحقیق کا ان سے موقع نہ مل سکا۔ انگریزی تعلیم کی ابتدا ان کے والد کی وفات کے بعد ہی ہوئی ہو گی ورنہ شاید وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے۔ کچھ دنوں تک ان کی تعلیم بلگرامی ٹیوٹوریل اسکول علی گڑھ میں بھی ہوئی ۱۹۲۳ء میں وہ کیمبرج گئے اور فٹز ولیم ہاؤس کے ممبر ہوئے وہاں سے انہوں نے معاشیات، سیاسیات اور تاریخ میں بی اے کیا۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی صدر شعبۂ عربی و اسلامیات جامعۂ کلکتہ اور ڈاکٹر محمد نظام الدین دائرۃ المعارف حیدرآباد دونوں کیمبرج میں پروفیسر براؤن کے شاگرد اور قاضی صاحب کے معاصر رہے ہیں۔ لندن سے بار ایٹ لا کی سند بھی انہوں نے حاصل کی اور لاطینی، جرمن اور فرانسیسی کی تحصیل بھی کی۔ فرانسیسی ادب سے ان کی دل چسپی اب بھی باقی ہے۔ یورپ کے بعض ممالک کی سیاحت بھی کی۔ اسی زمانے میں وہ سخت علیل ہوئے اور علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم میں داخل ہوئے جہاں کملا نہرو پہلے سے بغرض علاج موجود تھیں۔ پنڈت نہرو سے ان کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ وہاں سے وہ شفایاب ہو گئے لیکن علالت کے اثرات ان کی بعد کی زندگی پر دیر تک قائم رہے۔ اب ان کی مجموعی صحت اور کام کرنے کی طاقت اور ولولہ اتنا ہے کہ وہ ۴۵ سال سے زائد کے معلوم نہیں ہوتے یورپ میں ان کے قیام کی مجموعی مدت ۷ سال ہے ان کی واپسی کے بعد ان کے منجھلے بھائی قاضی محمد سعید صاحب جو جامعہ ملیہ کے پڑھے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر علیم کے معاصرین میں ہیں یورپ پہنچے، یہ برلین یونیورسٹی کے طالب علم رہے اور فلسفے کی تکمیل کرتے رہے۔ جرمن بہت اعلیٰ بولتے ہیں اور دوستوں میں فلسفے پر اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ جب یہ سات سال یورپ ٹھہر کر واپس آئے تو چھوٹے بھائی قاضی محمد فرید صاحب یورپ گئے انہوں نے بھی سات سال قیام کیا اور وہ کیمبرج سے معاشیات سیاسیات اور تاریخ میں ٹرائی پوس لے کر واپس آئے۔ اب وہ کراچی یونیورسٹی میں انہی مضامین کے استاد ہیں۔

قاضی صاحب نے اردو ادب کا مطالعہ ۱۹۱۶ء سے پہلے شروع کر دیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا مضمون "الناظر" میں شائع ہوا تھا پھر گارساں دتاسی کے ق ان کی ایک مختصر سی تحریر "معارف" میں شائع ہوئی۔ شاد عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام "کلامِ شاد" قاضی صاحب ہی نے مرتب کرا کر شائع کیا۔ یورپ کے دورانِ قیام میں پنے مضامین کے علاوہ اردو ادب کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس زمانے کی اہم مخطوطات کے جو نوٹس انہوں نے تیار کئے ہیں وہ اس پر گواہ ہیں۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ادبی دنیا ان سے ۳۶ء سے پہلے واقف نہ ہو سکی ان کا ادبی شہرہ اس وقت ہوا جب انہوں نے پٹنہ سے ایک بلند پایہ علمی، ادبی قی رسالہ "معیار" شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے تحقیقی مضامین اور بلند پایہ تبصروں نے ایک طرف لوگوں کو چونکایا تو دوسری طرف تحقیقی مضامین اور اعلیٰ تنقید ے کا نیا اسلوب اور نیا معیار بخشا۔ مولوی عبدالحق صاحب اور بعض دوسرے مستند اہلِ قلم نے اس رسالے کا خیر مقدم کیا اور اس کی بڑی تعریف کی۔

مولوی صاحب سے موصوف کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ ۱۶ء یا ۱۷ء کے لگ بھگ موخر الذکر نے مولوی صاحب اور انجمن کے کاموں کے سلسلے میں ایک ون بھی لکھا تھا۔ "معیار" کے پہلے شمارے میں انہوں نے اردو کے مشہور مصنف اور مسلم الثبوت انشا پرداز کی حیثیت سے مولوی صاحب کی تصویر بھی شائع کی تھی اور حالات گی اور ان کے کاموں کے متعلق ایک مضمون بھی شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا، یہ خیال غالباً رسالے کے جلد بند ہو جانے کی وجہ سے عمل میں نہ آ سکا۔

مولوی صاحب کی فرمائش پر قاضی صاحب نے انجمن کے لئے متعدد کتابیں مرتب کرنی شروع کی تھیں، ان میں مثنویاتِ مصحفی اور بعض دوسری کتابوں پر کام مکمل نہ ہو ئیں دیوانِ جوشش اور تذکرۂ میر حسن دہلوی ان کی تصحیح و ترتیب کے بعد شائع ہوئیں۔ دیوانِ جوشش کی ترتیب و تصحیح کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اعلیٰ ناقدانہ نسخہ ب کرنے کے سلسلے میں اسے سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔ تذکرۂ میر حسن انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے ایڈیٹ کیا ہے۔ افسوس کہ علالت اور مصروفیت کے باعث اس پر جلد اپنا مقدمہ مکمل نہ کر سکے اور انجمن نے عجلت سے کام لے کر مرتبِ سابق کا مقدمہ کتاب میں شامل کر دیا، اس طرح اردو ادب کے طالب علم قاضی صاحب کے ع اور مفید مقدمے سے محروم رہ گئے۔

آج کل وہ مختلف مضامین کے علاوہ دیوانِ قدرت اللہ قدرتؔ ایڈیٹ کر رہے ہیں، "جہانِ میرؔ" کے نام سے ایک کتاب لکھنی چاہتے ہیں۔ اور مصحفیؔ کے دواوین غالب اور اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کرانا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی کے معمولات بہت سادے ہیں صبح کی چائے کے بعد وہ اپنے مسودات اور کاغذات میں مصروف ہو جاتے ہیں انہیں میز کرسی پر کام کرتے کبھی نہیں دیکھا بس وہ مسہری پر بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں دوپہر ہونے تک پوری مسہری اور آس پاس کی تپائیوں اور کرسیوں طوطات اور حوالے کی کتابیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ دن کا کھانا وہیں ایک تپائی پر مسہری کے پاس لگ جاتا ہے نوکر رومال ہلاتا رہتا ہے خود کھانا تناول کرتے رہتے ہیں کوئی حب موجود ہوئے تو ان سے بات بھی کرتے جاتے ہیں۔ کھانا کھانے اور کپڑا پہننے پر وہ کم سے کم وقت خرچ کرتے ہیں۔ بس ابھی کھانا آیا ابھی انہوں نے سوپ پیالی سے پھلکے یا پلاؤ مرغ کے ساتھ کھائے، پڈنگ یا فیرنی کے دو چار چمچے لئے اور پھر کوئی موسمی پھل ہاتھ میں لیا، اسے ایک نظر انہوں نے دیکھا اور تولا، دو چار پر معلومات باتیں ل سے متعلق کہیں (اس قسم کے مسائل پر بھی ان کی نظر گہری اور دور رس ہے) پھل کاٹنے اور قاش کھانے شروع کئے وہ نوکر یا کسی اور کے ہاتھ کے کٹے ہوئے پھل کھانا پسند یں کرتے۔ قاشوں کا انبار بھی پلیٹ میں نہیں لگاتے بس تراشتے جاتے ہیں اور کھاتے جاتے ہیں۔ کوئی دس پندرہ منٹ میں وہ کھانے سے فارغ ہو کر آپ سے باتیں کرنے لگیں گے ام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے گرمیوں کا زمانہ ہوا تو کچھ دیر کے لئے بستر پر لیٹ جائیں گے وہ دن کو سوتے شاذ و نادر ہی ہیں تھوڑی دیر لیٹ پوٹ کر وہ کام شروع کر دیں گے۔ ھر ٹھیک چار بجا اور ادھر نوکر چائے کے لئے پوچھنے کو آیا۔ کوئی صاحب موجود ہوئے تو ان کے لئے گھر سے گرم گرم ناشتے کی چیزیں بن کر آ گئیں، چائے آ گئی، خود ان کے لئے دودھ ایک گلاس آیا۔ شام کو وہ عام طور پر ناشتہ نہیں کرتے تھے دودھ یا صرف ایک پیالی چائے پی لیتے ہیں کبھی یہ ضروری ہوا خود کسی کو چائے پر بلایا یا کہیں ایٹ ہوم میں گئے تو پھر رات ھانا نہیں کھاتے۔ کوئی ملنے والا موجود نہ ہوا اور کوئی ضروری مضمون ختم کرنا ہوا تو خانہ باغ میں یا چھت پر چہل قدمی کر لی پھر آ کر اپنے کام میں لگ گئے رات کا کھانا آٹھ ساڑھے ھ بجے کھا لیتے ہیں اور بالعموم دس بجے تک وہ سو جاتے ہیں۔

بریانی اور مرغ ان کی محبوب غذا ہے پھلوں میں آم اور آموں میں لنگڑا نہیں بلکہ سپیا انہیں مرغوب ہے پان کبھی نہیں کھاتے سگریٹ پہلے تو پیتے تھے لیکن اب مدتوں ے ترک کر رکھی ہے۔ اب انہیں کسی کھیل سے دلچسپی نہیں، کیمبرج میں بہت اچھے شطرنج کھیلنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے اور انہیں کالج کا بھی ملا تھا جب وہ بیرسٹری کرتے

تھے تو کلب جانے کا التزام کرتے تھے اور برج بڑے شوق سے کھیلتے تھے اب یہی وقت وہ کتب خانۂ خدابخش بانکی پور کو دیتے ہیں اور قلمی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ صبح کی سیر اور روزانہ غسل کرنے کا انہیں کوئی شوق نہیں۔ ان کے کسی خاص شوق کا مجھے علم نہیں۔ نادر کتابیں وہ خریدتے ہیں پڑھتے ہیں فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن انہیں جمع کرنے اور اپنے مکان کو نمائش گاہ بنانے کا خیال کبھی نہیں ہوا۔

میں نے انہیں سخت دماغی پریشانی یا کرب کی حالت میں کبھی نہیں پایا نہ کبھی کسی پہ آج تک خفا ہوتے دیکھا۔ ہاں مسلم لیگ کی بدعملیوں اور اراکین کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کا جب ذکر آیا تو وہ اکثر بیزار اور ناراض نظر آئے۔ زمانۂ حال کے مصنفین جو بلا ضرورت اور بغیر تحقیق و توجہ کے کتاب لکھنے کو تیار ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں سے وہ بڑے ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ، غول بیابانی ہیں، غلط اطلاع پھیلا کر وہ پبلک کو دھوکا دیتے ہیں ان کی سزا شارع عام پر ہونی چاہیئے۔

اپنے اصولوں میں بڑے پختہ ہونے کے باوجود وہ بڑے خوش اخلاق ہیں اور ہر قسم کے پڑھے لکھے آدمیوں سے بلا تکلف ملتے جلتے رہتے ہیں۔ آئے دن بھانت بھانت کے لوگ ان کے پاس آتے رہتے ہیں ادبی کاموں سے بھی اور خالص غیر ادبی کاموں سے بھی۔ ایک صاحب ان کے پرانے ملنے والوں میں ہیں اکثر ان کے پاس آتے ہیں دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں پھر حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہیں۔ پچھلے قرضوں کی عدم ادائیگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے نئے قرض کی رقم طلب کرتے ہیں، قاضی صاحب بڑے شوق و ذوق سے ساری باتیں سنتے ہیں پھر یا تو قرض دیتے ہیں یا کوئی مفید مشورہ۔

ایک بار ایک بزرگ ان کے پاس آئے اور اپنی تصنیف جو انہوں نے امیر مینائی پر کی تھی رائے کے لئے پیش کی۔ قاضی صاحب نے مطالعہ کے بعد عدم اشاعت کا مشورہ دیا اور انہیں بتایا کہ اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں ماخذ صرف تین کتابیں ہیں اور جس کی نظر سے یہ کتابیں گزری ہیں اُسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مصنف جو ہر قیمت پر اپنی کتاب شائع ہی کرنی چاہتے تھے بولے :۔ حضرت میں یہ تصنیف ان لوگوں کے لئے شائع کرنی چاہتا ہوں جن کی نظر سے یہ تین کتابیں نہیں گزری ہیں۔ قاضی صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ کتاب کو شائع ہوئے آج پندرہ بیس سال ہو گئے عام طور پر لوگ نہ مصنف کو جانتے ہیں نہ ان کی کتاب کو۔

ایک دوسرے کرم فرما ایک مرتبہ اپنے رسالے کا پہلا شمارہ لے کر ان کی خدمت میں پہنچے اور خواہش ظاہر کی کہ اس کی قلمی معاونت فرمائیں۔ قاضی صاحب نے حتمی طور پر انہیں رسالہ بند کر دینے کا مشورہ کیا۔ یہ بہت کم سمجھ اور کم علم سے آدمی تھے معلوم نہیں کن لوگوں نے انہیں رسالہ جاری کرنے کا مشورہ دیا تھا، انہوں نے سرورق پر بہت نمایاں طور پر "بیادگار شیخ الاسلام و المسلمین حضرت علامہ شاہ ...... جشن قادری فردوسی ...... رحمتہ اللہ علیہ" چھپوا رکھا تھا۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے یہ بتایا کہ ان کے والد فلاں خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں اور اب تک بقید حیات ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا اگر آپ رسالہ بند نہیں کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم سرورق سے رحمتہ اللہ علیہ نکال دیجئے۔ بہت ہی دانائی کا ثبوت دیتے ہوئے بولے :۔ صاحب اب تو ٹائیٹل پیج کا بلاک بن گیا ہے اسے ضائع کرنا پڑے گا فی الحال اسی طرح چلنے دیجئے۔ چنانچہ وہ اب تک اسی طرح چل رہا ہے اور ان کے والد اب تک اسی طرح بقید حیات ہیں۔

ان کے یہاں ایک خاص قسم کی سختی اور ٹکٹ نش ہے، وہ ویسے بہت ملنسار، متواضع، خلیق اور دوست نواز ہیں لیکن وہ جب کسی معاملے میں اصولی طور پر متفق نہ ہوں تو انہیں راضی کرنا آسان نہیں ایسے موقعوں پہ نہ وہ بڑے سے بڑے شخص کی پروا کرتے ہیں اور نہ اداروں اور انجمنوں کی۔ ان کا دماغ ایک ادیب سے زیادہ ایک ریاضی داں اور قانون داں کا دماغ ہے۔ وہ بات کا وہی مفہوم لیتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے 'مافی بطن الشاعر' سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔

ایک بار ایک صاحب نے اپنے یہاں تقریب میں مدعو کیا اور پانچ بجے شام کا وقت دیا۔ قاضی ٹھیک وقت پر جب وہاں پہنچے تو مکان، میزبان اور مہمان سے خالی تھا، قاضی صاحب انتظار میں بیٹھے رہے، فراش چھڑکاؤ کرتے رہے اور شہنائی بجانے والے شہنائی بجاتے رہے۔ چھ بجے جب قاضی صاحب لائبریری جانے کے لئے اٹھے تو صاحب خانہ وارد ہوئے یہ جان کر بہت شرمندہ ہوئے کہ وہ پانچ بجے سے انتظار میں ہیں اور بولے :۔ میری مراد پانچ سے پانچ نہ تھی"۔ قاضی صاحب نے کہا لیکن میری مراد ہمیشہ پانچ سے پانچ ہی ہوتی ہے اور یہ کہا اور رخصت ہو گئے۔

ایک علمی ادارے نے ان سے ایک کتاب ایڈیٹ کرائی۔ صاحب ادارہ چاہتے تھے کہ مقدمہ بھی وہ حوالۂ قلم کر دیں، قاضی صاحب کہتے تھے کہ اصل کتاب کے چھپ جانے کے بعد ہی مقدمہ لکھا جا سکتا ہے اس لئے کہ اکثر مقامات پر کتاب کے صفحات کے حوالے ہیں۔ کتاب چھپ گئی اور ادارے نے مقدمے کا تقاضا کیا۔

احب جس طرح لکھنا چاہتے تھے اس کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے متعلقہ معلومات حاصل ہو جائیں اس میں دیر ہو گئی تو ادارے یں لکھا کہ آپ فلاں تاریخ تک مقدمہ بھیج دیجئے ورنہ کتاب بغیر آپ کے مقدمے کے شائع ہو جائے گی۔ قاضی صاحب نے لکھ بھیجا، مقدمہ نہیں بھیج سکتا کتاب شوق ئع کر دیجئے۔ کتاب ان کے مقدمے کے بغیر شائع ہو گئی۔

قاضی صاحب کی بعض خاص عادات اور اصولوں کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔

وہ خطوط کثرت سے لکھتے ہیں۔ پوسٹ کارڈ زیادہ لفافہ کم۔ کبھی کبھی ایک کارڈ میں دو مختلف خط دو مختلف اشخاص کے نام لکھے ہوئے ملیں گے۔ اگر ایسا خط پ کو مل جائے تو سمجھئے کہ جو بلو بلیک روشنائی سے لکھا ہے وہ پرایا خط ہے اور جو سرخ روشنائی سے بین السطور میں تحریر ہوا ہے وہ آپ کے نام ہے۔ ابھی امکان ہے کہ یہ دونوں خط آپ کے نام نہ ہوں بلکہ جلی طور پر جو بلو یا سرخ پنسل سے چند لفظ لکھے گئے ہیں صرف انہی کے مخاطب آپ ہیں۔ ہوتا یہ ہے ہوں نے کوئی خط کسی کو لکھا اب یا تو وہ خط کتابوں میں یا کاغذات میں چپک کر رہ گیا اور پوسٹ نہ ہو سکا یا ابھی پوسٹ ہونے نہ پایا تھا کہ مکتوب الیہ کا خط آ گیا یا ضی صاحب کا خیال بدل گیا اور قصداً وہ خط پوسٹ نہ کیا گیا، اب کسی اور کو اس کے خط کی رسید دینی ہے یا کوئی اور اہم لیکن مختصر بات لکھنی ہے سادے ڈ موجود نہیں ہیں وہ اس کارڈ کو قلم زد کر کے دوسرا خط آپ کے نام لکھ دیں گے، یہ عام طور پر سرخ روشنائی سے لکھتے ہیں تاکہ دونوں خطوں کے مضمون میں اس نہ پیدا ہو۔ اب اگر یہ خط بھی کسی وجہ سے پوسٹ نہ ہوا اور کسی شخص کو صرف دو جملے لکھنے ہیں (رجسٹری مل گئی شکریہ، یا آپ کا خط آج بھی نہ آیا، یا ئی کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ پروف حسب ذیل پتے پر بھیجئے وغیرہ وغیرہ) تو پھر یہی کارڈ استعمال کیا جائے گا قلم کبھی ٹھیک ہوگا کبھی بہت بے تکا، نئی نب ئی ہے تو ٹھیک ہے اس زمانہ میں عام طور پر تحریر بہت صاف اور نسبتاً خوش خط ہوگی، جوں جوں نب گھستی جائے گی تحریر اور انداز خط بگڑتا جائے گا لیکن ف پھر بھی بہت واضح ہوں گے اور شوشوں اور دائروں کا بڑا خیال رکھا جائے گا۔

خطوط زیادہ تر علمی و ادبی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں غیر متعلق باتوں کا وہاں گزر نہیں۔ میرے پاس ان کے ایک ہزار سے زیادہ خط ہوں گے پانچ دس ہی ام پر انہوں نے اس اصول سے انحراف کیا۔ بہار کے فسادات کے زمانے میں انہوں نے بہت سے خط لکھے تھے صرف ایک خط میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ یں اب سکھ کثرت سے آ گئے ہیں۔ علی گڈھ میں ایک بار انہوں نے ایک قومی کارکن کے بارے میں لکھا کہ ممکن ہے کسی زمانے میں ان کا کردار اعلیٰ رہا ہو لیکن اب تو یں اور عام سیاسی لوگوں میں کچھ فرق نہیں رہا۔ میرے آکسفورڈ کے دوران قیام میں ایک بار انہوں نے کیمبرج سے اپنے کالج کی کلر ٹائی منگوانے کے لئے لکھا تھا۔

خطوں کا جواب بڑی پابندی سے دیتے ہیں اور عام طور پر ان کے خطوط طویل بھی ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک سطر کے لیکن عام طور پر جو اختصار اور یاز ان کے مضامین میں ہے اس کی جھلک ان کے خطوں میں بھی ملتی ہے۔ مضامین کی طرح کبھی کبھی وہ خطوط میں بھی رموز اور مخففات کا استعمال کرتے ہیں۔ "شخص لوم نے معاملہ معلوم کے متعلق کیا کہا؟" جن سے میں نے گفتگو کی وہ جلد ہی اس سلسلے میں خط لکھیں گے! کبھی آخر میں دستخط کی بجائے وہ صرف 'د' لکھ دیتے ہیں۔

وقت پر جواب آپ انہیں نہ دیں تو وہ بُرا مان جاتے ہیں اور بعض مرتبہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ انسانی کمزوریوں اور ڈاک کے محکمہ کی بدنظمیوں سے ی طرح واقف ہیں اس لئے ناراض ہونے سے پہلے وہ اپنے مکتوب الیہوں کو بڑا موقع دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی مسئلے کے متعلق انہوں نے آپ کو خط لکھا پ نے جواب نہ دیا تو ہفتہ دو ہفتہ کے بعد وہ دوسرا خط لکھیں گے اور بخوبی ممکن ہے کہ پچھلے خط کے مضمون کا اعادہ کریں گے شاید آپ کو ان کا پہلا خط ملا نہ ہو پ نے اب بھی توجہ نہ فرمائی تو کچھ دنوں کے بعد یاد دہانی کرائیں گے آپ نے اب بھی تساہل سے کام لیا تو آخری بار خط رجسٹرڈ بھیجیں گے اب اگر اس پر بھی آپ موش رہے تو پھر ان کی ناراضی سے دنیا میں آپ کو کوئی نہیں بچا سکتا۔

خطوط اور مضامین لکھنے کے لئے نہ تو خاص کاغذ کی پابندی ہے اور نہ سیاہی اور نب کی پروا۔ میرے پاس ان کے کچھ خانہ ساز پوسٹ کارڈ بھی ہیں جو حکومت ی مشینوں میں بننے کے بجائے ان کے اپنے ہاتھوں سے بنے ہیں یعنی دو کچہری یا ردی کاغذ کو لے کر جس کا ایک طرف سادہ ہے انہوں نے گوند سے چسپاں کر دیا ہے پھر اسے کاٹ کر کارڈ کے ائز کا بنا دیا ہے ایک بار اتفاق ایسا ہوا کہ خط جب آدھی منزل تک آ چکا تھا کاغذ نے چپکنے سے اور گوند نے چپکانے سے انکار کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ کارڈ کے پتے والا حصہ مجھے

مل گیا لیکن وہ ورق جس پر خط کی ابتدائی عبارتیں درج تھیں راہ میں گم ہو گیا۔

مضامین وہ بڑی تقطیع کے صاف ستھرے کاغذ پر کبھی نہیں لکھتے۔ وہ عام طور پر ردّی یا چھوٹی تقطیع کے کاغذوں پر مسودہ تیار کرتے ہیں۔ کاٹ چھانٹ کے بعد وہ دوسری طرف نقل تیار کرتے ہیں۔ یہ واضح ہوتی ہے اور عام طور پر کاپی کے سائز کی ہوتی ہے۔ حاشیہ بین السطور کے لئے گنجائش کم ہوتی ہے۔ ایک بار میرے سامنے انہیں ایک مضمون شروع کرنے کا موقع ملا۔ ملازم سے فل اسکیپ سائز کے کاغذ منگوائے اس پر لکھنے کے بجائے انہوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور جب اس کی تقطیع اِطبّا کے نسخوں کی تقطیع کے برابر ہو گئی تو اطمینان سے انہوں نے مضمون لکھنا شروع کر دیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خیال ان کے دماغ میں آیا سامنے رکھا ہوا جونسا کاغذ ملا اس پر انہوں نے اپنے خیالات عجلت میں قلم بند کرنے شروع کئے، اگر مناسب لفظ نہیں مل رہے ہیں تو اس کی جگہ چھوڑتے ہوئے وہ آگے بڑھ جاتے ہیں بعض مقامات پر وہ الفاظ بھی مکمّل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے پاس ان کے ایسے مسودات بھی ہیں جو کچہری کے کاغذات کی پشت پر لکھے گئے ہیں۔ کسی مضمون کا خیال پیدا ہوتے ہی، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مضمون لکھنا شروع کر دیں رسالوں کے خاص نمبر ہوں یا وقتی طور پر عجلت میں کوئی مضمون لکھنا ضروری ہوا تو اور بات ہے ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مختلف موضوعات ان کے دماغ میں چکّر کاٹتے رہتے ہیں کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا ہے مواد جمع ہوتا رہتا ہے برسوں کے بعد وہ خیالات اور معلومات ایک مضمون یا مضمونچہ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

سنہ ۳۶ء میں انہوں نے 'معیار' کے ایک نمبر میں ایک استفسار شائع کیا کہ: 'گلہ دارد' والے اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کئے ہیں کلّیات قدسی کے "قلمی نسخے دیکھے یہ اشعار موجود نہیں۔ ایک فارسی مجموعے میں یہ اشعار عشرتی کے نام نظر آئے اگر کسی صاحب کو اس کا تحقیقی علم ہو کہ یہ غزل کس کی ہے تو مجھے مطلع فرمائیں'۔

کئی سال کے بعد ایک مختصر سا نوٹ یاد آتا ہے اس موضوع پر انہوں نے معاصر سنہ ۴۱ء میں شائع کیا، آخر ۱۵ سال کے بعد تفصیل سے اس موضوع پر معاصر (مئی سنہ ۵۱ء) میں بحث کی اور حق تحقیق ادا کیا اور ثابت کیا کہ یہ غزل نصرت کی ہے جو نصرتی بھی اپنا تخلّص کیا کرتا تھا۔

یہی حال 'غالب بہ حیثیت محقق' کا ہے سنہ ۱۹۳۶ء سے پہلے ان کا مطالعہ غالبیات پر محدود تھا، غالب سے، بہ حیثیت فنکار اور بہ حیثیت انسان کے وہ پہلے سے متاثر تھے لیکن ان کی تصانیف کا باضابطہ مطالعہ انہوں نے اس کے بعد ہی شروع کیا ہے جس زمانے میں وہ قاطع برہان اور اس سلسلے کی ساری تصانیف کا مطالعہ کر رہے تھے ان پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ غالب بہ حیثیت شاعر اور انشا پرداز بہت بلند سہی لیکن فارسی زبان و ادب پر ان کا مطالعہ اتنا بھی نہیں جتنا ان کے بعض معاصرین کا ہے۔ یہ نظریہ مسلّمات کے خلاف تھا اور بہت دل چسپ، جوں جوں اُن کا مطالعہ بڑھتا گیا اس موضوع سے دل چسپی میں اضافہ ہوتا گیا سنہ ۱۹۴۹ء کے کسی مہینے میں میرا ان سے ملنا ہوا، کئی ملاقاتوں میں یہی تذکرہ رہا وہ قاطع برہان کی عبارتیں پڑھتے جاتے تھے اور اس کی تردید میں دلائل اور حوالہ کتابوں سے ڈھونڈ کر پیش کرتے جاتے تھے، فارسی ادب کی شاید ہی کوئی مستند کتاب جو انہیں مل سکی ہو اور انہوں نے چھوڑی ہو میں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کے لئے ایک مضمون لکھ دیں جس میں یہ ساری مباحث مفصّل طور پر آ جائیں انہوں نے فوراً رضامندی ظاہر کی ایک طویل مضمون لکھ کر دیا جو اب 'نقد غالب' میں مزید ترمیم و اضافہ کے بعد طویل تر ہو گیا ہے یہ گویا اس موضوع پر ان کے پندرہ بیس سالہ مطالعے کا نچوڑ ہے۔

انہیں مضمون میں لمبی تمہید سخت ناپسند ہے، اگر ضروری معلوم ہوا تو صرف چند سطروں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے براہِ راست کہہ ڈالتے ہیں اور پھر بغیر کسی اختتامی پیراگراف کے مضمون ختم کر ڈالتے ہیں۔

ترجمہ کرنے کے کام کو وہ بہت مشکل کام گردانتے ہیں اور اسے خود مصنّف کے معیار سے جانچتے ہیں۔ کہتے ہیں کامیاب ترجمہ وہ ہے جب اصل مصنّف کو سنایا جائے اور وہ مطمئن ہو جائے کہ مضمون یا افسانے کی صحیح روح ترجمہ میں آ گئی ہے۔ رسالوں میں مغربی افسانہ نویسوں کے افسانوں کے جو تراجم چھپتے ہیں ان سے قطعاً مطمئن نہیں ہیں، اس بات سے انہیں اور بھی تکلیف ہوتی ہے کہ بعض رسالوں میں مصنّف بچارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے اور ان کے دماغ سوزی کی اس طرح داد دی جاتی ہے کہ بعض افسانوں کے تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا۔

صحیح ترجمہ کی ذمہ داریوں کا انہیں پورا احساس ہے اس لئے خود ترجمہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں، افسانے اور مضامین تو درکنار اپنے کسی مضمون میں کسی انگریزی مصنف کا قول نقل کرنا ہوا تو اکثر دیکھا ہے کہ ترجمہ کے بغیر اصل انگریزی کی عبارت انہوں نے نقل کر دی۔ "معیار" کے دورِ ادارت میں انہوں نے متعدد مغربی افسانہ نویسوں کے ترجمے منصور احمد مرحوم اور بعض دوسرے معتبر آدمیوں سے کرائے تھے لیکن کوئی افسانہ ایسا نہ تھا جس کا اصل سے مقابلہ کرنے پر انہیں یہ احساس نہ ہوا ہو کہ ترجمے میں ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ میں نے ایک دن ان سے ترجمہ کے ذکر پر عنایت اللہ دہلوی مرحوم کا نام لیا اور پوچھا ان کے ترجموں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ آنکھیں بند کر کے چند لمحے خاموش رہے پھر بولے :- انہیں ترجمے پر خاصی قدرت حاصل ہے اور ان کا ترجمہ رواں دواں ہوتا ہے، لیکن ایسی بات نہیں کہ ان کے ترجمے میں خامیاں نہ ہوں۔ "فلائبر" کا ایک نسخہ ان کی میز پر پڑا تھا جسے شاہد احمد صاحب نے حال ہی میں شائع کیا تھا اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے انہوں نے ایک صفحہ کھولا، اصل فرانسیسی ناول سے مقابلہ کر کے انہوں نے کہا اس ایک صفحہ میں دو غلطیاں ترجمے کی ہیں۔ انہوں نے ازراہِ احتیاط یہ بھی کہا فی الحال یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ غلطی عنایت اللہ صاحب کی ہے یا انگریزی ترجمہ نگار کی اس لئے کہ انہوں نے اصل فرانسیسی سے نہیں بلکہ انگریزی ترجمہ سے کتاب کو اُردو میں منتقل کیا ہوگا۔

انہوں نے طویل مضامین بھی لکھے ہیں جو سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحوں پر محیط ہیں۔ بلکہ ایک مضمون تو ان کا تقریباً ڈھائی سو صفحوں میں ختم ہوا ہے اس پر بھی ان کے الفاظ میں "بہت سے سخن ہائے گفتنی، ناگفتہ رہ گئے" - اور بہت سے مقامات میں جہاں تفصیل کی ضرورت تھی اجمال سے کام لینا پڑا۔" ضرورت کی بات دوسری ہے ورنہ عام طور پر ان کی تحریریں بہت مختصر ہوتی ہیں اور ان کے یہاں بڑا ایجاز ہے اُنہوں نے بعض مقالے ورق یا دو ورق میں ختم کر دیئے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مواد ہمیشہ ان کے قبضہ میں ہوتا ہے وہ کبھی مواد کے قبضے میں نہیں ہو پاتے، پھر انشا پردازی پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ طول نویسی سے بچ جاتے ہیں۔ وہ اپنے مضامین پر پوری توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں اور محمد علی مرحوم کی طرح انہیں اپنی طول نویسی کی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ میرے پاس وقت نہیں ہے کہ مضمون یا خط مختصر لکھ سکوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ لفاظی ممکن ہے ابو الفضل کے عہد میں پسند کی جاتی ہو، آج کل تو وہ لٹریچر کے اس قول پر عمل ہے کہ اپنی تحریر کو زوائد سے مبرا کرو۔

ان کی تحریر میں مبالغے کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ الفاظ کا انتخاب سوچ سمجھ کر اور اُن کا استعمال اُن کے صحیح مفہوم کو جان کر ہی کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ اچھے ادیب اور محتاط لکھنے والے اپنے الفاظ کے انتخاب اور ان کے صحیح استعمال سے پہچانے جاتے ہیں۔ میرے کئی ایک مضمون میں لفظ "بیحد" استعمال ہوا تھا یہ معلومات بیحد قیمتی ہیں، یہ کتاب بیحد کم یاب ہے وغیرہ) انہوں نے اعتراض کیا اس پر بھی جب میں نے یہ مذموم عادت ترک نہ کی تو انہوں نے مجھے لکھا کہ آپ اس لفظ کو اپنی ڈکشنری سے بالکل خارج کر دیں۔ میں نے ایک بار ان کا ایک مضمون شائع کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے ایک تحقیق کو اس پایہ پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے متصور نہیں ہو سکتا، ان کا فوراً خط آیا کہ آپ کی رائے مبالغہ پر محمول ہے میرا دعویٰ ہے کہ اس سے کہیں بہتر مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کی طرح ان کے خلاف جو مضامین لکھے جاتے ہیں۔ اس کا جواب شاذ و نادر ہی دیتے ہیں۔ دیتے ہیں تو پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ مخاطب کس ظرف کا آدمی ہے۔ ویسے وہ اختلاف رائے کو پسند کرتے ہیں بلکہ علمی معاملات میں ایسی بحث و تمحیص کو وہ ضروری جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ جب کوئی تنقید لکھتے ہیں یا کتابوں پر تبصرے کرتے ہیں۔ تو جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ انصاف اور دیانت سے کام لیتے ہیں لیکن وہ نہ معصوم ہیں نہ منزّہ عن الخطا اس لئے بخوبی ممکن ہے کہ بغیر اس کے کہ ان کے ارادے کو اس میں دخل ہو انصاف اور حقیقت کے خلاف کچھ باتیں قلم سے نکل جائیں یا واقعات کی غلطیاں ہو جائیں یا یہ کہ مصنّف کے نقطۂ نظر کو صحیح طور پر سمجھنے سے وہ قاصر ہیں، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مصنّفین یا دوسرے ذمہ دار حضرات ان کے تبصروں سے اختلاف کریں اور ان کی غلطیوں سے انہیں مطلع کریں۔ جب تک وہ اپنا رسالہ معیار نکالتے رہے اس کا انہوں نے التزام رکھا اور اس ارادے کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ کسی نے ان سے اختلاف کیا اور اعتراضات کئے تو اس کا خط یا مضمون چھاپا، ضروری ہوا تو جواب دیا ورنہ اس کی بات مان لی اور شکریہ ادا کیا۔

تصنیفات پر رائے دینے میں یا تبصرہ لکھنے میں وہ بڑے محتاط ہیں وہ چلتی چلاتی یا مصلحت وقت پر مبنی رائے کبھی نہیں دیتے اور اسے خالص غیر علمی حرک بتاتے ہیں۔

ان کی تنقید دل کی تیزی کو برداشت کرنا ہر خاص و عام کا کام نہیں اس کے لئے اگر ایک طرف ضبط اور قوت برداشت کی ضرورت ہے تو دوسری طر اس سے صحیح طور پر محظوظ ہونے کے لئے علم کی تلاش و جستجو کی صحیح روح ناگزیر ہے۔ جو لوگ ان کے امتحان میں پورے اترے ہیں ان میں مہیش پرشاد، امتیاز علی صاحب عرشی، اور مالک رام صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک کرم فرما یاد آتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا تو قاضی صاحب نے اس پر لکھنے کا خیال ظاہر کیا وہ بڑے گھبرائے اور انہوں نے اس ارادے سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی اور لکھا کہ ”بھلا میرا حقیر مجموعہ آپ کی تنقید کا متحمل کس طرح ہو ہے“۔ جب ان کی دوسری تصنیف ایک اہم موضوع پر شائع ہوئی تو انہوں نے ایک نسخہ قاضی صاحب کی خدمت میں رائے کے لئے پیش کیا۔ انہوں نے پہلے تو بعض مش باتیں ان سے خط لکھ کر پوچھیں پھر انہیں مطلع کیا کہ وہ اس کتاب پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھ رہے ہیں جو تقریباً ۱۰۰ صفحات میں ہوگا۔ اس تنقید پر قاضی صاحب نے اس ق محنت کی جس قدر انہوں نے اپنی کتاب لکھنے میں کی ہوگی اور تنقید اس قدر پُر معلومات تھی کہ وہ اگر نظر ثانی کے وقت اسے پیش نظر رکھتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ک کتاب اپنے موضوع پر بہترین کتاب ثابت ہوتی۔ لیکن اس اطلاع کے پاتے ہی مصنف نے ان سے خط و کتابت تک بند کر دی۔

تنقید وہ بہت صاف، کھری اور بے لاگ لکھتے ہیں اس سلسلے میں نہ وہ تعلقات کا پاس رکھتے ہیں نہ دوستی کا۔ بلکہ بقول شخصے دوستوں پر وہ اور بھی ت جاتے ہیں، عرشی صاحب جن سے ان کے دیرینہ تعلقات ہیں، کی جس قدر کتابوں پر انہوں نے تبصرے لکھے ہیں شاید ہی کسی مصنّف کی تصنیفات پر لکھے ہو تبصروں کی طوالت اور اختصار زیادہ تر کتاب اور موضوع کی اہمیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ خطوط اکبر مرتبہ راقم پر ان کا تبصرہ صرف پانچ سطروں کا ہے لیکن خطوط غالب مرتّبہ عرشی پر ان کا تبصرہ کوئی پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔

تبصروں میں ہٹی ان سے بالکل نہیں ہوتی اور رواج زمانہ کے خلاف تعریفی کلمات بہت کم لکھتے ہیں، جن کتابوں پر آج تک انہوں نے تبصرے لکھے ہیں ا سب سے زیادہ وہ دیوان فائز سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جس کی ترتیب و تصحیح مناسب مسعود حسن رضوی ادیب نے کی ہے مختلف صحبتوں میں اس کتاب کا ذکر آیا ا ہمیشہ انہوں نے بہت اچھے الفاظ میں اس کتاب کی تصحیح و ترتیب کا ذکر کیا، بایں ہمہ جب انہوں نے معاصر میں اس پر تبصرہ لکھا تو تعریف میں صرف ڈھائی لکھیں، ”فاضل مرتب نے فائز اور ان کے کلام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے اور قدما کے کلام کو پیش کرنے کا جو اسلوب انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اس قسم کی ا کتابوں میں جو انجمن نے شائع کی ہیں، بہت کم ملتا ہے، ترتیب کا یہ بلند معیار قابل تقلید ہے۔“

فارسی اور اردو ادب کا جس قدر گہرا مطالعہ انہوں نے کیا ہے اور جس قدر مسائل ان کے ذہن نشین ہیں اس کا اندازہ عام طور پر لوگوں کو نہیں ہے جن لوگ انہیں قریب سے دیکھا ہے انہی کو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہر چند کیمبرج میں ان کے مضامین معاشیات سیاسیات اور تاریخ تھے لیکن چونکہ ادبیات فارسی و اردو ذوق انہیں بہت پہلے سے تھا اس لئے دوران قیام انگلستان ہی انہیں ان موضوعات پر اپنا مطالعہ وسیع کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ بہت سی قلمی کتابوں کے خلاصے یا نوٹس ان کے پاس اس زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔

یورپ سے واپسی کے بعد غالباً انہوں نے ملازمت کی طرف توجہ نہیں کی ہاں بیرسٹری کچھ دنوں انہوں نے ضرور کی لیکن یہ پیشہ ان کی افتاد طبیعت کے مطابق نہ تھا۔ خوش نصیبی سے ان کا تعلق ایک بہت ہی متموّل خاندان سے ہے اس لئے انہوں نے بہت سے علائق و مکروہات سے بہ آسانی پیچھا چھڑا لیا (ا کی شخصیت جو بہت نڈر، بے باک اور حق گو قسم کی ہے اس کا بھی راز یہی ہے)، اس وقت سے اب تک ان کا واحد شغل کتب بینی اور تالیف و تصنیف ہے۔

کتب بینی اور کثرتِ مطالعہ ہیچ ہے اگر کسی میں قوتِ استدلال و استنتاج نہ ہو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں مواد کی پرکھ اور نقد کا شعو ہو قاضی صاحب میں یہ ساری خوبیاں جمع ہیں۔ عام طور پر محققین اپنے تحقیقاتی کاموں کی ابتدا ’شک‘ سے کرتے ہیں قاضی صاحب کی ابتدا ’نفی‘ سے ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے وہ فوراً مان لیتے ہیں جب تک کہ اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے، وہ ہر بات کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں جب تک کہ آپ اس

صحت نہ ثابت کردیں۔

ان ساری باتوں کے علاوہ جو وصف انہیں دوسرے محققین سے ممتاز کرتا ہے وہ ان کی قوتِ حافظہ ہے۔

ایک بار ایک مجلس میں جس میں متعدد ادیب اور شاعر موجود تھے ذکر چھڑا کہ اُردو کے ہزاروں شعر ایسے ہیں جو زبان زد ہیں لیکن عام طور پر معلوم نہیں کہ کس کے شعر ہیں۔ لوگوں نے یکے بعد دیگرے کوئی دس شعر پڑھے قاضی صاحب نے فوراً بتا دیا کہ یہ شعر کس کے ہیں۔ اب ان کی باری آئی انہوں نے جو شعر پڑھے ہم لوگ کسی کا جواب نہ دے سکے۔ ان شعروں میں ایک یہ بھی تھا:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

بعد میں انہوں نے بتایا کہ یہ شعر وزیر لکھنوی شاگرد ناسخ کا ہے۔ گو بعض تذکروں میں خود ناسخ کے نام درج ہے۔

اپنے وسیع مطالعے اور حافظے ہی کی مدد سے انہوں نے آوارہ گرد اشعار کا ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے جس میں ایسے سارے اشعار درج ہیں جو دوسرے شعراء کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس کی متعدد قسطیں ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں اور جنہوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کی تجسس و تلاش کی داد دیئے بغیر نہ رہیں گے۔ فارسی کا یہ شعر کس نے نہیں سُنا ہے:

در بزمِ وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

لیکن یہ شعر اصل میں کس کی ملکیت ہے اس کا صحیح علم کم لوگوں کو ہوگا۔ قاضی صاحب نے اس پر تفصیلی بحث کی اور بتایا کہ نتائج الافکار میں نور جہاں بیگم، مجمع الاشعار میں عشرتی نور اللغات میں نسبتی کے نام منسوب ہے۔ علائی اسے مغربی کا اور غالب اسے قدسی کی غزل سمجھتے ہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اُسے حیرتی کے نائیدہ ہلالے متکہ سے سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب نے ثابت کیا کہ یہ غزل نصرتی کی ہے اور انہوں نے غالب کے اس قول کی کہ یہ غزل مطربوں کی زبان پر بھی تصدیق کی اور بتلایا کہ اسکا ایک پرانا گراموفون ریکارڈ بھی موجود ہے۔ (قاضی صاحب کے مآخذ صرف تذکرے اور بیاضیں نہیں ہز ماسٹرز وائس کی گراموفون ریکارڈ بھی ہیں)۔

ایک دن فن تنقید اور تنقید نگاروں کا ذکر تھا بولے صاحب "تنقید" جعلی مصدر ہے جس سے عرب واقف نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شبلی نے یہ لفظ پہلی مرتبہ استعمال کیا اور وہی اس لفظ کے موجد ہیں۔ اردو میں عام استعمال ان کی بدولت ہُوا ہو تو عجب نہیں۔ پھر انہوں نے اس لفظ کی قدیم مثالیں دینی شروع کیں انہوں نے بتایا کہ قدیم ترین مثال جو انہیں معلوم ہے ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتی ہے" "در تنقید روایت و تعریفِ روایت" جو نئی کتاب ان کے زیر مطالعہ رہتی ہے ملنے والوں سے زیادہ تر گفتگو اس سے متعلق ہوتی ہے۔ میں ایک بار ان سے ملنے گیا اثر لکھنوی صاحب کی چھان بین زیر مطالعہ تھی پوچھنے لگے لفظ 'رنڈی' عورت کے معنی میں مستعمل ہے یا نہیں۔ میں نے کہا میر امن کے یہاں یہ لفظ اسی معنی میں موجود ہے بولے لکھنؤ کے شعراء اور مصنّفین کے کلام سے سند چاہیئے۔ میں نے کہا یاد آتا ہے فسانۂ عجائب میں بھی یہ لفظ مذکور ہے۔ کہنے لگے۔ اثر صاحب کہتے ہیں لکھنؤ میں عورت کو رنڈی نہیں کہتے زمانۂ حال کا مجھے علم نہیں لیکن زمانۂ سابق میں لکھنؤ کے متعدد شعراء اور مصنّفین نے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے آج کل میں یہ اسناد جمع کر رہا ہوں۔ انہوں نے شاگردانِ دبیر میں سے کسی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی کا ایک مصرع سنایا۔

محل رنڈیوں سے ہے سارا بھرا

میں نے کہا ممکن ہے اس سے مراد زنانِ بازاری ہوں بولے نہیں میں نے سیاق کلام دیکھ لیا ہے، اس میں واجد علی شاہ کے متعلق لکھا ہے:

نہ کیوں کر کریں رنڈیاں ان سے چاہ
کہ ایسا تو مرد اور یہ مال و جاہ

'تہاقا' کے متعلق اثر صاحب نے لکھا تھا "قسم لے لیجئے جو لکھنوی ہونے پر بھی میں نے سُنا ہو"۔ کہنے لگے فسانۂ عجائب کے علاوہ یہ لفظ برق کے دیوان میں موجود ہے۔

کبک کی چال جو دیکھی تو تہاقا مارا

اسی طرح مصنف نے دعویٰ کیا تھا کہ موسِم کو موسَم (بالفتح) کہنے والے اہل لکھنؤ ہیں۔ قاضی صاحب نے میر کا شعر سنایا:

قفس میں میرؔ نہیں جوشِ داغ سینے پر
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسَم کی

(اس غزل کے قوافی برہم، شبنم، ماتم وغیرہ ہیں)

میں نے ایک بار ان سے پوچھا اس بات کی کیا سند ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے:۔

مجلسِ وعظ تو تادیر رہے گی غالب
پاس ہی مے خانہ ہے پی کر کے ابھی آتے ہیں

مسکرائے پھر بولے کہا جاتا ہے غالب کو خط لکھ کر پوچھا گیا تھا انہوں نے جواب دیا: مجھ پر کیا شامت آئی تھی کہ پاس ہی مے خانہ ہوتے ہوئے مجلس وعظ میں جا کر بیٹھتا"۔ پھر بولے یہ شعر دراصل یوں ہے:

مجلس وعظ تو تادیر رہے گی قائم
یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

کچھ لوگ اسے قائمؔ چاند پوری کا شعر سمجھتے ہیں لیکن 'قائم' لازماً بطور تخلّص نہیں آیا اور نہ یہ شعر دیوان قائم (نسخۂ لندن) میں موجود ہے۔

بے پناہ حافظہ اور ادبیات کے مطالعہ کے علاوہ جو وصف ان کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے وہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان پر ان کی تاریخی نظر اور بصیرت ہے۔ اس عہد کے مصنفین نظم و نثر میں جن اشخاص کا ذکر آتا ہے ان کی شخصیت متعیّن کرنے میں انہیں اپنے تاریخی مطالعہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دیوان انند رام مخلصؔ والے مضمون میں جو نوٹ انہوں نے نور بائی پر لکھا ہے اسے دیکھئے دستور الفصاحت (مرتبہ عرشی) میں ایک عبارت آئی تھی "باآخر محمد عاشق تصوّر واسطہ گردید" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تصوّر، محمد عاشق کا تخلّص ہے، انہوں نے تبصرے میں لکھا کہ "تذکرے محمد عاشق تصوّر کے ذکر سے خالی ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ محمد عاشق مصوّر ہیں جن کا ذکر انشاؔ کے اس شعر میں آیا ہے:

واہ اے میاں محمّد عاشق شبیہہ کش
کھینچی ہے تم نے کیوں مرے دل دار کی شبیہہ

سیاسی امور کے متعلق ان کی رائیں صائب ہوتی ہیں اور ان مسائل پر ان کی نظر گہری ہے۔ گو وہ اب عملی سیاست میں حصّہ نہیں لیتے لیکن یورپ جانے سے پہلے برسوں وہ اس دشت کی سیّاحی کر چکے ہیں۔ یہ زمانہ غالباً سنہ ۱۷ء، سنہ ۱۸ء کا تھا وہ تحریک خلافت میں شریک ہوئے اور اسی راستے سے وہ کانگریس میں آئے انہیں اس زمانے میں تحریک خلافت اور کانگریس کے تقریباً سربرآوردہ اصحاب کو قریب سے دیکھنے اور ان میں سے بعض کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہُوا۔ وہ مولانا محمد علی مرحوم کی دردمندی اور خلوص سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد انہیں سیاسی کاموں کی طرف غالباً توجہ کا موقع نہ ملا۔ تقسیم ہند سے کچھ پہلے وہ انجمن ترقی اُردو (شاخ بہار) کے سیکرٹری تھے اور اس عہدے پر وہ کئی سال تک رہے اور اُردو کے مسئلہ پر وہ مولانا عبدالحق صاحب کے ساتھ لوگوں سے لڑتے رہے۔ مولانا ابوالکلام ہوں یا ڈاکٹر سیّد محمود انہوں نے حق بات علانیہ کہی اور برملا کہی۔ وہ جناح صاحب کو مخلص اور ایک لائق قانون دان سمجھتے ہیں لیکن ایسا نہیں کہ انہیں غلطیوں سے منزّہ سمجھیں۔ ان پر اور لیگ کے دوسرے اراکین پر ان کے بڑے سخت اعتراضات ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ان اصحاب نے قوم کی باقاعدہ تنظیم کی کوشش بہت کم کی۔ معاملہ صرف نعروں اور ممبر سازی ہی تک رہا۔ وہ گاندھی جی کے خیالات سے متفق نہیں ہیں لیکن انہیں ایک بڑا سیاستدان اور اپنی قوم کا کامیاب لیڈر مانتے ہیں۔ ایک بار سوشلزم کا ذکر ہو رہا تھا بولے ہندوستان میں کمیونزم کے تو کچھ معنی بھی ہیں۔ سوشلزم کی بات سمجھ میں نہیں آتی اور یہاں اس کی کامیابی بڑی حد تک مشتبہ ہے۔ اس گفتگو کے کچھ ہی دنوں بعد سوشلسٹوں میں انتشار ہوا اور پارٹی کے کرتا دھرتا جے پرکاش نرائن علٰحدہ ہو گئے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کمیونزم کے حامیوں میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں اب دو ہی صورتیں معلوم ہوتی ہیں یا تو اشتمالیت کو بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکئے اور اس کے خلاف کروسیڈ کیجئے یا پھر اس تحریک کو مکمل طور پر قبول کر لیجئے۔ درمیان کی کوئی راہ نہیں ہے۔

فنونِ لطیفہ میں وہ شعر کو اور فنون پر ترجیح دیتے ہیں۔ موسیقی اور مصوّری سے ممکن ہے یورپ میں انہوں نے دلچسپی لی ہو، یہاں میں نے ان سے کبھی

ان فنون کا ذکر نہ سُنا۔ وہ ریڈیو کبھی نہیں سُنتے نہ خبروں سے انہیں دلچسپی لیتے دیکھا اور نہ پکّے گانوں سے میرا خیال ہے وہ تقریریں بھی شاید ہی سنتے ہوں۔ میں نے دو موقعوں پر انہیں متوجہ کیا اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ پروگرام سُن کر اپنی رائے سے مطلع کریں ریڈیو ان کے کمرے کے پاس ہی ان کے بیٹے قاضی مسعود کے کمرے میں بجتا رہا لیکن وہ متوجہ نہ ہو سکے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دونوں موضوع ایسے تھے جن سے ان کی دلچسپی مسلّم تھی، ایک تقریر خطوطِ اکبر پر تھی دوسرا غالب پر ایک فیچر تھا۔

فلمیں شاذ و نادر ہی دیکھتے ہیں سال بھر میں ایک آدھ بار کوئی اچھی فلم دیکھ لی تو دیکھ لی ورنہ اس کا بھی غم نہیں پالتے۔ کہتے ہیں ہندوستانی فلمیں دیکھنے میں وقت اور پیسے دونوں ضائع ہوتے ہیں کم سے کم اکثریت ایسی ہی فلموں کی ہے۔ بایں ہمہ کبھی کسی نے کسی فلم کی تعریف کی یا انہیں اپنے ساتھ لے گیا تو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک بار پٹنہ میں سہراب مودی کی 'سکندرِ اعظم' کی دھوم تھی دیکھنے گئے واپس آئے تو بولے۔ وقت ضائع ہوا لوگوں کو اس زمانے کے رسم و رواج معاشرت لباس وغیرہ کے متعلق جب تک اچھے اور صحیح معلومات نہ ہوں تاریخی فلم بنانے کا بیڑا نہیں اٹھانا چاہیئے۔

جب سہراب مودی کی فلم 'غالب' بنی تو انہوں نے اس خیال سے کہ فلم غالب سے متعلق ہے مجھے اس کی اطلاع دی اور جب فلم دیکھ چکے تو اپنے تاثرات مجھے اوکسفورڈ لکھ کر بھیجے۔ میں جب یورپ سے واپس آیا تو مجھے کھانے پر بلایا اور غالب فلم کے" ریکارڈ بھی سنوائے۔ اور دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ انہوں نے اس ایجی ٹیشن کا بھی ذکر کیا جو اس فلم کے خلاف دہلی وغیرہ میں ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈراما نگار نے بلا ضرورت حقیقت سے انحراف کیا ہے غالب کی زندگی پر بہت اچھا ڈراما لکھا جا سکتا تھا جو حقیقت پر مبنی ہوتا اور جس میں شاعر کے صحیح حالات پیش کئے جاتے۔

ان کی تنقیدی صلاحیتیں یہاں بھی کارفرما تھیں انہیں کہانی کے ساتھ ساتھ اداکاری اور ڈائرکشن پر بھی اعتراض تھا۔ وہ نہ ثریّا کی اداکاری سے خوش تھے اور نہ اس کے انتخاب پر۔ ان کے خیال میں نرگس اور مدھوبالا اس رول کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوتیں۔ فلم کے موضوع پر اس سے پہلے اس قدر تفصیلی بات کبھی نہیں ہوئی تھی فطری طور پر میرے دل میں ان معلومات کے مآخذ جاننے کی خواہش ہوئی معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں انہوں نے فلمی رسالوں اور معیاری انگریزی اخباروں کے فلمی نامہ نگاروں کی تنقیدات کا باضابطہ مطالعہ کیا ہے اور غالب فلم پر جو اہم رائیں اور تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کے تراشے انہوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ 'جہانِ غالب' میں جو ایک طرح کی غالب انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں غالب سے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع ہوں گی اب انہوں نے سہراب مودی، بھارت بھوشن اور ثریّا کے ناموں کے بھی اضافے کئے ہیں۔ ان سبھوں کا ذکر ایک آدھ ہی سطر میں ہو گا لیکن ہو گا ضرور اس لئے کہ ایک نے غالب کی زندگی پر فلم بنائی ہے تو دوسرے نے غالب کا رول ادا کیا ہے اور ثریّا غالب کی محبوبہ کی حیثیت سے فلم میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

ادبی ذوق کے باوجود وہ مشاعروں میں جانا پسند نہیں کرتے اور نہ وہ شاعروں کی اتنی عزت افزائی کرتے ہیں کہ انہیں شعر سننے پر مجبور ہونا پڑے۔ ہاں وہ خود کوئی ادبی جلسہ منعقد کر رہے ہوں یا ان کے خاص احباب کسی مشاعرے میں شریک ہو رہے ہوں تو دوسری بات ہے۔ میں نے انہیں صرف دو بار مشاعروں میں شرکت کرتے دیکھا ہے۔ ایک بار ان کے دوست ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ایک مقامی مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے یہ کوئی سنہ ۳۵ء کی بات ہے وہ مشاعرے میں آئے، خاموش بیٹھے رہے اور سگریٹ پیتے رہے۔ دوسری مرتبہ صوبائی انجمن ترقی اردو کی طرف سے انہوں نے اردو کانفرنس منعقد کی تھی آخری دن مشاعرے کا بھی پروگرام تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صدارت کے لئے لاہور سے آئے تھے وہ گئے۔ خطبۂ صدارت اور کچھ شعراء کو سُن کر چلے آئے۔ ایک موقع پر عندلیب شادانی صاحب پٹنہ کالج کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے آئے اور حسبِ معمول قاضی صاحب کے یہاں ٹھہرے میں نے ان سے پوچھا آپ نے شادانی صاحب کو کبھی سُنا بھی؟ بولے اس کا موقع نہیں ملا نہ انہوں نے سنانے کی فرمائش کی نہ میں نے ان سے کچھ کہا۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ وہ ان کی شاعری کے مدّاح ہیں انہوں نے ان کی کئی نظمیں اپنے رسالے میں شائع کی ہیں۔ اسی طرح ایک بار ڈاکٹر سچیدانند سنہا کے یہاں ساغر نظامی آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ احباب کو چائے پر مدعو کیا اور ساغر صاحب سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ قاضی صاحب موجود تھے۔ دو گھنٹے تک ساغر صاحب شعر سُناتے رہے لوگ داد سے چھت اڑاتے رہے اور قاضی صاحب سگار کا دھواں۔

یہ قصّہ مشاعرے کا ہے ان کے گھر کی بات کچھ اور ہے کوئی معقول شاعر ان سے ملنے جائے اور شعر سننے کا موقع ہو تو اخلاقاً اس سے شعر سنانے کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔ ایک بار میں پرویز شاہدی صاحب کو لے کر ان کے یہاں گیا ان سے قاضی صاحب کے دیرینہ تعلقات ہیں لیکن ایک عرصے کے بعد ان سے ملنا ہو رہا تھا۔ قاضی صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے باغیچے سے اُٹھے انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے اور علمی اور ادبی باتیں کرنی شروع کیں زیادہ تر صنفِ غزل کے مطابق۔ کلیم الدین احمد صاحب کی کتاب اردو شاعری والی شائع ہو چکی تھی (یہ اکتوبر ۴۱ء کی بات ہے) اس پر دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ قاضی صاحب ممکن ہے غزل کو 'نیم وحشی صنفِ شاعری' نہ سمجھتے ہوں لیکن وہ اس کے مداحوں میں بھی نہیں معلوم ہوتے 'معیار' میں انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے، چنانچہ انہوں نے کبھی کوئی ایسی غزل شائع نہیں کی۔ ایک بار ہندوستان کے مشہور غزل گو شاعر نے اپنی غزل پر نظم کا عنوان لکھ کر اشاعت کے لئے بھیج دیا، شرف، عالم آرزو، جلیل مرحوم جو 'معیار' کے کاموں میں ان کے معاون تھے مجھ سے کہتے تھے کہ یہ غزل انہیں واپس کر دی گئی اور لکھ دیا گیا کہ براہ کرم غزل کو نظم بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔

پرویز صاحب سے اس دن اصرار کر کے قاضی صاحب نے کئی غزلیں سُنیں، ایک غزل کا مطلع یاد رہ گیا ہے:

سُنا ہے کل تھا ان کے لب پہ ذکرِ مختصر میرا
تصوّر دے رہا ہے طول اسی کو کس قدر میرا

قاضی صاحب بہت محظوظ نظر آئے اور ان کے اشعار کی بہت تعریف کی۔

انہوں نے مجھے مختلف ملاقاتوں میں متعدد ناولوں اور افسانوں کے زبانی پلاٹ سُنائے ہیں لیکن انہیں کبھی ناول یا افسانہ لکھنے کا موقع مل سکے گا اس میں میں زیادہ پر اُمید نہیں ہوں۔ ان اصناف میں ان کے معیار کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے رسالے میں کبھی کوئی طبع زاد افسانہ یا ڈراما شائع نہیں کیا۔ مغربی مصنفین کی چیزیں ترجمہ کرا کے شائع کیں اور وہ بھی سخت جانچ اور احتساب کے بعد۔

یہ بات شاید ہی کسی اور کو معلوم ہو کہ قاضی صاحب شاعری میں بھی بند نہیں۔ انہوں نے موزوں طبیعت پائی ہے اب انہیں شعر کہنے کی شاید ہی فرصت ملتی ہو لیکن برسوں پہلے وہ کبھی کبھی فکرِ سخن کر لیا کرتے تھے۔ یہ چند شعر ان کی طالب علمی کے زمانے کی یادگار ہیں۔

چشمِ شب زندہ دار کو حسرت   دلِ امیدوار کو حرماں
تھی اسی واسطے یہاں لائی   زندگی تجھ سے تھا یہی پیماں؟

کبھی نہ خود کاتبِ تقدیر ہو خنداں مجھ پر   شوق پرواز ہے لیکن پرِ پرواز نہیں

میں سوزِ شب اگر نہ کراہوں تو کیا کروں   اک نوبہارِ ناز کو چاہوں تو کیا کروں

بُلبل ہو کہ پروانہ گل و شمع کے آگے   یہ سوختنی ہے تو وہ گردن زدنی ہے

مجھے رونے سے منع کرتے ہیں   یہ بھی اک امرِ اختیاری ہے!

سُنے جو اسے نیند اس کو نہ آئے   مرا حال ہے یہ کہانی نہیں ہے

کیا کہہ گیا ایک محرمِ راز   بُلبل نہیں گل ہے نغمۂ پرداز

تیرے لئے مجھ سے ہیں ہزاروں   میرا تو جہاں میں ایک تو ہے

قاضی صاحب کی کچھ مخصوص کمزوریاں بھی ہیں۔ بے پناہ حافظے کے باوجود انہیں مکمّل شعر بہ مشکل ہی یاد رہتے ہیں اور مکمّل غزل تو شاید ہی کوئی انہیں یاد ہو (یہ دوسری بات ہے کہ اُردو فارسی کا کوئی شعر اگرچہ وہ کتنا ہی غیر مشہور کیوں نہ ہو آپ کو مکمّل یاد نہ ہو۔ آپ صرف چند لفظ ان کے سامنے پڑھ دیں وہ نہ صرف شعر سمجھ جائیں گے بلکہ یہ بتا دیں گے کہ یہ شعر کس کا ہے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے یا کسی خاص قلمی نسخے میں، کن کن بیاضوں اور تذکروں میں اس کا اندراج ہے، وہ یہ بھی بتا دیں گے کہ یہ شعر صحیح یا غلط طور پر کن کن شعراء کی طرف منسوب ہے) یہی حال خطوں کے پتوں کا ہے۔ کثرت سے خط و کتابت کے باوجود اگر آپ کا پتہ مختصر نہیں ہے تو کبھی یاد نہ رکھیں گے اور ہمیشہ آپ کو تاکید کریں گے کہ اپنا پتہ خط کی پیشانی پر ضرور لکھا کیجئے (انہیں دوسروں کی سہولت کا بھی اس معاملہ میں بہت خیال رہتا ہے وہ اس امر کا التزام کرتے ہیں کہ اپنے خط پر تاریخ تحریر اور اپنا پتہ ضرور درج کریں) میری ان کی ایک مدّت سے خط و کتابت ہے لیکن ان کی تاکید رہتی ہے کہ میں اپنا پتا ضرور لکھا کروں ایک بار میں ایسا کرنا بھول گیا انہوں نے 'ظفر منزل' شاہ گنج پٹنہ ۶ کو شاہ منزل ظفر گنج بنا دیا۔ پتہ غلط تھا لیکن خط مل گیا۔

یہی حال مکانوں کا ہے انہیں کسی مکان کی چوحدی اور محلّ وقوع یاد رکھنے میں دقّت ہوتی ہے، کوئی رفیق ساتھ نہ ہو تو ممکن ہے وہ مطلوبہ مکان پر بڑے توقف کے بعد پہنچیں یا پہنچیں ہی نہیں۔ ایک مرتبہ انہیں پروفیسر قمر الدجیٰ صاحب پرنسپل سائنس کالج کے یہاں جانا تھا جہاں ان کے ایک دوست ٹھہرے ہوئے تھے۔ موصوف کی کوٹھی پٹنہ کالج کے سامنے سرِراہ واقع ہے اور یقین ہے انہوں نے بیسیوں بار دیکھی ہو گی۔ صحن خانہ میں پہنچ کر انہیں خیال ہوا کہ وہ کسی اور کی کوٹھی میں آ گئے ہیں، واپس آئے اور صدر دروازے پر نام کی تختی غور سے پڑھی، کوٹھی پروفیسر موصوف ہی کی تھی۔

کاغذات اور کتابیں بڑی منتشر حالت میں رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ انہیں یہ بات تو یاد رہتی ہے کہ مصحفی کے فلاں قصیدے کی نقل جو عرشی صاحب نے رام پور کے کتب خانے سے یا عندلیب شادانی صاحب نے جامعۂ ڈھاکا کے کتب خانے سے بھیجی ہے اس کے مطالب کیا ہیں، کب لکھا گیا، مصحفی کے کس دیوان میں ہے انشا سے اس وقت شاعر کے تعلقات کس طرح کے تھے، سلیمان شکوہ نے کس حد تک مصحفی کا اور کہاں تک انشا کا ساتھ دیا تھا، غرض یہ ساری باتیں یاد رہتی ہیں صرف یہ یاد نہیں رہتا کہ قصیدے کی نقل کہاں رکھی ہے۔ کاغذات ان کے پاس بہت جمع رہتے ہیں اور دن رات آتے ہی رہتے ہیں یہ فلاں تذکرے سے فلاں شاعر کے حالات مسعود حسن رضوی صاحب نے لکھنؤ سے بھیجے ہیں یہ نقل ڈھاکے سے یہ لاہور سے آئی ہے۔ یہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ڈاکٹر زبیر صدیقی یا شاہ مقبول احمد صاحب نے بھجوائی ہے۔ غرض روز بروز نقول اور کاغذات میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ خطوط کی بھرمار الگ ہوتی ہے، یہ خطوط نقلوں کے ساتھ چپک جاتے ہیں اور کبھی بارھویں صدی ہجری کے شعراء کے تراجم و اشعار کی نقلیں زمانۂ حال کے ادیبوں کے خطوں کے لفافے میں پہنچ کر مہینوں کے لئے گم ہو جاتے ہیں لیکن ضائع نہیں ہوتے اس لئے کہ جس طرح کوڑا کرکٹ کمپنی کے بمبوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں اسی طرح ہفتہ دو ہفتہ کے بعد یہ کاغذات اور خطوط تکیہ کے نیچے سے نکال کر بڑے بڑے صندوقوں اور بوریوں میں ڈال کر بند کر دیئے جاتے ہیں اس دن کے انتظار میں جب بوقتِ فرصت یہ چیزیں نکال کر علٰحدہ کی جائیں گی لیکن یہ وقت بڑی مشکل سے آتا ہے اور اسی وقت آتا ہے جب کوئی نہایت اہم کاغذ گم ہو جاتا ہے ایسے وقت سارے کام بند کر دیئے جاتے ہیں اور صندوقوں کے پٹ اور بوریوں کے مُنہ کھول دیئے جاتے ہیں لیکن ابھی وہ چند ہی کاغذات دیکھ پاتے ہیں کہ ان میں ایک ایسا کاغذ مل جاتا ہے جس کی تلاش میں وہ عرصے سے تھے۔ وہ نیا کام ملتوی ہو جاتا ہے بکس پھر مقفل ہو جاتے ہیں اور پرانے کاغذ کی گم شدگی کی وجہ سے جو مضمون نامکمل پڑا تھا وہ یک بیک ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے اور اس کی تکمیل شروع ہو جاتی ہے۔

کتابوں کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اکثر کتابیں اور رسالے بھی گم ہوتے رہتے ہیں۔ خطوط اور کاغذات کی طرح ان کے پاس مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے اس میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ نئی مطبوعات کے ساتھ قدیم نادر مطبوعات اور مخطوطات بھی خریدتے رہتے ہیں مختلف کتب خانوں سے قلمی کتابیں مستعار آتی رہتی ہیں یا ان کی نقلیں پہنچتی رہتی ہیں۔ ان کتابوں کے لئے اب موزوں جگہ باقی نہیں بچی اور ان کے رکھنے میں کوئی ترتیب نہیں۔ قلمی کتابیں مطبوعات کے ساتھ رکھی ہوئی ملیں گی اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مستعار مخطوطات، نول کشوری مطبوعات کے ساتھ خلط ملط ملیں گی۔ کتابیں، احباب اور تلامذہ الگ لے جاتے ہیں ان سے مانگ کر وہ قیمتی کتابیں دینے میں بھی کبھی تامل نہیں کرتے اکثر و بیشتر وہ کسی موضوع کے لئے خود ہی کوئی کتاب تجویز کرتے ہیں اور خود ہی مہیا کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کتب خانے آپ کہاں جائیں گے معلوم نہیں وقت پر آپ کو ملے یا نہیں، میرا ذاتی نسخہ لے لیجئے گا، ایسی کتابیں اکثر واپس آجاتی ہیں لیکن کچھ کو اپنے نئے مالکوں سے ایسی دل چسپی ہو جاتی ہے کہ واپس نہیں آتیں۔ قاضی صاحب یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ کتاب کوئی معقول شخص لے گیا ہوگا تو واپس آ ہی گئی ہوگی۔ اب اگر سامنے کی الماری یا شلف پر موجود نہیں تو لامحالہ صندوقوں میں کہیں بند ہوگی۔

کتابوں کی جلد بندی پر کبھی توجہ نہیں دیتے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی کتاب جلد ساز کے یہاں سے مجلّد ہو کر نئی نئی آئی ہو نہ کبھی اس معاملے میں دل چسپی لیتے ہوئے اُنہیں پایا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابیں کثرت استعمال سے بوسیدہ ہونے لگتی ہیں پہلے پرانی دفتیں الگ ہوتی ہیں پھر کتاب سے فائل پیج اُترتے ہیں اس کے بعد اصل کتاب کے صفحے جُدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی حال خاتمۂ کتاب کا ہوتا ہے۔

آئے دن کتابیں گم ہوتی رہتی ہیں اور گم شدہ کتابیں ملتی رہتی ہیں۔ کاغذات اور کتابوں کی اس گمشدگی کے لئے وہ ایک اصطلاح Misplace ہمیشہ استعمال کرتے ہیں کبھی کسی کتاب کا تذکرہ آیا کہنے لگے میرے پاس موجود ہے کہیں Misplace ہو گئی ہے۔ وہ اکثر فخریہ کہتے ہیں کہ میرے یہاں سے کاغذات یا کتابیں گم نہیں ہوتیں صرف کبھی کبھی Misplace ہو جاتی ہیں اور یہ صحیح ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ کتاب ممکن ہے برسوں کے بعد ملے لیکن ملے گی ضرور۔ ایک زمانے میں اورینٹل کانفرنس پٹنہ میں جو انہوں نے معرکۃ الآرا مقالہ مصحفی پر پڑھا تھا وہ Misplace تھا، پھر معلوم ہوا دیوان مصحفی کا ایک قلمی نسخہ Misplace ہو گیا ہے لوگوں کے خطوط اُردو کے تذکرے اور غالب کے تصنیفات آئے دن Misplace ہوتی رہتی ہیں آج کل میرے مجموعۂ مضامین کے مسودات کہیں Misplace ہو گئے ہیں۔

انہیں گھڑی سے کوئی دلچسپی نہیں، نہ وہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور نہ گفتگو کے دوران میں وہ کمرے کے کلاک پر نگاہ رکھتے ہیں لہذا انہیں وقت کا اندازہ کبھی نہیں ہوتا، گفتگو جب شروع ہوتی ہے تو ایسی محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ گھنٹہ پر گھنٹہ گزرتا جاتا ہے اور انہیں اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ قاضی صاحب بڑے جلیل القدر محقق ہیں اور اپنی زبان کے مایۂ ناز نقاد، لیکن ان کی گفتگو میں وہ خشکی نہیں جو اس قسم کے اہل علم میں عام طور پر ہوتی ہے۔ وہ خوش گفتار ہیں اور اپنے علم اور حافظے کی مدد سے مخاطب پر چھا جاتے ہیں۔ پھر بعض اصحاب کے برخلاف لوگوں کو اپنے پسندیدہ موضوع پر نہیں لے آتے بلکہ انہی کی دل چسپی کے موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں ایک بار ایک صاحب برسوں کے بعد ان سے ملنے آئے، باتیں شروع ہوئیں دن کا کھانا آیا دونوں نے کھا لیا پھر باتیں ہونے لگیں چار بج گئے شام کی چائے آگئی پھر باتوں میں مصروف ہو گئے، آٹھ بجے شب کا کھانا آیا کھانا کھا لیا باتیں اب بھی ختم نہ ہوئیں، آخر جب وہ بہ مشکل رخصت ہوئے اور قاضی صاحب تھکے ہارے اُوپر اپنی خواب گاہ میں پہنچے تو دیکھا پورا گھر سویا ہوا ہے اور بارہ بج رہے ہیں۔

انہیں اپنی کتاب یا مضمون کی تصحیح کا بڑا خیال رہتا ہے اس میں وہ جس قدر اہتمام کرتے ہیں، اور کھڑاگ کھڑا کرتے ہیں وہ عام تو عام خاص لوگوں کے بھی بس کا نہیں۔ 'معیار' ان کا اپنا رسالہ تھا جو انہوں نے سنہ ۳۶ء میں پٹنہ سے شائع کرنا شروع کیا تھا اس کی کتابت و طباعت کی نگرانی خود وہ کیا کرتے تھے اور تعجب نہیں کاپیاں اور پروف وہ چھپنے سے پہلے متعدد بار پڑھ لیتے ہوں لیکن جب پہلا شمارہ نکلا تو فہرست مضامین کے بعد 'معروضات' اور 'تعارف' سے پہلے نہایت نمایاں طور پر غلط نام درج تھا جو پورے ایک صفحہ کا ہے، دوسرے شمارے میں پھر نمایاں مقام پر پہلے شمارے کی تصحیح چھاپی گئی اس شمارے کے بعض الفاظ کی تصحیح تیسرے ماہ کے پرچے میں بھی موجود ہے۔ معیار کے دوسرے شماروں کی تصحیحات بھی اسی طرح ہر ماہ چھپتی رہیں۔ اب بھی جب وہ معیار کی فائل کسی قدر داں کو دیتے ہیں تو اپنے قلم سے مزید تصحیح و اضافہ کے بعد ہی دیتے ہیں۔

غالب نمبر میں میں نے غالب کے ایک فرضی اُستاد عبدالصمد پر اُن کا مضمون شائع کیا، مضمون لکھنے کے بعد سے چھپنے تک اس میں وہ تبدیلیاں اور اضافے کرتے رہے اور جب میں نے اسے احوالِ غالب میں دوبارہ شائع کرنا چاہا تو انہوں نے اس طرح شائع کرانے سے انکار کر دیا پورا مضمون دوبارہ لکھا یہاں تک، کہ انہوں نے عنوان بھی بدل ڈالا۔

غالب نمبر ہی میں ان کا مضمون 'غالب بہ حیثیت محقق' شائع ہوا۔ ان کے افکار نے تو ان کے ذہن میں نہ نہیں کتنی شکلیں بدلی ہوں گی جب مضمون نے یہ قالب اختیار کیا ہو گا مضمون مکمل ہو چکا تو انہوں نے اغلاط کی تصحیح کی، جا بجا قطع و برید کئے، کہیں کہیں مکرّر اصلاح کی بعض باتیں بدلیں بعض نئی لکھیں۔ اب مسودے میں کانٹ چھانٹ کی مزید گنجائش نہ رہی تو انہوں نے سادہ کاغذ کی چپیاں مضمون پر چسپاں کیں، کہیں کہیں سطر کی سطر اور پیراگراف کا پیراگراف انہوں نے نئی چپیوں پر لکھا۔ مضمون جب مجھے ملا اور میں نے کتابت کے لئے کاتب کے حوالہ کیا تو ان کا والا نامہ آیا جس میں انہوں نے بعض امور کی تصحیح کی تھی۔ مسودہ درست کر دیا گیا پھر دوسرا خط آیا اس میں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ مسودے میں اس طرح ترمیم کر دی جائے، یہ بھی کر دیا گیا ان کی فرمائش تھی کہ کاپی کی تصحیح وہ خود کریں گے۔ علی گڑھ میگزین والوں کے لئے یہ بات بالکل نئی تھی لیکن میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ وعدہ کر لیا اور انہیں کتابت شدہ اجزا بھیج دیئے گئے۔ انہوں نے اغلاط کی تصحیح کی۔ کچھ مزید مکرّر اصلاح کی اور اضافے کئے۔ کاپی نویس ان غلطیوں کو کاٹ پیٹ کر درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس عرصے میں ان کے کئی خطوط آئے اور اس طرح مضمون میں کچھ نہ کچھ مزید اضافے اور ترمیمات ہوتی رہیں۔ پروف بھی اتروا کر انہیں بھجوائے گئے اور اس میں بھی مکرّر اصلاح ہوئی تصحیح کے اس اہتمام اور اس دیدہ ریزی کے باوجود جب غالب نمبر شائع ہوا تو وہ تصحیح کی طرف سے مطمئن نظر نہ آئے اور اُنہوں نے مجھے بتایا کہ مضمون میں بعض فاحش اغلاط رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہی انہوں نے اپنے دعووں کے ثبوت میں مزید اسناد اور حوالے جمع کرنے شروع کئے۔ قدیم اور جدید فارسی کی سینکڑوں کتابیں پڑھیں ایک ایک لفظ کے لئے شاعروں کے مکمل دیوان دیکھ ڈالے۔ شاہنامہ کئی کئی بار پڑھا اور انہوں نے اتنا وافر مواد جمع کر لیا کہ جب میں نے نقدِ غالب میں اس مضمون کو شامل کرنا چاہا تو انہوں نے مضمون اسی طرح چھپوانے سے انکار کر دیا اور دوسرا مضمون از سرِ نو لکھنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد انہوں نے یہ ڈھائی سو صفحوں کا مضمون تمام کیا۔ اس کی تمہید میں انہوں نے لکھا:۔

> "غالب بہ حیثیت محقق" کے عنوان سے میرا ایک مقالہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اشاعت پذیر ہوا تھا جو بہت عجلت میں لکھا گیا تھا اور اس میں اغلاطِ طباعت بھی بہ کثرت تھے۔ میری استدعا ہے کہ یہ کالعدم سمجھا جائے اور مجھے اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے۔"

اس مضمون کی کاپی دہلی میں لکھی جاتی رہی میں برابر انہیں علی گڑھ سے پٹنہ بھجواتا رہا۔ مضمون کی تصحیح وہ مصروفیت کی وجہ سے کرنی نہیں چاہتے تھے لیکن یہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی میں بھی اس زمانے میں بہت مصروف تھا بہرکیف میرے اصرار پر وہ مان گئے اور کاپی کی تصحیح خود انہی نے کی۔ یہ یاد نہیں آتا کہ تصحیح شدہ کاپی ان کے پاس بھیجی گئی تھی یا نہیں کہ وہ دیکھ لیں کہ اغلاط بن گئیں یا نہیں۔ پھر جب کاپیاں جمیں تو ان کے پروف ان کی خدمت میں بھیج دیئے گئے اور میں انتظامات سے مطمئن ہو کر یورپ چلا گیا وہاں سے جب واپس آیا اور چھپی ہوئی کتاب پر نظر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مضمون کے اختتام کے بعد پانچ صفحوں کا "تصحیح و اضافہ" ہے پھر اس کے بعد "تتمہ تصحیح و اضافہ" ہے، یہیں پر بس نہیں اب مزید پانچ صفحوں کا 'غلط نامہ' ہے اس کے اختتام پر پھر "تتمہ غلطنامہ" درج ہے۔ وہ اب بھی مطمئن نہیں اور جب وہ اپنے کسی ذی علم دوست کو اپنے اس مضمون کا آف پرنٹ دیتے ہیں تو اپنے قلم سے مزید تصحیح کرنے کے بعد ہی دیتے ہیں۔

کسی بات کے لکھنے اور ناظرین تک اسے صحیح طور پر پہنچانے کا یہ سارا ولولہ، یہ ساری جدّ و جہد اور یہ ساری علمی دیانت انہوں نے براؤن اور دوسرے علمائے یورپ سے سیکھی ہے، مشرق میں ایک شخصیت سے وہ بیحد متاثر ہیں اور میں نے اکثر ان کا ذکر انہیں بڑے احترام سے کرتے سنا ہے، یہ شخصیت عبدالوہاب قزوینی کی ہے لیکن قزوینی کی خوش نصیبی یہ ہے کہ ان کی تصانیف کے لئے انہیں یورپ اور ایران کے بہترین پریس ملے۔ اگر یورپ کے مستشرقین کو اپنی کتابیں ہندوستان کے سڑے ہوئے پریس میں چھپوانی پڑ جائیں تو یقین مانئے انہیں اپنی کتاب ہی کی ضخامت کا ایک غلطنامہ بھی شائع کرانا پڑے۔

شفق رضوی عمادپوری

حسنؔ وارثی

نام :- سیّد حسنؑ مرتضیٰ (اسم تاریخی مظہر سعید)

ولدیت :- سیّد حسنؑ رضا (صدر الصدور اضلاع مغربی و شمالی)

ولادت :- سنہ ۱۲۸۹ ہجری مطابق سنہ ۱۸۷۱ء -

سکونت :- موضع عمادپور - نزد ریلوے اسٹیشن رفیع گنج - ضلع گیا -

اساتذہ :- (۱) طب و شاعری :- حکیم سیّد عابد علی کوثرؔ وارثی خیرآبادی - (اس زمانہ میں تخلّص حسنؔ کرتے تھے)

(۲) حدیث و شاعری :- مولانا محمدؐ ظہیر احسن شوقؔ نیموی (آپ ہی کے کہنے سے تخلّص شفقؔ اختیار کیا)

(۳) عروض و شاعری :- مفتی امیر احمدؐ امیرؔ مینائی -

رحلت :- ۷ر اپریل سنہ ۱۹۴۴ء روز جمعہ وقت نو بجے صبح بمقام عمادپور ضلع گیا -

چودھویں صدی ہجری صلعم سے چند سال چھوٹا ہونا میرے لئے منجملۂ آثار سعادت متصور ہے چونکہ جس روحی فداہٗ ہستی سے یہ یادگار تقویم منسوب ہے اس کے احترام و ادب کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے - مگر بین الاقوامی بیسویں صدی کی نسبت جس واقعہ سے بتاتے ہیں وہ ہمارے نزدیک مصدّق نہیں لہٰذا اس مروّجہ صدی سے چند سال بڑا ہونا اچھا لگتا ہے - اسی بیسویں صدی کا پہلا عشرہ پورا ہونے میں ابھی دو سال باقی تھے جب کا حال سنا رہا ہوں - مخزن وغیرہ رسائل اور گلدستوں میں کلام شفقؔ عمادپوری دیکھ کر اس سے محظوظ ہونا کیسا یوں کہئے کہ انقباض خاطر کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا - آپ پوچھیں گے کہ اس للّٰہی کی وجہ ؟ اچھا تو سنئے میری عمر کچی اور عقل بھی خام سہی مگر خاصے سن رسیدہ بزرگواروں سے طریقت کی برادری قائم کرنے کی عزت باینہمہ حاصل تھی - اُنہی میں اخی طریقت حضرت حکیم سید عابد علی کوثرؔ خیرآبادی تھے کہ صورت اور سیرت، دونوں اعتباروں سے 'سو بزرگوں کے ایک بزرگ' جن کی محاسن مبارک اور سر اقدس نورٌ علیٰ نور یعنی سن سفید - پھر وہ بھی وارثی اور میں بھی وارثی - ان کی بزرگانہ شفقتوں کا یہ عالم کہ رمضان کے مہینے بیمار ہو کر جوان کے زیر علاج آیا تو ضد کر بیٹھا کہ افطاری کی مخصوص چیز پھلکیاں کھاؤں گا - اب

حکیم صاحب اجزائے ضروری مسان رہے ہیں۔ اپنی طرف سے دوائیں بغرض اصلاح ملا کر آہنی چولھے پر کڑاہی چڑھائے پھلکیاں میٹھے تل رہے ہیں۔ غور کی جا ہے کہ ایسے شفیق بزرگ پیر بھائی شاگردی سے منحرف ہونے والے شفق سے ملتجی نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ حکیم صاحب تو آخر کار اپنے وطن خیرآباد سدھارے۔ یہ شفق ٹھہرے ہمجوار۔ گیا آتے ہی جاتے رہتے تھے۔ اپنے رشتہ داروں میں سے میر شفاعت حسین مرحوم کے یہاں اکثر مقیم ہوا کرتے تھے کہیں نہ کہیں مل ہی جاتے مگر ایک عرصہ تک مراسم علیک سلیک سے آگے نہ بڑھے۔

۱۹۱۴ء کے اواخر میں میری شادی ہوئی۔ میرے سگے ماموں جان ہی میرے خسر ہوئے۔ شہر میں ان کی ٹکر کا مسلمان رئیس کوئی دوسرا نہ تھا۔ اسم شریف سید ابوالبرکات عرف ظفر نواب ہے ۱۹۱۶ء میں جانی و خوشدامن کی رحلت کا بڑا اثر ماموں جان پر ہوا۔ ظفر منزل معہ اسٹیٹ میرے سپرد کر کے ممدوح الشان دولت باغ والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ ممدوح کے مصاحبوں میں منشی وصی احمد وصی تخلص شاگرد میر احمد علی صاحب عشرت رئیس گیا تھے۔ انہی کی ترغیب سے میں بھی حضرت عشرت کے تلمیذوں میں داخل ہو گیا۔ اب معلوم ہوا کہ میری شادی میں استاد مرحوم نے بھی رقعہ نظم فرمایا تھا مگر حضرت شفق کے رقعہ کو سب پر ترجیح رہی تھی۔ افسوس کہ یہ محفوظ نہ رہ سکا۔ صرف پہلا مصرعہ یاد ہے ع "سمہ ہے غازۂ عروس سخن"۔ ظفر منزل ہی میں منشی سید ظہیرالدین شمس ملے۔ یہ شفق کے شاگرد، پرگو شاعر، بہادر شکاری، خوش نویس، فارسی کی معقول استعداد رکھنے کے علاوہ، وقت بے وقت عمدہ کھانا بھی پکا لینے میں مشاق، ڈرامہ نویس و ایکٹر تھے۔ مگر ان کی غربت کا ناجائز فائدہ کچھ ہم چشموں نے اُٹھایا تھا۔ لہٰذا مجھے اُن کی ہمدردی عزیز ہوئی۔ انہی کے ذریعہ آغا حشر کاشمیری سے راہ و رسم ہوئی اور جناب شفق سے پینگ بڑھے۔ اور بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچے کہ تفاوت سن و سال بھی بے تکلفیوں میں حارج نہ ہو سکا۔ مولانا کو ان کے کلام کی داد مجمع اغیار میں جی بھر دیتا مگر تخلیہ میں مصرعہ مصرعہ پر سخت تنقید کرتا۔ واضح باد کہ یہ تنقید صرف تخیل سے متعلق ہوا کرتی تھی ورنہ علم عروض سے متعلق تو مولانا اتنا جانتے تھے کہ ہمارے جیسے اُن کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے میں بھی فخر محسوس کرتے۔ قابل لحاظ بات یہ تھی کہ میری حد ادب سے باہر شوخ گفتاری سے کبھی کبیدہ خاطر ہونا کیسا؟ اور اُلٹے چھیڑ کر میری الٹی سیدھی باتیں سنتے اور فراخ دل و حوصلہ کے ساتھ گزارشات ماننے کی ہوتیں تو مان بھی لیتے۔ بہت دنوں مجھے اس کا راز معلوم نہ ہو سکا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ آخر یہی سمجھ میں آئی کہ اس ذریعہ وہ مجھے اپنی معلومات سے مستفید فرماتے ہیں کیونکہ غور جو کیا تو میری لایعنی بکواس سے ان کے تخیل میں خود ان کے نزدیک اصلاح یا رد و بدل شاذ و نادر ہی ہوا مگر مجھے خوب خوب نکات اس ذریعہ حاصل ہوئے۔ سچ کہا ہے کہ ؎

ہمنشیں تو از تو بہ باید   تا ترا عقل و دیں بیفزاید

حالانکہ استاد عشرت ۱۹۱۸ء میں سفر آخرت فرما چکے تھے اور مولانا شفق کے علم و واقفیت کا دوسرا استاد فن میرے قریب نہیں تھا۔ مگر ان اصلاحیں جو شاگردوں کے کلام پر نظر سے گزریں وہ کچھ جی بڑھانے میں ممد نہ ہوئیں۔ علاوہ ازیں حقیقت بھی یہی ہے کہ استاد عشرت کے طرز اصلاح کا عادی 'غلط گوئی کے عار' کو قبول کر سکتا ہے مگر کسی اور کی اصلاحوں سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ عام طریقہ سے الفاظ، مصارع، یا پورا شعر بدل دینے کو اصلاح سمجھا جاتا ہے۔ میرے پاس ایک مسودہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر بقلم استاد کچھ بھی تحریر ہو۔ موصوف کا طریقہ ہی انوکھا تھا۔ نہایت چبھتے ہوئے طریقے کی تنقید ایسی فرماتے کہ غلطی الفاظ کی ہو یا تخیل کی واضح ہو جاتی۔ حتی الوسع ہم بقلم خود اصلاح کر لیتے کبھی دماغ ساتھ نہ دیتا اور اصلاح نہ سوجھتی تو ممد و معاون اشارات ایسے فرماتے کہ فوراً بات ذہن میں آجاتی۔ بیچارے شفق صاحب کو ان باتوں سے کیا واسطہ!

مولانا شفق، صوفی صافی طینت، مرنجاں مرنج، خوش گو، پُرگو، ہر صنف سخن پر پوری طرح حاوی، خوش نویس ہی نہیں کمال زود نویس۔ شکستہ کی رفتار سے نستعلیق لکھتے انہی کو دیکھا۔ مشق سخن کمال کو پہنچی ہوئی۔ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ ہی نہیں بلکہ علم جمل کے ماہر تھے۔ خلاصہ یہ کہ خدمت ادب و فن کے لئے وہ پیدا ہوئے تھے۔ ع۔ بریں زیستم ہم بریں بگزرم" ان کی حیات مستعار کی زبان حال تھی۔ چنانچہ ان مشغلوں میں ایسے پڑے کہ دین سنوارنے نہ سنوارنے کے متعلق تو ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے مگر جہاں تک دنیا کا تعلق ہے۔ یہی کہنا پڑتا ہے کہ اس کے کام کے وہ بالکل نہیں رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سرکاری مطالبات یعنی مال و روڈ سیس داخل کرنے کے لئے رقم لے کر عدالت پور سے آئے۔ عین وقت پر طبیعت موزوں ہو پڑی۔ مبدء فیاض کی توجہ تو حاصل کر لی گئی مگر باقی خزانے میں جائداد نیلام پر چڑھ

گئی۔ اسی طریقے سے بزرگوں سے ملے ہوئے ٹکڑے پارچے تک یکے بعد دگر نکلتے چلے گئے۔ ورنہ اتنی حیثیت رکھتے تھے کہ خوش اوقات بسر کر لیتے۔ ایک دن اس حال میں پائے گئے کہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر بنگالی بابو سے کہہ رہے تھے۔ ؎

رفیع گنج کا اک ٹکٹ دیجئے   اور انٹر کا محصول لے لیجئے

یہ نہیں کہ بابو مطلب نہ پا رہا تھا مگر مولانا کو باحواس بھی سمجھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ٹالے بالے بتا کر مولانا کو چلتا کر دینا چاہتا تھا۔ بروقت کوئی آڑے آیا تو معاملہ رو براہ ہؤا اور مولانا عماد پور کو سیدھے ہوئے۔

”شعر و شاعری“ ہی مولانا کے زیر مشق نہیں تھی۔ نثر نگاری بھی خوب کر لیتے تھے۔ منثور نوادرات کی مثالیں پیش کی جائیں تو طوالت ہوگی۔ مگر اپنے معاصرین اساتذہ بہار سے یقینی بہتر اُردو لکھتے تھے۔ ادیب اور العصر الہ آباد ندیم اسہیل گیا۔ یہ ماہنامے نثر مضامین پیش کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں شفقؔ کی تالیفات کے جتنے نسخے شائع ہوئے ہیں اُتنی کسی اور بہاری صاحب قلم کی کتابیں نہ چھاپی گئی ہیں نہ وہ قبول عام حاصل کر سکیں جو شفقؔ کے بکار آمد رسائل کو قسمت ہؤا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بڑا دلچسپ ہؤا تھا جو مولانا خود مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے۔ سرورق کتب کے داخلی صفحہ پر مولانا اپنی بعض تالیفات کا اشتہار دے دیا کرتے تھے۔ ”خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ“ کی مصداق ”المشتہر“ بیچاروں کو خود بننا پڑتا تھا۔ قدامت پسندی ان کا جوہر تھا لہٰذا انکسار کی حدیں نہ تھیں چنانچہ المشتہر کے نیچے اپنے نام کے ساتھ ہیچمیرز لکھنے کے عادی تھے۔ کتابوں کا ایک آرڈر ایسا بھی وصول ہؤا جس کے پتہ پر ”جناب مولانا ہیچمیرز ....“ لکھ کر آیا تھا۔

جون ۱۹۰۱ء پٹنہ سے ان کا اپنا گلدستہ نسیم سحر کے نام سے شائع ہونا شروع ہؤا تھا۔ اسی زمانہ میں راقم آثم کے حضرت قبلہ گاہی بیرسٹری پاس کر کے مراجعت فرمائے وطن ہوئے تھے۔ مولانا نے تبریک و تہنیت میں تاریخی قطعات معہ تمہیدی جملوں کے شائع فرمائے تھے۔ یہ صرف تبرک نہیں ہیں بلکہ نوادرات میں سے بھی نایاب ہیں لہٰذا ان کو داخل متن کر کے ضائع ہو جانے سے بچا لینا ضروری ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ان کی اشاعت کا ایک مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ اس ذریعہ میں اپنے بڑوں کا اشتہار کرنے کا مجرم قرار پاؤں۔ لیکن ناظرین بانمکین سے معذرت میں صرف اپنا ایک شعر لکھنے پر اکتفا کروں گا کہ ؎

شہرتِ افسانۂ حسنِ ازل کے ساتھ ساتھ   کس قدر دست و گریباں میری رسوائی ملی

(منقول از) نسیم سحر بابت ماہ جولائی ۱۹۰۱ء نمبر ۲ جلد ۱ (باہتمام سید حسن مرتضیٰ عماد پوری۔ مطبع احسن المطابع پٹنہ)۔

ع مبارک ہو آنا سفر سے وطن میں

میں سچے دل سے اس بے انتہا مسرت کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں جو مسٹر سید علی امام صاحب (خلف مولوی سید مظہر امام مرحوم وکیل، و خویش نواب سید ابو صالح خان بہادر مغفور، رئیس اعظم گیا) کے بیرسٹر ایٹ لا ہو کر سفر ولایت سے واپس آنے پر ہوئی ہے۔

جناب مسٹر ممدوح اور ان کے معزز احباب و اقارب کی قومی محبت و اسلامی اخوت سے امید ہے کہ اس ہدیہ مختصر کو قبول فرمائیں ؎

از دست گدائے بینوا نایہ ہیچ!   جز آنکہ بصدق دل دعائے بکنند

قطعہ تاریخ سال مع تہنیت استقبال بتقریب مراجعت مسٹر سید علی امام بیرسٹر از سفر انگلستان

فصل بہار آئی ہے، لا جلد ساقیا   کشتیِ زر میں بادۂ گلگوں کے بھر کے جام
مشتاق دیر سے ترے دریادلی کے ہیں   ساغر بکف کھڑے ہوئے رندانِ تشنہ کام
وہ مے پلا کہ آنکھوں میں روشن چراغ ہو   وہ جام دے کہ آتش تر سے ہو سرخ کام
وہ مے پلا کہ نشۂ عیش و سرور ہو   وہ جام دے کہ جس سے ہو شرمندہ جم کا جام
مجمع یہ کیسا اور یہ کیسی ہے بھیڑ بھاڑ   کیوں ہے یہ اژدہام، یہ کیسی ہے دھوم دھام

اسٹیشن گیا ہیں یہ تیاریاں ہیں کیوں
کیوں ہے پلیٹ فارم پہ یہ تازہ اہتمام
یہ کس کی پیشوائی کو ہیں باادب کھڑے
جاہ و جلال و شوکت و اعزاز و احتشام
لو آ گئے وہ جن کا تھا آنکھوں کو انتظار
لو اہل دید، تم ہوئے مسرور و شادکام
لو ہو کے انگلینڈ سے بیرسٹرایٹ لا
اہل وطن سے مل گئے مسٹر علی امام
احباب ذی وقار ہیں سرگرم تہنیت
مصروف عیش و محو مسرّت ہیں خاص و عام
اب یہ دعا ہے خالق لیل و نہار سے
جب تک کہ رات دن سے بڑھے اور سحر سے شام
زینے ترقّیوں کے کریں طے یہ جلد جلد
ہو جائیں اپنی قوم میں ممدوح خاص و عام
ذی خلق و ذی مروّت و ذی جاہ و ذی حشم
ان چاروں وصف سے رہے مشہور ان کا نام
تاریخ سال کی جو ہوئی فکر اے شفق
دل ہو گیا وفور مسرّت سے شادکام
دشمن کا سر گرا کے یہ ہاتف نے دی ندا
مسٹر علی امام ہوئے فائز المرام

۱۹ ھ ۱۳

دیگر

گئے تھے ملک ولایت جو ہونے بیرسٹر
وطن کو لوٹ کے وہ فائز المرام آئے
گئے تھے ہند سے یورپ کو جو بشوکت و جاہ
وہ پھر کے خیر سے باعز و احتشام آئے
ہے ان کی شان صادق یہ مصرعِ سلطاں
کہ نیک نام گئے اور.. نیک نام آئے
دعا یہ ہے کہ رہے عز و جاہ روز افزوں
ہمائے اوج سعادت پئے سلام آئے
ترقی آپ کی ہو موجب حمایت قوم
عروج آپ کا اسلامیوں کو کام آئے
نہ آئے کس طرح اقبال بہر استقبال
کہ آج صاحب اعزاز و احترام آئے
شفق گئے تھے وطن سے جو سوئے انگلستان
سفر سے آج وہ مسٹر علی امام آئے

۱۹ ھ ۱۳

دیگر فارسی در صنعت تعمیہ

مرحبا اے ساقی مستانہ و رنگین ادا
گلعذار و گلبدن، گلپوش و گلگوں پیرہن
مرحبا اے خندۂ گلہائے صحن بوستاں
مرحبا اے نغمۂ خوش لحن مرغان چمن
مرحبا اے خامۂ رطب اللساں عذب البیاں
مرحبا اے طوطیٔ شکّر فشاں شکّر شکن
مرحبا اے رہ نورد ملک انگلستان ما
از قدومت رشک گلزار جناں خاک وطن
مرحبا اے آمد تو باعث صد انبساط
چشم مشتاقاں شدہ فرشِ بساط انجمن
چوں نمودم جستجوئے سال تشریف آوری
ناگہاں در جوش آمد بحر طبع موجزن
از لب جو مصرعہ دلخواہ شد گوش آشنا
آب رفتہ باز اندر جوئے آمد در چمن

۱۹ ھ ۱۳

اس لحاظ سے بھی مندرجات بالا دلچسپ ہونے چاہئیں کہ ایک اُستادِ فن کی سی سالہ عمر کا نمونۂ کلام ہیں۔ ظاہر ہے کہ تیس سال اور وقت پا کر مولانا اگر نظرِ ثانی فرماتے تو بہت کچھ رد و بدل کر کے نظموں کو اور ہی قالب دے سکتے تھے مگر پھر ہم اس نادر نمونے کو کہاں پاتے؟ مشقِ سخن کی ارتقا کو واضح کرنے میں یہ بڑے مددگار ہوں گے۔

جب مولانا کو ضرورتوں نے مجبور کر دیا تو وہ شیر گھاٹی کی طرف مطب کھول کر، توکل علی اللہ بیٹھ گئے مگر کام کیا چلتا۔ ہر قسم کے طریقے علاج معالجہ کے دنیا میں جاری ہوئے یہاں تک کہ طبِ روحانی اور طبِ اسلامی کے ناموں سے بھی دعوت چشم و گوش ہوئی مگر افسوس اس کارہتی دنیا تک رہے گا کہ "طبِ مومنی" نام کی کوئی حکمت عملی کسی کا خواب بھی نہ بن سکی ورنہ اس کی صحیح تعبیر شاید مولانا کامیابی کے ساتھ دیتے۔ اس زمانہ میں آستانۂ عالیہ دیوہ شریف کے لئے جو ٹرسٹ کمیٹی عدالت چیف کورٹ لکھنؤ کے حکم سے قائم تھی اس کا سیکرٹری راقم آثم تھا۔ مولانا کو ساتھ لے کر حاضرِ آستانہ ہوا۔ مولانا ایک مخمّس لکھ کر لے گئے تھے۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی مشہور غزل ع۔ اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری" کی تضمین کی تھی جس حسنِ عقیدت اور پُرخلوص انداز میں اس نظم کو مولانا نے وہاں عرض کیا اس سے مجمع کا مجمع متاثر ہوا اور میں اپنے آپے سے ایسا گزر گیا کہ اپنی بساط سے باہر بات کہہ سُنائی کہ ع۔ دریوزہ گر میکدہ، صہبا بکدو برد"!۔

حضرت اکبر الہ آبادی کے بزرگ داود نگر ضلع گیا سے جب چلے تھے تو اسی قرب و جوار میں ریلوے اسٹیشن رفیع گنج کو دامن میں لئے ہوئے موضع جھکٹیا سے بھی ایک شاخ وارد الہ آباد ہوئی تھی جس کے نمائندہ ہمارے وقتوں میں بابو عبدالحی وارثی تعلقہ دار قصبہ رانی پور، شہر الہ آباد میں بمحلہ سرائے کہنہ رہتے تھے۔ بابو عبدالحی کو گھر کا چراغ قسمت نہ ہوا تھا لہٰذا وہ اپنی جائداد نذرِ آستانہ کر دینے کا ارادہ و اعلان کر چکے تھے۔ شفق ان کے چچا تھے اور قریب ترین حقدار وراثت۔ اسی وراثت کی بشارت میں مولانا کو دے بیٹھا تھا۔ یہ تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کچھ دنوں کے بعد بابو عبدالحی حاضرِ آستانہ ہوئے تو بقلم خاص لکھا ہُوا مسودہ وقف نامہ کا ساتھ لائے۔ ہم سب کو پڑھ پڑھ کر سنایا اور وعدہ کر کے الہ آباد گئے کہ جاتے ہی رجسٹری کرا کے فارغ البال ہو جائیں گے کہیں سے کوئی شبہ بھی اس کا نظر نہیں آتا تھا کہ یہ ہو کر نہ رہے گا۔ اپنی خفّت کا شدید احساس مجھے تھا مگر اپنی تسلّی یہی کہہ کر کیا کرتا تھا کہ اپنے حدود کو نہ پہچاننے کی یہی سزا ہے۔

گیا میں بلا کی لوئیں چلتی ہیں، قیامت کی گرمیاں پڑتی ہیں۔ پہاڑوں پر جانے میں طوالت نظر آتی تھی لہٰذا نہ اِس سرے، نہ اُس سرے، خیر الامور اوسطہا معہ متعلّقین کلکتہ اُٹھ جایا کرتے تھے۔ ہر مہینے دیوہ شریف کی حاضری کا معمول تھا۔ اسی غرض سے گیا آیا ہوا تھا۔ اُن دنوں شدید قسم کا دردِ سر آئے دن ہُوا کرتا تھا۔ چنانچہ اُس دن بھی اسی دردِ سر میں مبتلا، بعد مغرب، اندھیرا کئے، صدر پھاٹک کے سامنے کھلے صحن میں پلنگ سدار، پڑا تھا۔ عینک بھی اتار رکھی تھی کہ پھاٹک کی طرف سے ایک خاموش سایہ میری طرف رینگتا نظر آیا۔ وہ بھی اس رفتار سے کہ ع۔ بیمار کی ہے چال، قدم ناتواں کے ہیں"۔ طبیعت تاؤ کھانے لگی کہ آخر ملازمین جو میری تکلیف جان رہے ہیں اور جمع غفیرہ کئے پھاٹک پر کھڑے گپیں ہانک رہے ہیں انہوں نے اس آتی بلا کو روکا کیوں نہیں۔ بہرکیف اب یہ سایہ سرکتے سرکتے پاس آ گیا۔ بڑی غمزدہ آواز میں، یاد نہیں کہ آداب عرض کیا کہ سلام علیک۔ پیکر اور برزخ تو ناشناسا کا وہی ناشناسا مگر آواز؛ باہمہ نحافت و رقّت گولے کا کام کر گئی۔ "ہائیں" کہنا ہُوا دردِ سر کو فراموش کر کے، میں اُٹھ بیٹھا کیوں کہ لب و لہجہ مولانا کا تھا۔ بر وقت سوا اس کے کوئی خیال دماغ میں نہ آ سکا کہ معلوم ہوتا ہے کہ رفیع گنج سے بیخیالی میں جریدہ ہی چل پڑے اور گیا میں دھر لئے گئے ہیں۔ اسٹیشن کے ریلوے اسٹاف والے اور پولیس کے سپاہی اتنا احسان کرتے تھے کہ "حسنین منزل" کا پتہ بتانے والوں کو حوالات وغیرہ کی سیر نہ کراتے تھے بلکہ اپنا آدمی ساتھ کر کے برآوردہ منگوا لیا کرتے تھے۔

اس لئے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوا۔ کسی اور طرف خیال ہی نہ جا سکا۔ تصدیق کے لئے مستفسر حال ہوا تو بابو عبدالحی کے رحلت کی خبر سنائی۔ انا للّٰہ پڑھ کر رہ گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وقف نامہ تعمیل ہو گیا اور مولانا جہاں کے تہاں رہ گئے۔ اس لئے یہ حزن و ملال ہے۔ ان کا غم غلط کرنے میں میرا حصّہ کہاں سے ہو سکتا تھا؟ بابو عبدالحی کے ساتھ مجھے اپنا جنازہ اُٹھتا نظر آ رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، آخر پوچھ ہی بیٹھا کہ وقف نامہ کی رجسٹری کر کے انتقال کیا؟ نہایت معصومیت کے ساتھ فرمایا کہ وقف نامہ تعمیل نہ ہو سکا۔ اور "جناب والا" بارہ سہام کے مالک قرار پائے ہیں۔ اپنا شعر یاد آتا ہے جو مولانا ہی کی فرمائش کی غزل کا ہے۔

؎ ہنگام بہار آمد و بلبل بفغاں شد
آشفتہ بیانے چہ پریشاں خبرم داد

اس وقت تو اس کا بھی خیال نہ ہو سکا کہ اپنی کہی پوری ہونے کی خوشیاں مناؤں یا مولانا کو مبارک باد ہی دوں۔ درد سر نے بڑا کام کیا ورنہ ممکن تھا کہ بدنما صورت پیدا ہو جاتی کیونکہ اس طرح مولانا کا پریشان کر کے اظہار حقیقت کرنا واقعی بری طرح کھلا تھا۔

تفصیلی گفتگو کے بعد مولانا روانہ الہ آباد ہوئے اور میں دیوہ شریف پہنچا۔ وہاں سب یہی کہہ رہے تھے کہ بابو عبدالحی کی نذر قبول نہ ہوئی اس لئے وہ رجسٹری کر دینے کی مہلت نہ پا سکے مگر میرا خیال آج بھی یہی ہے کہ جیسی مقبول نذر بابو صاحب کی ہوئی ویسی کسی کی بھی نہیں۔ اوقاف بہت سے ہوتے مگر سب کے اغراض وثائق وقف نامہ جات کی رو سے مقرر و معین۔ ان کے متعلق میں یہی کہوں گا کہ ہر واقف کا دل رکھ لیا گیا۔ اس کو اس کی منشاء کے مطابق خدمت کی اجازت مل گئی بابو عبدالحی کی نذر۔ ان کی منشا کیا معنی ان کے علم سے بھی بالا بالا بالکل ہی اپنا لی گئی اور شفق نام شاعر کو اس کی نظم کے صلہ میں انعام ہوئی۔

الہ آباد میں مقدمہ بازیاں ہوتی رہیں۔ خطوط و تار آتے جاتے رہے۔ بارہ سہام متروکہ میں سے یاران طریقت کچھ نہ کچھ لے ہی مرے۔ مولانا بیچارے ان جوگوں کے تھے ہی نہیں۔ بہر حال جب ان کو پورا تسلط حاصل ہو گیا تو پھر وہ زیادہ تر الہ آباد میں قیام رکھنے لگے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ "چوں بدولت برسی 'مست نہ گردی' مردے" اس امتحان میں بھی یہی کہنہ مشق شاعر، پیر سالخوردہ، سرد و گرم زمانہ چشیدہ، البتہ سو جوانوں کا ایک جوان ثابت ہوا۔ سوا اس کے کہ شیروانی ذرا بہتر کپڑے کی ہونے لگی اور امروہہ والی ٹوپی صاف ستھری رہنے لگی اور کوئی تبدیلی مولانا میں ظاہر نہ ہوئی۔ باطن ان کا اُجلا تھا ہی اس کو یہ ہاتھوں کا میل کیا چھو سکتا تھا۔ کبر و نخوت و خود بینی مولانا کے پاس ہو کر بھی کبھی نہ گزری۔ اپنی وضع قطع انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلی۔ دیکھنے والا بہت سے بہت محسوس کرتا تو بس اسی قدر کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی فتوحات آج کل کچھ معقول ہو رہی ہے۔ حالانکہ اب اُن کا شمار رئیسوں اور امیروں میں تھا۔ خلاصہ یہ کہ خادم ادب عالیہ جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ یہی اُن کا سب سے بڑا کمال تھا۔

صاحب دولت ہونے سے پہلے وہ اپنی تالیفات کی اشاعت تابڑ توڑ کرتے رہے مگر الہ آباد کی زندگی میں اس کا سلسلہ رفتہ رفتہ موقوف ہو گیا حالانکہ مکمل دیوان، مراثی کا مجموعہ اور تکمیل شدہ لغت موجود تھا جس کی اشاعت کی بڑی ضرورت تھی۔ اللہ ہی جانے اب یہ قدر دانوں کے قبضے میں ہے یا ناقدروں کے۔

مولانا کو بیعت حضرت امیر شریعت جناب حضور مولانا شاہ بدرالدین مجیبی سجادہ نشین پھلواری شریف ضلع پٹنہ سے تھی۔ مگر ان کو ہم وارثیوں سے ربط خاص تھا۔ برادر طریقت بیدم شاہ، مولانا اور ہم جہاں مل بیٹھتے تو راتیں آنکھوں میں کٹ جاتیں ؎

صد کشاد آں را کہ ہم امروز رخ بنمودہٗ
مژدہ باد آں را کہ محو ذوق فردا کردہٗ

رہے نام اللہ کا۔

تذکرہ شعرائے متغزلین

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ یہ تذکرہ غزل گو شعراء کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ ہے
یہ مختصر سا جائزہ پہلے نقوش کے غزل نمبر میں شامل تھا۔ اب اسے الگ صورت
میں بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۱/۸

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

مانی جائسی

سیّد کلب مصطفیٰ

سیّد اخلاق[1] حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے ایک موقع پر مجھ سے کہا کہ "تم سب بھائیوں میں ایک کامپلکس (Complex) ہے جو تمہاری قرار واقعی ترقی میں مانع رہتا ہے"۔ — یہ رائے ہم سب کے لئے کہاں تک صحیح ہے، اس گفتگو کا یہ محل نہیں، لیکن اگر اس لفظ "کامپلکس" میں مرکّب کے مفہوم کے علاوہ دماغی رَو و ذہنی لَو کا مفہوم بھی شامل ہے تو یہ لفظ بھائی جان پر حرف بہ حرف درست بیٹھتی ہے —— یہ خوش ہوں تو خفا ہونا بھول جائیں اور خفا ہوں تو خوش ہونا مشکل سے انہیں یاد آتے تھے — اپنا کلام سنانے کا شوقین نہ ہونے پر بھی، جی میں آجائے تو خود سنا چلیں اور ترنگ آجائے تو خوشامدوں اور التجاؤں پر بھی نہ سنائیں بیخبری پر اتر آئیں تو اہل وعیال کی پرواہ نہ کریں اور باخبری کے عالم میں ہوں تو غیروں تک کے لئے پریشان رہیں۔ یہ کسی سے محبت کریں گے تو والہانہ انداز سے اس کے ذکر میں رطب اللسان رہیں گے اور نفرت کریں گے تو نام تک زبان پہ آنے دیں گے۔

غرض بھائی جان کی سیرت کا تجزیّہ کچھ آسان کام نہیں اور بڑی کرید سے میں نے جو اتنی باتیں نکالی ہیں، یہ دو چار روز نہیں برسوں کے مطالعے کا نتیجہ ہے کم سے کم پچیس سال کا۔

یوں تو میں نے بھائی جان کو اپنے ہوش میں پہلے پہل غالباً ۱۹۱۹ء میں دیکھا تھا۔ جب وہ بھوپال سے رائے بریلی کے ایک مشاعرے میں تشریف لائے تھے مگر اس وقت کی ان کی کوئی بات اب میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ ان کا سارا سامان خوش سلیقگی اور نفاست پسندی کا آئینہ دار تھا اور ان کا طرزِ کلام ان کی خود اعتمادی پر دال۔ ان کے دورانِ قیام میں شعر و شاعری کا جو چرچا رہتا تھا اس کی اہمیت کو ہم بھلا کیا سمجھتے، ہاں شعر سن کر خوش ضرور ہو لیتے تھے۔ رہا جذبۂ محبت، سو وہ پیدا ہی کیونکر ہوتا، ہمارا حصّہ تو بس دُور کا جلوہ تھا۔

تو ۱۹۱۹ء میں بھائی جان کو بس دیکھ لیا تھا، ان کی سیرت کو پرکھنے کا موقع کہیں نو دس سال بعد فروری ۱۹۲۸ء سے ملا جب میں گورنمنٹ جوبلی کالج

---

[1] اب یہ لاہور ہائی کورٹ میں جج ہیں۔

میں ایف اے کے آخری سال کا متعلم تھا اور وہ کسی مقامی ادبی انجمن کے زیر اہتمام رفاہِ عام کلب میں منعقد ہونے والے ایک بڑے مشاعرے کی شرکت کے لئے آگرے سے لکھنؤ آئے تھے۔

میرے دو ہم سبق اور دارالاقامہ کے رفقاء (عمران احمد فاروقی خیرآبادی۔ آئی سی۔ ایس جناب پاکستان میں کمشنر ہیں اور منور عباس صاحب ایڈوکیٹ میرٹھی ثم پاکستانی جناب کراچی میں وکالت کرتے ہیں) نے ان کو چاء پر بلایا تھا۔ بھائی جان کے ساتھ مولانا سید ظفر مہدی صاحب گہرؔ جائسی بھی تھے اور حضرت جوشؔ ملیح آبادی بھی۔ میں چاء کی اس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی صحبت میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ لیکن جب ان کو پہنچانے گیا تو اثنائے گفتگو میں "عزیزدار" نکل گیا۔ اس پر کچھ ایسے انداز سے انہوں نے ٹوکا کہ وہ دن اور آج کا دن، اس لفظ سے دار کی طرح دور ہی رہتا ہوں۔

اسی ملاقات کے بعد جب بھائی جان نے مجھے بی۔ اے میں پڑھنے کے لئے آگرے بلوا لیا اور یک لخت چار سال ان کے ساتھ رہنا ہوا تو ان کو بہت قریب سے بالکل قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر جب ۱۹۴۰ء میں انہی کے ایما سے میں نے رائے بریلی سے منتقل ہو کر لکھنؤ میں وکالت شروع کی تو کوئی سال بھر اور ساتھ رہا۔ ساتھ نہ رہنے کے دوران میں بھی ان کی سیرت و کردار سے متاثر ہونے اور ان کا تجزیہ کرنے کے اکثر مواقع ملتے رہے، خصوصاً جب انہوں نے ۱۹۴۸ء میں ہاربرے کی منیجری سے استعفاء دینے کے بعد لکھنؤ کا مستقل قیام اختیار کیا تو ملنے جلنے کے اور زیادہ اتفاقات ہونے لگے۔

غرض بھائی جان کو دیکھنے برتنے، تولنے اور پرکھنے کا جتنا موقع مجھے مل سکا، ان کے عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں میں مشکل ہی سے کسی اور کو ملا ہوگا۔ اور شاید اسی بناء پر میرے عزیز اور دوست سید آل حسن صاحب جونپوری ثم پاکستانی نے مجھ سے بھائی جان کے متعلق لکھنے کی فرمائش کی۔

"کئی مہینے ہوئے رسالہ "نقوش" لاہور نے ایک شخصیات نمبر نکالا تھا جو مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر اب تک کے قریب قریب تمام اہل قلم کی سیرت اور نجی زندگی کے خاکوں پر مشتمل تھا۔ مگر اس وقت بہت سی شخصیتوں پر مضامین حاصل نہیں ہو سکے تھے لہٰذا اس کی تلافی کے لئے اب شخصیات نمبر کا حصۂ دوم نکالا جا رہا ہے۔ مدیر "نقوش" کی یہ خاص کوشش رہی ہے کہ مضامین انہی لوگوں کے شائع کئے جائیں جنہوں نے اپنے موضوع کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہو۔ چنانچہ پہلے حصے میں چودھری محمد علی ردولوی پر ان کی صاحب زادی بیگم اخلاق حسین نے اور وقار عظیم پر انکے بھائی اقبال عظیم نے لکھا تھا۔ اس طرح اور شخصیتوں پر بھی ان کے مخصوص دوستوں یا عزیزوں کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں حصہ دوم کے لئے مانیؔ صاحب پر کوئی صاحب لکھ رہے ہیں یا نہیں۔ نقوش کا یہ نمبر ایک ادبی دستاویز ایک مستقل ریفرنس بک کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں مانیؔ صاحب کا شمول انتہائی ضروری ہے۔ میری خواہش تھی کہ ان پر آپ کا مضمون نکلتا آپ سے زیادہ قریب سے ہمدردی سے اور گہری نظر سے انہیں کس نے دیکھا ہوگا

مضمون میں مانی صاحب کی ادبی خدمات کے مفصل بیان یا ان پر تنقید و تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ نہ ان کی سوانح حیات درکار ہیں جس کے لئے مواد اکٹھا کرنے میں کچھ وقت لگے۔ ان چیزوں کا ضمنی تذکرہ تو بہرحال ضرور آنا چاہئے تاکہ ان کے ادبی کارنامے جو ابھی تک گوشۂ گم نامی میں ہیں سامنے آجائیں۔ لیکن دراصل ضرورت ہے محض ان کے مزاج، عادات، رہن سہن کے طریقے وغیرہ وغیرہ کے، ایک ایسے مرقع کی جسے دیکھ کر پڑھنے والے کے ذہن میں ان کی سیرت اور شخصیت کی جیتی جاگتی تصویریں ابھر آئیں"۔

مگر یہاں تو دقت یہ ہے کہ اس کاروبارِ شوق کے لئے وقت کہاں سے لاؤں اور وقت نکال بھی لوں تو وہ سکون کیوں کر فراہم ہو جو دماغی کاوشوں کے لئے لازمۂ خاص ہے خیر "خیال خاطر احباب" کو پیش نظر رکھ کر جیسا بن پڑتا ہے، لکھے دیتا ہوں۔ "آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے" کا اندیشہ تو یوں جاتا رہا۔ اور نقد نظر کو ٹھوکر سے بچانے کی صورت یہ نکالی ہے کہ بھائی جان کی شاعری پر خود کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ان کی شاعری کے متعلق دوسروں کی رائیں پیش کردی جائیں وہ بھی محض چند اہل نظر کی رائیں۔

جناب پیارے لال شاکرؔ میرٹھی اپنے رسالۂ العصر کی چھبیسویں جلد کے شمارۂ فروری ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں۔

"مولوی سید کلب احمد صاحب مانیؔ . . . . شاعری کا ذوق آپ میں فطری ہے اور ذوق بھی انتہا درجے کا سلیم . . . .

کلام بہ لحاظ ادائے جذبات و علوِ خیال و طرزِ بندش نہایت بلند پایہ اور رنگ میں سب سے جُدا ہے۔ آپ کی فلسفیانہ دل آویز نظمیں اکثر رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ العصر کے اس نمبر میں بھی ایک نظم بہ عنوانِ "حسن و عشق" شائع ہوئی ہے۔ جس کی خوبیاں آپ کے حسنِ بیان، بلند پروازیِ فکر، قوتِ استدلال و فیصلہ اور قادر الکلامی کی بیّن اور روشن دلیلیں ہیں۔"

حامد حسن صاحب قادری نے غالباً ۱۹۴۱ء میں غالب کی تضمین کے سلسلے میں بعض دوسرے تضمین کرنے والے شعراء سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"سید کلب احمد صاحب مانی۔ جائسی شاعری میں نہایت صحیح مذاق اور سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا، لیکن شاعر کی ایک دو باتوں، ایک آدھ تنقیدی فقرے، ایک پسندیدہ شعر سے اس کی طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مانی صاحب کا آگرے کے اور شاعروں سے موازنہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کا سا ذوقِ نظر بعض ان سے زیادہ عمر اور زیادہ مشق کے شاعروں میں بھی نہ پایا۔"

اور اب جناب نیاز فتحپوری نے ان کے مجموعۂ منظومات پر بہ سلسلۂ تبصرہ جو لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے (نگار بابت مارچ ۱۹۵۵ء)۔

ان کی شاعری کی عمر کسی طرح پچاس سال سے کم نہیں ہے اور اس نصف صدی کے دوران میں جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ اگر سب فراہم ہو سکتا تو کئی مجموعے اس وقت تک شائع ہو چکے ہوتے۔

ان مجموعوں کی ابتداء میں جناب مانی نے اپنے اور مختلف ادوارِ شاعری کے حالات بھی قلم بند کئے ہیں، جن سے ان کے رجحانِ طبع ان کی غیر معمولی ذہانت اور فطری میلان پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

جناب مانی کی شاعری اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب دبستانِ لکھنؤ کی خارجی شاعری عروج پر تھی اور اس ماحول میں نشو و نما پانے کی وجہ سے انہیں بھی قدرتاً یہی رنگ اختیار کرنا چاہئے تھا، لیکن کس قدر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ اس وقت بھی مانی کی شاعری کا مزاج یہ تھا۔

کسی کی آنکھ سے افسانہ غم پر جو نکلا تھا
جزائے صد ہزار آلام ہے اس ایک آنسو میں
نہیں فرصت نہ ہو گی کشمکش ہائے تمنا سے
مگر جی چاہتا ہے یہ کہ تم ہو میرے قابو میں

اجازت دیجئے رونے کی اب تو دل کی حالت پر
بہت اچھا، میں آمادہ ہوا ترکِ محبت پر
اُمید افزا کوئی صورت نہ تسکیں کا کوئی پہلو
نتیجہ کیا وہ قائم ہی سہی عہدِ محبت پر

زمانِ ہجر ہے اب جرم بیتابی سے کیا ڈرنا
یہی الزام عہدِ وصل میں تھا اور ہمیں پر تھا

جناب مانی نے کسی کا تلمذ اختیار نہیں کیا اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیوں کہ ان کے ابتدائی کلام میں بھی کافی پختگی نظر آتی ہے اور ابتدا ہی سے اُنہوں نے بہت پھونک پھونک کر اس کوچے میں قدم رکھا۔ ان کی شاعری یکسر جذبات و تاثرات لیکن بڑے رکھاؤ کی شاعری ہے اور اسی لئے ان کی نظمیں بھی بڑے لطیف رنگِ تغزل میں رچی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مانی کی قدرتِ سخن گوئی کا اندازہ ان کی تضمینوں سے ہوتا ہے کہ غالب کی نہایت مشکل زمینوں میں بھی انہوں نے ایسے چست اور متوازن مصرعے لگائے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

مانی نہایت ہوش و گوش والے شاعر ہیں اور باوجود والہانہ غزل گوئی کے جذبات کی رو میں متانت و سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں دیتے اسی لئے ان کے یہاں عمومیت یا سوقیت کا پتہ نہیں اور ان کا ستھرا ذوق ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے۔ حضرت مانی غالب کے پرستاروں میں ہیں لیکن اس ذوقِ پرستاری میں انہوں

نے اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنا رنگ سب سے علٰحدہ پیدا کیا جس میں ان کا "سہیم و شریک" ہمیں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ عرصہ ہوا میرے ان کے ایک مشترک دوست نے مانی کی شاعری کے متعلق میری رائے صرف ایک فقرے میں چاہی تھی اور میں نے بے اختیار کہہ دیا تھا کہ "مانی بڑا شریف شاعر ہے"۔ اور اگر شریف کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھا جائے جس میں شائستگی اعتدال رکھ رکھاؤ سبھی کچھ شامل ہے تو ہر وہ شخص جو کلام مانی کا مطالعہ کر چکا ہے، غالباً یہی رائے قائم کرے گا۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

ذرّے افسانے سناتے ہیں کہیں تم تو نہیں　　جانِ عالم، یہ تمہارا ہی تکلّم تو نہیں
نظم یہ بزم میں بے صاحب محفل کیسا　　نگراں پردے ہی پردے میں کہیں تم تو نہیں
جلوہ گر بھی وہ اگر ہوں تو کہاں تاب نظر　　طالب دید ترے ہوش کہیں گم تو نہیں
موت اک مژدۂ جاں بخش بنی جاتی ہے　　کون دامن کی ہوا دینے لگا تم تو نہیں

ان تبصروں سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ بھائی جان نے محض غزلیں، نظمیں اور مخمّس ہی کہے ہیں، انہوں نے تاریخیں بھی کہی ہیں، قصیدے بھی نظم کئے ہیں، سلام بھی کہے ہیں اور نثر نگاری، افسانہ نویسی اور تنقید عالیہ کے بہترین نمونے بھی پیش فرمائے ہیں۔ اُردو ہی میں نہیں، فارسی میں بھی سخن سنجی کی ہے۔ بھائی جان کے قصیدے سب کے سب اہل بیت رسول کی شان میں ہیں ان میں سے ایک قصیدے کی ردیف "آج" ہے جس میں تشبیب سے لے کر آخر شعر تک ایک غیر منقطع تسلسل ہے اور اسی میں خیبر کا واقعۂ تاریخی بھی نظم فرمایا ہے لیکن کہیں "آج" کی ردیف بیکار نہیں، یہی نہیں بلکہ "آج" مضمون مصرع کا جزو لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ اکثر ایسے مقامات ہیں کہ پہلا مصرع سن کر سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ دوسرے مصرع میں "آج" کی ردیف چسپاں کیسے ہوگی۔ خطیب اعظم شمس العلما مولانا سید سبط حسن صاحب مغفور فرمایا کرتے تھے "بھائی کلب احمدؒ صاحب آپ نے وہ "آجیہ قصیدہ" خوب ہی کہا ہے"۔ اس قصیدے کے چند شعر اور بھائی جان کی شاعری اور نثر نگاری کے چند نمونے بس چند نمونے ان کے غیر مطبوعہ کلام، تحریروں اور خطوں سے دیئے دیتا ہوں۔ ورنہ ان کی فکر و قلم کی تجلّی ان کے دونوں شائع شدہ مجموعوں "نقوش مانی" اور "نگارستان مانی" کے ذریعے سے نظم و نثر دونوں میدانوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان مجموعوں کے دیباچے جامعیت اور اختصار کے معجزے ہیں۔ بھائی جان کی قوت نقد و نظر کا اندازہ رسالہ "تسنیم" سے کیا جا سکتا ہے جو آگرے سے ان کی ادارت میں نکلتا تھا اور جنوری ۱۹۳۱ء سے جون ۱۹۳۳ء تک نکل کر بعض حوادث کے ماتحت بند ہو گیا۔

اشاعت یافتہ مجموعوں کے دیباچوں سے بھائی جان کے سوانح زندگی بھی اجمالاً معلوم ہو سکتے ہیں اور ان کی فطرت اور ان کے کردار پر بھی چھوٹ پڑ سکتی ہے۔ لیکن کون اس دقت نظر کے ساتھ پڑھتا ہے اور کون حالات سے کردار کا اندازہ لگانے کی زحمت کرتا ہے۔ اسی لحاظ سے ان کی زندگی کے حالات اور ان کی فطرت و کردار کی خصوصیات کو ذرا بسط سے لکھنے کی ضرورت ہوئی۔

مقام و سن ولادت بھائی جان ۱۸۸۵ء میں دیہریا ضلع گورکھپور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ جہاں بابا مرحوم (مولوی سید کلب جعفر صاحب) بہ سلسلہ ملازمت انگریزی قیام پذیر تھے۔

وطن اور نسب جائس جو صوبہ اودھ ضلع رائے بریلی کی ایک پرانی تاریخی اور مردم خیز بستی ہے اور جسے اور علماء و فضلائے روزگار کا مولد و مسکن ہونے کے علاوہ ملک محمدؒ جائسی کا وطن ہونے کی بنا پر ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اسی جائس سے بھائی جان کو وطنیت کی نسبت آبائی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ان کو "وطن" اور بعض مخصوص شخصیتوں کو چھوڑ کر وطن والوں سے کوئی ربط خاص نہیں بلکہ گویا ایک نوع کی بیزاری سی ہے، ورنہ ان کے قدرداں اور ان کی فنکاری و استادی کے مدح خواں وہاں بھی سبھی ہیں۔ شاید اختلاف طبع و مزاج کے باعث یہ صورت حال ہو۔ وطن کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کئی جگہ شعراً بھی فرمایا ہے:۔ مثلاً

میری عزت سے نہیں اہلِ وطن خوش کہ ابھی   برق ٹوٹی نہیں اُجڑے ہوئے کاشانے پر

اعزا کی محبت کھینچ ہی لاتی تھی جائس میں   بڑی مشکل سے مانی اب یہ معمولِ کہن چھوٹا

واقعی بے وطنی بھی ہے مصیبت غالبؔ   پوچھو مانیؔ سے مگر اس کی حقیقت غالبؔ
لاکھ زحمت ہو، سفر پھر ہے غنیمت غالبؔ   کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ

تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

لیکن باوصف اس وطن بیزاری کے بھائی جان نے اپنے کو "جائسی" لکھنا ترک نہیں کیا اور نام و نمود کے لحاظ سے کسی ٹکسالی شہر سے نسبت نہیں دی حالاں کہ "لکھنوی" لکھتے تو تعلقات قرابت کی بنا پر حق بجانب تھا اور لکھنؤ کو بھی ان کی نسبت سے فخر ہو سکتا تھا۔ نسب کے متعلق بس اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ یہ سلسلہ جد اعلیٰ سید نجم الدین فاتح جائس اور عابد شب زندہ دار مقدس بزرگ سے گزرتا ہوا حضرت امام علی نقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

حلیہ بھائی جان کا قد متوسط، متناسب اور خوش نما اعضا، سینہ کمر کے مقابلے میں بہت چوڑا، اکہرا جسم بلند پیشانی، چوڑی کلائی، اونچی مگر ذرا پھیلی ہوئی ناک۔ گندمی سے کچھ کھلتا ہوا گورا رنگ ہے۔ ابتدائے عمر میں سر کے بال بہت گھنے تھے۔ مگر ۱۹۲۹ء سے تو سر کے اگلے حصے کو اس وبال سے پاک ہی دیکھا۔

تعلیم پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی تھی، پندرہ سولہ ہی سال کے سن میں پڑھنا لکھنا سب چھوڑ چھاڑ دیا۔ دو تین برس اور پڑھنے کا نام ہی نام رہا۔ اس کے بعد فکر معاش میں لگ گئے۔

مطالعے سے جی چراتے بلکہ گھبراتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ بہترین شعراء کے دیوان اور دلچسپ ترین افسانوں کا مطالعہ بھی ممکن نہیں مگر اب ستر برس کی عمر میں ترکِ تعلیم و بیزاری مطالعہ پر تاسف کرتے ہیں۔ جو شخص اُردو مڈل۔ وہ اول درجے ہی میں سہی، پاس ہو اور جو انٹرنس سے بھی آگے نہ بڑھ سکا ہو، اس کی علمی استعداد جیسی ہوگی ظاہر ہے۔ مگر جب اُردو، فارسی اور بڑی حد تک عربی ادب کے سلسلے میں، وہ محض اپنی دقت نظر، فطانت، دقتِ سلیم اور ذہانت کے زور سے نہایت مشکل اور اہم مواقع اور مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں اور ایک علامۂ دہر نظر آتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ محض چند کتابوں کا پڑھ لینا تعلیم کا صحیح مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اصل شے ذوق نظر اور استعداد ذہنی ہے —— ان کے نہ پڑھنے کے متعلق جناب نیازؔ فتحپوری نے ایک بار بڑے لطف سے کہا تھا کہ "مانی صاحب بہت اچھا ہوا آپ نے نہ پڑھا ورنہ آپ کی غیر معمولی ذہانت آپ کو نہ معلوم کہاں لے جاتی اور پھر ہم لوگوں کو بڑی دشواری ہوتی"۔ سب صحیح مگر واقعہ یہ ہے کہ جو وسعت نظر کتب بینی سے پیدا ہوتی ہے اس کے فقدان نے بھائی جان کو بہت نقصان پہنچایا۔ ان کی شاعری محض ان کی جودت طبع اور جذبات و نفسیات انسانی کے تجزیہ و تحلیل کی قوت پر معلق ہو کر رہ گئی۔

خطاطی اور نقاشی شاعری کے علاوہ بھائی جان کو خطاطی اور نقاشی کا بھی بہت شوق ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ یہ میرے تخلص کا اثر ہے۔ ان کا خط نسخ و نستعلیق بہت پاکیزہ اور پختہ ہے۔ قینچی سے کاغذ پر پھول کاٹنا اور پھولوں میں مختصر عبارتوں کا منقش ہونا جن کے حروف قینچی سے کٹے ہوئے اس قدر باقاعدہ اور نوک پلک سے درست ہوتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ مہاراج کمار محمد امیر حیدر خاں صاحب آف محمود آباد نے کیا خوب فرمایا ہے "مانی صاحب! یہ تو صناعی کا معجزہ ہے"۔

ازدواجی زندگی اور اولاد بھائی جان کو کوئی چودہ پندرہ برس کی عمر میں یرقانِ قبل السابع ہو گیا تھا۔ حکیم حاذق سید حسن علی صاحب نصیر آبادی المعروف بہ حکیم پتی نے جو بابا مرحوم کے مخصوص احباب میں سے تھے "مشورہ دیا کہ ان کی شادی بہت جلد کر دی جائے ورنہ زندہ نہ بچیں گے"۔ لہٰذا کم سنی ہی میں شادی ہو گئی۔ ۳۱ء میں ان بھابی کا انتقال ہو گیا۔ تین لڑکے ان کی یادگار تھے جن میں سے دو جوان کسب معاش کرتے ہوئے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں راہی دار البقا ہوئے بڑے

سید آفتاب رائے بریلی میں کامیاب وکیل اور دوسرے سید رشید احمد نشنل ہائی اسکول رائے بریلی کے ہیڈ ماسٹر تھے تیسرے سید اقبال احمد زندہ ہیں۔ ان بھابی کی موت کے تقریباً سال بھر بعد بھائی جان نے دوسرا عقد خود ہی بھوپال میں کر لیا۔ پہلی بھابی سے بھائی جان کی کچھ بنی نہیں اور ستمبر ۱۹۱۹ء تک ان سے غیر مانوس ہی سے رہے۔ پھر جب آخر ۱۹۱۹ء میں ملتفت ہوئے اور ان کو اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تو وہ تاب لطف نہ لا سکیں اور بھائی جان کو کہنا پڑا ؎

جس کو ترا ستم مٹا نہ سکا
وہی دل تاب لطف لا نہ سکا

ان کے انتقال پر جو تاریخ بھائی جان نے کہی وہ ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ قطعہ تاریخ "نقوش مانی" میں ہے جس کو معذرت لطیف کہا جا سکتا ہے آخری شعر جس کے دونوں مصرعوں میں بالترتیب سنہ عیسوی اور سنہ ہجری نکلتے ہیں یہ ہے۔

دفیقہ کی لحد ہے یا کہ یہ تصویر عبرت ہے
۱۹۲۱ عیسوی
مرے ہی گھر کا یہ بگڑا ہوا نقشا ہے اے مانی
۱۳۳۹ ہجری

پہلی بیوی کے بچوں کی طرف سے یک گونہ تغافل کے بعد دوسری بیوی کے بچوں سے کمال محبت و رافت کا برتاؤ کیا تعجب نہیں جو اسی کمپلکس (complex) کا نتیجہ ہو۔ موجودہ بھابی[1] سے ان کے سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں

احباب | میرے علم میں تو بھائی جان کے بس وہی دوست ہیں جن کا تعلق ادب اور شاعری سے ہے، نیاز فتح پوری، ضیائے عباس ہاشمی بدایونی ثم پاکستانی، لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) اکبر آبادی، فانی بدایونی، مولانا سید ظفر مہدی، گہر جائسی، جوش ملیح آبادی (وارد حال پاکستان) اختر جونا گڑھی، محمد محمود مخمور اکبر آبادی ثم پاکستانی، محمد زکریا، مائل بھوپالی، سید محمد عمر حسینی ٹونکی اور اب حضرت عزیز لکھنوی کے فرزند حیات لکھنوی کے سلسلہ شاگردی[2] کے ساتھ ساتھ زمرۂ احباب میں داخل ہو گئے ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے بھائی جان ازراہ شفقت فرمانے لگے "مجھے بہت افسوس ہے۔ کہ کلب مصطفیٰ میرے بھائی ہیں ورنہ میں ان کو دوست بناتا"۔ مگر میں خوش ہوں کہ ان کا دوست نہ ہوا اور بھائی ہونے کا ناقابل شکست فخر مجھے حاصل ہے۔ کیوں کہ جب میں ان کے دوستوں کی فہرست پر نظر ڈالتا ہوں تو بعض ایسے نام بھی ملتے ہیں جو مسلسل اس فہرست میں درج نہ رہ سکے۔ بہت غور کے بعد معلوم ہوا کہ اس تغیر میں بھائی جان کے تلوّن مزاج کو دخل نہیں ہے بلکہ اس کا سبب ان کا والہانہ انداز ہے۔ جس میں وہ خلوص و اعتماد اور وہ غیر معمولی جذبات ایثار و قربانی شامل ہوتے ہیں کہ ان کے لگ بھگ پہنچنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جب کوئی ان کو دوست بنانا چاہے تو انہیں کہہ دینا چاہئے:۔

ندیم خویش می سازی مرا، لیکن ازاں ترسم
نیاری تاب آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ایسا کرتے تو یہ شعر کیسے کہتے:۔

عمر بھر کھایا فریب دوستی لیکن یہ دل
رسم و راہ اہل عالم سے ہے بیگانہ ہنوز

لیکن اس کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ وقت پر ان کے وہی دوست جن سے کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی، ان کے زیادہ ہمدرد پائے گئے، مثلاً جناب نیاز فتح پوری کو جب معلوم ہوا کہ ان کا تعلق بلہرے سے منقطع ہو گیا ہے تو انہوں نے مجھے لکھا کہ "مانی صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ میں ابھی زندہ ہوں"۔ دوسرے خط میں لکھا کہ "مانی صاحب کہاں ہیں، ان کے لئے کچھ سوچنا اور کرنا ہے"۔

مذہب | بھائی جان مذہباً شیعہ تو خیر ہیں ہی سخت قسم کے موحّد بھی ہیں ان میں مذہب کا کٹرپن نہیں ہے، دو تین کے سوا باقی سب دوست ان کے حنفی

---

[1] لڑکوں کے نام اور عمریں اس وقت یہ ہیں۔ اقبال الظفر ۳۰ سال۔ مومن الظفر ۲۷ سال۔ فیاض احمد ۲۴ سال، مشتاق احمد ۲۱ سال، وصی احمد ۱۳ سال، فرقان احمد ۱۰ سال۔ درویش احمد ۷ سال۔

[2] شاگرد بنانے میں بھائی جان بخل کی حد تک محتاط ہیں۔

المذہب ہیں، وہ نماز تو فی الجملہ پابندی سے پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھ لیتے ہیں مگر اب تو بس یونہی کچھ۔ روزے کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ "بھائی رمضان شریف کے متعلق ایک شخص نے کیا خوب بات کہی ہے کہ "ہر گیارہ دن کے بعد یہ تیس سال آجاتے ہیں"۔ غرض بھائی جان متعصب اور متشدّد نہیں ہیں مگر اپنے اعتقادات مذہبی کو چھپاتے بھی نہیں، چھپانا کیا معنی، چھپانے کی فرمائش بھی اگر کسی مصلحت سے کی جائے تو وہ اخفا گوارا نہیں کرتے۔ اگست ۱۹۱۳ء میں گونا چھاؤنی میں بھائی جان منشی سیّد حشمت علی صاحب میر منشی کے مہمان ہیں" تلاشِ ملازمت جاری ہے۔ منشی صاحب موصوف معین ہیں۔ دو چار روز کے بعد منشی صاحب نے کہا:

"بہتر ہوگا کہ آپ اپنے کو شیخ اور سنّی بتائیے"۔

بھائی جان۔ "کیوں؟"

منشی صاحب۔ "نوکری ملنے میں آسانی ہوگی"۔

بھائی جان۔ "بس سیّد اور شیعہ اپنے کو بتاؤں تو قتل تو نہ کر دیا جاؤں گا"۔

منشی صاحب۔ "جی نہیں۔ اس کا تو وہم بھی نہیں، مگر سُنّی کہنے سے نوکری مل جانے کا زیادہ امکان ہے"۔

بھائی جان۔ "تو میں انشاء اللہ کل یہاں سے چلا جاؤں گا، روٹیوں کے لئے جھوٹ بولنا میرے امکان سے باہر ہے"۔

پھر منشی حشمت علی صاحب نے لاکھ لاکھ روکا مگر بھائی جان وہاں نہ ٹھہرے اور بھوپال چلے گئے۔ جہاں بہت جلد نوکری بھی مل گئی اور دس برس مسلسل اعلانِ شیعت کے ساتھ انتہا درجے کے ہر دلعزیز ہو کر رہے۔

ملازمت اور معیشت بھائی جان نے کوئی بیس برس کے سن سے نوکری شروع کی یعنی ۱۹۰۵ء سے کم و بیش پچاس سال تک مختلف مقامات پر نوکری کرتے رہے اور اب حکومت ہند سے اعزازی وظیفۂ ادبی پاتے ہیں۔ آگرے اور بلہرے میں ان کا عہدہ دنیوی اعتبار سے اچھا خاصا معزز تھا۔ لیکن جب وہ بلہرے کی ملازمت ترک کرنے کے بعد آٹے کی چکّی لگا کر گردشِ تقدیر کا مطالعہ کر رہے تھے۔ یا جب چکّی میں پس چکنے کے بعد پرچون کی دوکان لے کر بیٹھے اور دھیلے دمڑی کا سودا بیچنے لگے اس وقت بھی ان کی آن بان اور تیوروں میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہی انداز جو اعزاز و احترام کی ملازمتوں میں تھا، اس محنت و مزدوری میں بھی قائم رہا۔

اصلاح نظم و نثر بھائی جان میں نظم و نثر دونوں کی اصلاح کا غیر معمولی سلیقہ ہے، میری تو ساری نثر نگاری انہی کی اصلاح کی رہین منت ہے۔ ان کی اصلاح کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ۱۹۰۳ء میں بھائی جان حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کے درجۂ انٹرنس میں تعلیم پاتے تھے۔ حکیم سیّد علی صاحب آشفتہ لکھنوی مرحوم بھی شعر کہتے تھے اور بھائی جان بھی (آشفتہ صاحب اس زمانے میں بھائی جان ہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے ان کے ترک لکھنؤ کے بعد عزیز صاحب لکھنوی کو دکھانے لگے) ایک روز آشفتہ صاحب نے غزل پیش کی، اور جو اصلاح دی گئی ہو وہ معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ ایک شعر کا پہلا مصرع آشفتہ صاحب سے درست نہ لگا تھا بھائی جان نے مصرع قلم زد کر کے دوسرا مصرع لگا دیا اور اسے مطلع بنا دیا۔

کمالِ عشق ہے الفت کا طشت از بام ہو جانا (بھائی جان)
چھلک جاتا ہے جب لبریز ہو جاتا ہے پیمانا (آشفتہ صاحب)

واضح رہے کہ اس وقت بھائی جان کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔

بھائی جان کے ایک بڑے ذی علم شاگرد نے چند سخن فہموں کے مجمع میں غزل سُنائی۔ غزل پر اصلاح نہ ہوئی تھی مگر سارے شعر بے عیب اور ایک سے ایک بہتر تھے۔ ایک شعر تھا:

آ چکا تھا قلب تک بڑھتا ہوا سیلاب نوح
غش وہ اچھا تھا کہ موبیلے کو سفینہ ہو گیا

بھائی جان نے مکرّر پڑھوایا۔ جیسے ہی وہ پہلا مصرع پڑھ چکے بھائی جان نے دوہرایا۔ "آ چکا تھا قلب تک بڑھتا ہوا سیلاب نور" اس طرح بھری

محفل میں صرف ایک حرف سے اصلاح کر دی اور سوا شاگرد کے کوئی محسوس نہ کر سکا۔

حیاتؔ صاحب ملکہ زی کا ایک شعر :-

اب وہ دنیا ہے مری خاموشیوں پر طعنہ زن
ہائے جس دنیا کی خاطر ہونٹ سی لینا پڑے

اصلاح :- اب وہی دنیا ہے خاموشی پہ میری طعنہ زن۔

تابشؔ صاحب لکھنوی کا ایک شعر :-

تسلّیاں دے رہا ہے کیا کیا یہ عشق خانہ خراب دیکھو
عوض میں تسکین دل کے اس نے دیا مجھے اضطراب دیکھو

اصلاح :- تلافیاں کر رہا ہے کیا کیا یہ عشق خانہ خراب دیکھو
عوض میں تسکین دل کے مجھ کو عطا کیا اضطراب دیکھو

اصلاح نثر کی بھی ایک مثال دیکھیئے :-

..... جناب فاطمہ زہراؓ نے انسانیت کی آبیاری جس مشقت اور عرق ریزی سے کی ہے وہ ارباب نظر کے دلوں پر نقش ہے۔ جناب فضہؓ نے فرض شناسی کی کیسی نظیر پیش کی ہے اسے کتب سیر میں ملاحظہ فرمائیے۔

اصلاح :- جناب فاطمہ زہراؓ نے انسانیت کی آبیاری جس مشقت اور عرق ریزی سے کی ہے وہ ارباب نظر کے دلوں پر نقش ہے۔ وہ تو خیر رسولؐ کی بیٹی تھیں۔ جناب فضہؓ نے فرض شناسی ..... الخ

قوّت حافظہ بھائی جان نے بلا کا حافظہ پایا ہے۔ جو سُن لیا بس کالنقش فی الحجر ہو گیا۔ ان کو نہ صرف انیسؔ کے مرثیوں اور میر حسنؔ اور غالبؔ کی مثنویوں کے اشعار حفظ ہیں بلکہ غالبؔ مرحوم کے بعض خطوط اور تحریروں کے صفحے کے صفحے بس ایک مرتبہ سن کر ازبر ہو گئے ہیں۔ اسی قوّت حافظہ کا نتیجہ ہے جس سے ایک بار مل لیتے ہیں اس کو بھولتے نہیں اور اگر کوئی ان کو بھول جاتا ہے تو برہم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر قوی الحافظہ ہونے کے باوجود بدی کو یاد نہیں رکھتے بدی کرنا تو درکنار۔

جرأت و استقلال یوں تو میں نے ان کو ستر برس کے سن میں جون کی لو اور دھوپ میں پیدل اور سائیکل پر منزلیں مارتے ہوئے بھی دیکھا ہے، لیکن جس لکھنؤ میں نہ صرف ان کے بعض عزیزوں کو لوگ دنیوی حیثیت سے بھی نہایت عزت اور امتیاز کی نظر سے دیکھتے ہوں بلکہ وہ خود بھی کمال عزت و امتیاز کی منزل پر فائز ہوں وہیں چکی چلانا یا پرچون کی دوکان پر بیٹھنا اور پھر اسی عالم میں اپنے شاعرانہ اور ادیبانہ تمکین و وقار کے ساتھ ادبی محفلوں میں شرکت کرنا بڑی جرأت اخلاق اور ہمت مردانہ کا کام ہے۔ جب ایسے نازک اور مشکل موقعوں پر بھی ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی ہو تو ان کے ایسے اشعار کیوں کر دل نشین اور اثر انداز نہ ہوں :—

درسِ ہمت ہے اُٹھے رہروِ الفت کیلئے
کانٹے پانا تو مرا برہنہ پا ہو جانا

کھیلتا ہوں ابھی طوفانِ بلا سے ورنہ
جس جگہ ناؤ ڈبو دوں وہی ساحل ہو جائے

اُف یہ امواجِ بلا مانیؔ یہ تیرا حوصلہ
اک نظر دل کی طرف ہے، ایک طوفاں کی طرف

نازک مزاجی بھائی جان کی نازک مزاجیاں، اے معاذ اللہ! کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کب اور کس بات پہ روٹھ جائیں گے۔ بعض اوقات تو ان کی افتاد مزاج سے ہم ضغطے میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک بار میں اور بھائی جان ریاست لوہ پور کے سیّد بادشاہ حسین صاحب کے یہاں مدعو ہوئے سبط محمد صاحب

اکبر پوری بھی وہیں مقیم تھے، شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا، بھائی جان سے استدعا کی گئی۔ انہوں نے شعر سنائے اور ہم نے اپنی بساط بھر داد دی پھر ہماری خواہش پر انہوں نے وہی "آجیبہ" قصیدہ شروع کیا، ابھی اس مطوّل قصیدے کے چند ہی شعر سنائے تھے کہ سبط محمدؐ صاحب حسب عادت تھوڑی دیر کے لئے کھو گئے۔ بس پڑھنا موقوف کر دیا، اور کہنے لگے "اب آپ لوگ سننا نہیں چاہتے"۔ بے چارے سبط محمدؐ نے کہا "ہم لوگ بڑے شوق سے سُن رہے ہیں" تو مکرر کہا "نہیں آپ لوگ سننا نہیں چاہتے" بڑی مشکل ہوئی، خیر سے ساعت کچھ اچھی تھی جلد ہی من بھی گئے۔

ابھی حال ہی کا قصّہ ہے میں بھی مراد آباد میں تھا بھائی جان بھی، میں نے سیّد ہادی حسن صاحب کمشنر کے یہاں ایک نشست کی بنا کر دی، بھائی جان خوش خوش گئے مگر نہ معلوم کیوں، ایسے آزردہ ہوئے کہ ایک شعر سنانے پر بھی تیار نہ تھے۔ جتنا اصرار زیادہ ہوتا تھا انکار بڑھتا جاتا تھا۔ بارے سید نجم الحسن صاحب کمشنر نے جو بھائی جان کے مزاج سے خوب واقف اور ان کے احباب قدیم سے ہیں، بھائی جان سے کچھ ایسی باتیں کیں اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ راضی ہو گئے۔ اور پھر خوب سُنایا۔

ایسے کتنے ہی واقعات ان کی زندگی میں گزرے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نہ وہ قرار واقعی ترقی کر سکے اور نہ عام طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔ چنانچہ ان کے قدر شناسوں کا شمار صرف انہی لوگوں تک محدود ہے جو ان کی سیرت و کردار سے بخوبی متعارف ہیں، مگر صحیح طور پر متعارف ہونا سہل تو نہیں "کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"۔

بااین ہمہ یہ نہ سمجھئے کہ وہ محض نازک مزاج ہیں اور اشفاق و کرم یا دوسروں کی نازک مزاجی کے احترام کا کوئی جذبہ ان میں ہے ہی نہیں —— ہے اور بھرپور ہے۔

حیاتؔ صاحب اپنے وطن لکھنؤ آئے ہوئے ہیں، بھائی جان کا قیام بھی اُن دنوں یہیں ہے۔ دوپہر کے قریب بھائی جان سے چند منٹ میں واپسی کا وعدہ کر کے میرے مکان کے پاس ہی اپنے کسی عزیز سے ملنے چلے جاتے ہیں اور گھنٹوں تک نہیں آتے، جا کے سو رہتے ہیں۔

بھائی جان شدّت انتظار سے بے تاب ہو کر ان کی تلاش میں نکل جاتے ہیں، مکان نہیں ملتا، واپس آ جاتے ہیں۔ میں نے باہر سے آتے ہوئے دیکھا تو پوچھا "کہاں تشریف لے گئے تھے"۔ بولے کہ حیات صاحب کو ڈھونڈنے گیا تھا"۔ میں نے کہا "میں بلا کے لاتا ہوں"۔ کہنے لگے "میں بھی چلتا ہوں"۔

اب چار بجے کا وقت تھا اور صبح کو اطہر حسین صاحب جعفری فاضل شرقیات بھائی جان کو میری معرفت چائے کی دعوت دے گئے تھے۔ ہر چند میں نے بھائی جان کے لانے کا صریحی وعدہ ان سے نہیں کیا تھا پھر بھی خیال تھا کہ میں انہیں لے جا سکوں گا۔ مگر اس وقت تو رنگ ہی بے رنگ تھا اور ان کو چائے پر چلنے کے لئے آمادہ کرنا "کار دارد" کا حکم رکھتا تھا جعفری صاحب کا دولتکدہ دور تھا، وقت ہو چکا تھا اس لئے مزاج کے پرسکون ہونے کا انتظار بھی کچھ نامناسب ہی تھا لہذا حیات صاحب کی طرف جاتے ہوئے راہ میں جی کڑا کر کے میں نے عرض کیا کہ "جعفری صاحب کے یہاں چلنا ہے"۔ سن کر قطعیت کے لہجے میں فرمایا "میں تو نہ جاؤں گا"۔ میں نے کہا "میں نے تو وعدہ —————— بس اتنا ہی کہا تھا کہ فرمایا "تو چلوں گا"۔ اب حیاتؔ صاحب سے ملے تو ان پر برس پڑے "خدا کی قسم آپ کی ان باتوں پر خودکشی کر لینے کو جی چاہتا ہے، ارے صاحب آپ کو مجھ سے جلد واپسی کا غلط وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی"۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جو تیور کڑے دیکھے تو ٹل آیا۔

کچھ توقف کے بعد جعفری صاحب کے یہاں چلنا ہوا تو راستے میں فرمانے لگے "بھلا منزلیں مار کے چائے پینے کا کیا تک ہے"۔ پھر جب ہم اطہر صاحب کے یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب پہلے سے آئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یہ خبر پاتے ہی کہنے لگے اب میں ایک مصرع نہ سناؤں گا"۔ مگر جب کمرے میں داخل ہوئے تو ان صاحب سے بہ حسنِ اخلاق پیش آئے اور شعر بھی خوب خوب سنائے، بڑا لطف رہا۔ ساری بدمزگی جاتی رہی۔

حاضر جوابی اور بذلہ سنجی لیکن بھائی جان کی اس نازک مزاجی اور ذکی الحسی کو ان کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور سوجھ بوجھ اکثر خوش گوار بھی بنا دیتی ہے۔

ادھر لکھنؤ میں مسلسل قیام پذیر رہنے کے بعد کچھ دنوں سے بھائی جان کا قیام دہلی میں زیادہ رہنے لگا ہے۔ یہاں تشریف لائے تو حکیم صاحب عالم کے یہاں مولانا

سید ابن حسن صاحب نونہروی۔ جناب شدید۔ مولانا سید ابرار حسین صاحب پارہوی اور اکثر اہل علم کا مجمع تھا۔ کسی نے پوچھا "مانی صاحب آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں، نیاز ہی حاصل نہیں ہوتا۔" اس پر حکیم صاحب عالم صاحب نے جو بقول جوشؔ صاحب جان لکھنؤ ہیں فرمایا۔ بھائی اب یہ دلّی والے ہو گئے ہیں، فقرہ لاجواب تھا۔ مگر بھائی جان نے برجستہ فرمایا" اور آپ دس[1] کھا گئے۔" نیاز فتحپوری نے یہ لطیفہ سُنا تو فرمایا" پھر بھی چپ نہیں رہتے۔" مہاراج کمار محمد امیر حیدر خاں صاحب (محمود آباد) کے پہلے فرزند پیدا ہوتے ہیں۔ بڑی خوشی کا موقع ہے۔ بھائی جان بھی بلدے سے تہنیت کیلئے آئے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے۔ ہنوز دھوپ کی شدّت اور حدّت کم نہیں ہوئی کہ راجہ صاحب محمود آباد (مہاراج کمار) سے واپسی کی اجازت لینے جاتے ہیں۔ حاشیہ نشینوں نے کہا" اس وقت تشریف نہ لے جائیے۔ دھوپ تیز ہے زحمت ہوگی" بھائی جان نے بے تکلف کہا "آج اگر "زحمت" کا لفظ لغت میں ہے تو وہ "رحمت" پر ایک نقطے کے اضافے کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اللہ اللہ۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔

ایک بار دہلی میں جوشؔ صاحب نے شبستان سرخوشی میں کھانے پر مدعو کیا۔ دس بارہ آدمی تھے، اتفاق سے صہبا پرست حضرات ایک صف میں اور پرہیزگار مقابل والی صف میں بیٹھے تھے، اتنے میں اجمل خاں صاحب (پرائیویٹ سکریٹری مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات حکومت ہند) تشریف لائے۔ جوشؔ صاحب بولے" آپ ہمارے ساتھ مردانے میں نہ بیٹھئے" مخدّرات" کی صف میں جائیے۔ بھائی جان نے پذیرائی کرتے ہوئے فرمایا" ہاں خانصاحب آپ "مخدرات" کی طرف نہ جائیے ادھر آئیے۔

حرف زبر کو زیر کرکے جواب دے دینا حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور فطانت کا معجزہ ہے۔

اخلاق و عادات بھائی جان دوسروں کے حفظ مراتب کا خاص خیال رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اپنے ساتھ نامناسب برتاؤ انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ ان کے دل میں درد محبت ہے مگر اس کا اظہار نہیں کر پاتے جس کی وجہ سے ان کی محبت کی گہرائیوں کا اندازہ لگانا دشوار ہے اور یہی سبب ہے کہ غیروں کا کیا ذکر اکثر عزیز بھی ان سے بدظن رہتے ہیں۔ دراصل ان کے مزاج میں لغو گوئی نامعقولیت اور فقدان انسانیت کے خلاف نفرت کے جذبات کی اتنی شدّت ہے کہ پہلی نظر ڈالنے والے کو ان پر کبر و نخوت کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

بابا مرحوم کا غیر معمولی احترام کرتے تھے اور جب تک سامنے رہتے ان کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ مگر جب علٰحدہ ہوتے تو خیریت کا خط بھی نہ لکھتے تھے۔ بابا مرحوم فرمایا کرتے تھے" کلب احمدؔ کا تو بس یہ حال ہے کہ از نظر دور از دل دور۔"

خودداری، عالی ہمتی، بلند نظری، جوانمردی، محدود دائرے میں فیاضانہ سلوک ان کا مخصوص شعار ہے۔ انگریز کو زیادہ سچا ایمان دار اور منصف مزاج جانتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا کوئی ذاتی مقصد درمیان میں نہ ہو۔ شک اور وہم کسی میں پاتے تو اُسے تلقین کرتے ہیں اور خود اوہام کو پاس نہیں آنے دیتے۔ لیکن کوئی چلتے وقت چھینک دے یا بلّی راستہ کاٹ دے تو کچھ تامل کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہ کہہ دیتے ہیں" کیا کہوں یہ توہم جیسے گھٹی میں پڑ گیا ہے ورنہ دراصل محض بیہودہ اور بے بنیاد ہے۔" ابھی کچھ دنوں پہلے تک گھوڑے کی سواری خوب کرتے تھے، لباس اور چھڑی کا بھی بہت شوق تھا، اچکن حتی الامکان بوٹی دار پہنتے تھے۔ سامان بھی اول درجہ کا رکھنا پسند کرتے تھے۔ اب یہ سب کالعدم ہے۔ کبھی ذکر آتا ہے تو فرماتے ہیں" ان حدود و ضوابط سے آزاد ہو گیا ہوں۔"

عموماً بہت تڑکے اُٹھتے ہیں۔ خدا کی قدرت کاملہ کے دل سے قائل ہیں اس لئے مستقبل کی طرف سے کبھی مایوس اور پریشان نہیں ہوتے۔ البتہ ادھر جب آلام و افکار کی انتہا نہ رہی تھی تو کہا کرتے تھے" خدا پر بھروسہ رکھنے کی طاقت دل میں کم رہ گئی ہے، ورنہ میں ان پریشانیوں کو کہاں خاطر میں لاتا تھا۔"

خودستائی اور ستائش پسندی کی کمزوری تو عام طور پر کم و بیش سبھی میں پائی جاتی ہے، بھائی جان میں بھی ہے مگر اس کا مظاہرہ ان کے یہاں بہت خفیف اور ہلکے انداز میں ہوتا ہے۔ اور ایسے موقعوں پر بھی، جو کم ہی پیش آتے ہیں، وہ انکسار کی تہ جما دیتے ہیں۔

معقول پسندی بھائی جان جہاں لغو اور مہمل بات کو گوارا نہیں کر سکتے وہاں وہ معقول بات کو فوراً قبول بھی کر لیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے "پپیہا"۔ اس میں ایک

---

[1] یعنی "ی" کے دس عدد کم کر دیئے۔

مصرع میں "گو بہ گو" تھا کسی نے سو بہ سو کہہ کر مصرع دہرایا۔ یہ اصلاح پپیہے کی مناسبت سے بے حد موزوں تھی۔ انہوں نے فوراً اس اصلاح کو قبول کر لیا۔

ابتدا میں، بالکل ابتدا میں تو وہ مشاعروں میں چوری چھپے شرکت کرتے تھے، لیکن تیس بتیس برس سے انہوں نے مشاعروں میں جانا گویا ترک ہی کر دیا تھا۔ اب پھر جانے لگے ہیں مگر بہت کمی کے ساتھ البتہ کالج اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں جانا ہمیشہ اُردو کی ترویج اور خدمت سمجھتے تھے اور کبھی بلا کسی خاص مانع کے جانے سے انکار نہیں کیا۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۹ء تک انہیں دنیائے علم و ادب سے بالکل بے گانگی رہی مشاعروں میں تو جاتے ہی نہ تھے، رسالوں اور اخباروں کو بھی اشاعت کے لئے نظم یا نثر دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کی شہرت کو خاصا دھکا لگا۔ گو اب تو نئی پود کے لوگ بھی انہیں اور ان کے ادبی وقار کو جاننے لگے ہیں جو ابھی پانچ چھ سال قبل تک گویا ان سے ناآشنا ہی تھے۔ لیکن باوجود اس کے ان کا کلام ہنوز اس شہرت اور مقبولیت کو نہیں پہنچا جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کے اور اسباب بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس وقت کے شاعر نہیں ہیں سو پچاس برس بعد انہیں آنا چاہئے تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کا کلام عوام کے سمجھنے کا نہیں۔

بہر حال جب تک خودداری، عالی ہمتی، انصاف گوئی، حق شناسی، بلند نظری اور مستقل مزاجی جیسی اخلاقی خصوصیتیں اہم سمجھی جاتی رہیں گی، بھائی جان کا کلام باقی اور درس آموز انسانیت رہے گا۔ اس کے علاوہ جوں جوں علوِ فکر، حسن بیان، چستی بندش، راستی تخیل اور فلسفۂ جذبات کے محاسن اور نزاکتوں کے سمجھنے والے بڑھتے جائیں گے ان کا کلام معراج پاتا جائے گا۔ بھائی جان، انیس اور غالب کے بہت دلدادہ ہیں بلکہ کہنا چاہئے کہ اُردو شعرائے ماسبق میں سے سب سے زیادہ انہی دونوں کے دل دادہ ہیں۔ یہ چاہتے تو انہی دونوں کے متعلق ایسی کتاب لکھ ڈالتے جو دنیائے علم و ادب میں ایک شاہکار اور ایک اضافۂ گراں بہا ہوتا لیکن یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا حاصل ہوں صرف چند غزلیں، چند قصیدے، چند نظمیں، چند مخمس، چند شذرات، اور چند افسانے اور وہ بھی اکثر غیر مطبوعہ۔

بقول میرے ایک عزیز دوست اختر حمید خاں، آئی۔ سی۔ ایس پرنسپل کومیلا کالج (مشرقی پاکستان) یہ حقیقت ایک ماتم خیز سانحہ ہے کہ بھائی جان نے وہ نہ کیا جس کے لئے قدرت نے انہیں خلق کیا تھا اور جس کے وہ اہل تھے۔ خیر، اب تو "کار از دست رفتہ و تیر از کمان جستہ" پر تاسف بے فائدہ اور لاحاصل ہی سا ہے۔ جو فیض دنیائے شعر و ادب کو ان سے پہنچ سکا اسی کو غنیمت سمجھئے اور بس۔

خلفائے محمدؐ

ابو المنصر شام کا سب سے بڑا مؤرخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے
جتنی بھی سوانحی کتابیں لکھیں ان کا ساری دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے
خلفائے محمدؐ میں اس نے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ پر دنیا جہان
کی کتابیں پڑھ کر ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جو ان خلفاء پر سب سے
معیاری اور مستند کتاب ہے۔

ترجمہ بے حد سلیس   قیمت -/۱۰

ادارۂ فروغِ اُردو —— لاہور

میرزا ادیب

جمیل ملک

کہنے والے کہتے ہیں کہ میرزا ادیب، کی کوئی شخصیت ہی نہیں وہ تو بس ایک شخص ہے۔ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی طرح ایک شخص، پھر اُسے در خورِ اعتنا کیوں سمجھا جائے۔ غالب نے بھی تو کہا تھا کہ ؏

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یہ سچ ہے کہ آدمی سے انسان تک سینکڑوں مراحل، ہزاروں منازل طے کرنا پڑتی ہیں اور جب تک پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں، سانس نہ پھول جائے، منزل قریب نہیں آتی۔ انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے نہیں آتیں اُس کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ لیکن آخر یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ دنیا میں جو لاکھوں آدمی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں بس "آدمی" ہیں انسان نہیں "اشخاص" ہیں شخصیتیں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تاریخ نے اب تک چند شخصیات کے سر پر ہی عظمت کا تاج رکھا ہے۔ لیکن وہ "آدمی" وہ "اشخاص" کہاں گئے جنہوں نے یہ انسان بنائے، یہ شخصیات تراشیں۔ آخر انہوں نے بھی تو زندگی کے تپتے صحراؤں کی خاک چھانی تھی، گلزاروں میں پھول کھلائے تھے۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار سے محبت کی تھی۔ ان کے لئے جان دی تھی۔ اگر آج تک مورخ نے اُن پر نظر نہیں ڈالی۔ اُن کی عظمت کو منوں مٹی میں مدفون کر دیا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اُن کو "فالتو آدمی" سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے اور اپنی سعیٔ کرم کا نچوڑ یہ پیش کیا جائے کہ "صاحب فلاں صاحب کی تو کوئی شخصیت ہی نہیں وہ تو بس ایک شخص ہے"

جب انسان کا بچپن ہوتا ہے، جب وہ بالغ النظر نہیں ہوتا تو اُسے تیز رنگوں سے، فوق الفطرت عناصر سے بڑی محبت ہوتی ہے، ہمارے ہاں اردو ادب تو اب منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اس کے مستقبل سے مایوس ہونا میں کفر کے مترادف سمجھتا ہوں۔ لیکن اِدھر جب سے دنیا نے پے بہ پے کروٹیں بدلنا شروع کی ہیں۔ اردو ادب میں بھی یکے بعد دیگرے اتنے متضاد اور باہم متصادم رجحانات در آئے ہیں کہ ہمارے اکثر ادیبوں کی شخصیات لخت لخت ہو کر رہ گئی ہیں۔ ترقی پسند، جدید، جدید تر، نئی پود، نئی نسل کی بحثیں ایسی چلیں کہ آج تک یہی طے نہیں ہو پایا کہ آیا یہ سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں یا ان کے رستے جدا جدا ہیں! یہ ملتے کہاں کہاں ہیں اور جدا کہاں کہاں ہوتے ہیں! ان کی سنجیدہ

اور متین ادبی شخصیات نے ادبی اقدار متعین کرنے اور راہیں ہموار کرنے کی پر خلوص کوششیں کئی بار کیں، انہوں نے اعلےٰ اقدارِ ادب کا ساتھ بھی دیا۔ اور اپنے طور پر اس دشت کی صحرا نوردی بھی کی مگر صاحب ایسی سنجیدہ اور متین شخصیات کو شخصیات کون مانتا، یہاں تو وہی تیز چمکتے ہوئے رنگوں پر مر مٹنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ مگر آپ جانتے ہیں فوق البھڑک مسافر کی پرستش ہزار پرکشش مشغلہ سہی مگر اس میں آدمی کتنی سرعت سے جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمارے ادب میں بیسیوں مل جائیں گی۔ آپ ہی بتائیے ہمارے ہاں اختر شیرانی، منٹو، مجاز وغیرہ پر کیا بیتی، یہ درست ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے، ان کو شخصیات مان لینے میں بھی مجھے کوئی تامّل نہیں لیکن کیا یہ شعلے اتنی جلدی بجھ جانے والے تھے؟ اور یہ جو ہمارے افق ادب پر آئے دن بیسیوں ستارے پل بھر چمک کر ڈوب جاتے ہیں اس میں بھی صرف سات آسمانوں کی گردش کا ہی قصور ہے؟ اس معاشرے میں فنکاروں کی مجبوریاں سب بجا لیکن انہیں "مجبور محض" سمجھ کر ان کا ہر گناہ معاف کر دینے کی جو رسم ہمارے ہاں چل نکلی ہے۔ اور ان کی خامیوں کو خوبیاں سمجھ کر ان کی شخصیتوں کی پیش از وقت بیجا پرستش کی جو وبا پھیلی بڑھی ہے اس نے نہ صرف اچھے اچھے "ذہین ادیبوں" کو ہی وقت سے پہلے ہم سے چھین لیا ہے بلکہ کئی شریف و نجیب، سنجیدہ و متین شخصیتیں بھی اس سارے عمل میں بنتے بنتے بگڑ گئی ہیں، بے توجہی کا شکار ہو گئی ہیں یا نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ انہی شخصیتوں میں سے ایک میرزا ادیب کی شخصیت بھی ہے۔

اُڑے اُڑے بالوں، بجھی بجھی آنکھوں، پتلے پتلے ہونٹوں، لمبی ناک لمبوترے چہرے اور گندمی رنگ والا، دراز قد میرزا ادیب۔ جب چلتا ہے تو ہمیشہ کسی مونس و غمخوار کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے بڑے پیارے انداز میں —— آپ سے باتیں کرے گا —— اس کے ہاتھوں کا لمس —— اس کی لمبی لمبی ترشی ترشائی حساس انگلیوں کی گھٹتی بڑھتی دھڑکن —— ایک ہمکتی لپکتی پھیلتی بڑھتی زندگی —— بیچ بیچ میں ہاتھوں کا گرم گرم دباؤ —— ہتھیلی کی تپش —— نسوں کی اٹھتی بیٹھتی سانس —— آپ پر اس کی کنارہ کش مخفی —— صاعقہ بردوش شخصیت کے راز دھیرے دھیرے —— ہولے ہولے منکشف کرتی جائے گی —— یہ دھڑکتے ہاتھ۔ یہ گرم لمس —— یہ دھیمی دھیمی —— مٹھی مٹھی آنچ آپ کو اس کے خلوص اور سادگی کا یقین دلائے گی۔ آپ کو اس کے دل کی نامعلوم پہنائیوں میں خفتہ آتش فشاں پیدا ہوتے محسوس ہونگے۔ بپھرتے غراتے طوفان نظر آئیں گے —— ان طوفانوں و سیلابوں کے کنارے —— آپ کو وہی صحرا نورد —— صداقت و انقلاب کا داعی —— کنارہ کش بے نیاز اور پر عظمت کھڑا نظر آئے گا —— جس کی گھن گرج والی آواز آج بیس سال سے ادب کے افق پر گونج رہی ہے —— جوں جوں زمانہ بیت رہا ہے —— یہ آواز پتھروں و چٹانوں کے سینے چیر رہی ہے اس کی صدائے بازگشت سارے نئے ادب میں سنائی دے رہی ہے۔

Taine ٹین نے کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے تین چیزوں کو بنیادی قرار دیا ہے۔ Race "نسل" Malieu فضا یا ماحول اور Momentum یعنی روح عصر۔ یورپ کے نقادوں کی طرح ہمارے ہاں کے نقادوں کو یہ سعادت تو ابھی برسوں حاصل نہیں ہو گی کہ وہ ایک مدت تک فنکاروں کے قریب رہ کر ان کے ساتھ شب و روز گزار کر، ان کی زندگی اور فن کا مطالعہ کریں اور نہ مجھے ہی اس بات کا دعویٰ ہے کہ میں نے میرزا ادیب کے ساتھ رہ کر برسوں ریاضت کی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ گزشتہ آٹھ سالوں میں مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کے جتنے مواقع ملے ہیں۔ ان سے میں نے اس فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی ہے۔ لوگ کہتے ہیں میرزا ادیب ایک پہیلی ہے وہ اپنے راز لوگوں پر افشا ہی نہیں کرتا تو کوئی اس پر کیا لکھے اور یوں میرزا ادیب کی ذہنی تصویر مرتب کرنا اتنا آسان بھی نہیں لگتا لیکن ٹین نے جن تین عناصر کا ذکر کیا ہے اگر کسی ادبی شخصیت کو ان سے قطعاً مفر نہیں تو پھر یہ عناصر اس کی خوشیوں اور غموں، اس کے قہقہوں اور آنسوؤں اس کی چال ڈھال، اور نشست و برخاست، اس کے فن اور زندگی میں ضرور جھلکیں گے اور یہیں سے کسی فنکار کی زندگی صفحۂ راز سے نکل کر منصۂ شہود پر آنے لگے گی۔

سینٹ بیو نے کہا تھا "اگر تم درختوں کی جڑوں کو پہچانو تو اُن کے پھل پھول کو خود بخود پہچان جاؤ گے"۔ خواہ وہ غالب کی صد رنگ طبیعت ہو یا میر کی داغ داغ شخصیت ہو یا میرزا ادیب کی لٹی پٹی، کھوئی کھوئی، محروم و متجسس زندگی، اِن سب سے اُن کی داستانِ حیات مرتب کی جاسکتی ہے اُن کے قدموں کے نشان تلاش کئے جاسکتے ہیں۔

انسان کی زندگی میں بچپن سے بڑھاپے تک کتنے ہی سنگِ میل آتے ہیں اور فنکار تو بعض اوقات اپنی قدرتِ بیان اور دسترسِ فن سے ازل اور ابد کی طنابیں کھینچ دیتا ہے۔ میرزا ادیب نے شاید ابھی یہ عظیم فریضہ سرانجام نہیں دیا۔ لیکن ہر پرخلوص اور سچے فنکار کی طرح وہ اس آدرش کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ زمانے سے ہمارے کس ادیب کو شکایت نہیں مگر یہ بات تو اُس کے مخالف بھی مانیں گے کہ اُس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی ستم ہوا ہے، زمانہ سب کو اپنی چھلنی میں چھانتا رہتا ہے۔ لیکن ہر غالب کو بجنوری نہیں ملتا کہ وہ اُسی کے تیروں سے اُس کے لئے ڈھال بنا رہے جو اُسے ہر زمانی، ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ جب بچہ جنم لیتا ہے تو ماں باپ اُسی دن سے اُس کے روشن مستقبل کے لئے سنہرے خواب دیکھنے لگتے ہیں لیکن جب اُن کی توقعات بر نہیں آتیں تو اپنا سر پیٹ لیتے ہیں۔ سینٹ بیو کے قول کو سامنے رکھ کر، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات والی ضرب المثل پر غور کریں تو ہرچند ہمیں میرزا ادیب ہونہار بروا ہی نظر آئے گا اور اس کے پات بھی چکنے ہی ملیں گے لیکن اگر ہم اُن کی جڑوں کو بنظرِ عمیق دیکھیں گے تو ہم سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہے گی کہ اِس درخت کی جڑوں کو بھی اُس گدلے اور زہریلے پانی نے سیراب کیا ہے جو سالہا سال سے ہمارے ہاں نچلے اور متوسط طبقوں کا مقدر ہو چکا ہے۔ اگرچہ باپ کے خشمگیں شعلوں میں اُس کا احساس جمال اور ذوق نظر جھلستا رہا ہے لیکن ماں کی ممتا اور شفقت اُسکی جڑوں میں سموئے ہوئے زہریلے پانی کو میٹھے امرت میں تبدیل کرتی رہی۔ وہ کہتا ہے جب میں ننھا منھا تھا تو ایک دفعہ راستے سے بھٹک گیا۔ عین اُس وقت جب میری معصوم آنکھوں میں ستاروں سے آنسو چمک رہے تھے ایک مردِ درویش مجھے اپنے ساتھ بگھی پر بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اُس کی بیوی نے، جو ایک عورت بھی تھی اور ایک ماں بھی مجھے اپنے بچے کی طرح چھاتی سے لگا لیا، مجھے اچھی اچھی مٹھائیاں کھلائیں، سونے کے لئے مجھے نرم بچھونا دیا۔ ماں کی ممتا کی یہ کرن اُسے اپنی ماں کے بعد دوسری بار ایک اور عورت میں نظر آئی انسانیت پرستی کی یہ کرن جو وہ اپنے بچپن میں دیکھ پایا تھا آج تک اُس کے غم خانۂ دل کو روشن کر رہی ہے۔ پھر جب اس کی مسیں بھیگنے لگیں، تو اُس کی شاعرانہ طبیعت نے انگڑائی لی، ابتدائے جوانی میں سبھی شاعر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرزا ادیب، نے بھی شاعر بننے کی ناکام سی کوشش کی۔ اختر شیرانی، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم جیسے رومان پسندوں کا یہ متوالا خود شاعر تو نہ بن سکا۔ ہاں اُس نے اپنی شاعرانہ طبیعت کی تسکین کے لئے ایک ذہنی مجسمہ ضرور بنا لیا ایک کونا زا، کا پیکر ضرور تراش لیا۔ عورت کی شفقت اور ماں کی ممتا تو اُسے ورثے میں ملی تھی۔ اب اُس نے عورت کو ذہنی محبوبہ کے روپ میں بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ اقبال کو 'آہ سحر گاہی' سے بہت پیار تھا۔ شب بیداری سے بڑا لگاؤ تھا۔ سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی کی ساری حکائتیں اقبال کے ہاں اِسی سحر گاہی اور شب بیداری کا نتیجہ ہیں مگر میرزا ادیب کو تو بچپن سے بادِ صبا کے نرم جھونکوں سے عشق ہے نسیم صبح کا پہلا جھونکا جب اُس کے کان میں آکر سرگوشی کرتا ہے اور جو شخص ہزاروں صبحوں کا اُجالا اپنی سانسوں میں گھول کر پی گیا ہو اُس کی تحریروں میں رومان کیوں نہیں ہوگا، روشنی کیوں نہیں ہوگی، زندگی کیوں نہیں ہوگی، صحرا نورد کے رومان میرزا ادیب نے اپنی صبحوں کے اجالے میں جامع مسجد کی مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھ کر لکھے۔ انہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ صبح کا ناشتہ بھنے ہوئے چنوں سے کرتا رہا۔ بادِ صبح گاہی کا امرت رس پی پی کر بھنے ہوئے چنوں کو حلق سے نیچے اُتارتا رہا، خون میں تحلیل کرتا رہا، فن کا جزو بناتا رہا۔ اُس کی یہی مشقت، یہی عرق ریزی، صحرا نورد کے خطوط اور صحرا نورد کے رومان' میں عشق اور زندگی بن کر چمک اُٹھی ہے۔ پھول اور کلیاں بن کر مہک اُٹھی۔ گلشن گلزار بن کر کھل گئی۔ زندگی و حرارت بن کر روح میں حلول کر گئی۔ اور اردو ادب کی رومانی تحریک سے بڑھ کر حقیقت نگاری کے میدان میں بھی ہمیشہ کے لئے میرزا ادیب کو زندہ کر گئی ہے۔

پھر اُس نے دیکھا کہ ملک میں چاروں طرف انقلاب آفریں آوازیں بلند ہو رہی ہیں، وہ چونک کر اُن آوازوں کے تعاقب میں چل کھڑا ہوا ——— اُسے معلوم ہوا کہ یہ آوازیں سودیشی تحریک، اور تحریک عدم تعاون کی بازگشت ہیں۔ چوراہوں پر جلسے ہو رہے ہیں، سڑکوں پر جلوس نکل رہے ہیں ——— کہیں ایک عورت جلوس کی رہنمائی کرتے کرتے آگے بڑھ جاتی ہے۔ گولیوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتی ہے، گولیوں کی باڑ کو اپنی سیسہ پلائی ہوئی چھاتی پر روک لیتی ہے۔ میرزا ادیب اُسے دیکھتا ہے۔ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ایک بار پھر عورت مثالی انداز میں اُس کی نظروں کے سامنے آتی ہے اور اس کی محبوب ہیروئن بن کر اُس کے افسانوں میں بس جاتی ہے کہیں ایک مرد، ایک باغی، پولیس کی تیز رفتار گاڑیوں کے آگے لیٹ جاتا ہے، گاڑیاں اُس کو کچل کر آگے بڑھ سکتی ہیں مگر نہیں بڑھ سکتیں۔ میرزا ادیب کی نظریں اِس نوجوان پر پڑتی ہیں وہ دل ہی دل میں اسے اپنی ہیروئن کے پہلو میں لا کھڑا کرتا ہے۔ جو اُس کے افسانوں کا مضبوط و تنومند ہیرو ہے، بلند کردار ہے۔ یوں جب وہ صحرا صحرا زندگی کو تلاش کرتے کرتے کسی سرسبز و شاداب پھول پھلوں والے "جنگل" میں جا نکلتا ہے۔ اُس کے ہم چشم اور ہمعصر غالب کی طرح اُس کے تیروں سے اُس کے لئے کوئی ڈھال نہیں بناتے، بلکہ اُس کے تیروں سے اُسے چھلنی کرنے پر تل جاتے ہیں، اُسے جنگل جنگل بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں مگر یہاں پھر اُس کے محبوب ساتھی، اُس کے ہیرو اور ہیروئن اُس کی دلجوئی کرتے اُس کے تھکے ہوئے دل و دماغ کو کبھی پیار سے تھپکاتے اور کبھی شوخی سے جھنجھوڑتے ہیں۔ اُس کی شخصیت کے پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں چن چن کر اُن کا ہار بناتے ہیں اور یہ مالا میرزا ادیب کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔

میرزا ادیب نسلی اثرات قبول کرتا ہوا، ماحول اور گردوپیش کی چکی میں پستا ہوا، روحِ عصر کو اپنے احساس اور فن کا جزو بناتا ہوا، بچپن اور جوانی، ادب اور ثقافت، فلم، ریڈیو اور ادارت سبھی مراحل سے گزرتا، سبھی ٹھکانوں پر دم لیتا ہوا، پھر سرگرمِ سفر ہو جاتا ہے۔ قناعت کے بے برگ و بار خشک و تہی دامن درخت کے نیچے نہیں بیٹھ جاتا۔ وہ تصورِ جاناں میں اپنی تمام زندگی کسی اجڑے چمن میں بیٹھ کر نہیں گزار دیتا ——— وہ سو شکست خوردگیوں سو محرومیوں سو ناکامیوں کے بعد بھی پست ہمت اور مایوس نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی موجوں کے تھپیڑے کھانے کے باوجود اپنی پوری طاقت پوری توانائی سے جدوجہد کر رہا ہے بچپن میں والد نے اُس پر سختی کی، اُسے آنکھیں دکھائیں تو وہ ماں کی ممتا سے مرعوب ہوتے ہوتے ذہنی طور پر عورت کی عظمت سے اس قدر متاثر ہوا کہ رومان پسند ہو گیا جب آئی سی ایس بننے کے لئے خواب تشنۂ تکمیل رہے تو وہ فلم ریڈیو اور ادبِ لطیف کی ادارت کے فرائض سرانجام دے دے کر اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے پیٹ کے لئے ایندھن مہیا کرتا رہا۔ جب وہ ادبی گروہ بندیوں اور عملی سیاست میں حصہ نہ لے سکا۔ تو ادب و ثقافت کے ہنگاموں سے بظاہر کنارہ کش ہو گیا اور اگر کہیں وہ پلٹتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا نظر بھی آیا تو زیادہ تر نوجوان اور نو وارد ادیبوں کے ساتھ ——— کبھی ہنستا، کھلکھلاتا ہوا اور کبھی سراسیمہ اور حواس باختہ ——— میں جب میرزا ادیب کو نئے نئے ادیبوں کے ساتھ دیکھتا ہوں تو مجھے اُس کی شرافت و متانت، بے تکلفی اور بے ساختہ پن، جذبۂ ایثار و محبت پر رشک آتا ہے۔ گو میں نے میرزا ادیب کا بچپن نہیں دیکھا اور یوں بھی میں میرزا ادیب کے مقابلے میں بچہ ہی ہوں لیکن اُسے نوعمر اور نئے نئے رجحانات اپنانے والے فنکاروں کے ساتھ دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ میرزا ادیب ایک بار اپنے بچپن میں داخل ہو گیا ہے۔ دراصل وہ اپنے تجربہ کار اور پختہ دماغ کو بچپن کی شیرینیوں اور مسکراہٹوں سے ہم آمیز اور ہم آہنگ کر کے ہمیشہ اسے معصوم و دلآویز سرسبز و شاداب رکھنا چاہتا ہے میرزا ادیب کو اپنے لڑکپن سے اس قدر محبت تو نہ ہو گی جتنی ورڈز ورتھ کو تھی لیکن اُس کی عمر کے اس حصے میں بھی اُس کی جوانی کی پختگی میں بھی بچپن کی اس قدر شیرینی اور حلاوت، اتنا آرام اور سکون ملتا ہے کہ جی چاہتا ہے اس درخت کے سائے میں تھوڑی دیر بیٹھ کر دم لے لیا جائے اور یوں مجھے اب بھی میرزا ادیب صحرانورد کے کسی رومان کا کوئی کھویا ہوا معصوم ہیرو ہی نظر آتا ہے ویسے بھی میرزا ادیب کی اپنی خواہشات کس قدر معصوم ہیں، اُس کی اپنی شخصیت کی طرح کس قدر سیدھی سادی اور بے ضرر ہیں۔ رہنے کے لئے ایک پرسکون مکان، پہننے کے لئے اچھے کپڑے، کھانے کے لئے ستھری، صحت مند غذا ——— ادب میں تو خیر اسے اب تک جتنی بڑی شخصیت مانا گیا وہ ہم سب پر روشن ہے مگر ستم تو یہ ہے کہ ابھی تک اُس کی یہ چند ابتدائی، بظاہر بڑی معمولی خواہشات بھی پوری نہیں ہوئیں ——— میں نے کہا تھا نا کہ ہمارے ہاں اب تک زیادہ تر فوق البھڑک اور چمکیلے رنگوں کی ہی قدر ہوئی ہے۔ گہرے رنگوں کو پرکھنے کی فرصت ہی کسے ہے۔ اس وادی میں قدم رکھ کر تو دوسروں کی شخصیت کی خبر لاتے لاتے خود خاک ہونا پڑتا ہے اور جب شخصیتوں کا مطالعہ اتنا آسان ہو گیا ہو جتنا ہمارے ہاں ہے اور جہاں فقرہ بازی کا آرٹ سیکھ لینے سے واہ واہ کے

پھول نقادوں کی جھولی میں اگریں تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ صحرانوردی کرتے پھریں، جنگل جنگل بھٹکیں اور اپنا لہو مفت میں پانی کردیں یا کسی کے "آنسو ستارے" دیکھیں یا کسی کے درد کے پیوند لگے "کمبل" پر نظر دوڑائیں اور میں نے بھی اگر میرزا ادیب کی شخصیت پر یہ چند فقرے درست کر لیے ہیں تو کون سا ادب پر یا میرزا ادیب پر بڑا احسان کر دیا ہے۔ ہاں اگر ہمارے لکھنے والوں کو اُس غلط رجحان کا احساس ہو سکے جس کی طرف میں بین السطور اشارے کرتا رہا ہوں تو میں بھی سمجھوں گا کہ چلو میرزا ادیب کی شخصیت کو تو پوری طرح میں بھی نہ کھنگال سکا ۔ ایک غلط رجحان کی طرف تو لوگ متوجہ ہو گئے اگر ایسا ہو گیا تو پھر اس کی تلافی بھی کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گی ۔

مَیں نے میرزا ادیب کی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ اُس کی شرافت و متانت اُس کی رومان پسندی اُس کے طبعی لڑکپن اور معصومانہ حرکات و سکنات کا ذکر کیا ہے لیکن میری اس گفتگو سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میرزا ادیب محض بچہ ہی ہے۔ میں آخر میں آپ سے صاف صاف کہہ دوں کہ وہ نرا بچہ ہی نہیں وہ اپنے ارادوں میں جوانوں کی طرح اولوالعزم اور بوڑھوں کی طرح مشّاق اور تجربہ کار ہے۔ اُس کی شخصیت لڑکپن، جوانی اور پختگی کا حسین امتزاج ہے اُس کا لڑکپن اور جوانی گھُل مِل کر اِس طرح پختگی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوگا۔ یوں اُس کے لڑکپن اور جوانی پر پختگی و تجربہ کی پرچھائیاں ضرور ہیں مگر وہ اِدھر کچھ عرصے سے ایک اور معصومانہ ادا دکھا رہا ہے ایک اور کھیل رچا رہا ہے۔ اور جب وہ کوئی ڈرامہ کھیلنے لگتا ہے تو روح اور دل و دماغ سے پختگی کا غلاف بڑی بے دردی سے اُتار پھینکتا ہے۔ وہ پھر بچہ بن جاتا ہے، ذہین اور سمجھ دار بچہ، اگرچہ اُس کی شخصیت کی سطح پر کوئی ڈرامہ، کوئی تصادم، کوئی کشمکش اپنے بھرپور تسلسل کے ساتھ نظر نہیں آتی لیکن اُس کی زندگی میں بعض ڈرامائی واقعات ضرور ملتے ہیں۔ جن کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں اور جنہوں نے اس کی شخصیت کی تہہ میں بے پناہ ہلچل، تصادم، کشمکش اور ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ ابھی تو ہمیں وہ اپنی شخصیت کا ایک ایک سین ایک ایک ایکٹ دکھا کر ہی چھپ جاتا ہے لیکن ایک دن دنیا کے سٹیج پر وہ اپنی شخصیت کا بھرپور اور مکمل ڈرامہ بھی ضرور پیش کرے گا اور تب اُس کی شخصیت پورے طور پر اجاگر ہو جائے گی ۔

تاملاتِ نیاز

اس مجموعے میں نیاز فتحپوری کے ایسے ایسے نادر مضامین ہیں جو ان کے پرچے "نگار" میں چھپ کر دنیائے ادب میں تہلکہ برپا کر چکے ہیں۔ نیاز نے ہمیشہ کھلے کھلے رسم و رواج اور نظریات کی وہ وہ دھجیاں بکھیری ہیں کہ جھوٹے تقدس مآب اور رسم و رواج کے سہارے زندہ رہنے والے بوکھلا اٹھے۔

قیمت ۲/۸

ادارۂ فروغ اُردو۔ لاہور

صالحہ عابد حسین

بیگم انیس قدوائی

”زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب“ —— لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب اتنے حسین اور متضاد عناصر کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے قدرت کے ہاتھ چوم لیں۔

کیسا بھاری ثقیل قسم کا نام ”مصداق“، کام سنجیدہ قسم کی کہانیاں لکھنا۔ افسانوی نام صالحہ ”فاوسٹ“ کے مترجم کی اہلیہ محترمہ۔ مگر جب پیاری پیاری بولی بولتی ہوئی اتر پڑیں تو لکھنؤ کی محفلوں کا لطف آجاتے اور دل خوش ہو جائے۔

اجزائے حیات کا تجزیہ کرنے بیٹھوں تو عناصر اربعہ کے علاوہ صندل۔ سرمہ۔ لونڈر اور ہارسنگھار کے ساتھ نمک، اور گلقند آفتابی بھی ملا ہوا نظر آتا ہے —— وہی ہلکا نیلگونی سرمئی شیڈ والا کنھیا جیسا صندلی رنگ۔ ہارسنگھار کی خوشبو دار اور پیلاہٹ۔ نمک کی ملاحت اور گلقند و خمیرہ کی بخشی ہوئی طاقت —— میری خوش قسمتی تھی کہ صالحہ بننے کے بعد اُن سے متعارف ہوئی۔ اور میں نے طے کر لیا کہ ”مصداق کہنا“ ان کے بھائی جان (خواجہ غلام السیدین) کو مبارک ہے۔ میں تو صالحہ کہوں گی۔

۴۷ء میں پہلی بار جامعہ ملیہ کے عجائب گھر میں ایک بالاخانہ پر مجھے نظر آئیں۔ نام سے بخوبی واقف تھی۔ عابد صاحب سے بھی غائبانہ تعارف تھا۔ خود ان کی کئی کہانیاں اور ایک ناول بھی پڑھ چکی تھی اور نہ جانے کیوں سوچ رکھا تھا کہ کوئی بڑی عقلمند قسم کی بھاری بھرکم عورت ہوں گی —— لیکن پاس جا کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار دل سے دعا نکلی۔ اللہ ان اجزائے حیات کا گٹھ جوڑ برقرار رکھے اور عابد صاحب کا گھر آباد رہے —— دبلی پتلی کنواری نما بیاہی عورت۔ جو اپنی عمر سے پندرہ برس چھوٹی دکھائی دیتی تھیں۔ نزلہ زکام کی مریض اس پر کتابوں کی کیڑا۔ اتنی خیریت تھی کہ لکھتی کم تھیں۔ بولتی زیادہ تھیں اور چلتی کبھی کبھار تھیں ورنہ اللہ جانے کیا ہوتا۔

منہ چھپانے کی عادت میری بھی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ دیر آشنا نکلیں۔ بہت دنوں تک رسمی طریقہ سے ملنا ہوتا رہا۔ اور خیریت خیر صلا پوچھ کر ہم نے ایک دوسرے سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ لیکن آخر ایک دن پہچاننا ہی پڑا۔ پھر جو جی کھول کر ملاقات ہوئی ہے۔ تو اب تک ہوتی ہی چلی جا رہی ہے۔ لگتا تو ایسا ہی

ہے کہ یہ سلسلہ تاحیات جاری رہے گا — ویسے پہلی ملاقات میں تو وہ ایسا تہذیب کا مجسمہ بن کر بیٹھتی ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہیں کوئی لفظ خلاف محاورہ یا خلاف تہذیب منہ سے نہ نکل جائے جو ان پر گھڑوں پانی پڑ جائے لیکن پتہ نہیں کیوں میرے گنوارپن کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتی ہیں۔ شاید یہ بھی بربنائے تہذیب ہو۔ جتنی پیاری زبان لکھتی ہیں اتنی ہی بولتی بھی ہیں۔ مشرقی طرز معاشرت اور مغربی لٹریچر میں بڑا خوبصورت تال میل انہوں نے پیدا کر رکھا ہے گھر میں قدم رکھتے ہی انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کہاں بیٹھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ڈرائینگ روم میں صوفے پر۔ یا صحن میں پڑی ہوئی بان کی کھُرّی چارپائی پر یا ان کے کتابوں رسالوں سے بھرے ہوئے کمرہ میں مسند تکیہ سے لگ کر — نئے ادب کی عریاں پسندی اور بے اعتدالی پر اتنے لطیف انداز میں تبصرہ کرتی ہیں کہ کسی جملہ کو دہرائے بغیر ہی سُننے والا نفس مضمون کی پستی اور اُن کی پُرگوئی کا قائل ہو جاتا ہے — جی ہاں! نئے ادب کی عریاں پسندی اور بے اعتدالی پر اتنے لطیف انداز میں تبصرہ کرتی ہیں کہ کسی جملہ کو دہرائے بغیر ہی سُننے والا نفس مضمون کی پستی اور ان کی پُرگوئی کا قائل ہو جاتا ہے — بہت چپکے چپکے کچھ لکھتی رہتی ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پڑھ کر سُنا دیتی ہیں۔ اور ہولے ہولے زندگی میں مٹھاس گھولتی رہتی ہیں۔

کہتے ہیں "غالب کے انداز بیان اور اُردوئے معلّٰی کو ایک "ظالم" پانی پتی انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ کر لے گیا تھا۔" اور اس لوٹ میں صالحہ کے گھرانے کو بھی حصّہ ملا تھا۔ بلکہ ان کے نانا (مولانا حالی) خود اس لوٹ میں شریک تھے اور مالدار باپ کی بیٹی صالحہ کی والدہ محترمہ نے بھرپور ترکہ۔ شرافت۔ اخلاق حمیدہ اور علم و اخلاق کی صورت میں وصول کیا تھا۔ اُدھر ددھیال سے خواجہ غلام الثقلین کی چھوڑی ہوئی پونجی ورثہ میں ملی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ سسرال سے فلاسفی رونمائی میں حاصل ہو گئی۔ صالحہ نے اتنا قیمتی اثاثہ سمیٹ کر اپنے بھائی جان (سیدین صاحب) کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور جو کچھ وہ باہر سے لائے تھے اس سے بھی تحفہ وصول کیا۔

اُٹھان اچھی تھی۔ باپ کی سرپرستی تو دو ہی سال حاصل رہی لیکن ماں کی آغوش نے وہ سب ریت رسمیں سکھا دیں، جو بڑے بوڑھوں سے چلی آ رہی تھیں۔ مشرق کی آئیڈیل خاتون نے۔ مذہب۔ تاریخ اور ادب کے سارے سبق اپنی ہی گود میں پڑھا دئے۔ کسی اسکول کی شکل تو تھوڑے ہی دن دیکھنا نصیب ہوئی۔ ۲۴ سال کی عمر تھی جب جامعہ ملیہ کا عجیب و غریب ماحول میسر ہوا۔ ساتھ ہی بیماریوں کا دور شروع ہو گیا۔ اور سچ پوچھئے تو ان کی شخصیت کے بناؤ اور بگاڑ میں ڈاکٹروں اور دواؤں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ احسان ماننے سے انکار کر دیں۔ انہی دنوں اکلوتی بچی کی پیدائش اور اس کی موت نے اور بھی ذکی الحس کر دیا۔ بیماریوں نے ان کے جذبۂ محبت و ہمدردی کو بیدار کیا۔ ڈاکٹروں نے صبر و ضبط کا مادّہ پیدا کیا۔ اور دواؤں نے کڑوے کسیلے گھونٹ اتارنا سکھایا۔ اور جامعہ ملیہ نے وہ علمی ماحول عطا کیا جس کی انہیں ضرورت تھی۔ عابد صاحب کی رفاقت نے زندگی پر سائنٹیفک نظر ڈالی۔ اور شاید انہی دنوں ان کو خدا بہت یاد آیا اور جب سے یاد کرنے کی عادت پڑ گئی۔ اب علالت کے طویل و لامتناہی سلسلہ نے مذہب کے آستانہ پر سر ٹیک دیا ہے۔ اور جہاں حق ہو وہاں باطل کا گزر کہاں۔

اللہ میاں نے صالحہ کو حسن نظر عطا کر دیا ہے۔ اس لئے انہیں ہر چیز خوبصورت نظر آتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اپنی افسانوی دنیا میں حسن کا کوئی جنچا تُلا معیار اب تک انہوں نے قائم نہیں کیا ہے۔ یا شاید وہ "ہمہ اوست" کی قائل ہوں۔

اپنی ہر کہانی کو کلیجہ سے لگا کر رکھتی ہیں۔ اور دوسروں کی ادبی کاوشوں کو سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہیں۔ بشرطیکہ اس میں کوئی فنّی نقص نہ ہو۔

ان سے برسوں ملتے رہئے۔ ان کی خوش مذاقی۔ سادگی و پرکاری۔ تہذیب آپ کو مسحور کرتی رہے گی لیکن سالوں کی ملاقات کے بعد بھی یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑے گا ع

"نظر آتا ہے، کوسوں سے کسی کا آستاں مجھ کو"

صالحہ نہ "دروغ مصلحت آمیز" کی قائل ہیں۔ نہ "راستی فتنہ انگیز" کی۔ اس لئے بہت سوچ سمجھ کر تلی تلائی بات کہتی ہیں۔ اقبال کی طرح "بے خطر آتش نمرود" میں کود پڑنے سے بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی۔ اُن کی عقل "محو تماشائے لب بام" نہیں رہتی۔ بلکہ یہ اندازہ کرتی رہتی ہے کہ اس زینہ میں کتنی سیڑھیاں ہیں۔ اور کتنا وقفہ اس پر چڑھنے اترنے میں صرف ہوگا۔ اور اوپر پہنچ کر کیا کیا مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہاتھ میں دوربین بھی ہو۔

نزاعی مسائل ہیں ان کی عافیت پسندی کوئی ایسا کونہ سنبھال لیتی ہے جہاں بیٹھ کر وہ سب کو دیکھ سکیں سب کی سُن سکیں اور دونوں فریق سے بے نیاز ہو کر مطمئن رہ سکیں۔

اسی عافیت پسندی نے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنا گوشۂ عافیت ایسا الگ بنا رکھا ہے جس تک وہ نہ چاہیں تو کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی بعض اوقات جب اُنھیں کسی کی شادی کا جوڑا تیار کرتے، لحاف سیتے یا مجلسوں اور تقریبوں کا اہتمام کرتے دیکھو تو بالکل سیدھی سادی قصباتی بیوی نظر آتی ہیں کوئی میرا ماموں ہے تو کوئی چچیرا بھانجہ۔ کوئی بہن کی بچی ہے۔ تو کوئی میری تیری کسی کی بھی۔ لیکن چابکدستی کا یہ عالم ہے۔ کہ کسی کو میری بچی کہہ کر گلے لگایا۔ تو کسی کو میرا بیٹا کہہ کر پیٹھ تھپکی۔ کسی کے کھانے کو پوچھا تو کسی کی دوا کو اور پھر سب کو لاڈ پیار کر کرا کمرہ سے بھگا کر دروازہ بند کر لیا۔

باہر کا شور و شغب انہیں پسند نہیں ہے۔ لیکن گھر کے اندر کا غل غپاڑہ کچھ ایسا بُرا بھی نہیں لگتا۔ اسی لئے اپنے کمرہ میں انہوں نے مضبوط چٹخنی لگا رکھی ہے اور الماریوں میں کتابیں بھر رکھی ہیں تاکہ خلوت انجمن بنی رہے۔ اور "فراغت" و "کتاب" دونوں لطف حاصل ہو سکیں۔ البتہ مارے رشک کے میرے دل سے آہ نکل جاتی ہے۔ کاش اس عافیت کوشی کا سلیقہ مجھے بھی ہوتا۔

ویسے ان کا اصول تو پرانی بیویوں کی طرح ہی ہے کہ "آپ بھلا اپنا گھر بھلا" لیکن عابد صاحب کا شوق صحرا نوردی پچھلے دنوں ان کو بھی جرمنی گھسیٹ لے گیا۔ اللہ کا شکر ہے جیسی گئی تھیں۔ ویسی ہی لوٹ آئیں۔ اپنی چادر میں وہ اتنی نفاست سے پاؤں پسارتی ہیں کہ کیا مجال جو ایک انگلی بھی کھلی رہ جائے۔ اور چادر پھٹنے بھی نہیں پاتی یہ کمال ہے۔

اُردو زبان سے عشق ہے۔ ادب سے شدید محبت ہے۔ لیکن فطرت بڑی ٹھیٹھ نسوانی پائی ہے۔ اور ان کی کہانیوں میں ہر جگہ ہندوستانی عورت کا دل دھڑکتا اور آنسو تیرتے نظر آتے ہیں۔

کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک باپ اپنے بیٹے کو لایا کہ اسے شکر کھانے کی لت پڑ گئی ہے۔ آپ نصیحت کیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کل آنا۔ اس دن آپ نے خود شکر استعمال نہ کرنے کا عہد کیا۔ کیونکہ اس بشری کمزوری میں آپ خود مبتلا تھے اور دوسرے دن جب وقت مقررہ پر وہ لڑکا آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے تنبیہہ و تاکید کی۔ فوائد و نقصان بتائے۔

سو بھئی صالحہ کی کہانیوں پر میں تنقید و تبصرہ کیسے کروں۔ ان پر تبصرہ کرنے والے کو خود بھی معصوم صفت ہونا چاہئے۔ کیونکہ ان کی کہانیوں کے کردار اتنے شریف، سادہ اور مہذب ہوتے ہیں کہ ان پر اوچھی نظریں ڈالنا ناممکن ہے۔ اس لئے میں اگلے سال شاید اس قابل ہو سکوں گی۔

کبھی کبھی وہ بھاری چیزوں کو ہلکی نازک چیزوں میں ملانے کی کوشش کرتی ہیں کبھی ایسا تلخ و شیریں محلول بھی تیار کرتی ہیں جسے ہر شخص بہ آسانی پی سکے لیکن مجھے ان سے صرف ایک شکایت ہے کہ ان کا تیار کیا ہوا شربت حلق سے نیچے اُترتے ہی تراوت پیدا کرتا ہے مگر نیند آنے لگتی ہے۔ جسم میں چستی و پھرتی نہیں پیدا ہوتی جھنجھوڑ کر جگاتا نہیں ہے۔ پپوٹے بھاری ہونے لگتے ہیں۔

صالحہ بحیثیت انسان کے قابل احترام شخصیت ہیں اور بحیثیت عورت کے ہمدردی و خلوص کا مجسمہ لیکن عقلمند ضرورت سے زیادہ ہیں کاش ان کی "پاسبان عقل" کسی وقت انہیں تنہا بھی چھوڑ دیا کرتی۔ شاید خرابی صحت نے انہیں پرلے درجے کا محتاط بنا دیا ہے۔

اب تک دو ناول "عذرا" اور "آتش خاموش" اور تین افسانوی مجموعے "نقش اوّل" "ساز ہستی" "نراس میں آس" چھپ چکے ہیں۔ یادگار حالی اور کچھ ڈرامے بھی شائع ہو چکے ہیں ماشاء اللہ عمر اور بیماریوں نے فرصت دی تو ابھی بہت کچھ لکھیں گی اور ادب کو مالا مال کریں گی۔ یہ سب گھروں کے اندر جگمگاتے ہوئے دیئے ہیں وہ دیئے جن کی ضرورت سے زمانہ کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا اور بجلی کے ہنڈے جن کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ دیا ہندوستان کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ہر نئے راہرو کو راستہ دکھائے گا۔ اور اسے روشن شاہراہ پر چھوڑ کر پھر نئے مسافر کی رہبری کرنے جھونپڑی کی چوکھٹ پر واپس چلا جائے گا —— آج کل پھر بستر علالت پر دراز ہیں اور دوستوں کے سچے دل سے نکلی ہوئی دعائیں بسر اوقات کر رہی ہیں۔ امید ہے ہماری دعاؤں میں نقوش کے قارئین بھی شریک ہو جائیں گے ۵

قتیل شفائی

ابراہیم جلیس

پچھلی دو صدیوں کے دوران ارضِ ہمالہ پر دو مشہور "اورنگ زیب" پیدا ہوئے۔ ایک اورنگ زیب نے شہنشاہ عالمگیر بن کر اپنی تلوار کے ذریعے جھیل ڈل سے لے کر راس کماری تک سارا ارضِ ہمالہ فتح کیا تھا تو دوسرے اورنگ زیب نے شاعر قتیلؔ شفائی کا روپ دھار کر اپنے قلم کے ذریعے ارضِ ہمالہ پر آباد دنیائے شعر و ادب کو مسخر کر لیا۔

میں نے یہاں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ اورنگ زیب قتیل شفائی کا اس لئے نام لیا ہے کہ میری اپنی نظر میں قتیل شفائی بھی بڑا "بادشاہ آدمی" ہے۔ اس کے سوا اورنگ زیب عالمگیر اور اورنگ زیب قتیل شفائی میں قطعی طور پر کوئی مماثلت، کوئی موزونیت بلکہ کوئی مشابہت نہیں ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ تھا، اورنگ زیب قتیل شفائی رعایا۔۔۔ وہ اورنگ زیب شمشیر بکف، یہ اورنگ زیب قلم در انگشت ۔۔۔ وہ اورنگ زیب قرآن مجید کا کاتب، یہ اورنگ زیب کلامِ قتیل شفائی کا مصنف ۔۔۔ وہ حافظ قرآن، یہ صاحبِ دیوان ۔۔۔ اُس کی لمبی داڑھی، اِس کا منہ صفاچٹ ۔۔۔ وہ خلعت ہفت پارچہ میں ملبوس اور یہ سوٹڈ بوٹڈ ۔۔۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں پہلے اورنگ زیب کو یہیں رخصت کر کے دوسرے اورنگ زیب کے ساتھ آپ کی طرف آؤں۔

آپ دوسرے اورنگ زیب کو نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتا، یا اگر جانتا بھی ہوں تو بڑا واجبی واجبی سا ۔۔۔ البتہ قتیل شفائی کو آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں اور پاکستان اور ہندوستان کا ہر وہ شخص جانتا ہے جو تھوڑی بہت اردو زبان جانتا ہو یا پاکستانی فلمیں دیکھتا ہو۔

قتیل شفائی دراصل اورنگ زیب ثانی کی ایک ارتقائی شخصیت ہے۔

قتیل شفائی اپنے ہمزاد اورنگ زیب سے کب آخری بار رخصت ہوا یہ میں نہیں جانتا لیکن قتیلؔ نے اپنے ہمزاد اورنگ زیب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ قتیل شفائی کا بچپن اور لڑکپن تھا۔ اس کے بعد جب شباب آیا تو وہ اورنگ زیب نہیں بلکہ قتیل شفائی کا نام لے کر آیا ۔۔۔ اب ہمالہ کے دامن میں آباد پٹھانوں کی ایک بستی ہری پور ہزارہ کے چند لوگ اُس اورنگ زیب کو جانتے ہوں تو جانتے ہوں یا ہری پور ہزارہ کے اسکول کے رجسٹروں میں یا پھر قتیل کے قریبی رشتہ داروں کی زبان پر اورنگ زیب کا نام شاید ابھی موجود ہو ۔۔۔ ویسے اورنگ زیب اب کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے آپ کو قتیل شفائی میں ڈھالنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کام مکمل کر لیا اور اب ہمیشہ کے لئے قتیل شفائی کی جون میں چھپ کے رہ گیا ہے۔

قتیل شفائی چونکہ میرا دوست، ہم سفر، ہم جنس، ہم عصر، ہم مشرب، ہم پیشہ اور ہم جلیس ہے اس لئے اس نے مجھے کبھی کبھار اورنگ زیب کی باتیں بھی بڑے مزے لے لے کر سنائی ہیں اور میں نے باتوں باتوں میں یہ پتہ چلا لیا ہے۔ کہ اورنگ زیب کس طرح قتیل شفائی بنا ہے۔ اس تبدیلی کا عمل تقریباً تقریباً وہی ہے جو پانی کے قطرے کو گہر بنا دیتا ہے۔ اب یوں سمجھئے کہ اگر اورنگ زیب ایک شخص تھا تو قتیل شفائی ایک شخصیت ہے۔

قتیل نے مجھے بتایا کہ اورنگ زیب اب سے تقریباً تیس سال پہلے ہری پور ہزارہ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کی پہلی اولاد جس لاڈ پیار اور جس ناز و نعم سے پالی جاتی ہے اورنگ زیب کو بھی ماں باپ کا وہی لاڈ پیار ملا —— اچھے ماں باپ، اچھا گھر، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھی تربیت اور اچھا ماحول —— ان ساری اچھائیوں نے ننھے اورنگ زیب پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ چناں چہ گھر ہو یا اسکول ہر جگہ لوگ بڑے پیار سے یہی کہتے تھے کہ اورنگ زیب بڑا اچھا لڑکا ہے —— لوگ آج کل قتیل شفائی سے ملنے کے بعد پہلا تاثر یہی قائم کرتے ہیں کہ قتیل نہ صرف شاعر اچھا ہے بلکہ آدمی بھی اچھا ہے۔ یہ اچھائی دراصل اسے ماں باپ کے خون کے ذریعے ورثہ میں ملی ہے اور اس کو اورنگ زیب نے بیس برس تک اپنے پاس امانت کے طور پر رکھا اور پھر جب قتیل شفائی صرف شعر گوئی کی صلاحیت لے کر اورنگ زیب سے ملا تو اورنگ زیب کو قتیل شفائی کی بے مائیگی پر ترس آیا اور اس نے اپنی ساری اچھائیاں قتیل شفائی کے حوالے کر دیں یہی وجہ ہے کہ عام شاعروں کی طرح ہم قتیل کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ع۔ شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

قتیل کے آبائی نام اور اس کے وطن کو دیکھ کر بچپن میں قتیل کے والد کے دوست یہی اندازہ لگاتے ہوں گے کہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح ملازموں سے پاؤں دبواتے حقّہ پیتے اور اپنی طرح کے "اورنگ زیب" پیدا کرتے زندگی کے دن گزارے گا، اور ہری پور ہزارے کے باہر کسی کو بھی پتہ نہ چلے گا کہ کوئی اورنگ زیب بھی اس دنیا میں آیا تھا قتیل شفائی میں شعر گوئی کا ذوق کب پیدا ہوا، اس نے پہلا شعر کب کہا، وہ شعر کیا تھا، کیسا تھا یہ اب شاید قتیل کو بھی یاد نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ مجھے جب ملا تو وہ اس وقت ایک بھرپور شاعر تھا اور ایک مشہور شاعر تھا۔

قتیل سے ملنے سے پہلے میں نے قتیل کی آواز سنی، اس کی آواز اتنی میٹھی اور اتنی رسیلی تھی کہ میں بے قرار ہو گیا کہ میں نے رسالہ "سویرا" لاہور کے موجود الوقت مدیر ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ کل رات میں نے راولپنڈی کے ایک سینما گھر سے ریلے ہونے والے مشاعرہ میں گاندھی جی کے قتل کے عنوان سے قتیل شفائی کی مترنّم نظم سنی ہے۔ اس کی آواز اور اس کا کلام سن کر میں اس کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کیسا شاعر ہے یہ! قتل بھی کرتا ہے، اور ساتھ ہی شفا بھی عطا کرتا ہے۔ ساحر لدھیانوی کا جواب آیا کہ تم نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ وہ جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی اچھا انسان بھی ہے —— ساحر کی اس رائے نے قتیل سے ملنے کی خواہش کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ ان دنوں قتیل شفائی لاہور میں تھا اور میں اس سے کوئی پندرہ سو میل دور حیدرآباد دکن میں —— اس لئے یہ آگ کئی برس تک جلتی رہی۔

عرصہ گزر گیا۔ پھر میں مہاجر بن کر لاہور پہنچا —— لاہور پہنچنے کے دوسرے دن یا تیسرے دن میں حضرت احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ لاہور کے یارانِ ترقی پسند کی ایک بیٹھک "پیراڈائیز ریسٹوران" سے باہر نکل رہا تھا کہ قاسمی صاحب نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں پوچھا۔

قتیل شفائی سے بھی ملے ہو؟

میں نے تڑپ کر کہا ——

نہیں کہاں ہے وہ! میں تو کب سے اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لئے بیقرار ہوں۔

قاسمی صاحب نے کہا ——

تو آؤ پھر —— !

ایک ہی لمحے بعد اپنے آگے ایک سرشار جواں میں نے کھڑا پایا تھا اور وہ تھا قتیل شفائی —— گیبرڈین کے ویل پریسڈ سوٹ اور ٹوٹل کی بیش قیمت نکٹائی میں ملبوس گندمی رنگ، بھرے بھرے چہرے، چمکدار پیشانی، چمکدار آنکھوں، چمکدار گالوں والا متوسط قد کاٹھ والا بھرپور طور پر صحت مند قتیل شفائی اس

قتیل شفائی سے بالکل مختلف تھا جس کا ہیولیٰ میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا۔ قتیل سے ملنے سے پہلے اور اس کے پُرانے طرز کے ثقیل قسم کے تخلص کو ذہن میں رکھنے سے میرے تصور میں قتیل کا وہی ہیولیٰ بنا تھا جیسا کہ بالعموم پُرانے روایتی شاعروں کا ہوتا ہے یعنی دھان پان جسم، اس پر جھولتی ہوئی میلی سیاہ اچکن، پچکے ہوئے گالوں میں دبا ہُوا پان کا بیڑا، آنکھوں پر دُہرے تالے والی عینک، سر پر خشک لمبے لمبے بال، ٹانگوں میں علیگڑھ فیشن کا پاجامہ اور پیروں میں آپا شاہی جوتی، دن بھر آنکھوں سے چیڑ پونچھنے والا اور سرِ شام ہی سے ٹھرّا نوشی کا آغاز کر کے نصف شب کے قریب مدہوش ہو کر کسی گندی نالی میں پڑے رہنے والا شاعر ——— لیکن قتیل اپنے دقیانوسی تخلص کے بالکل برعکس بڑا کھلتے ڈھلتے والا اور نہایت جامہ زیب شخص ہے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ وہ جتنا نظم گو شاعر ہے اس کی زندگی میں بھی ویسا ہی نظم و ضبط ہے۔ جس طرح قتیل دیکھنے میں شاعر کے بجائے ایم اے کا طالب علم، فلموں کا ہیرو یا سول سروس کا کوئی اعلیٰ افسر معلوم ہوتا ہے، اسی طرح اس کا گھر بھی شاعر کا کلبۂ تاریک نہیں ہے لاہور کے ایک نواحی محلّے مصری شاہ میں چٹی مسیت (سفید مسجد) سے قریب رحیم پارک کے علاقے میں جدید ترین فرنیچر اور رنگ برنگے حریری پردوں سے سرسراتا ایک پختہ مکان ہے جس میں قتیل شفائی اپنی ایک عدد بیوی اور چار خورد بچوں کے ساتھ ایک کھاتی پیتی زندگی کے ساتھ فلرٹ، تارناحق کر رہا ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ یہ کھاتی پیتی زندگی قتیل کو اس کے خوشحال باپ سے ورثے میں ملی ہے بلکہ وہ اپنے باپ سے ملی ہوئی جائداد اور ذاتی مکان کو اپنے اقربا کے حوالے کر کے عرصہ ہُوا ہری پور ہزارے کو خیرباد کہہ آیا تھا۔ اور اپنی زندگی کے فردوس کی آپ اپنے ہاتھوں تعمیر کے لئے تقریباً خالی ہاتھوں اور خالی جیبوں کے ساتھ لاہور آیا تھا۔ اس سماج میں ایک شاعر کی زندگی کیا ہوتی ہے! ملک کے خزانے میں شاعر کا کیا حصّہ ہوتا ہے! شعر کہتا جوگے رہنا، یا شعر کہنا اور مانگے تانگے کی زندگی بسر کرنا، شاعر کو ہمارے سماج میں واہ واہ تو بہت ملتی ہے لیکن یہ واہ واہ نہ تو کبھی چاندی کے سکّوں میں ڈھل سکتی ہے اور نہ کرنسی نوٹوں میں بدل سکتی ہے! مگر قتیل نے (جو بڑا سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہے) یہ عزم کیا کہ وہ اپنی شاعری کو اس طرح پیش کرے گا کہ واہ واہ صرف آواز ہی نہ رہ سکے بلکہ کرنسی نوٹوں میں بدل سکے اور چاندی کے سکّے میں ڈھل جائے۔ قتیل پٹھان ہونے کی وجہ سے دُھن کا بڑا پکا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی جدوجہد اور اپنے وجود سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو زبان کا شاعر محض اپنی قوتِ شعرگوئی سے بھی ایک بڑی باعزت اور خوشحال زندگی کی تخلیق کر سکتا ہے۔

سردیوں میں ٹوئیڈ، گیبرڈین، پک اینڈ پک وغیرہ کے بیش قیمت سوٹ اور شیروانیاں پہننے والا اور گرمیوں میں ہر روز ململ کا سفید براق کُرتہ اور اُجلا پاجامہ اور ہلکی سی چپل پہننے والا صاف ستھرا قتیل شفائی بقول خود اس خوش لباسی کو اس لئے اہمیت دیتا ہے کہ خول صاف ستھرا ہو تو روح بھی صاف ستھری رہتی ہے چنانچہ قتیل کی شاعری میں جو پاکیزگی نفاست اور اُجلاپن نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ دراصل اس کی اپنی نفاستِ طبع کی پیداوار ہے۔ جس زمانے میں قتیل اپنے شعر و فن کے لئے پہلی بار دنیا کے سامنے آیا اس زمانے میں شاعر کی روایات کچھ عجیب سی تھیں، یعنی شاعر وہ ہے جو بے حد شراب پئے۔ جو بادہ خوار نہیں وہ شاعر نہیں، زندگی کے راستے پر شاعر ہمیشہ لڑکھڑاتا چلے، سیدھا نہ چلے، تاکہ لوگ آسانی سے پہچان لیں کہ دیکھو ——— دیکھو وہ شاعر جا رہا ہے۔ اُن دنوں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی (سابق) اسرار الحق مجاز اور عبدالحمید عدم کی بادہ خواری الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح مشہور تھی۔ نوعمر شاعروں پر اس کا بڑا ہی بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ ہر نوعمر شاعر ان بڑے شاعروں کی تقلید میں ان کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے چلنے میں بڑا فخر محسوس کرنے لگا تھا مگر روایات کا باغی، ابتذال کو نہ ماننے والا اور اپنے آپ پر پورا اعتماد رکھنے والا قتیل شفائی اس راستے پر چلنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا وہ اس دنیا کو ساغر و مینا کی آڑ سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا وہ اس دنیا کو اور انسان کی زندگی کو براہِ راست اور بہ قائمی ہوش و حواس دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ شعروں کے پھول اور بیل بُوٹے اُگانے کے لئے "شرابیاری" کا قائل نہیں تھا۔ اس نے کبھی ابتدا ہی میں غیر شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شعر قتیل کہے گا۔ شراب نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ قتیل شراب نہیں پیتا ——— وہ شراب پینے کو بُرا بھی نہیں سمجھتا لیکن وہ اسی طرح شراب پیتا ہے جیسے کوئی سدا گیروے رنگ کے کپڑے پہننے والا سادھو تنہائی میں دنیا کی نظروں سے چھپ کر رنگ برنگے بھڑکیلے کپڑے پہنے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ مسکرائے اور پھر چپکے سے انہیں اتار کر چھپا کر رکھ دے ——— کبھی کبھی جب آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوں اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو یا عید شب برات کی شام ہو یا نہایت بے تکلّف دوستوں کا مجمع ہو تو قتیل چپکے سے تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو جاتا ہے اور جب دوبارہ نمودار ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ میں اسکاٹ لینڈ کی کوئی بڑھیا قسم کی وہسکی کی ایک دلآویز بوتل ہوتی ہے۔ پھر

جام رقصاں ہوتے ہیں، پھر مے چھلکتی ہے، پھر قتیل پیتا ہے —— لیکن اتنی ہی پیتا ہے کہ وہ سرور کی حد سے آگے نہ جائے اور نشے کی حد سے دور ہی رہے، قتیل کے بلانوش دوست اسے کم ظرف کہتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کم ظرف نہیں "خوش ظرف" ہے۔ وہ روز نہیں پیتا، زیادہ نہیں پیتا اور پینے کو بُرا نہیں سمجھتا اس لئے میری یہ پیشین گوئی ہے کہ وہ اختر شیرانی، منٹو اور مجاز کی طرح "غرقِ مئے ناب" نہیں ہوگا بلکہ اس کی موت ایک صحت مند زندگی کے طبعی اختتام کی طرح آئے گی۔

ان دنوں میرے شب و روز کا بیشتر حصہ قتیل کے ساتھ گزرتا ہے اور میں قتیل کا بڑا گہرا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، لکھتے پڑھتے، سوتے جاگتے قتیل شفائی کو میں غور سے دیکھتا رہتا ہوں —— اور حاصل مطالعہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو عام آدمی کی طرح نہیں بسر کرتا بلکہ وہ زندگی کو ایک بہت بڑی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زندگی کے لمحے لمحے کا رس نچوڑ لے۔ ایک لمحہ بھی بیکار نہ جانے پائے۔ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا یہ قتیل کا وطیرہ نہیں بلکہ وہ روز و شب سے اُن کی ساری لذتیں کشید کرنے کو "زندگی گزارنے" کا نام دیتا ہے۔ اسی لئے وہ بڑا سحر خیز ہے۔ گرمی ہو یا سردی ہر صبح تازہ ٹھنڈے پانی کے غسل کے بعد دو مکھن لگے توس، دو فرائی انڈے، تھوڑا سا شہد اور پاؤ بھر دودھ پر مشتمل ناشتے کے بعد وہ ضروری خطوط لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے ادھر نو بجتے ہیں ادھر قتیل گھر سے نکلتا ہے۔ اور سہ پہر تک فلم کمپنیوں، اخباروں اور ناشران کتب کے دفتروں میں اپنے افکار کی سودا بازی میں مصروف رہتا ہے۔ شام ہوتی ہے تو وہ اپنے چند منتخب دوستوں کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ رومانی اور تاریخی سڑک مال روڈ پر ٹہلتا ہوا لارنس باغ کا ایک چکر لگا کر ساڑھے آٹھ نو بجے تک ایک شریف گھریلو آدمی کی طرح گھر پہنچ جاتا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھانے میں لطف محسوس کرتا ہے، طبیعت شعر گوئی پہ آمادہ ہو تو اس وقت تک جاگتا رہتا ہے جب تک رات کی زلفیں بکھر کر کمر تک یا اس سے بھی نیچے نہ لہرا جائیں۔ اگر طبیعت موزوں نہیں ہے تو پھر دس گیارہ بجے کے درمیان کسی لمحے نیند کی پری آتی ہے اور قتیل کو ساتھ لے کر خوابوں کے جزیرے میں چلی جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرا تجزیہ غلط ہو لیکن جب بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ قتیل کی شاعری میں اتنی مٹھاس کیوں ہے تو معاً میرا ذہن برفی، گلاب جامن اور موتی چور کے لڈوؤں یا زردے کی طرف چلا جاتا ہے۔ قتیل اپنی میٹھی طبیعت کے لحاظ سے میٹھے کا بڑا دلدادہ ہے۔ ہر کھانے کے بعد ایک سویٹ ڈش اس کے لئے ایک لازمہ ہے۔ کبھی کبھی دفتروں میں جب ہم دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں تو قتیل کھانے کے بعد بالالتزام اٹھنی کی برفی ضرور منگاتا ہے۔ شیرینی کے اس شوق نے بلاشبہ قتیل کو بڑا شیریں دہن، شیریں زبان اور شیریں بیاں شاعر بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔ (میں پھر کہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے میرا تجزیہ غلط ہو)

جس طرح قتیل کی شاعری میں جدید اور قدیم شاعری کا ایک حسین امتزاج ہے اسی طرح اس کی شخصیت میں بھی جدید اور قدیم تہذیب کی مناسب مناسب آمیزش ہے۔ وہ مغربی تہذیب کو بھی پسند کرتا ہے اور مشرقی تہذیب کے اچھے اصولوں سے بھی کنارہ کش نہیں —— دوستوں میں وہ احمد ندیم قاسمی کا بڑا احترام کرتا ہے۔ حالانکہ قتیل، قاسمی صاحب سے بے حد بے تکلف ہے لیکن اس پر مشرقی اخلاق کا اس قدر گہرا اثر ہے کہ وہ قاسمی صاحب کی موجودگی میں اپنے آپ کو چند خاص حدوں میں محصور کر دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بزرگوں کے اس روائتی احترام نے قتیل میں کبھی کوئی احساس کمتری نہیں پیدا ہونے دیا۔ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی محفل ہو یا پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت مشاعرہ، اخبار کا دفتر ہو یا فلم کمپنی کا دفتر —— قتیل جہاں بھی جاتا ہے جہاں بھی بیٹھتا ہے اور جہاں بھی بات کرتا ہے۔ اس میں بڑا "دبنگ پن" ہوتا ہے۔ جیسے اس کا وجود کہہ رہا ہو کہ کوئی بات نہیں، آپ کوئی بھی ہوں۔ آخر میں بھی تو قتیل شفائی ہوں۔

قتیل اپنی قیمت آپ پہچانتا ہے۔ اس نے کسی موقع پر بھی اپنے آپ کو ارزاں نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں وہ فلموں کے لئے گیت لکھتا ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ فلمی شاعر کو ایک گیت کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ سو روپے دے سکے لیکن قتیل وہ شاعر ہے جو فلمی صنعت کی اس زبوں حالی کے باوجود ایک گیت کا کم سے کم معاوضہ ساڑھے تین سو روپے لیتا ہے۔ ویسے اس نے ایک ایک گیت چار چار سو اور پانچ پانچ سو روپیہ میں بھی لکھا ہے۔ پاکستان کے فلم ساز قتیل سے اس کے مہنگے گیت اس لئے خریدنے پر مجبور ہیں کہ جن فلموں میں اس کے گیت ہوتے ہیں وہ کم از کم سلور جوبلی فلم ضرور ہوتی ہے۔ ویسے ثبوت پیش

کرنے کا تکلف بیکار ہے اس لئے کہ قتیل کا صرف ایک ہی گیت ؎

الفت کی نئی منزل کو چلا تو بانہیں ڈال کے بانہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

آج وہ خیبر سے سندر بن تک اور جھیل وُلر سے راس کماری تک گونج رہا ہے۔

قتیل علم کی دنیا سے فلم کی دنیا میں اس لئے داخل ہوا کہ علم کی دنیا میں قتیل کا ایک مجموعۂ کلام جو اوسطاً سو دو غزلوں، نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہوتا ہے (بظاہر ایک ہزار تعداد والی ایک اشاعت جو شاعر کے مرنے تک ایک ہزار سے زیادہ فروخت نہیں ہوتا البتہ بیس ہزار گھروں کی کتابوں کی الماریوں میں ضرور پائی جاتی ہے) چار پانچ سو روپیہ میں فروخت ہوتا ہے اور اس کے برعکس فلم کی دنیا میں اس کا صرف ایک گیت چار پانچ سو روپیہ حاصل کر لیتا ہے۔ قتیل شاعر کے علاوہ ایک کنبے کا صدرِ خاندان، اپنی بیوی کا شوہر، اپنے بچوں پرویز، مسرت، تنویر اور ثمینہ کا باپ اور اپنی بوڑھی والدہ کا کفیل ہے اور وہ صرف علمی دنیا کا شاعر بن کر زندگی کی اس گاڑی کو نہیں کھینچ سکتا جس میں اتنے سارے افراد سوار ہیں۔ اس لئے وہ علم کی دنیا سے فلم کی دنیا اور فلم کی دنیا سے علم کی دنیا میں صبح سے شام تک محنت میں مصروف رہتا ہے کہ وہ جتنا خود دار ہے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی زندگی بھی اتنی ہی خود دار رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کو اس کے اہل و عیال کے لئے کوئی "قتیل فنڈ" نہ جاری کرنا پڑے یا اس کی بیوی بچے حکومت کے وظیفے کے محتاج ہوں۔

قتیل جن دنوں چنگی کے محکمے میں کلرک تھا، لاہور کے فلمی رسالوں اداکار اور "اُجالا" کا ایڈیٹر تھا اور مشہور ترقی پسند ماہانہ جدید "ادبِ لطیف" کا مدیر مسئول تھا ان دنوں اس کی زندگی مالی اعتبار سے اچھی یا خوش گوار نہیں تھی لیکن بچے تُلے منصوبوں کے تحت زندگی بسر کرنے والے قتیل کو یقین تھا کہ وہ ایک دن خود اپنے ہاتھوں اسی زمین پر اپنی زندگی کا ایک چھوٹا سا خوب صورت فردوس تعمیر کرے گا —— چنانچہ وہ اس فردوس کی تعمیر بڑی حد تک مکمل کر چکا ہے۔

قتیل میں بعض خامیاں بھی ہیں لیکن چونکہ ان خامیوں نے قتیل کو شخص سے شخصیت بننے میں کوئی مدد نہیں دی ہے اس لئے ان کا تذکرہ ہی بیکار ہے اور اب جب کہ وہ شخص سے شخصیت بن چکا ہے تو ہمیں اور آپ کو اس کی خامیاں بھی اچھائیاں نظر آنے لگی ہیں۔

بعض دوست، جو قتیل کی زندگی میں صرف خامیاں تلاش کرنا چاہتے ہیں وہ صرف "ایک عورت" تک پہنچ سکے ہیں وہ عورت (جو ابھی بقیدِ حیات ہے) جوانی کے راستے پر قتیل کی پہلی لغزش ہے اور شاید آخری بھی۔ اب بھی کبھی کبھی قتیل کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھئے تو اس کے تصور کی چلمن کے پیچھے ایک سایہ سا ضرور نظر آتا ہے وہ آنچل ہے کہ رخسار کم پیراہن ہے۔ کچھ تو ہے جو قتیل کی لغزش کی غمازانہ طور پر چغلی کھاتا ہے۔ قتیل نے کچھ دن ایسے گزارے جب کہ اس کے شانوں پر اس کی بیوی کے علاوہ ایک اور عورت کی زلفیں پریشان ہو گئی تھیں، قتیل اس کی محبت کے بازار میں آوارہ و رسوا گھوم رہا تھا قتیل سراپا "ایک دل" بنا ہوا تھا۔ لیکن اچانک ایک دن اس کی محبت کا چاند غروب ہو گیا! ایک چھناکے کے ساتھ قتیل کا دل ٹوٹ گیا! قتیل پر ایک عرصہ تک نیم دیوانگی کا عالم طاری رہا اور اس کی دیوانگی جیسے زمانے بھر کو سمجھا گئی کہ قتیل کی شاعری میں درد اور مٹھاس دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ کیوں ہو گئے ہیں ——!

اب قتیل کبھی کبھی اس عورت کے بارے میں یہ ضرور سوچتا ہے کہ اب وہ شمعِ فروزاں کہاں ہے! لیکن قتیل اس کی جدائی کو ایک بہت بڑا سبق ایک بہت بڑا تجربہ سمجھتا ہے اور وہ اس سبق اور اس تجربے کو بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے شعروں میں گوندھتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں گیتوں اور غزلوں کے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ہمارے آپ کے سامنے سے ایک نہایت خوبصورت عورت چھپاک سے گزر گئی ہے صرف اس کے جسم کی خوشبو ہے جو باقی رہ گئی ہے اور مشامِ جان سے ٹکرا رہی ہے۔

جوانی کی اس پہلی لغزش کے بعد قتیل ایک دم سنبھل گیا ہے —— آج کل وہ صرف ایک قلم ہے۔ وہ قلم جو جمہور کی امانت ہے۔ جس میں وہ خون جوان ہے جس سے عظمتِ انسان کی آنچ آتی ہے۔ وہ مؤرخ جس کے سینے میں غمِ حیات کی تاریخ کے ورق سرسرا رہے ہیں۔ وہ قلم جس سے مشیت بھی شکست کھاتی ہے اسی لئے قتیل بڑے فخر سے دعویٰ کرتا ہے کہ ؎

میں خود اسیر سہی میرا فن اسیر نہیں
میرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں

لاہور کی چند شخصیتیں

محمد طفیل

(یہ مضمون میں نے شخصیات نمبر جلد دوم کے لئے لکھا تھا مگر ڈر کے مارے چھپوایا نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری کسی تحریر سے کوئی بھی ناخوش ہو۔ اپنی طرف سے میں نے ان دوستوں پر بڑے پیار سے قلم اٹھایا ہے۔ ہاں، پیار کی قسمیں مختلف ضرور ہیں۔ کوئی پچکار پچکار کے پیار کرتا ہے اور کوئی گال نوچ کے —— بدقسمتی سے میں نے پچکارنے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں گال بھی نوچ لئے ہیں —— میرے نزدیک اپنے دوستوں سے بھرپور محبت کا اظہار اسی طرح ممکن تھا۔

اگر کسی دوست نے میری اس صراحت کے باوجود، میرے خلوص پر شک کیا تو مجھے دلی صدمہ ہوگا۔)

ڈاکٹر محمد باقر

کسی لڑکے کی سفارش مقصود تھی یا ایسی قسم کا کوئی اور عجیب مگر بیہودہ سا کام لے کر ہم ڈاکٹر باقر کے ہاں ماڈل ٹاؤن پہنچے۔ میرے ہمراہ میرے دیرینہ دوست ملک محمد اسلم تھے۔ ان کی ڈاکٹر صاحب سے پہلے کی خوب سلام دعا تھی۔ اپنی اس سے پہلے ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔

پکارنے پر ڈاکٹر صاحب برآمد ہوئے۔ دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ جیسے انہیں پہلوانی چھوڑے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ جسم پر ململ کا کرتہ اوڑھے، تہبند باندھے، سلیپر پہنے، ہنستے ہوئے السلام علیکم ملک صاحب کہہ کر ہاتھ بڑھایا۔ محبت سے ملے۔ چھوٹتے ہی احساس ہوا کہ یہ صاحب پروفیسر تو ہیں مگر سڑی نہیں ہیں۔

جب تک ہم بیٹھے، بڑے پیار سے ہمیں اپنا برخوردار سمجھ کر باتیں کرتے اور باتیں بناتے رہے جو رائے بھی دی، جو بات بھی کی قطعی معقول، سوائے اس بات کے کہ میرے فلاں گورنر سے تعلقات ہیں۔ فلاں وزیر میرا پانی بھرتا ہے۔

اخباروں کے تراشے رکھنے، ہر قسم کی ادبی دستاویزوں کو محفوظ کر لینے کا انہیں بڑا ہوکا ہے۔ آپ ان سے آج بھی بیس پچیس برس پہلے کے تمام ملکی اور ادبی موضوعات پر ہر قسم کا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا جانے، لوگ کہتے ہیں کہ جس سے ان کی ٹھن جاتی ہے، اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور بڑے تگڑم باز ہیں۔ اپنا رشتہ ان سے نیاز مندوں والا ہے اس لئے میں اپنی حدود میں رہنا پسند کروں گا۔ ورنہ باقر صاحب سے ملاقات ہوگی تو منہ چھپانا پڑے گا۔

مجھ سے اب جب بھی ملتے ہیں بڑی محبت سے ملتے ہیں اور پہلا فقرہ بغیر سلام دعا کے، ان کا یہ ہوتا ہے "سنا بھئی طفیل کیہہ حال اے تیرا" اس کے بعد ادبی باتوں سے لے کر سیاسی باتوں تک اور سیاسی باتوں سے لے کر نہاں خانوں کی باتوں تک پوری بے تکلفی کے ساتھ کھڑے کھڑے ہی تبصرہ کر ڈالیں گے۔

پچھلے دنوں یہ ایران گئے تھے۔ میں نے پوچھا کیسی گذری؟ —— خوب گذری یار —— ڈاکٹر مصدق سے ملا، شاہِ ایران سے ملا، ان کے بھائی سے ملا۔ فلاں سے ملا —— فلاں سے ملا —— وہ ساری یادداشتیں اور فوٹو لایا ہوں۔ دکھاؤں گا آپ کو۔"

"آپ کا وہ مضمون، جو آپ نے وہاں کے عظیم الشان غسلخانوں کے بارے میں لکھا ہے مجھے بڑا ہی پسند ہے۔"

"ہے نا! —— وہ مضمون بہت پسند کیا گیا ہے مگر میں نے اصلی واقعات تو لکھے ہی نہیں اس لئے کہ وہاں ایسے غسلخانے بھی ہیں جن میں لوگ مادر زاد ننگے نہاتے ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں —— وہاں نہلانے والوں کا بھی انتظام ہے۔ جس کا جی چاہے ان کی مدد سے نہا لے۔ خوب رگڑ رگڑ کر نہلاتے ہیں اور جسم پر سے اتنی میل اتارتے ہیں کہ بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ ابھی کالے صاحب سے گورے صاحب بن جائیں گے۔

"آپ تو ایسے بیان کر رہے ہیں جیسے خود بھی ننگے نہائے ہوں۔"

"چل ہٹ، بے شرم کہیں کا۔"

ڈاکٹر صاحب بڑے سخت پنجابی ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں انہیں سب سے ترقی یافتہ اور بڑی زبان پنجابی ہی نظر آتی ہے۔ پنجاب کی اور اہلِ پنجاب کی ایک ایک ادا پر واری نثاری ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو یہ مسلمانوں کی تمام مذہبی کتابوں کو بھی پنجابی میں منتقل کرا کے دم لیں۔

ہنستے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں —— دوسروں کی سنتے بھی ہیں۔ اپنی سناتے بھی ہیں۔ مگر سناتے زیادہ ہیں، سنتے کم ہیں۔ ہر ایک کا کام بہ خوشی کر دیتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ نوے فی صد اچھے آدمی ہیں۔ دس فی صد جو کمزوریاں ہیں وہ بھی اگر خدانخواستہ نہ ہوتیں تو یہ بے چارے اشرف المخلوقات میں سے خارج ہو جاتے۔

حمید احمد خاں

میرے نزدیک ان کا شمار بھی بزرگوں میں ہے۔

سید وقار عظیم جب باقاعدہ لاہور آ گئے تو میں نے انہیں نقوش کی ادارت کے سلسلے میں پھانسنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ معلوم ہوا وقار صاحب حمید احمد خاں کے پاس بیگم روڈ پر ٹھہرے ہیں۔ بیگم روڈ پہنچا۔ وقار صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور حمید احمد خاں صاحب سے بھی۔

میانہ قد و قامت کے آدمی، پنجابی ہوتے ہوئے بھی بڑے نستعلیق، کبھی اتنے سنجیدہ ہو جاتے جیسے یقین ہو جائے کہ ابھی فرما دیں گے "نکل جاؤ میرے گھر سے"، کبھی ایسے باغ و بہار جیسے پہلا یقین واہمہ بن جائے۔

میری ان سے نہ زیادہ واقفیت تھی اور نہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے باب میں زیادہ باتیں نہیں بنا سکتا۔ اس کے باوجود یہ بات مسلّمہ، جس نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ ان کی بڑی تعریف کرتا ہے۔

جب یہ لندن گئے تو مجھے اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں نے لاہور کے پتے پر نقوش کا ایک شمارہ بھیجا تو ان کا لندن سے جواب، ایک دستی رقعہ کی شکل میں ملا۔ "آپ کا پرچہ میرے گھر والوں کو موصول ہوا تھا مگر میں تو یہاں ہوں اس لئے پرچہ واپس بھجوا رہا ہوں۔"

مجھے ان کی اتنی احتیاط اچھی معلوم نہ ہوئی۔ کچھ دکھ سا ہوا، مگر پی گیا۔ جب سے لندن سے آئے ہیں ان سے باقاعدہ ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ملاقات کی آرزو تو ہے مگر جلد پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ میں نے ایک دن انہیں اپنے دفتر کے سامنے سے آنکھیں بچا کے گزرتے دیکھا ہے۔ ارادے کے باوجود اب ملاقات کا حوصلہ ہو تو کیسے؟

لندن سے آنے کے بعد میں نے ان کے ایک مضمون کی بڑی دھوم سنی۔ موضوع تھا 'اقبال کی چوریاں'۔ علامہ اقبال نے مغربی ادیبوں اور شاعروں کے خیالات سے استفادہ کر کے جو نظمیں بغیر حوالے کے نظم کی ہوئی تھیں ان پر تھا مضمون، خوب چرچے ہوئے اس مضمون کے، اخباروں میں مخالف اور موافق لکھا گیا۔ کسی نے حمید احمد خاں کی اس جرأت کی داد دی۔ کسی نے سنا ڈالیں، بہرحال رہا معرکہ، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اتنا بچ بچا کر چلنے کے باوجود، ان میں زندگی کی تمام حرارتیں موجود ہیں۔

غالب ان کا محبوب موضوع ہے۔ اِدھر (پاکستان میں) غالب پر کام کرنے والوں میں یا تو مولانا غلام رسول مہر ہیں یا یہ۔ نہیں نہیں ایک اور بزرگ ہیں جو سی۔ ایس۔ پی بھی ہیں اور ادیب بھی، شیخ اکرام ——— ویسے تو اور بھی ہوں گے مگر باقی قلم کا ذائقہ بدلنے کے لئے غالب پر لکھتے ہیں ان لوگوں نے تو غالب کو سمجھنے کے لئے اپنی زندگی بِتا دینے کی آرزو کر رکھی ہے۔

میں نے ایک بار حمید احمد خاں صاحب سے شکایت کی "آپ نقوش کے لئے کچھ بھی نہیں لکھتے۔" بات کو اور باتوں کے ریلے میں رولے گئے اور میں ہکا بکا رہ گیا۔

ایک بار درسی کتابوں کے سلسلے میں ان کے پاس پہنچا۔ مدعا عرض کیا۔ بات سنتے ہی ڈوب گئے اور میں تیرتا ہی رہ گیا۔

جب میں نے دوبارہ وہی بات عرض کر دی تو فرمایا "میں آپ کے لئے نہ لکھ سکوں گا۔ اس لئے کہ آپ حکومت کے نزدیک خوفناک آدمی ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ کام کیا تو میں بھی مارا جاؤں گا۔"

"اوہو!"

"جی ہاں!"

میں انہیں اب تک یہ نہیں سمجھا سکا ہوں کہ میں نے وہ تمام بُری عادتیں چھوڑ دی ہیں جن کی وجہ سے میں خطرناک آدمی بنا تھا۔ بہرحال میں ایک بار

پھر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بارے میں رائے دریافت کروں گا۔ کیونکہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کے قریب ہو جاؤں اور ان سے ادب پڑھوں، اخلاق سیکھوں اور شرافت کا درس لوں۔

میرزا ادیب[1]

دل میں ہزار بدگمانیاں رکھنے والے اپنے میرزا صاحب، بے حد شریف النفس اور بڑے بے ضرر دوست ہیں۔ میری طرح یہ بھی دل ہی دل میں کڑھتے اور گھلتے رہتے ہیں، مگر دل کی بات اُن سے نہیں کہتے جن سے شکایت ہوتی ہے۔ کبھی دل کی بات کہہ دی تو اتنے خوفناک طریقہ پر کہ سکتہ طاری ہو جائے۔

میں نے میرزا صاحب کا ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح احترام کیا ہے مگر احتیاط صرف اتنی کی کہ انہیں میرے اس جذبہ کا علم نہ ہونے پائے۔

ان کی شخصیت میں جو چیز نمایاں اور قابلِ قدر ہے، وہ ہے ان کی معصومیت، یہی وجہ ہے کہ انہیں اب تک اپنی بڑائی کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ خدا کرے کہ انہیں اپنی بڑائی کا احساس بھی نہ ہو ورنہ ڈر ہے کہیں حواس نہ کھو بیٹھیں۔ یہ جو وہ احساسِ کمتری کے سہارے ہی وہ اس دنیا میں بقائمی ہوش و حواس چل پھر رہے ہیں۔

میرزا صاحب اپنے سے چھوٹی عمر کے بچوں میں بڑا خوش رہتے ہیں۔ جس نے میٹرک پاس کر لیا وہ رزلٹ دیکھتے ہی میرزا صاحب کے پاس ادیب بننے کے لئے پہنچتا ہے اور میرزا صاحب اتنے بھلے آدمی ہیں کہ اسے چھاپ چھوپ کر ادیب بنا دیتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا میں بھی میرزا صاحب کے نقشِ قدم پر چل کر ہر دلعزیز بن جاؤں مگر اب تک اللہ نے مجھے اس کی توفیق نہیں دی۔

میرزا صاحب کے عموماً دو ہی موڈ ہوتے ہیں۔ یا تو آپ سے مل کر بچھے چلے جائیں گے، یا پھر بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھیں گے۔ بفضلِ خدا مجھے ان کے دونوں ہی موڈوں سے واسطہ پڑا ہے۔

میں نے ایک بار اپنا کوئی نمبر بڑی ہی محنت سے مرتب کر کے میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ میرزا صاحب ورق الٹ الٹ کر دیکھتے اور پڑھتے رہے۔ شامتِ اعمال پوچھ بیٹھا "میرزا صاحب پرچہ پسند آیا؟"

"ہاں ٹائیٹل اچھا ہے۔"

میں کٹ گیا، جل گیا، مگر خاموش رہا۔ بڑے تھے اس لئے احترام لازم تھا۔ کوئی تین چار ماہ بعد میرزا صاحب بھی اپنا سالنامہ لے کر آ نکلے۔ میں ابھی پرچہ اِدھر اُدھر سے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرزا صاحب پوچھ بیٹھے "کیسا ہے؟"

"اس کا تو ٹائیٹل بھی اچھا نہیں۔"

میرزا صاحب عموماً دو دو زناٹے پیدل مارچ کرتے ہیں۔ آپ انہیں اس پیدل مارچ میں اکیلا کم ہی پائیں گے۔ کوئی نہ کوئی ناپختہ ادیب ضرور ساتھ ہو گا۔ یہ بڑے ادیبوں سے، ان کے گھر پر، اور ناپختہ ادیبوں سے سڑکوں پر ملا کرتے ہیں۔

یہ بے حد نیک مگر ضرورت سے زیادہ سادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یار لوگ ان سے دل لگی سے بھی باز نہیں آتے۔ میرزا صاحب کی آرزو تھی کہ وہ بھی فلمی کہانیاں لکھیں۔ مدتوں کی خواہش اب پوری ہو گئی ہے۔

سنا ہے کہ کسی ستم ظریف ڈائرکٹر نے ایک ایکٹرس سے یہ کہہ رکھا ہے کہ جب میرزا صاحب آئیں تو ان سے ہاتھ ملایا کرو۔ جب جائیں تو بھی دو چار میٹھی میٹھی باتیں کر لیا کرو —— وہ ایکٹرس اس سے بھی تیز، مکتبۂ اردو ٹیلیفون کر دیتی ہے —— "ہائے میرزا صاحب کہاں ہیں؟ انہوں نے تو یہ وقت مجھ سے ملنے کا مقرر کر رکھا تھا۔"

اِدھر کارکنانِ مکتبۂ اُردو حیران! —— ہوں میرزا صاحب!"

---

[1] ان پر ایک صحیح قسم کا مضمون اس اشاعت میں موجود ہے اس لئے آپ ان چند سطروں کو درخورِ اعتنا ہی نہ جانیں۔

میرزا صاحب خود ہی ناراض ہوتے رہتے ہیں، خود ہی راضی ہوتے رہتے ہیں۔ نہ ان کی کبھی ناراضی کا پتہ چلا نہ راضی ہونے کا۔ یہ گھڑی کے ڈائیل کی طرح دو کے بعد تین بجاتے ہی رہتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ایڈیٹری کم بخت بھی سوتنوں والا رشتہ ہے۔ ہزار دامن بچا کر چلئے الجھ ہی جائیے گا۔ وہ کبھی کبھی اپنے پرچے میں، میرے اور میرے پرچے کے خلاف لکھ کر یا لکھوا کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی یہاں واشگاف انداز میں اقرار نہیں کیا کہ میرزا صاحب بے حد مخلص، نیک، پڑھے لکھے، دلچسپ اور قابلِ احترام شخصیت ہیں۔

خدا ہم دونوں پر رحم کرے۔

بلونت سنگھ[۱]

اتنا تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ سکھ ہیں۔

ان سے میری میٹھی میٹھی سی خط و کتابت ضرور تھی مگر باقاعدہ جان پہچان اس وقت ہوئی جب میں اس خالص پنجابی دوست سے ملنے الہ آباد گیا۔ وہ بھی ان دنوں، جب پاسپورٹ کے سو بکھیڑے ہیں۔

الہ آباد اس کے اور میرے پنجاب سے سینکڑوں میل دور تھا یہی وجہ ہے کہ جب بلونت سنگھ سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے جو بات سب سے پہلے پوچھی، یہ تھی: "پنجابی دوستوں کا کیا حال ہے، فلاں کیسا ہے اور فلاں کیسا ——— کیا آج بھی انار کلی میں شام کو ویسی ہی رونق ہوتی ہے؟ کیا لوگ اب بھی شام کو مال روڈ پر ٹہل کر لارنس میں جا کر ٹھکی لیتے ہیں اور کیا کوئی ایسی صورت نہیں نکل سکتی کہ میں لاہور کو ایک نظر پھر سے جا کے دیکھ لوں؟"

میں سوائے اس بات کے اور کیا جواب دیتا کہ الہ آباد سے امرتسر سینکڑوں میل دور ہے اور امرتسر سے لاہور ہزاروں ہی میل دور!

بلونت سنگھ نے جب مجھے "طفیل جی!" کہہ کر پکارا تو میری روح خوش ہو گئی۔ اس لئے کہ اس سے پہلے مجھے کسی نے بھی اتنی محبت سے نہیں پکارا تھا۔ صرف اس تخاطب پر، میں ان کے جتنا نزدیک پہلے تھا اس سے زیادہ نزدیک ہو گیا۔ اس لئے کہ ان کی محبت اور ان کا خلوص پہلے ہی قدم پر متوجہ کر کے اپنا چکا تھا۔

یہ سکھ ہیں، مگر سکھوں کے جانی دشمن ——— خود کہتے ہیں کہ سکھ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ پھر سکھوں کے نام سے منسوب کر کر کے وہ وہ من گھڑت اور شاندار لطیفے سناتے ہیں کہ کوئی باور کر ہی نہیں سکتا کہ یہ جو صاحب لطیفے بیان کر رہے ہیں ان کا واسطہ سکھ قوم سے بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اپنے تارا سنگھ کو معلوم نہیں ہے کہ ان کی قوم میں ایک سکھ ایسا بھی موجود ہے جو سکھوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

بلونت سنگھ بڑے خوبصورت اور وجیہہ ہیں۔ وہ جو منٹو نے موذیل میں ترلوچن سنگھ کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ اگر داڑھی مونچھ منڈوا دے تو کئی لوگ اسے آنکھیں ماریں۔" وہ ان پر بھی بالکل ٹھیک بیٹھتا ہے۔

مجھے اس کا تو علم نہیں ہے کہ یہ آدمی کنجوس بھی ہیں یا نہیں۔ مگر یہ رکشا والوں سے پیسے چکاتے ہوئے بڑا لڑتے ہیں ——— وہاں کا کیا لو گے؟ ——— چار آنے ——— دو آنے دوں گا ——— رکشا والے کے انکار پر یہ اس منزل کی طرف منہ کر کے چلنے جائیں گے۔ راستہ بھر، ہر رکشا والے سے پوچھتے جائیں گے ——— "بھئی وہاں کا کیا لو گے؟" ظاہر ہے جب منزل آدھی سے زیادہ پیدل چلتے چلتے ہی کٹ جائے گی تو رکشا والا خود بخود آدھے پیسوں پر راضی ہو جائے گا۔ تب یہ اس پر بڑے فخر سے سوار ہو جائیں گے اور یہ بھی کہہ دیں گے۔ وہ پہلا چار آنے مانگتا تھا، بیوقوف کہیں کا۔

---

[۱] انہیں میں نے لاہور کے ادیبوں میں اس لئے شامل کر لیا ہے کہ یہ لاہور کافی عرصہ رہے ہیں اور پہلی مرتبہ میں نے انہیں یہیں دیکھا تھا۔

میں نے ان سے شکایت کی: "آپ مجھے اسٹیشن پر لینے کیوں نہیں آئے؟"

"طفیل جی! مجھے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ آپ آج آنے والے ہیں!"

"میں نے خط جو لکھا تھا!"

"بھئی معاف کرنا، میں نے اپنا پوسٹ بکس لے رکھا ہے۔ میری ڈاک اس میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ آٹھویں دسویں دن اُدھر جاتا ہوں تو ڈاک لاتا ہوں۔ اس لئے آپ کا خط آ کر بھی مجھے اب تک نہیں ملا۔ اب آپ کے جانے کے بعد فرصت ملے گی تو جا کر ڈاک لاؤں گا۔" اگر آپ کا اس مضمون کا خط مل گیا تو اسٹیشن ضرور چلا جاؤں گا۔ وہاں سے آپ کو لاؤں گا اور اپنے ہاں ٹھہراؤں گا۔ عملاً نہ سہی، ذہناً سہی۔"

ان دنوں ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لئے یہ پوچھنا ضروری تھا: "بھابھی کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟"

"آج کل وہ ہے تو اپنے ماں باپ کے پاس، مگر ہے وہ بھی سکھنی۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اگر میری والدہ نے میری یہ باتیں سن لیں تو بہت ہی بُرا ہو گا۔"

"بہت ڈرتے ہیں؟"

"ہاں اس لئے کہ میرا ان کا معاہدہ ہے کہ میں صرف ان کی بہو کے بارے میں کچھ نہ کہا کروں اور دنیا جہان کی سکھنیوں کے بارے میں جو جی چاہے کہتا رہوں۔"

"اچھا تو یہ موضوع گھر سے باہر زیر بحث آئے گا؟"

"منظور!"

پھر اتنا وقت ہی کسے تھا کہ اتنے شاندار موضوع پر بھی گفتگو ہو سکتی۔ بھاگم بھاگ میں جن جن موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ان سے میں نے جو نتیجے اخذ کئے وہ یہ ہیں:

محبت کے قابل انسان، مخلص، بھولا بھالا، لطیفہ ساز، گفتگو میں اناڑی، دوستوں پر بھروسہ کرنے والا، بزدل اور کاہل ہونے کے ساتھ حد درجہ دلچسپ ——— اور پیارا۔

واپسی پر جب گاڑی کے چھوٹنے میں وقت بہت ہی کم رہ گیا تو میں نے بوکھلا کر نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ بات کر دی تو انہوں نے بڑے مزے میں کہا ——— "ہو گیا نا آپ پر بھی سکھوں کا اثر؟"

عشرت رحمانی

"جائیے، لے جائیے اپنا کنٹریکٹ، میں مضمون نہیں پڑھوں گا۔"

جن صاحب سے یہ کہا جا رہا تھا۔ جب وہ "بہت اچھا" کہہ کر چلے گئے تو میں نے شوکت تھانوی صاحب سے دریافت کیا۔ "آپ کی تعریف؟"

"عشرت رحمانی۔"

یہ واقعہ ہے لکھنؤ کا۔ غالباً ۱۹۴۵ء کا۔ نہ جانے اس وقت میرے دل میں یہ جذبہ کیوں پیدا ہوا کہ جن صاحب کو شوکت صاحب نے یہ زوردار ڈانٹ پلائی ہے وہ بیچارہ ہے مردِ معقول۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں لاہور چلا آیا۔ عشرت صاحب وہیں ریڈیو اسٹیشن پر رہ گئے۔

دوبارہ لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تو عشرت صاحب کی شوکت صاحب سے پھر گاڑھی چھن رہی تھی۔ اگر عشرت صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شوکت صاحب

سے عمر بھر نہ بولتا۔

انہی دنوں عشرت صاحب نے مجھے لکھنؤ ریڈیو پر آنے کی دعوت دی جسے میں نے منظور کر کے نامنظور کر دیا اس لئے کہ جان بوجھ کر حاضر نہیں ہوا تھا۔ جب میں لاہور آ گیا تو انہوں نے مجھے شکایت کا خط لکھا، شکایت قطعی حق بجانب تھی۔ اگر میں کوئی لاٹ صاحب ہوتا تو مجھے ایسے نخرے پھبتے بھی، اک ذرا سا لونڈا، اس پر یہ سو سو نخرے، مگر ان ساری باتوں سے مجھے سولہ آنے یقین ہو گیا کہ عشرت صاحب ہیں پیار کے قابل۔ شوکت صاحب ڈانٹیں تو بھی یہ دوستی کا دم بھرنے سے باز نہ آئیں۔ مجھے بلائیں اور میں حاضر نہ ہو کر حماقت کروں، تو پھر تعلقات جوں کے توں۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ یہ پاکستان بن جانے کی وجہ سے پہلے ڈھاکہ پہنچے پھر لاہور آ گئے۔ لاہور آ کر، اگر یہ میرے پاس خود نہ آتے تو یہ عشرت رحمانی ہوتے ہی نہیں۔ اب میری ان کی گھُٹنے لگی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے اپنا رازداں سمجھ لیا اور ہم دونوں نے اپنے دیرینہ دوست اور کرم فرما، شوکت تھانوی کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ وہ کہتے شوکت صاحب میں یہ خرابی ہے، میں کہتا یہ، اللہ کی شان کہ ہم دونوں کی اس موضوع پر خوب نبھتی۔ مگر حاصل کلام ہمیشہ یہی رہا کہ یار شوکت صاحب میں جو یہ یہ خوبیاں ہیں، انہوں نے ان کی تمام برائیوں پر پانی پھیر رکھا ہے۔

عشرت صاحب نے ہمیشہ سب سے دل و جان ہی کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ میں نے بھی جب ان سے کوئی فرمائش کی ہے تو انہوں نے اسے بستر مرگ پر بھی پورا کیا ہے۔ بستر مرگ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ پچھلے دنوں انہوں نے ایک بڑی خطرناک چیز کا اپریشن کرایا تھا۔ بظاہر بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ مگر انہوں نے میری فرمائش پہنچنے پر اپنی بے پناہ تکلیف کے باوجود، ہائے ہائے کر کے بھی میرا الجھا مسئلہ سلجھا دیا۔

اپنے عشرت صاحب کی یہ بڑی خواہش ہے کہ سب لوگ مل کر انہیں علامہ کہیں۔ میں نے کئی بار سوچا ہے۔ اگر اور کم بختوں کو اس بات کا خیال نہیں آتا تو میں ہی اپنے دوست کا دل رکھ لوں۔ ہزار کوشش کے باوجود مجھ سے اب تک یہ نہیں ہو سکا۔ اگر عشرت صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ اس قسم کی کوئی میری خواہش ہے تو وہ اپنے فریضہ سے اب تک سُرخرو ہو چکے ہوتے۔

جن کے دوست عشرت صاحب ہیں وہ سب خوش نصیب ہیں مگر عشرت صاحب کو ایسے دوست نہیں ملے جن سے ان کی خوش قسمتی کا پتہ چل سکتا۔

پچھلے دنوں عشرت صاحب نے مجھے نئے مگر بے سلے کپڑوں کا ایک گٹھڑ لا کر دیا کہ اسے اپنے پاس رکھ لو۔ جو میرا رقعہ لائے اسے دے دینا۔ بہت دنوں تک یہ گٹھڑ ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ ایک دن ہمارے عقل مآب نوکر صاحب نے اسے جو مہرے رکھ کر پھینکا تو اس میں سے خوشبو کے بھبکے نکلنے لگے اور ساتھ ہی کوئی چیز بہہ نکلی معلوم ہوا انیل کی شیشی تھی جس کے دن آج پورے ہو گئے ہیں۔ تمام کپڑوں کا ناس مارا گیا —— جو صاحب رقعہ لانے والے تھے وہ رقعہ لائے اور کپڑے لے گئے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے عشرت صاحب سے کپڑوں کی غرقابی کا ضرور تذکرہ کیا ہوگا مگر عشرت صاحب کی زبان پر آج تک شکایت نہیں آئی۔ انسان ہو تو اس پائے کا، ورنہ نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔

ظہیر کاشمیری

پھٹ پھٹ پھٹ، وہ گیا ایک آدمی موٹر سائیکل پر، موٹر سائیکل کی ہیئت بھی عام موٹر سائیکلوں سے الگ اور سوار کی بھی عام آدمیوں سے مختلف، انفرادیت ہی انفرادیت، عموماً بچے موٹر سائیکل کا مذاق اڑاتے ہوئے اور سوار پر ہنستے ہوئے پائے گئے ہیں —— مگر وہ سوار ہیں خود اعتمادی کی پوٹ ظہیر کاشمیری۔

گفتار کے امام، دو منٹ بھی انہوں نے کسی سے بات کر لی تو وہ ان کی باتوں سے چکرائے گا بھی اور مرعوب بھی ہوگا۔ چکرائے گا اس لئے کہ یہ چھوٹتے ہی مارکس کی تعلیمات پلانا شروع کر دیتے ہیں اور اشتراکی نقطۂ نظر سے ہر بات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً اگر سڑک پر ایک مزدور سر پر گٹھڑ اٹھائے ایک صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے تو ان کی تقریر یہ ہوگی ”لعنت ہو سرمایہ داری پر اور اس معاشرہ پر، جس میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں۔ اصل میں چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ کمینہ جو صاحب بنا

آگے آگے جا رہا ہے اس کے سر پر گٹھڑ ہوتا اور جو پیچھے پیچھے جا رہا ہے، اسے آگے آگے صاحب بنے جانا چاہیئے تھا۔"

لوگ کہیں گے "بات تو ایک ہی ہوتی۔ پھر بھی ایک مزدور رہا اور ایک آقا۔"

"ہاں صاحب! بات تو ایک ہی ہوتی مگر ایک بار ایسا ہو تو جائے۔"

ظہیر صاحب کا خیال یہ ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا ہوں اور مارکسی نقطۂ نظر سے سوچنے والوں میں مجھ جیسا جوہرِ قابل کوئی اور نہیں ہے۔ نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ اپنے ہی نقطۂ نظر کے ادیبوں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں۔ اگر ہر نقطۂ نظر سے لکھنے والے کو اسی ایک لاٹھی سے ہانک دیتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ ہم کہتے اقبال آپ سے بڑا شاعر تھا۔ یہ کہتے چونکہ اقبال مر گیا ہے اس لئے آپ اسے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ جب میں بھی مر جاؤں گا اس وقت اس بات کا فیصلہ کرنا۔

آج کل یہ میکلوڈ روڈ کے چوک میں، کرسی ڈال کر اپنے ارد گرد تین چار ذہنی بچوں کو بٹھا کر، انگلی اٹھا اٹھا کر، بازو لہرا لہرا کر تقریر کر رہے ہوتے ہیں۔ راستہ چلتے لوگ بھی ٹھہر جاتے ہیں مگر ان کی تقریر جاری ہی رہتی ہے۔

خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ ہی سے جاہل سمجھ کر بات ہی نہیں کی ہے۔ اگر بات کی بھی ہے تو میری ان کی بنی نہیں ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی اس پر میں نے آج تک غور ہی نہیں کیا ہے۔

اگر انہوں نے بات کی بھی تو اتنی کہ راہ چلتے موٹر سائیکل سے اترے اور اپنی تازہ غزل پورے دبدبے کے ساتھ سُنا کر چل دیئے۔ میں ابھی ان کی غزل کے تیوروں پر غور ہی کر رہا ہوں، کہ یہ اپنے اگلے پڑاؤ پر۔

جب یہ اپنا کلام سناتے ہیں تو بڑے ہی اعتماد کے ساتھ اور یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھ سے بہتر، کوئی مائی کا لال کہہ کر تو دکھا دے۔

مشاعروں میں لوگ ان کی صورت دیکھ کر ہنس دیں تو ہنس دیں مگر ان کے کلام سے مرعوب ہی ہو کر جاتے ہیں۔ خوب لٹکے ہوئے پیارے پیارے سے الفاظ لاتے ہیں کہ دل میں اتر ہی جائیں مگر ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مشاعرے میں ہوٹ ہو گئے۔

سخت پریشان ہوئے۔ کہنے لگے "دوستو! میں آج تک ہوٹ نہیں ہوا تھا اس لئے کیا آپ لوگ اپنی ہوٹنگ واپس نہیں لے سکتے؟"

"بیٹھ جاؤ!"

"ہائیں!"

قدرت اللہ شہاب

یہ غالباً ۱۹۵۰ء میں محکمۂ نشر و اشاعت میں سیکرٹری تھے یا کیا، میں نیاز مندی کے شوق میں ان کے پاس پہنچا، کارڈ بھیجا۔ جواب ملا، انتظار کیجئے۔ انتظار کیا تو بلاوا نہ آیا۔ آہستہ آہستہ خون کھولنے لگا۔ بالآخر یہ رقعہ لکھ کر چلا آیا:

> "یہ ناچیز، آپ ایسے لاٹ صاحب سے ملنے چلا آیا تھا۔ آپ کو فرصت نہیں۔ مجھ میں
> مزید تابِ انتظار نہیں۔"

کوئی پندرہ دن کے بعد یہ "لاٹ صاحب" خود میرے دفتر میں آ نکلے اور آتے ہی جو بات کہی وہ یہ کہ "میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں مگر میں اس دن مجبور تھا۔ ایک بڑی ہی ضروری میٹنگ ہو رہی تھی جس میں خود متعلقہ وزیر صاحب بھی شامل تھے اس لئے آپ کو فوراً بلانا مشکل ہو گیا تھا۔"

ان کی اس معذرت کے بعد نہ صرف یہ کہ انہیں معاف کر دینے کو دل چاہا بلکہ الٹی ندامت ہوئی کہ اتنے عمدہ آدمی کے بارے میں، جو میں نے رائے قائم کر لی تھی وہ کس قدر غلط تھی۔

اس کے بعد یہ دن بدن بڑے افسر بنتے گئے مگر انھوں نے اپنی وضع نہ بدلی۔ جب بھی کراچی سے لاہور آئے؛ اس خاکسار سے ملے بغیر نہ گئے۔ یہ چھوٹوں کے پاس خود جاتے ہیں، بڑوں کو اپنے ہاں حاضر ہونے کا موقع دیتے ہیں۔

کوئی ڈھائی تین برس پہلے یہ جھنگ میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر تھے۔ ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا اس نوکری میں تو بڑے ٹھاٹھ ہوں گے۔ کہنے لگے "قطعاً نہیں۔ بڑا کام کرنا پڑتا ہے۔ برس ہا برس سے لوگوں کے مقدمے چل رہے ہیں اور بغیر کسی وجہ کے چل رہے ہیں۔ کوئی بھی افسر اپنے فرائض کو نہیں پہچانتا۔ ناداروں اور غریبوں کے لئے کچھ روپیہ حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ وہ تک کارندے کھا جاتے ہیں۔ عجیب مصیبت میں جان آگئی ہے۔ اب میں نے حکم دے رکھا ہے کہ جس کسی کو شکایت ہو وہ مجھ تک براہِ راست پہنچے۔ چنانچہ سینکڑوں ہی غرض مند روز پہنچتے ہیں۔ میں ان کی درخواستوں پر متعلقہ افسر کو لکھ دیتا ہوں کہ یہ کام فلاں تاریخ تک ضرور ہو جانا چاہئے۔ اسی طرح برسوں کے لٹکے ہوئے کام چند مہینوں میں ہوئے ہیں —— اب ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ناداروں اور غریبوں کا روپیہ خود لے کر نکلتا ہوں اور جن جن کا مقرر ہے انہیں خود اپنے ہاتھ سے دے کر آتا ہوں۔ ورنہ اس سے پہلے روپیہ منظور کسی اور کے لئے تھا اور کھاتا کوئی اور تھا۔"

ایک بڑا دلچسپ واقعہ اور بھی سنایا:

"میں نے ایک مزارعہ کی درخواست پر، پٹواری کو یہ لکھ دیا کہ یہ کام فلاں تاریخ تک ضرور ہو جانا چاہئے۔ جب میرے آرڈر لے کر مزارعہ پٹواری کے پاس پہنچا تو اس نے وہ درخواست ہی لے کر پھاڑ دی اور مجھے بھی دو چار سنا دیں۔ اطلاع ملنے پر، میں خود اس کے پاس گیا اور اس سے کہا جناب اس غریب کا کام کر دیجئے۔ مجھے بھی اس نے نہ جانچا۔ جب وہ الٹی سیدھی باتیں مجھ سے بھی کرنے لگا تو میرے ساتھیوں میں سے ایک بول پڑا۔ یہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ہیں لہٰذا ادب سے بات کرو —— جہاں حالات ایسے ہوں وہاں آدمی کس طرح ٹھاٹھ سے نوکری کر سکتا ہے؟"

"آخر آپ نے اس پٹواری صاحب سے کیا سلوک کیا؟"

"بس ہنس کے چلا آیا تھا۔"

یہ تو ان کی انسان دوستی اور نرم دلی کا حال ہے۔

اتنے نرم دل انسان نے جب بھی قلم سے کام لیا ہے تو اس نے برسائی آگ ہی ہے۔ یہ حکومت کے ہمیشہ بڑے اور اہم عہدوں پر رہے۔ مگر ان کی بیشتر تحریریں حکومت کے خلاف ہی پڑھنے کو ملیں —— معاشرہ کی کسی نہ کسی خرابی پر، بلا جھجک لکھیں گے، خواہ کچھ ہو جائے۔

انھوں نے ایک کتاب "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" کے نام سے لکھ رکھی ہے، وہ چھپواتے نہیں ہیں۔ شاید ڈر گئے ہوں۔ اگر بات یہی ہے تو اس کو ان کی بزدلی پر محمول نہ کیجئے۔ وہ کتاب ہی انتہائی خطرناک ہوگی۔

ان جیسے سادہ لوح، انسان دوست، بھولے بھالے، مخلص اور دیانتدار افسر میری ان گنہگار آنکھوں نے کم دیکھے ہیں۔

قیوم نظر

یہ میرے وہ دوست ہیں جن کا کلام سمجھنے کے لئے مجھے کئی کئی ہفتے خمیرہ گاؤ زبان کھانا پڑا مگر شعر پھر بھی سمجھ میں نہ آئے۔ ان کی اب تک جتنی بھی چیزیں نقوش میں چھپی ہیں وہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ پیش اس لئے کر دیں کہ اگر کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آتی تو ضروری نہیں ہے کہ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئے۔

یہاں چند ایک ادیبوں کا ایک اکھاڑہ[1] ہے اس کے یہ خلیفہ ہیں۔ اس اکھاڑے میں سبھی پڑھے لکھے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ ہفتہ واری

---

[1] مجھے اس اکھاڑے کی افادیت سے انکار نہیں۔

ان سب کے علم کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دور دور سے لوگ ان کے علم سے استفادہ کی خاطر آتے ہیں مگر اپنی بے علمی کی بنا پر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میرا مشورہ تو ان دوستوں سے (خاص کر قیوم صاحب سے) یہ ہے کہ اپنے علم کو لوگوں کی سطح پر لے آئیں۔ جیسے جیسے پبلک کا شعور بڑھے خود بھی سیڑھیاں چڑھتے جائیں ورنہ کسی دن یہ ہوگا کہ اس اکھاڑے کے تمام ادیب قطب مینار پر چڑھ جائیں گے اور مجھ جیسے کم علم، ادب کے چٹیل میدان میں کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔

قیوم نظر سے میری دوستی بڑی پرانی اور شرابِ کہنہ کی طرح قیمتی ہے۔ کوئی ناراض ہو تو قہقہے لگانے والا، کوئی خوش ہو تو قہقہے لگانے والا آج کل بہت فکر مند ہے اس لئے کہ حکومت پاکستان نے میرے اس پیارے دوست کو خواہ مخواہ پاکستان کے نمائندہ ادیب کی حیثیت سے پورے یورپ کے دورے پر بھیج دیا ہے۔ ان کی پریشانی کی وجہ میرے نزدیک تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے پائے کا باہر کوئی ادیب نہ ہوگا۔ اب یہ بات کریں گے تو کس سے، یہاں تو انہوں نے بہ ہزار دقت چند ایک دوست ایسے ضرور پیدا کر لئے تھے جو ان کے علم سے پوری طرح آگاہ تھے۔

یہ ان تمام ادیبوں کے خیر خواہ نہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ کہتے ہیں ہم پنجابی بولتے ہوئے اردو میں لکھتے ہیں، یہ اردو بولتے ہوئے اردو میں کیوں لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بڑے پیار میں اردو بولنے والوں کو سناتے رہتے ہیں۔ میں بھی مزے لیتا ہوں یہ بھی، مگر اتنے تعلقات کے باوجود مجھے اب تک اس قابل نہیں بنا سکے کہ میں بھی ان کا ہم زبان بن سکتا۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ ان کی طبیعت میں بڑی قلندری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قطعی جوڑ توڑ کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ برس ہا برس سے اس ایک اکھاڑے کی سرداری ان کے سر تھوپی جا رہی ہے۔ یہ غریب ہیں کہ اپنے فرض کو نبھا رہے ہیں۔ انتظامی معاملات کی بھی ان میں کوئی خرابی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اکھاڑے میں جو کوئی دو ہاتھ دکھاتا ہے اسے بذریعہ ریزولیوشن خارج کراتے جاتے ہیں۔

اگر کسی ہوٹل میں ایک میز کے ارد گرد پندرہ بیس نیاز مند بیٹھے ہوں اور زور زور سے قہقہے ہوٹل کے کمرے سے بے تحاشا باہر نکل رہے ہوں تو یہ سمجھ لیجئے اس محفل کا امام قیوم نظر ہے جو اپنا بہترین دوست ہے۔

یہ سب کے سب چائے پئیں گے، چاپس کھائیں گے۔ جب بیرا بل لے کر آئے گا تو یہ سب سے مساوی مساوی پیسے اکٹھے کریں گے اور چائے کا بل ادا کر کے بیرے کو ٹپ اپنی طرف سے کر دیں گے۔

میری بدقسمتی کہ اب یہ زیادہ مصروف ہو گئے ہیں اور میرے پاس کم آنے لگے ہیں۔ بیچ میں تو بالکل ہی آنا بند کر دیا تھا۔ پھر میں نے منت خوشامد کر کے ان کی آمد کو چالو کیا ہے۔ یہ آ جاتے ہیں تو میں بھی دو گھڑی ہنس لیتا ہوں۔

یہ یورپ کا دورہ کر کے آ جائیں تو سوچتا ہوں میں بھی، شیرینی اور پگڑی لے جا کر باقاعدہ ان کا چیلا بن جاؤں۔ دوستی اپنی جگہ، یہ سلسلہ اپنی جگہ۔ اگر میرے کسی بدخواہ نے میرے اس ارادے کو فسخ نہ کرا دیا تو میری دنیا ضرور سنور جائے گی۔

قیوم صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ باہر جا کر مجھے ضرور خط لکھیں گے۔ اگر انہوں نے مجھے خط لکھا تو میں جواباً یہ ضرور لکھ دوں گا کہ میں نے آپ کی زندگی کا مطالعہ کر کے اب یہ عہد کر لیا ہے کہ باقی زندگی میں آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔

ابراہیم جلیس

یہ حیدرآباد دکن کی یادگار ہیں۔ جب پولیس ایکشن ہوا تو یہ ریڈیو اسٹیشن پر اس وقت بھی ہندوستانی سامراجیوں کو رضاکاروں کے مقابلہ میں پیچھے دھکیل رہے تھے۔ اسی بہادری کی بنا پر انہیں پاکستان آنا پڑا۔

انہوں نے آتے ہی اپنا روزنامچہ بڑے دلچسپ انداز میں لکھ کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں پڑھ ڈالا۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ مطلب یہ کہ یہاں کے

ادیبوں نے انہیں سر پر چڑھا لیا۔ جب سے سر پر چڑھے اب اترے ہیں۔

سو خوبیوں کی ایک خوبی ان میں یہ ہے کہ انہیں اپنے ملنے والوں کو بس بے وقوف ہی بنانے کی دُھن سوار رہتی ہے۔ کوئی سنجیدہ بات ہو رہی ہو گی تو یہ فقرے بازی پر اتر کر اس مسئلہ کی اہمیت ہی کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔ موضوع اگر ٹھٹھے مخول کا ہو تو ایک دم سنجیدہ ہو جائیں گے، جیسے معقولیت ان پر ختم ہو۔

جب یہ لاہور سے کراچی چلے گئے تو خیال تھا کہ حیدر آبادی ہیں، بدل گئے ہوں گے مگر ملاقات ہوئی تو یہ وہی جلیس تھے جو اس سے پہلے لاہور میں تھے۔ وہی زندگی، وہی ہنسی مذاق اور وہی سنجیدگی، مگر اتنے پر انہیں ضرور لگ گئے تھے کہ چین ہو آئے تھے۔

مجھے چین کی یہ چیز دکھائی وہ چیز دکھائی۔ سامان دکھایا، فوٹو دکھائے، ان میں سے ایک فوٹو نکال کر اور ایک لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھ کر، خوب لڑکی تھی یہ بھی، کاش میرے ساتھ آسکتی۔ مجھ سے تو جُدا ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب سے یہاں آیا ہوں اس کے چار خط آچکے ہیں۔ میں نے فوراً جواب دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ فوراً یہاں آجاؤ۔ میرا بنگلہ حاضر ہے۔ میری گاڑی حاضر ہے۔

میں ان کے اس انکشاف پر حیرت زدہ بن گیا کہ یہ خود تو ہوٹل میں کرایہ پر رہتے ہیں، سواری کے لئے رکشا والے کی منت خوشامد کرتے ہیں۔

آخر ماجرا کیا ہے؟

"کیا یہ دونوں چیزیں بھی آپ کو چینی حکومت نے دی ہیں؟"

"بھئی نہیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب بنگلہ ضرور بنواؤں گا، موٹر ضرور خریدوں گا اس لئے اسے بلا رہا تھا کہ آکر اپنی چیزیں سنبھالو۔"

"اچھا تو جناب! یہ بنگلہ اور موٹر تو بعد میں خرید لیجئے گا۔ مجھے آج کل میں ایک افسانہ ضرور لکھ دیں۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔ آج کل میں پیسوں کے ہاتھوں بہت پریشان تھا۔"

"روپے ضرور ملیں گے، مگر جیسا افسانہ ہو گا اتنے۔"

"طے۔"

دوسرے دن شام کو ایک افسانہ لائے "لیجئے طفیل افسانہ سنو۔ ایک سو روپے والا افسانہ لایا ہوں۔" افسانہ سُنانے کے بعد پوچھا، "کہو کیا قیمت لگاتے ہو؟"

"سپوری ایک اکنّی!"

بے اختیار قہقہہ لگایا جسے اڑوس پڑوس میں سب نے سُنا۔

اسی دن کسی کالج میں مشاعرہ تھا مجھے ساتھ لے گئے۔ میں نے ان سے کہا، میرا کسی سے تعارف نہ کرائیے گا، جو مجھے جانتا ہو گا اس سے میں خود مل لوں گا۔ نئے تعارف نہیں چاہتا۔

"بہت اچھا۔"

مشاعرہ شروع تھا۔ اب جس شاعر کا نام پکارا جائے اس کے بارے میں ان کے اس قسم کے ریمارک سننے پڑتے۔ مثلاً اس شاعر کی بیوی بڑی خوبصورت ہے اس لئے اس کی اور اُس کی نہیں بنتی تو اس کی ساری شاعری بیوی کے فراق میں ہوتی ہے ——— دیکھنا یہ شاعر جو اٹھ رہا ہے آج طے کر کے آیا ہے کہ پبلک ہی کو ہوٹ کر کے جاؤں گا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے اس بے چارے کو پبلک ہی ہوٹ کرتی چلی آئی ہے۔

مشاعرہ ختم ہوا تو اس کے بعد کالج کی طرف سے کھانے کا بھی انتظام تھا۔ جو چند ایک میرے جاننے والے تھے ان سے چوری چوری مل ہی چکا تھا ——— کھانا ایک میز پر دھرا تھا، سب نکال نکال کر بڑے انہماک سے کھا رہے تھے۔ صرف چمچے چلنے کی آوازیں آرہی تھیں، ورنہ تھا کامل سکوت، کہ یہ

پھٹ سے میری طرف اشارہ کر کے بول پڑے "حضرات! یہ صاحب جو بہت تیزی سے کھا رہے ہیں ان سے میں نے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں ان کا کسی سے تعارف نہیں کراؤں گا۔"

جلیس صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ بس اتنا چاہتے ہیں کہ سب لوگ مجھے بڑا لکھنے والا مانیں اور میری جھوٹی باتوں پر بھی یقین کر لیں۔ ان دو خواہشوں کے علاوہ ان کی کوئی تیسری خواہش نہیں ہے۔ وہ بنگلے، موٹر اور لڑکی والی بات ان کی خواہش میں شامل نہیں ہے۔ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ انہی دو باتوں پہ ساری زندگی گزار لیں گے۔

کوئی چھ برس کراچی رہنے کے بعد، آج کل یہ پھر لاہور آئے ہوئے ہیں۔ کوئی چار پانچ مرتبہ مجھے ملنے بھی آئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ابھی تک ان کے ہتھے نہیں چڑھا۔

سیف الدّین سیفؔ

میری ان سے آج سے چودہ پندرہ برس پہلے، جب یہ کالج ہی میں پڑھتے اور خاکسار تحریک سے عملاً تعلق رکھتے تھے، امرتسر میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ان کی شاعری کی بسم اللہ کا دور تھا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے مجھے اپنی دو تین چیزیں بڑی ہی بے یقینی کے ساتھ سنائی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے اپنی پہلی کوشش 'ادبی دنیا' میں بھیجی ہے، دیکھئے چھپتی ہے یا نہیں۔

مجھے آج بھی اردو شاعری اور اس کی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کا کچھ پتہ نہیں ہے، اُس وقت خاک ہوتا۔ اس کے باوجود مجھے سیف صاحب کے شعر بہت اچھے معلوم ہوئے تھے۔ مجھے خوشی تھی تو اس بات کی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا۔ ان کا سنانا ایسا بھاگوان ثابت ہوا کہ آج تک شعر ہی شعر سنتا چلا آ رہا ہوں۔ مجھے تو اب اس حد تک یقین ہو گیا ہے کہ اِدھر میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی ہوگی اور اُدھر شاعر میرے سرہانے بیٹھا کہہ رہا ہوگا۔ طفیل صاحب! ذرا ایک منٹ رُک جائیے اور میرا مقطع ضرور سُن جائیے۔

اب سیف صاحب تو مجھے شعر سنانے کی "جاگ" لگا کر، خود کسی کو سنانے کے قائل ہی نہیں رہے۔ بہت ہی زیادہ اصرار پر کسی کو دو ایک شعر سنا دیئے تو سنا دیئے ورنہ نہیں۔

سیف صاحب کا شمار اب اونچے لوگوں میں ہے جن کی آواز پر دس پندرہ آدمی ایک سیکنڈ میں اکٹھے بھی ہو سکتے ہوں اور جو یہ کہیں وہ حکم کی بجا آوری میں اپنی سعادت بھی سمجھتے ہوں۔

پانچ چھ برس کی بات ہے کہ ری ہیبلی ٹیشن والوں نے ان سے مکان خالی کرانا چاہا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ پولیس لے آئے تو بھی یہ مرعوب نہ ہوئے۔ ایک ہنگامہ ہو گیا، دو چار سو آدمی ان کے اکٹھے ہو گئے، پولیس کی بھی لاریوں پہ لاریاں آنی شروع ہو گئیں۔ پولیس مردہ باد اور ری ہیبلی ٹیشن مردہ باد کے نعروں میں ہزاروں ہی آدمی شریک ہوئے۔ ٹریفک بند ہو گئی، پولیس کو متنبہ کر دیا گیا۔ اگر زبردستی کی تو نتائج کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔ شورش کاشمیری ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر حکومت کے خلاف تقریر کرنے لگ گئے۔ شیم شیم کے نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ اس وقت کے گورنر جناب عبدالرب نشتر کو بہ ذات خود مداخلت کرنی پڑی۔ پولیس لاریوں میں بیٹھ بیٹھ کر اسی جگہ چلی گئی جہاں سے آئی تھی ——— لوگوں نے آخری نعرہ جو لگایا وہ یہ تھا سیف الدین سیف زندہ باد!

اب یہ ادب سے زیادہ فلم کی طرف متوجہ ہیں۔ پہلے انہوں نے فلمی گانے دوسری فلم کمپنیوں کے لئے لکھے، اب اپنے لئے لکھتے ہیں اور اپنے ہی سرمایہ سے فلماتے بھی ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ یہ اور ابوالاثر حفیظ جالندھری موٹر سے اترے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں پہنچے وہ سیف صاحب کا گھر تھا۔ جدھر

دیکھتا ہوں اُدھر ایک سے ایک ایکٹرس اور ایک سے ایک ایکٹر پڑا نظر آرہا ہے۔ طبیعت ایک دم خوش ہو گئی۔ روز ادیبوں اور شاعروں کی پریشان صورتیں دیکھ دیکھ کر جو کوفت ہوا کرتی تھی وہ ان دمکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر کافور ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد بڑا ہی پُرتکلف کھانا ملا۔ ایکٹروں، ایکٹرسوں کے بیچ میں بیٹھ کر اور کبھی انہیں دیکھ کر اور کبھی کھانے کو دیکھ کر جو چند لقمے کھائے اس کا لطف آج بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد حفیظ صاحب نے اپنا کلام عہد بعہد سنایا۔ کچھ ماحول ایسا تھا اور کچھ حفیظ صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا۔ حفیظ صاحب نے اپنا کلام ترنّم سے بھی پڑھا، گا کر بھی پڑھا۔ پڑھا اور خوب پڑھا۔ سامعین سے داد بھی ایسی مل رہی تھی کہ سننے والوں کا بھی دل خوش ہوا جا رہا تھا۔ یہ محفل کوئی صبح تین بجے تک ہی ہو گی۔

سیف صاحب غزل میں اپنا بڑا اونچا مقام سمجھتے ہیں اور شعر و شاعری کو خالہ جی کا گھر نہیں سمجھتے۔ ہر شاعر کی ذہنی اڑان سے لے کر لفظوں کے انتخاب اور غزل کے مزاج پر گھنٹوں بڑی عمدہ باتیں کر سکتے ہیں۔

نقوش کے کسی نمبر کے لئے سیف صاحب نے وعدہ کر رکھا تھا کہ غزل دوں گا۔ حاضر ہوتا تو ملاقات ہی نہ ہوتی۔ تیسری چوتھی بار ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ نئی غزل کوئی ہے ہی نہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر انہوں نے کچھ سوچا، نوکر سے پان اور سگریٹ منگوائے اور مجھے آدھ گھنٹہ بیٹھ جانے کے لئے کہہ دیا۔ چنانچہ میرے بیٹھے بیٹھے سات شعر کی ایک خوبصورت سی غزل کہہ کر میرے حوالے کر دی۔

سیف صاحب کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں اور یہ ہیں بھی تعریف کے قابل، مگر منہ پھٹ بہت زیادہ ہیں، کسی کا دل رکھنے کے لئے بھی تو رعایت نہیں کرتے۔

اے حمید

گلاب کے پھولوں اور رومانی داستانوں کے تذکرہ نگار، اے حمید کو نہ تو میں زیادہ جانتا ہوں اور نہ زیادہ پہچانتا ہی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آٹھ نو برس سے ایک دوسرے کو جانتے چلے آرہے ہیں۔ اکٹھے بھی بیٹھے ہیں، باتیں بھی کی ہیں، خوش ہونے والی باتیں بھی اور لڑنے والی بھی۔

ابھی انہوں نے افسانے لکھنے شروع ہی کئے تھے کہ یہ خوب بنے ٹھنے ہمارے دفتر کے سامنے سے گذرے۔ ان دنوں ہمارے ہاں ایک ایسے صاحب کام کرتے تھے جو ان کے واقف تھے۔

وہ صاحب ان سے مل کر واپس آئے تو مجھ سے پوچھا — "انہیں جانتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"اے حمید ہیں یہ، ادب لطیف کے افسانہ نگار۔"

"ہوں گے! یہاں افسانہ نگاروں کی کون سی کمی ہے۔ کمی ہے تو اچھے افسانہ نگاروں کی۔"

غالباً میری یہ بات اللہ میاں نے سُن لی اور انہیں اچھے افسانہ نگار کی تمام صلاحیتوں سے نواز دیا۔ بعد میں اس خوبصورت سے خدوخال کے افسانہ نگار نے بڑے بڑے خوبصورت افسانے لکھے جو لڑکپن سے نکلتی ہوئی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو بہت لبھاتے۔ اے حمید بزرگوں اور "بزرگنوں" کا افسانہ نگار نہیں ہے۔ یہ تو ۱۴ برس سے لے کر ۳۰، ۳۵ برس تک کی ابلتی جوانیوں کا افسانہ نگار ہے۔

یہ آپ کے سامنے سے گذر جائیں تو بڑے ہی سنجیدہ معلوم ہوں گے۔ سلام دعا ہو گی تو بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ، مگر اصلی اے حمید آپ کو اس وقت نظر آئے گا جب اس کے سامنے سبز نگین چلتے اور باقر خانی پڑی ہو اور ساتھ ہی امرتسر کے دو چار دوست دائیں بائیں ٹکے ہوں اس وقت ان کی زبان تلوار کی کاٹ کا کام دے گی اور دل فرہاد و وامق کی یاد دلائے گا۔

اسے حمید قہقہے لگانے کے عادی ہیں مگر روح مایوسیوں اور نامرادیوں سے کچلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اگر نظر آنے لگیں گے تو دن میں چار بار بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ غائب ہونے پر آئیں گے تو چار مہینے میں ایک بھی ملاقات نہ ہو گی۔

لوگ گرمیوں میں پہاڑوں پر جاتے ہیں یہ سردیوں میں، سردیوں میں جب برف پہاڑوں پر گرتی ہے تو ان کا دل سنبھلنے لگتا ہے۔ میدانوں میں جب لوگ مارے سردی کے ٹھٹھر ٹھٹھر جاتے ہیں تو یہ شدید برفباری میں بھی اپنا سینہ تان دیتے ہیں۔ غرض اٹھتی جوانی میں نیا خون بھرا ہوا ہے اس لئے یہ ساری کلیلیں اسی کے دم سے ہیں — میرا دل کہتا ہے کہ وہ کوئی دو برس سے سردیوں میں کسی بھی پہاڑ پر نہیں گئے ہوں گے۔ اس لئے کہ اپنے افسانے کا ہیرو بن کر، جب انہوں نے خود ہی شادی کر لی ہے تو اب وہ برف بن کر ان پر گرتی ہو گی۔

انہوں نے اپنی زندگی میں کئی پلان بنائے مگر سوائے ناولیں لکھنے کے ان کا کوئی پلان سرے نہ چڑھا۔

ظہیر کاشمیری اور انتظار حسین کی طرح، میں نے انہیں کبھی اپنی تعریف کرتے نہیں سنا۔ افسانہ لکھ کر ادبی میٹنگوں میں سنایا تو چپ، دوسرا افسانہ لکھ کر رسالے میں چھپوایا تو چپ، کسی نے تعریف کر دی تو چپ، کسی نے ناک بھوں چڑھائی تو چپ، ورنہ ادھر میں نے کئی ادیب اور شاعر ایسے بھی دیکھے ہیں کہ وہ کوئی چیز بعد میں لکھتے ہیں، ہنگامہ پہلے کرا دیتے ہیں۔

اشفاق احمد

جب یہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اس وقت یہ بڑے ہی اچھے آدمی تھے۔ البتہ اس وقت اتنے اچھے افسانہ نگار نہ تھے۔ اس کے بعد جب یہ خود ایک کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے تو خود کہنے لگے ”اب ذرا میں معقول آدمی بننا چاہتا ہوں۔“ یہ معقول آدمی تو ضرور بنے مگر وہ جو چیز دوستی کی روح ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ خارج ہونے لگی۔

ان کا اپنی ذات کے بارے میں جو یہ خیال ہے کہ میں بڑا بیوقوف قسم کا انسان ہوں، بڑا غلط ہے۔ مرورِ زمانہ کے باوجود بہت سارا پیارا دوست مخلص ہی مخلص، محبت ہی محبت قسم کا برانڈ۔ خوبصورت باتوں کا بادشاہ، باتیں افسانوں ہی کی طرح سے دلکش، پیچ در پیچ اتنی کہ تسلسل ٹوٹنے ہی نہیں پاتا۔ ریکارڈ کی طرح بجتے ہی چلے جائیں گے۔ ایکٹنگ بھی ایسی غضب کی کہ ہاتھوں کے سارے طوطے اڑ جائیں اور مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

ان کا یہ انداز ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتا۔ نئے ملنے والوں سے، دلہن کی طرح شرماتے ہیں۔ پرانا ملنے والا مل جائے تو بازار ہی میں کھڑے کھڑے اتنا ہنسائیں گے، اتنا ہنسائیں گے کہ راہ گیر کم از کم ان دونوں میں سے ایک کو تو ضرور پاگل سمجھے گا۔

یہ اپنے زیادہ قریبی دوستوں کو بڑی محبت کے ساتھ کمینہ، حرامزادہ، الّو کا پٹھا ضرور کہیں گے۔ اگر یہ تینوں القاب کسی پر صرف نہ ہوئے ہوں تو وہ ان کے بے تکلف دوستوں میں سے نہیں ہے اور یہ اندازِ تخاطب ہر کسی کو نصیب بھی نہیں ہو سکتا۔ اب میرے ان کے کوئی آٹھ برس کے تعلقات ہیں۔ انہوں نے مجھے اب تک اس قابل نہیں سمجھا کہ ان میں سے ایک آدھ لفظ ہی کا مستحق سمجھا جاؤں۔

قلندری طبیعت میں بہت ہے۔ بے حد سادہ رہتے ہیں۔ گیروے رنگ کا سیدھا سادا کرتہ، شلوار اور دونوں پاؤں میں ایک ایک چپل، اسٹالن نما مونچھیں اور چہرہ مہرہ بھی۔ آج کل اسٹالن سے انہیں تشبیہہ نہیں دینا چاہئے تھی۔ اس لئے کہ اس بے چارے پر وہ وہ الزامات ان کے دوستوں نے لگائے ہیں کہ اشفاق صاحب بھی شرمانے لگ گئے ہوں گے۔ اس لئے ان میں چہرے مہرے کے علاوہ ایک عیب بھی اسٹالن والا نہیں ہے۔

مکان کی تیسری منزل پر ان کے گھر والوں نے انہیں ایک کمرہ دے رکھا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں جب دن کے بارہ بجتے ہیں تو یہ سارے کپڑے اتار کر افسانہ لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پسینہ بہتا جاتا ہے اور یہ لکھتے جاتے ہیں۔ اگر گھر میں باہر سے مہمان وغیرہ آ جائیں تو یہ لارنس گارڈن میں جا کر، ایک درخت کے نیچے بیٹھ جائیں گے اور افسانہ لکھنا شروع کر دیں گے۔ خواہ کیڑے مکوڑے چڑھ دوڑیں خواہ چیونٹیاں کاٹ کھائیں، یہ لکھتے جائیں گے۔ جب افسانے کا آخری لفظ تک لکھ لیں گے تب ایک آدھ چیونٹی کو انگلیوں میں مسل کر کہیں گے ’حرامزادی، کمینی، الّو کی پٹھی!‘

انتظار حسین

ننھے سائز کے انتظار حسین سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تو ان کے قد اور جُثّے نے حیرت میں ضرور ڈالا۔ باتیں ہوئیں تو یہ انکشاف بھی ہوا کہ آدمی اتنا پڑھا لکھا ضرور ہے کہ مجھ ایسے جاہل کو مرعوب کر سکتا ہے۔ باتیں ہی تو اس کا سارا آرٹ ہیں۔ اپنے مضمونوں میں بھی تو بغیر دلائل کے باتیں ہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ باتیں ہوتی ہیں بامحاورہ اور چٹپٹی، جس دن کسی نقاد نے ان کے مضمونوں سے ان کی باتوں کو الگ کر دیا اس دن انتظار حسین گوشہ نشین ہو جائیں گے۔

نہ جانے یہ کیا بات ہے کہ ہزار محبت کے باوجود میری ان کی ٹھنی ہی رہتی ہے۔ ہم ایک دوسرے پر فقرے چُست کر کے دلی سکون حاصل کرتے ہیں۔ وہ اہلِ زبان اور میں بے زبان، کاہے کو پورا اترتا ہوں گا۔ مجھے جو غصّہ آتا ہے تو وہ یہی کہ اگر اس ذرا سے آدمی سے مات کھالی تو محلّے کے لونڈے بھی مجھ پر بہ آسانی فقرے چُست کر لیا کریں گے۔

انتظار صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ جتنے ادیب چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان میں ایک بھی ادیب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ریکارڈ بڑا اچھا ہے جو بھول کر بھی انہوں نے کسی کو ادیب مانا ہو۔ ایک دن بیٹھے انتظار صاحب یہی باتیں کر رہے تھے کہ سب کے سب ادیب جاہل ہیں، تو میں نے ان سے بہ ادب درخواست کر دی تب تو آپ ان سب کے امام ٹھہرے۔

یہ دو دھاری تلوار ہیں۔ دوستوں سے بھی ہنس ہنس کے بات کریں گے اور دشمنوں سے بھی، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ باتیں کس کھاتے میں سے پیش کی جا رہی ہیں۔ لوگ ان کے جانی دشمن ہوتے ہوئے بھی ان سے علیک سلیک ختم نہ کریں گے۔ اگر دوسرا ختم کر دے گا تو یہ ختم نہ ہونے دیں گے۔

ویسے یہ بیچارے بھی میری ہی طرح بے ضرر اور غیر مفید انسان ہیں۔ ان کی دشمنی سے نہ کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، نہ ان کی دوستی سے کوئی فائدہ، دشمنی میں زیادہ سے زیادہ تیر ماریں گے تو کسی کے خلاف ریویو لکھ دیں گے، دوستی پر اتریں گے تو اسے ایک کپ چائے پلا دیں گے۔

میز کے گرد بیٹھے ہاڑ کو روتے رہیں گے۔ ہائے کیا لوگ تھے وہ بھی اور کیا زمانہ تھا وہ، اب فجوؒ کی ریوڑیاں نہیں ملتیں، مجوؒ کے پاپڑ نہیں ملتے، کجوؒ کی گجک نہیں ملتی، بجوؒ کے دہی بڑے نہیں ملتے۔

سو خوبیوں کی ایک بات ان میں یہ دیکھی کہ انہوں نے کبھی حالات کی ناسازگاری کا رونا نہیں رویا۔ بے کار رہے تو چہکتے رہے۔ بھوکے رہے تو پھدکتے رہے۔ ویسے یہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور چاہتے ہیں۔ ماحول پُرسکون ہو تو انہیں بے چینی ہوتی ہے۔ چاہتے ہیں کہ کچھ کروں تاکہ لوگ متوجہ ہوں۔ خواہ اس کے لئے انہیں کوئی ناشائستہ حرکت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

جن سے مل کر میرا دل خوش ہوتا ہے ان میں ایک انتظار حسین بھی ہیں۔ اگر مجھے کسی پریشانی نے نڈھال کر رکھا ہو، مایوسی کا کوئی پہاڑ سامنے ہو تو میں انتظار حسین کی تلاش میں نکلتا ہوں اور انھیں ڈھونڈھ لینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی ہوٹل میں مل جائیں گے، کسی پنواڑی کی دکان پر مل جائیں گے، کسی کالج کے طالب علم کو مرعوب کرتے ہوئے مل جائیں گے۔ مگر ملیں گے ضرور! ان کے گھر والے دن میں ان کی شکل دیکھ لیں تو دیکھ لیں رات کو ان کے بستر سڑکیں اور ہوٹل ہوں گے۔

ناصر کاظمی

میری ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب یہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ کالج میں دو لڑکوں کا بڑا چرچا تھا۔ ایک ان کا دوسرے حمید نسیم کا، کالج میں جن لڑکوں کے چرچے ہوتے ہیں ان کی وجوہ عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ ان کا چرچا کیوں تھا، بات سمجھ میں نہ آئی۔ نہ شکل و صورت نہ ذہانت، شکل و صورت تھی تو ایسی جیسے کوئی ہالی وڈ کا جواری ہو اور ذہانت بس اتنی کہ کام چل جائے۔

ان دنوں بس یہی سرسری سا ہی تعارف ہوا تھا۔ اس وقت انہوں نے چڑھتی پتنگ کی طرح شانے ہلا ہلا کر کچھ مرعوب کرنا چاہا۔ اپنی امارت کی طرف اشارے بھی کئے اور دوسرے لڑکوں سے اپنے آپ کو الگ سا بھی بتایا۔

پاکستان کی بدولت یہ کھاتا پیتا شاعر اسی لاہور میں آگیا جس میں اس کی امارت سے بہت سے مرعوب تھے۔ مگر اب امارت اُدھر رہ گئی تھی اور یہ اِدھر آگئے تھے۔ برسوں سے دھکے کھا رہے ہیں اور شعر کہہ رہے ہیں۔

ان کی انتظار حسین بڑی کمزوری ہیں۔ اکیلے ہوں تو یہ انہیں اور وہ اِنہیں ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ جب دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی ٹی ہاؤس میں بیٹھ جاتے ہیں ورنہ ایک دوسرے کو ساری ساری رات ڈھونڈھنے ہی میں گذار دیتے ہیں۔

ویسے ایسا ہوتا کبھی کبھی ہی ہے۔ جب تک ان دونوں کے مشاغل آپس میں نہ ٹکرائیں یہ نوبت نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے اب دونوں نے کچھ وعدے وعید کر رکھے ہیں کہ اگر مشاغل ٹکرا بھی جائیں تو بھی ایک دوسرے کو صورت دکھانا ہے ضروری۔

ناصر صاحب بلاشبہ مزے دار آدمی ہیں، بور قطعی نہیں ہیں۔ ورنہ شاعر چند ایک کو چھوڑ کر بیس قدم دور اپنے اوصاف سمیت پہچان لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے ملنے والوں میں ضرورت کی حد تک ہر دلعزیز ہیں۔ اگر ہر دلعزیز نہیں ہیں تو صرف ان میں، جو خود کو بھی غزل کا شاعر سمجھتے ہیں۔

ان کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں، پوری معصومیت لئے ہوئے۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فلاں ادیب کی فلاں آدمی سے نہیں بنتی تو اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے اور سگریٹ پہ سگریٹ پیتے ہوئے پوچھیں گے۔۔ وہ چیز دیکھی؟ بات بنی نہیں، اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر مخاطب کی ردّی سی چیز پر تبصرہ ——— واہ واہ سبحان اللہ — بات ہوئی نا کوئی! بخدا جو سلیقہ اور ڈھنگ آپ کو کہنے کا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی اُسے نہیں چھوا۔ دیکھئے جب پندرہ برس بعد آپ مر جائیں گے تو اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

یہ دن کو سوتے ہیں اور راتوں کو جاگتے ہیں۔ جب میں بھی ان کا تھوڑا بہت ہمراز تھا تو مجھے معلوم تھا کہ یہ رات کے اتنے بج کر اتنے منٹ پر کہاں ملیں گے اور اتنے بج کر اتنے منٹ پر کہاں۔ جیسے جیسے سورج کے نکلنے کا وقت قریب آتا ان کے ٹھکانے غیر یقینی ہوتے جاتے۔

اُن دنوں ان کی جیب میں ایک چھوٹی سی پنسل ہوتی تھی۔ چائے پی، بل پر دستخط کر کے سرخرو ہو گئے۔ اس طرح ان کی ساری رات بلوں پر دستخط کرتے گذر جاتی تھی۔ ہوٹل والوں کے سینکڑوں روپے ہو گئے تو بھی وہ مطمئن، اس لئے کہ ان کا یہ گاہک اور شاعروں کی طرح کا نہ تھا۔

بزرگوں کا احترام کرنا، عام زندگی میں شاعری سے کام نہ لینا، صرف غزل کی کتابیں پڑھنا، نثر کی کتابوں سے دور بھاگنا ان کا روزمرہ ہے۔

(نامکمل)

صاحب
(مدیرِ نقوش کے اسکیچوں کا مجموعہ)

جس میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا شخصی تجزیہ بڑے فنکارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

نیاز فتحپوری نے اس کتاب پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"صاحب" کے چند مطبوعہ اجزا دیکھ کر بڑا لطف آیا۔ یہ صرف چہرہ نمائی نہیں بلکہ گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی ہے جس میں پطرس کا مزاح، شاؔ کا نشتر، آسکر وائلڈ کا PARADOX اور چسٹرٹن کی چٹکیاں سبھی کچھ موجود ہے۔"

قیمت تین روپے
ادارۂ فروغِ اُردو۔ لاہور

کُھلے خط

اس عنوان کے تحت ہم آئندہ بھی ضروری خط پیش کیا کریں گے۔

(ادارہ)

مکرمی طفیل صاحب۔ آپ نے جون ۵۶ء کے نقوش میں حضرت فراقؔ گورکھپوری کا خط چھاپا جس میں، مجھ پر بھی چھینٹے آگئے ہیں۔ یہ مکتوب اُن کا جواب ہے۔ استدعا ہے کہ اس کو بھی اپنے مقتدر رسالے میں جگہ دیجئے۔ اگر آپ نے حیلے حوالے کئے اور بغلیں جھانکے تو "گھٹ" ہو جائے گی۔

فراق صاحب اپنی طویل نظم "حدیثِ حسن" کا رعب جمانے کو اس کی شان نزول ایک جیتی جاگتی عورت کو قرار دیتے ہیں جو اُن کی زندگی میں داخل ہو گئی ہے فرماتے ہیں:۔

"میری زندگی کرب انگیز محرومیوں اور ناکامیوں کی زندگی رہی ہے۔ میری عمر ایک پاگل بنا دینے والی بھیانک تنہائی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں گزری ہے۔"

(زندگی کے آلام و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والا اور اپنے منہ میاں مٹھو بنے! ایں چہ بوالعجبی ست۔ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو! اثرؔ)

اور زندگی کو کرب انگیز محرومیوں اور ناکامیوں کی آماجگاہ بنانے کا ذمہ دار کون؟ خود حضرت کی بیاہتا بیوی! جیسا اپنے خطوط میں جو کوئی دو برس اُدھر اسی نقوش میں شائع ہوئے تھے اعلان کر چکے ہیں۔ یہی نہیں خود فراق صاحب کے کلام کا مجموعہ جو "مشعل" کے نام سے شائع ہوا ہے اور جس کو فراق صاحب نے "حاشیہ" سے مزین کیا ہے اُس کا صفحہ س ملاحظہ کیجئے جہاں یہ عبارت واضح ہے:۔

"خود میری گھریلو اور ازدواجی زندگی تمام تر تلخ ناخوشگوار اور کڑوی رہی ہے۔ مجھے گھر کا سکھ ہی نہیں ملا۔"

مجھے یاد پڑتا ہے کہ نقوش کے پچھلے خطوط میں بیوی کی بدصورتی کا بھی دکھڑا رویا ہے۔

اس وقت حضرت کا سن شریف ساٹھ سے متجاوز ہوگا۔ دیکھئے کس دھڑلے سے "پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت ست" کا سہرا اپنے سر بندھوانا چاہتے ہیں۔ سنئے اور وجد کیجئے:۔

"اب جا کے میری زندگی میں ایک ایسی عورت داخل ہوئی ہے جس نے میری جھلسی ہوئی زندگی کے خارزار کو چمن چمن کر دیا ہے، یہ نظم اُسی دیوی کو نذرِ عقیدت ہے۔"

ارے صاحب دیوی کی نذرِ عقیدت تھی تو اس کا ڈھنڈورا پیٹنا کیا ضرور تھا اور اگر اس کا عمومی اظہار منظور تھا اور اس میں جذبۂ احترام شامل تھا تو دیوی کے نام کا اعلان کرنے

ہی شرم نہ آنا چاہیئے تھی۔ ٹاٹا نگر کے شری گوئلی جی کو ایسے اعلان میں مطلق باک یا تامل نہیں ہوا۔ دیوی جی اور اُن کے شوہر کی تصویر بھی جزوِ کتاب ہے کیونکہ دل و ضمیر پاک و صاف تھے۔ مگر جہاں دال میں کچھ کالا کالا ہو ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہاں سے اس حقیر سراپا تقصیر کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"امید ہے کہ جناب اثر لکھنوی لوگوں کی نظر بچا کے یہ نظم پڑھ لیں گے اور یا تو اس کا جواب لکھنے کی سعیٔ لاحاصل فرمائیں گے یا ان کو اپنے اعتراضات بے ہنگام و اصلاحات بلاغت نظام سے نوازیں گے۔

اثر نہ یہ کرے گا نہ وہ بلکہ دیوی کی تخلیق کا راز افشا کرنے کی کوشش کرے گا کہ کچھ برس اُدھر تک یہ دیوی جی ایک چھوکری تھیں۔ مجھے یہ القا نہیں ہوا بلکہ خود فراق صاحب کے ایک شعر سے مطلب نکالا۔ سنئے کیا خوب فرماتے ہیں ؎

لڑکپن کی ادا ہے جان لیوا
غضب یہ چھوکری ہے ہاتھ بھر کی

کئی برس ہوئے رسالہ فنکار دہلی میں فراق صاحب کی ایک غزل چھپی تھی جس میں مندرجہ بالا شعر بھی تھا اور مقطع میں مجھ غریب کو لے ڈالا تھا ؎

فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس وقت
اثر بیٹھے ہوئے کرتے ہیں ہی ہی

پھر نثر میں اس کی توضیح کی تھی:۔

"میرزا جعفر علی خاں اثر کی طرف اشارہ ہے جنہیں میرے اچھے بُرے تمام اشعار پر اعتراض ہے"۔

چونکہ تحریر کا آخری حصہ سفید جھوٹ تھا مجھے اس کی تردید کی ضرورت ہوئی اور میں نے بھی فراق صاحب کی زمین میں ایک نظم موزوں کر ڈالی اور نثر میں بھی مثالیں دے کر فراق صاحب کے جھوٹ کا لفافہ چاک کیا۔ یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فنکار سے ضروری اقتباسات دے دیئے جائیں۔

یہ فنکار دہلی جلد ۲۔ اکتوبر نومبر سے لئے گئے ہیں۔ سنہ سرورق پر درج نہیں۔ وہو ہٰذا۔

"فراق صاحب گورکھپوری سے میری تنقیدوں کا جواب تو بن نہیں پڑتا اندر اندر گھُٹتے ہیں، بہت مجبور ہوتے ہیں تو دل کی بھڑاس نکالنے کو اپنے کسی چیلے چاپڑ سے کبھی کبھار کچھ گالیاں لکھوا دیتے ہیں۔ رسالہ تہذیب پٹنہ اس کا شاہد ہے۔ مگر اب اپنی غزلوں کے مقطعوں میں مجھے مخاطب کرنا شروع کر دیا ہے۔ ع

"بحمداللہ کھلا عقدۂ انامل"۔ رسالۂ تہذیب پٹنہ میں اس کی پہل ہوئی (ملاحظہ ہو جون جولائی کا مشترکہ نمبر)۔ غزل میں ایک قطعہ شامل کر کے فرماتے ہیں ؎

وہ مرے اشعار اثر صاحب ہیں جن پر معترض
کچھ سمجھ میں آ تو سکتے ہیں لیاقت چاہیئے
میر و سودا پڑھ کے بھی کورے کے کورے رہ گئے
خواندگی سے کچھ نہیں ہوتا بصیرت چاہیئے
جیسی تنقیدیں اثر لکھتے ہیں ایسی تو ہر ایک
پھینک دے گا لکھ کے توفیق حماقت چاہیئے

اب رسالۂ فنکار دہلی جلد ۱ کے صفحہ ۹۹ پر اپنی غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:۔

فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس وقت
اثر بیٹھے کیا کرتے ہیں ہی ہی"

نثر میں اس کی توضیح کرتے ہیں:۔

میرزا جعفر علی خاں اثر کی طرف اشارہ ہے جنہیں میرے اچھے بُرے تمام اشعار پر اعتراض ہے۔

اس وقت اسی سفید جھوٹ کا پردہ چاک کرنا ہے۔

میں نے جہاں "روپ" کی فحش اور مبتذل رباعیوں کی مذمّت کی ہے۔ زبان و بیان کی خامیاں دکھائی ہیں، سرقۂ شعری کا بھانڈا پھوڑا ہے، وہیں اچھی رباعیوں کی تعریف بھی کی ہے . . . . (مثلاً)

نکھری نکھری نئی جوانی دمِ صبح
آنکھوں میں سکوں کی کہانی دمِ صبح
آنگن میں سہاگن اٹھائے ہوئے ہاتھ
تلسی پہ چڑھا رہی ہے پانی دمِ صبح

تنقید - آرٹ کا کرشمہ دیکھئے کہ فطری منظر اس پیکرِ حسن میں اپنی رعنائیاں چھپا کر ذہن سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اب یہی "بھاگ بھری سہاگن" "صبح دمیدہ ہے۔ جس کے چہرے کی بشاشت، آنکھوں کا سکون اور اطمینان ؟ راتوں کی میٹھی نیند، دل کی یکسوئی، صاف ستھری معصوم زندگی اور پاک خیالات کا آئینہ ہے۔ پچھلی رباعیوں کے "فیضانِ گناہ"، "وجدانِ سیاہ کار" اور دوسرے ہفوات کے پشتاروں سے اس کا موازنہ کیجئے کس میں آرٹ اور جاذبیت ہے کس میں وہ خلوص اور سچّی ترنگ ہے جو خواہشات نفسانی کو برانگیختہ کرنے کے بجائے شبستان جمال میں روحانیت کی شمع فروزاں کر دے کس میں عفونت اور گندگی ہے۔ کس میں نزہت اور سنجیدگی ہے، کس میں فنّی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، کس میں افسانے کی رنگینیاں حقیقت میں تحلیل ہو گئیں اور ایک کی چھوٹ ایک پر پڑنے لگی ..... تیسرے مصرع میں یہ بات کہی نہیں گئی لیکن "اٹھائے ہوئے ہاتھ" کا ٹکڑا بتا رہا ہے کہ اس ہاتھ سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں جس کے پرتو سے تلسی کا مقدس پودا مہکتے ہوئے نور کا شاداب بوٹا بن کر اسپنسر کے Queen of garden اور بن جانسن کے The plant & flower of light کو شرمانے لگا۔" (منقول از چھان بین صفحات ۳۲۰ — ۳۲۱)

"فراق صاحب کی للّٰہ دری، شیطان کی آنت کی طرح لمبی غزل کی طرح میں چند اشعار جو فی البدیہہ موزوں ہو گئے وہ بھی حاضر ہیں:-

اثر کو کس نے دیکھا کرتے ہی ہی !　　کوئی حد ہے فراق اس جھوٹ کی بھی[۱]
تمہاری شاعری کے ہیں عناصر　　یہ ہیں ہیں ہی ہی ہو، ہو، اور کھی کھی[۲]
بہی خواہ ادب کی حیثیت سے　　تمہاری بد مذاقی کا ہوں شاکی
عفونت میں بسی جو شاعری ہو　　تمہاری ہو کہ ہو بدّھو، نفر کی
جب آئی سامنے میری نظر کے　　مذمّت کیسی لعنت میں نے بھیجی
پسندیدہ کسی کا شعر دیکھا　　تو میں نے داد بھی جی کھول کر دی
مری تنقید ہے درسِ بصیرت　　سمجھنے دے جو تم کو خود پسندی
بہائم کی صفوں میں لے گئی ہے　　تمہیں یہ بلبلاہٹ اونٹ کی سی
پکارو خوب یاروں کو پکارو　　یہ ساری چاندنی ہے چار دن کی
اندھیرا پاکھ ہے پھر اور تم ہو　　بکے جاؤ ابھی واہی تباہی
معاذ اللہ یہ کج مج بیانی　　کبھی چکھا ہے غم کے خشک و تر بھی[۳]
بجائے "کام" لفظ راس لاؤ　　خوشی ہی کام آتی ہے نہ غم ہی[۴]
ادا کی چھوکری اچھا بنایا　　لئے گھومو ابھی ہے ہاتھ بھر کی[۵]

---

[۱] فراق صاحب کا مقطع ہے ؎ فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس وقت　اثر بیٹھے ہوئے کرتے ہیں ہی ہی۔

[۲] فراق صاحب کی ایک غزل مشمولہ "مشعل" کا مطلع ہے ؎ جو کچھ بھی ہے دل میں سب کہیں ہم　وہ کچھ نہ کہے تو کیا کریں ہم۔
اسی میں یہ شعر ہے ؎ کیوں ہم پہ نہیں تری عنایت　یہ پوچھنے والے کون ہیں ہم۔
ہیں کو ہیں (بالکسر) پڑھئے ورنہ قافیہ غائب !

[۳] شعر فراق ؎ ثنا خواں لذّت ناز و نعم کے　کبھی چکھّا ہے غم کے خشک و تر بھی

[۴] شعر فراق ؎ محبت میں کریں کیا حال دل کا　خوشی ہی کام آتی ہے نہ غم ہی

[۵] شعر فراق ؎ لڑکپن کی ادا ہے جان لیوا　غضب یہ چھوکری ہے ہاتھ بھر کی

کنول آنکھوں کے دکھلا کر برِ شاخ   بتایا چشمِ جاناں میں ہے پھیلی[1]
جہاں کو کہہ کے اجڑا پھر یہ کہنا   غنیمت ہے یہاں ذات آدمی کی[2]
ہجومِ یاس میں بھی بزمِ دل کے   کہاں پر کے کی آ کر ٹانگ پھسلی[3]
کہاں کی ہے زباں سیدھے کٹا ہے   نکالو یار موچ اپنی زباں کی[4]
بلیک وڈان ، غالب اور چکبست   سبھی کی جیب تو ہے تم نے کتری
اگر گنوائے جائیں نام سب کے   تو ہو فہرست خاصی لمبی چوڑی
بہانہ خوئے بد کا یہ نکالا   کمی اردو میں ہے آفاقیت کی

بہت کچھ اور کہہ سکتا ہوں ، لیکن
" جوابِ جاہلاں باشد خموشی "

شاید میرا استنباط غلط نہ سمجھا جائے کہ کچھ برس اُدھر کی چھوکری جس کی بوٹی بوٹی اُس وقت بھی پھڑکتی تھی۔ اب داغؔ کے اس مطلع کی مصداق ہوگئی ہے۔

؎ ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی   اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اور یہ سونے کی چڑیا فراق صاحب کے ہاتھ لگ گئی ہے اور " اُن کی جھلسی ہوئی زندگی کے خارزار کو چمن چمن کر دیا ہے "۔ وہ اسے دیوی کہہ کر نذرِ عقیدت بشکلِ " حدیثِ حسن " پیش کرتے ہیں۔ مگر پرانی عادتیں کہیں چھوٹتی ہیں ، وہی مثل ہے کہ چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ اس ہدیۂ عقیدت میں اس نوع کے اشعار بھی شامل ہیں :-

ان انکھڑیوں میں جلیں جرمِ اوّلیں کے چراغ   لپک گناہ کے شعلوں کی ابروئے خمدار
... فرازِ سینہ پہ رخشندہ دو مہِ کامل   وہ جسم چاندنی میں جیسے چھوٹتا ہو انار
... شبِ وصال کٹے پھر بھی یہ کنوارا پن   تمام غنچہ صفت ہے کھلا ہوا گلزار
... کنار میں بھی اُسے لے کے ڈھونڈتے رہیئے   سپردگی کے بھی پہلو میں صد ادائے فرار

واہ صاحب اچھی دیوی جی ہیں اور اچھا پجاری۔

مگر میں نے غور کیا تو یقین ہوا کہ دیوی جی کے بر چلنے میں فراق صاحب کے روحانی تصرّف کو دخل ہے۔ وہ کیونکر ؟ سُنیئے۔

کچھ مہینے اُدھر فراق صاحب کی تین غزلیں رسالہ " بیسویں صدی دہلی " میں اُن کی خود نوشتہ تمہید کے ساتھ شائع ہوئیں۔ تمہید حسب ذیل ہے :-

" ہر غزل میں سہل ممتنع کی بہت سی مثالیں ہیں۔ انہیں ایک عمر کی مشق اور ریاضتِ نفس کا نچوڑ سمجھئے۔ ایسے خیالات کی دولت جوانی

---

[1] شعرِ فراق ؎ کنول دو ادھ کھلے جیسے سرِ شاخ   خوشا اُن انکھڑیوں کی نیم خوابی
[2] شعرِ فراق ؎ بساتا کیا خدا اُجڑے جہاں کو   غنیمت ہے یہاں ذات آدمی کی
[3] شعرِ فراق ؎ ہجومِ یاس میں بھی بزمِ دل کے   تمنّا کو سرکنا تھا نہ سرکی
[4] شعرِ فراق ؎ کہیں کوہِ الم سیدھے کٹا ہے   کمر ٹک ہو کے رہ جاتی ہے دہری
("یار" اُستاد فراق کے تتبع میں لایا گیا۔ اثرؔ)

میں ہاتھ نہیں آتی"۔

اور پہلا ہی مطلع یہ ہے :۔

؎ زندگی کی خوشی نہ دور نہ پاس — وصل کی رات اور اتنی اُداس

فاعتبروا یا اولی الابصار !

مگر صاحب "ہر سے کہ دمِ زعشق زند بس غنیمت ست" باوجودیکہ یہ نوبت پہنچی ہے کہ جنس مقابل کا شب وصال کے بعد بھی کنوارا پن برقرار رہتا ہے۔

شب وصال کٹے پھر بھی یہ کنوارا پن — تمام غنچہ صفت ہے کھلا ہوا گلزار

پہلے مصرع کو بطرز استعجاب پڑھئے تو اور لطف آئے ع شب وصال کٹے۔ پھر بھی یہ کنوارا پن ! اور خود فراق صاحب کو اس تحریر میں شریک کرنا چاہیئے تو "پھر" کو "پر" سے بدل کر یوں پڑھئے ع شب وصال کٹے پَر بھی یہ کنوارا پن ! کبھی فراق صاحب قلقاریاں مار کے اور بغلیں بجا کے معشوق سے کہتے تھے ؎

شب وصال ذرا آئینہ تو دیکھ اے دوست — ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

پھر "افسانۂ آں شبے کہ بایار گزشت" یوں کہا ؎

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بقدم — رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی

یوں بھی کہا ع ہنگام وصال پینگ لیتا ہوا جسم —— کبھی توسنِ فکر کو اس طرح جولاں کیا : ع "کنڈل پہ کنڈل کے جیسے پھن کاڑھے سانپ" (کیا ران پٹری جاگی ہے !) پھر زیر لب کہہ کر ع "یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے" اپنا یہ شعر بچشم پُرنم پڑھا ؎

زندگی کی خوشی نہ دور نہ پاس — وصل کی رات اور اتنی اُداس

مگر پھر کسی نے مسیحائی کی اور یہ پھر چہکنے لگے ؎

شب وصال کٹے پھر بھی یہ کنوارا پن — تمام غنچہ صفت ہے کھلا ہوا گلزار

آپ کہیں گے ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند اور میں کہوں گا کہ اقلیم لمسیات کے تاجدار شاعر کو ایسا ہی ہونا چاہیئے اور جب شرع میں شرم نہیں تو پھر ایسی شاعری میں ع شرم چہ کتیست کہ پیش مرداں بیاید اور کچھ نہ ہو سکا تو مردے ہی کو قبر میں لٹا دیا اور سمجھے کہ ع

"ہم امتحانِ عشق میں پورے اتر گئے" (شفیق لکھنوی مرحوم)

(اثر لکھنوی)

---

(۲)

ع جو چاہو اپنے انداز سے تم تحریر کر ڈالو

"نقوش" کا شخصیات نمبر شخصیات کے موضوع پر کم و بیش ایک تذکرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس زاویۂ اعتبار سے یہ از بس لازم ہے کہ کردار نگاری کی جزئیات کے ساتھ ساتھ صحتِ واقعات کا خیال رکھنے کی بھی اس میں پوری پوری کوشش کی جائے اور کہیں کوئی ایسی بات سپردِ قلم نہ کی جائے جس کی صحت محلِ نظر ہو اور غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہو۔ لیکن ایک دو مضامین پر طائرانہ نظر ڈالنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کہیں کہیں معاملہ مندرجہ بالا کلیے کے بالکل برعکس ہے۔ میرے عزیز اور محبوب دوست جناب شاد امرتسری (ع زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا) جنہوں نے کمالِ التفات اور خاصی وقت

نظر سے راقم الحروف کی حقیر اور معمولی شخصیت کا اتنا بڑا سنسنی خیز اور دلچسپ سکینڈل مُرتب کر ڈالا ہے۔ میرے متعلق اپنے ذاتی خیالات و تاثرات کا اظہار کرنے کے پوری طرح مجاز ہیں اور اُن کے اِس سو فی صدی جائز حق پر حرف زنی کرنے کی نہ تو مجھے اور نہ ہی کسی اور کو مجال ہو سکتی ہے۔ یہ کہ اُن کے تحریر کردہ کوائف میں اصلیت کے عنصر کے ساتھ ساتھ "الف لیلےٰ" کے کیریکٹر کی کتنی چیزیں اور اُن کی اپنی ذہنی افتاد (Inferiority Complex) کی کتنی اُپج شامل ہے ایک بالکل غیر متعلق سوال ہے۔ لیکن شاد صاحب نے اپنے مضمون میں میرا شعر حافظے کی مدد سے نقل کرنے کی جو "سیف الملوکی" فرمائی ہے وہ عدل کے مبادی مقتضیات کی تشفی کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی۔ اس لئے میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ "نقوش" کے قارئین کی واقفیت کے لئے اُس کی تصحیح کر دوں۔

شاد صاحب نے شعر یوں نقل کیا ہے ؎

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جُرم پر
ہنستا تو ہو گا حضرتِ یزداں کبھی کبھی

حقیقتاً شعر یُوں ہے ؎

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جُرم پر
ہنستا تو ہو گا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

قریب قریب اسی قسم کا حادثہ میرے فاضل، باذوق، اور بزرگ دوست حکیم نیّر واسطی صاحب کے مضمون (جو اُنہوں نے اختر شیرانی کی شخصیت پر تحریر فرمایا ہے) میں بھی سرزد ہو گیا ہے۔ میرا ایک "بدنام" شعر صاحبِ موصوف نے اپنے مضمون کے اختتام میں بلا تکلّف غلط نقل کر دیا ہے۔

اِس حادثے کا پس منظر تو خیر میرے احاطۂ علم سے باہر نہیں۔ میرے نہایت محبوب اور جامع الصفات دوست جناب شورشؔ کاشمیری مجھ سے غایت درجہ قلبی شغف رکھتے ہیں ایک دفعہ آپ نے میرا شعر میری موجودگی میں یُوں پڑھ دیا تھا ؎

میں میکدے کی راہ سے ہو کر "گزر" گیا
ورنہ سفرِ حیات کا "بے حد" طویل تھا

ہم "چٹان" ہی کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اِس پر مجھے فی البدیہہ ایک لطیفہ گھڑنا پڑا۔

میں نے عرض کیا :۔

"آغا صاحب! ہندو تو آدمی کو اس وقت جُلاتے ہیں جب وہ بیچارہ مرجائے —— لیکن یہ مسلمانوں نے جیتے جاگتے اور زندہ ابنائے آدم کو اُن کی زندگی ہی میں جو دیا سلائی لگانی شروع کر دی ہے یہ میرے خیال میں اپنی قسم کا پہلا نادر اجتہاد ہے۔

آغا نے مُسکرا کر کہا۔ "باوا آدم! کس کو دیا سلائی لگ گئی؟"

میں نے کہا "میاں میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ قسم خُدا کی جل گیا ہوں شعر سُن کر خدا کے واسطے غور سے سُن لو اور آئندہ اِس شعر کو یوں پڑھا کرو ؎

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نِکل گیا
ورنہ سفرِ حیات کا کتنا طویل تھا!؟

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ نیّر واسطی صاحب کے بالائی ڈرائینگ روم میں جہاں کبھی راقم الحروف، شورشؔ کاشمیری اور نیّر واسطی اکٹھے مجلس آرائیاں کیا کرتے تھے یہ شعر اپنی پہلی اور غلط صورت ہی میں کراہ رہا ہے اور نیّر صاحب اِس کے مرض کی تشخیص کرنے سے قاصر ہیں۔ قارئینِ کرام تصحیح فرمالیں۔

میں اپنے فاضل اور جلیل القدر احباب سے بہ کمال معذرت، یہ درخواست کروں گا کہ ایسے سنجیدہ، اہم اور نازک قسم کے معاملات اور نگارشات، جن کی وساطت سے خُلَفا کے نتائج فکر اور رشحاتِ قلم کے آئندہ نسلوں تک پہنچ جانے کا "اندیشہ" ہو، اُن میں عملِ نقل کو حافظے کی مدد پر چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنا دیانت داری اور وقائع نگاری دونوں کی روایات کے منافی ہے۔ ایک عظیم اور معمولی شعر میں صرف لباس کا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں سے کسی ایک شعر کا اگر کوئی لفظ حذف کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو شعر کی تمام تعمیر چشم زدن میں منہدم ہو جائے گی :۔

؎ تازگی ہے تِری جوانی کی
آئینے تو بہت پُرانے ہیں

زبلیہ! شوق سے قدم رکھو   یہ فقیروں کے آشیانے ہیں
اُن میں اور ہم میں فاصلا ہی کیا   زندگی درمیان پڑتی ہے   جز صدا کچھ نہیں رہا باقی   کس حسین نے مجھے پکارا ہے
جل بھی جا بدنصیب پروانے!   شمع کی زندگی دراز نہیں
ہم بھی مرتے ہیں اُس کی صورت پر   کس کو اپنے ہنر پہ ناز نہیں   پوچھ کر وہ حسین جو حال گیا   آگ پر اور تیل ڈال گیا
اُف وہ انساں جو نیکیاں کر کے   نیکیوں کو کنویں میں ڈال گیا

ہم تو خیر انتہا کے غافل ہیں   آپ کو بھی کوئی خیال نہیں   کھول دیجے کرم کے دروازے   بارگاہوں کے در نہیں ہوتے
اِک نظر ڈال دو خدا کے لئے۔   زندگی دِلکشی سے خالی ہے
کاش وہ کاکلیں بِکھر جائیں   آج گرمی بہت زیادہ ہے   رنجشیں مستقل نہیں ہوتیں   دیکھ! قطعِ تعلّقات نہ کر
آئیے کوئی نیک کام کریں   آج موسم بڑا گلابی ہے
صبحِ محشر کو ملتوی کر دو   ہو گئی میکدے میں رات مجھے   وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں   سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

ہم نے دنیا بِگاڑ لی اپنی   دوستوں کی کدورتیں نہ گئیں
کیسے کیسے عظیم بندوں سے   کیسے کیسے گناہ ہوتے ہیں   آپ سے عرضِ حال کیا معنی؟   آپ سنتے ہی مسکرا دیں گے
اِس خرد کے خراب خانے میں   چند نادانیاں ضروری ہیں

یہ جو آوارگی ہے شبنم کی   اِس میں کچھ جرمِ آفتاب بھی ہے

عدمؔ

عصمتیں لٹتی ہیں چوراہوں میں   آبرو بکتی ہے بازاروں میں
بنتِ حوّا کی یہ تذلیل کہ آج   شمعِ محفل ہے وہ میخواروں میں
(زرّینؔ)

جیسے زرّینؔ نے اپنے تیکھے انداز میں تحریر کیا ہے
مسلے پھول
ضخامت: ۲۷۴ صفحات۔ سرورق: دیدہ زیب
کتابت وطباعت: عمدہ۔ قیمت: -/۴

مسلے پھول ـــ سماج کے منہ پر ایک زوردار چپت ہے۔ سماج کے مکروہ چہرے سے نقاب نوچنے کی ایک کامیاب کوشش۔ ایک ایسا آئینہ جس میں سماج کے صحیح خدوخال نظر آئیں گے اور جسے پڑھ کر کوئی بھی حسّاس ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسلے پھول ـــ جس کے ہر ورق پر آپ کو معصوم جوانیوں کے خون کے دھبے نظر آئیں گے جسے پڑھکر آپ کی نظروں میں ان بے گناہ دوشیزاؤں اور بھولی بھالی لڑکیوں کے خاکے اُبھریں گے جو سرمایہ داروں اور سیہ کاروں کے ہاتھوں بربادی اور ذلّت سے ہمکنار ہوئیں۔

مسلے پھول ـــ جس میں طوائف کی زندگی کے صحیح خدوخال واضح کئے گئے ہیں۔ اسکی زندگی کے دونوں رُخ پیش کئے گئے ہیں۔ تحریر سے خون ٹپکتا ہے۔ اگر مصنف کے بس میں ہوتا تو وہ اس سماج کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا جس میں عورت کسبی ہے، جہاں اس کا گوشت بکتا ہے، جہاں عورت رقص و نغمہ اور رات کی بات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ طوائف جو ایک مسلا ہوا پھول ہے، ایک گالی ہے، احتجاج ہے، ایک دردناک المیہ ہے، بے جان قہقہہ ہے، مجسّم فریاد ہے۔

مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" قاضی عبدالغفار کی "مجنوں کی ڈائری" منٹو کے افسانوں اور شورش کاشمیری کی "اس بازار میں" کے بعد طوائف کی زندگی پر اردو کے جواں سال افسانہ نگار اور شاعر کے۔ زرّین کی اچھوتی تصنیف "مسلے پھول" جن کا حقیقت پسندانہ قلم ان تمام گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے جن پر سے پردہ اٹھائے بغیر طوائف کے بارے میں کوئی واضح نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ "مسلے پھول" کا مصنف نہ صرف عصمت فروشی کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا متمنی ہے بلکہ اسکا حل بھی پیش کرتا ہے۔ کیا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ ممکن نہیں کہ طوائف خانے بند کر دیئے جائیں اور ان طوائفوں کیلئے کوئی باعزت روزگار مہیا کیا جائے اور ان حالات و واقعات پر قابو پایا جائے جن سے دوچار ہونے کے بعد ایک عورت طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے؟

ملنے کا پتہ: کتاب منزل کشمیری بازار لاہور، زرّین بُک ٹال ناظم آباد (ضلع سرگودھا) سے طلب کریں

تصانیف

حجاب (امتیاز علی) و امتیاز علی تاج

ننھی بیبیاں : پہلی کتاب جو بیگم حجاب امتیاز علی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہے۔ یہ کتاب مغربی کلاسیکی میں شمار کی جاتی ہے اس لئے یورپ کی تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ مغربی ممالک میں کوئی عام لائبریری یا طلبا کی لائبریری اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔ نوجوانوں کو انعام یا تحفے میں دینے کے لئے خصوصیت سے منتخب کی جاتی ہے۔ کتاب میں انسانی اقدار ایسی ہیں کہ پاکستانی پڑھنے والے مارچ خاندان کے شہرہ آفاق کرداروں کے غموں اور خوشیوں سے بخوبی لطف اندوز ہو سکیں گے۔ ترجمہ ایسا شگفتہ، سلیس اور رواں ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ ضخامت ۵۵۰ صفحے، بلاک کی چھ نہایت بارونق رنگین تصویریں جو مصر کے عربی ایڈیشن میں سے لی گئی ہیں اور وہیں سے چھپوا کر منگوائی گئی ہیں۔ سرورق نامور مصری فنکار اعتدال حسن کا بنایا ہوا ہے۔ قیمت ۵/۸

ظالم محبت : حجاب امتیاز علی کا شاہکار جس کا چوتھا ایڈیشن اب شائع ہوا ہے' ہر ادبی رسالے، ہر ادیب اور ہر ناول پڑھنے والے نے اسے اردو کی ایک زندہ جاوید تصنیف قرار دیا ہے۔ تکونی محبت کا پلاٹ جس میں تین انسانی آوازیں بیک وقت چلا اٹھتی ہیں کہ زندگی کی یہ رات جاودانی نہیں' انسان کا یہ رعنا خواب جگنو کی چمک ہے' صبح سے پہلے اس طلسم کو نہ توڑو۔ لیکن طلسم ٹوٹتے ہیں، روشنیاں مدھم پڑتی ہیں اور زندگی کی راتیں فانی ثابت ہوتی ہیں اس کے باوجود انسان اور اس کی محبت ابدی معلوم ہوتی ہے۔ مجلد مع گرد پوش قیمت ۴/۸

اندھیرا خواب : اگر صوفی کے خواب اندھیرے تھے تو اس کی وجہ تھی۔ اگر ریحانی کی نکٹائی کا رنگ سُرخ تھا اور صوفی اسے دیکھ کر وحشی درندے کی طرح اپنے عاشق پر حملہ آور ہو گئی تھی تو اس کا مقصد تھا۔ اگر ایک طرف ریحانی کی پاکیزہ محبت اور دوسری طرف شرابی کی سُرخ آنکھیں اسے وارفتہ کر دیتی تھیں تو اس کے گہرے معنی تھے۔ زندگی کا کوئی لمحہ اور انسان کی کوئی حرکت بے معنی یا بے مقصد نہیں ہوتی۔ یہ حجاب امتیاز علی کا وہ معرکۃ الآرا ناول ہے جسے پڑھ کر دو عالمانِ تجزیۂ نفس (ڈائرکٹر مینٹل کلینک پاکستان اور ممبر یونیسکو سائیکولوجیکل ریسرچ سوسائٹی انڈیا) نے متفق الرائے ہو کر کہا کہ یہ تجزیۂ نفس اور فساد اعصاب پر ایک ایسا دلچسپ اور اچھوتا ناول ہے کہ کسی یورپین زبان میں بھی نظر سے نہیں گزرا۔ مجلد مع گرد پوش قیمت ۴/۸

انارکلی : سیّد امتیاز علی تاج کا شہرۂ آفاق ڈرامہ ایک طویل مدت کے بعد چھپ گیا ہے۔

قیمت -/۵

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

میں لکس ٹائیلٹ صابن استعمال کرتی ہوں

نیّر سلطانہ

کہتی ہے

LUX
TOILET SOAP

فلمی ستاروں کا نفیس اور خوشبودار حسن بخش صابن

LTS.6—193UD

ان کی تندرستی اہم شے ہے

اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں

اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں

اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ غذائیت ہے ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن 'اے' کی اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کے اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن 'ڈی' بھی موجود ہے! آپ کے بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے۔

ہمیشہ محفوظ اور پاک وصاف

ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سر بمہر اور ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھیے۔

ڈالڈا برانڈ وناسپتی

کھانوں کو بہتر بناتا ہے

HVM 17—193 UD

LIFEBUOY
SOAP
LIFEBUOY
SOAP
LIFEBUOY SOAP

تندرست بچے باقاعدہ لائف بوائے صابن
سے نہاتے ہیں

—یہ* آئے دن کی گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھوڈالتا ہے!

* آئے دن ہمیں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے، جس میں جراثیم ہوتے ہیں اور جن سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے تو بیشمار لوگ اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن کے باقاعدہ غسل سے کرتے ہیں جو گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھوڈالتا ہے —اور تازگی اور شگفتگی کا صحت مندانہ احساس دلاتا ہے۔

L 10— 193UD

سیدھی پیٹھ
اور
مضبوط اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچّہ کو یہ خالص دودھ
دیجئے

OSTERMILK
MODIFIED MILK-FOOD FOR INFANT FEEDING

اگر آپ کا بچّہ بوتل سے دودھ پا رہا ہے تو اُس کے لئے آسٹر ملک بہترین ہے۔ یہ ایک خالص قوّت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جس کے استعمال سے بچّوں کی پیٹھ سیدھی اور اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچّے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ اس لئے آسٹر ملک فوراً خرید یئے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچّوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔

ہر ماں کے لئے مفید مشورہ

تین مہینے کی عمر تک بچّہ کو ۲۴ گھنٹہ میں ۲۰ گھنٹہ سونا چاہئے اس عمر کے بعد نیند کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ نو مہینے کی عمر میں بچّہ کو دن کے وقت صرف ۴ گھنٹہ اور ۲۴ گھنٹہ میں کُل ۱۶ گھنٹہ سونا چاہئے۔

آسٹر ملک

ماں کے دودھ سے قریب تر

گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

R. 62

میری قمیص پٹخنا بند کرو...

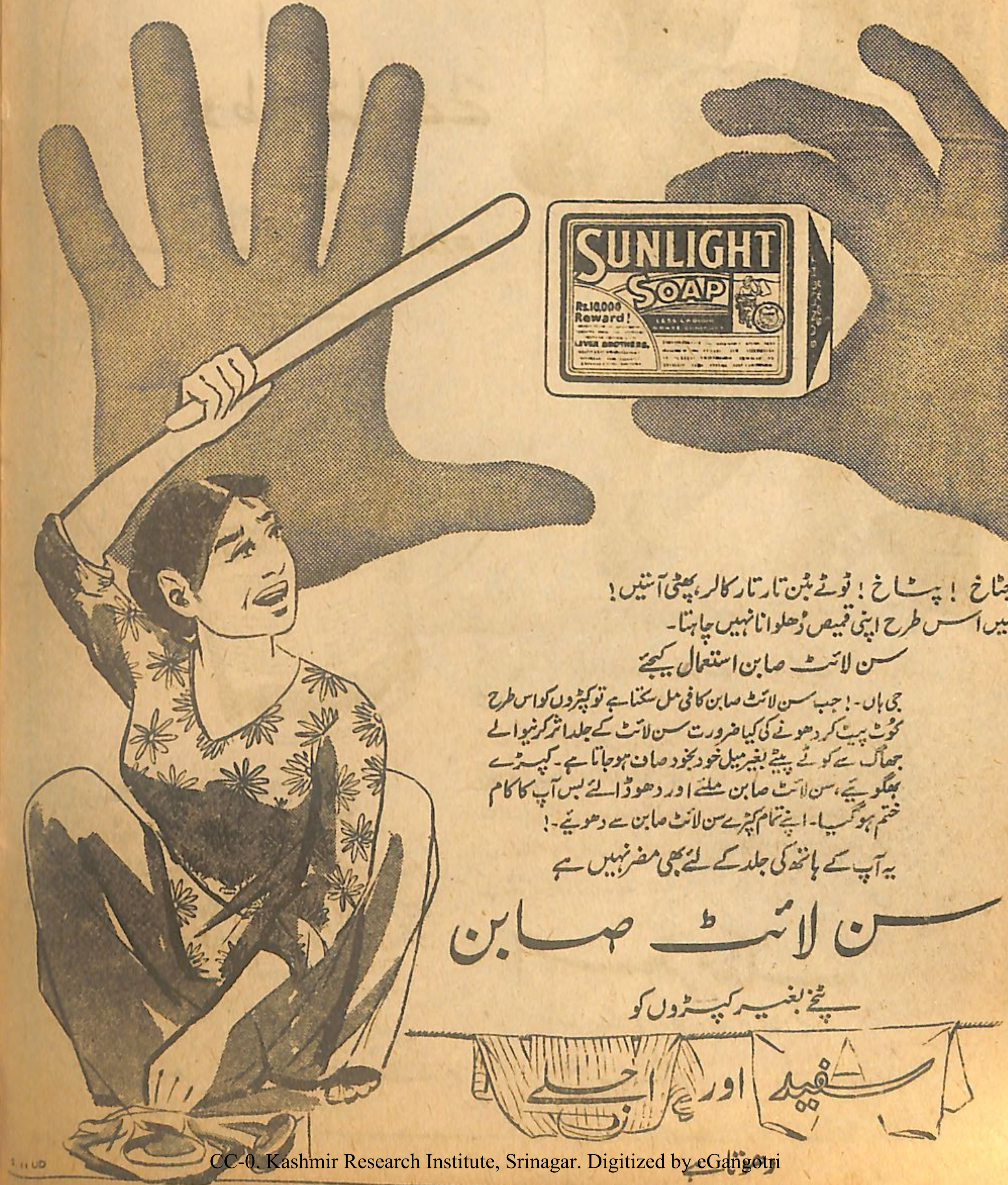

ٹاخ ! پٹاخ ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر، پھٹی آستینیں !
یں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتا۔

سن لائٹ صابن استعمال کیجئے

جی ہاں۔! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح
کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت سن لائٹ کے جلد اثر کرنیوالے
جھاگ سے کوٹے پیٹے بغیر میل خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے
بھگو دیجئے، سن لائٹ صابن ملئے اور دھو ڈالئے بس آپ کا کام
ختم ہو گیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے۔!

یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے

سن لائٹ صابن

پیٹے بغیر کپڑوں کو

سفید اور اجلے

Regd. L. No. 5312

تذکرہ

شعرائے متغزلین

مرتبہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

ولی دکنی سے لے کر عہد حاضر تک کے تمام غزل گو شعرا کے حالات بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ اس مختصر سی کتاب میں جمع کر دئے گئے ھیں ۔

یہ حالات اصل میں غزل نمبر کے لئے ترتیب دئے گئے تھے ۔ وقت پر مکمل نہ ھونے کی وجہ سے اب انہیں الگ بھی پیش کیا جا رھا ھے ۔ اسے آج ھی حاصل کریں اس کے بغیر غزل نمبر نامکمل رھے گا ۔

قیمت ۱/۸

ادارہ فروغ اردو ۔ لاہور

ASHRAF PRESS - LAHORE